

چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

جولائی 2014



چوکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ
ڈائجسٹ
کہانی

جلد نمبر 15 شمارہ نمبر 10 جولائی 2014ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1088 روپے



ادارہ کا کسی بھی راسخ کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈرڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقی ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

روح کا انتقام

ایک سو کا عجیب و غریب شاخسانہ جو کہ اپنے دشمن سے بدلہ لینے کے لئے سرگرمی مچی

41

رضوان بھیٹی

بے گناہ

خود بخود اور دوسروں کو پریشان کرنے والے خود بھی کہیں سے کہیں رہتے - حقیقت کہانی میں ہے

56

اے وحید

زولو کا

وہ آتی ہر اترتو توں کا مالک تھا اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو تنگ کر دیں گی

89

ملک فہیم ارشاد

خونی بارش

احکام خداوندی کو انکار کرنے والے اکثر نشان عبرت بن کر موت سے ہلکا رہا ہوا جاتے ہیں

112

ایم اے راحت

سنہری تابوت

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اجنبی میں ذاتی حیرت انگیز اور تھیر انگیز کہانی

قرآن کی باتیں

دین و دنیا میں فلاح پانے کیلئے قرآن کی باتوں پر عمل کرنا انسانی زندگی کیلئے اہم ہے

37

احسان سحر

دل کا خون

آرزو، تمنا اور خواہش کے لہاوے میں لپٹی ہوئی دل کو ریزہ ریزہ کرتی حقیقت پر مبنی رو داد

51

رفعت محمود

شب قدر

احکام خداوندی سے اجتناب کوئیں کیلئے دل و دماغ کو بہت کئی ذہن سے جوئے ہو سکتی کہانی

81

صباح محمد اسلم

عذاب تنہائی

ایزہ الکی کسمہ بنائے والے اکثر خسارے میں رہتے ہیں - کہانی پڑھ کر دیکھ لیں

99

مدثر بخاری

وہ کون تھی

ایک ایسی کہانی جو غم و غصہ کا سنگ بھجائی اور لوگوں کو ہلکا کر دے گی - ایک ایسی کہانی جو حقیقت

ایہ بڑا پاشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

وہج ڈاکٹر

حقیقت سے چشم پوشی اور اندھا دامن کو
زندہ دگر کر دیتا ہے، ثبوت کہانی میں ہے

پراسرار وجود

ایک مافوق الفطرت ہستی کی دیدہ دلیری
جسے بڑھ کر اہل دل عیش عیش کر اٹھیں گے

شاہکار تخلیق

ایک ماورائی مخلوق کی محبت کی انست کہانی
جسے پڑھنے والے عیش عیش کر اٹھیں گے

آزمائش

رات کے گھما ٹوپ اور ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ
دینے والے اندھیرے میں ختم لینے والی کہانی

زندگان کی روح

ایک دولت کے بھاری کی مہرت انگیز اور
حیرت انگیز خونی اور ناقابل فرسوش حقیقی روداد

ثبوت

کسی کے دل میں غش اپنی بات ڈالنا مشکل ہی نہیں
بلکہ جان بوجھ کر کام ہے ثبوت کہانی میں ہے

خونی کاوش

لے آئے آپ کو محل قل سمجھنے والے ایک شخص کا
عبرت ناک اور حیرت ناک دل دہلاتا خونی واقعہ

عشق ناگن

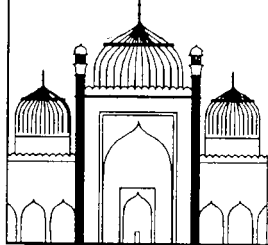
یہ دنیا ہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ
رہے گی۔ اسی الفاظ کو احاطہ کرتی دنگناز کہانی

واصل جہنم

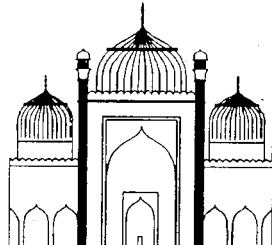
خود غرض، مطلب پرست کی ایک ناقابل
یقین دل برداشتہ زندہ براندام کرتی خونی کہانی

قوس قزح

قارئین کے پیچھے گئے اشعار جنہیں قارئین
بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....



قرآن کی باتیں



☆ مومنوں تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم پر ہیزگار بنو۔ روزوں کے دن گفتی کے چند روز ہیں تو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کر لے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں لیکن رکھیں نہیں وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔ اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے اور اگر سمجھو تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اول اول نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل الگ الگ کرنے والا ہے تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہئے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں رکھ کر ان کا شمار پورا کر لے اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔ اور یہ آسانی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ تم روزوں کا شمار پورا کر لو اور اس احسان کے بدلے کہ اللہ نے تم کو ہدایت بخشی ہے تم اس کو بزرگی سے یاد کرو اور اس کا شکر کرو۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 183 سے 185)

☆ اللہ تمہارے بے ارادہ قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن پختہ قسموں پر جن کے خلاف کرو گے، مواخذہ کرے گا تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا ایک غلام آزاد کرنا۔ اور جس کو یہ میسر نہ ہو تو وہ تین روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ اور اسے توڑ دو اور تم کو چاہئے کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو اس طرح اللہ تمہارے سمجھانے کے لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 89)

☆ مومنوں جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا۔ اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے تو یا تو اس کا بدلہ دے اور وہ یہ ہے کہ اسی طرح کا چار پایہ جسے تم میں سے دو معتبر شخص مقرر کر دیں، کرے اور یہ قربانی کعبے پہنچائی جائے یا کفارہ دے اور وہ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ اپنے کام کی سزا کا مزا چکھے اور جو پہلے ہو چکا وہ اللہ نے معاف کر دیا اور جو پھر ایسا کام کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 95)

☆ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام

کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ (سورۃ حج 22 آیت 41)

☆ بیٹا نماز کی پابندی رکھنا اور (لوگوں کو) اچھے کاموں کے کرنے کا امر اور بری باتوں سے منع کرتے رہنا اور جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اس پر صبر کرنا۔ بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔ (سورۃ لقمان 31۔ آیت 17)

☆ اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا اور حکم دیا کہ جس مقام پر ابراہیم کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنالو۔ اور ابراہیم اور اسماعیل کو کہا کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 125)

☆ اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں بیٹھے ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جانا اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے سمجھانے کے لئے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ وہ پرہیز گار بنیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 187)

☆ اور دن کے دونوں سروں یعنی صبح اور شام کے اوقات میں اور رات کی چند پہلی ساعات میں نماز پڑھا کرو۔ کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ان کے لئے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں۔ (سورۃ ہود 11 آیت 114)

☆ اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دو یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر مصیبت پڑتی ہے تو صبر کرتے ہیں اور نماز آداب سے پڑھتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ (سورۃ حج 22 آیت 34 سے 35)

☆ جو بات کو سنتے اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی اور یہی عقل والے ہیں۔ (سورۃ زمر 39 آیت 18)

☆ جن لوگوں کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو ایسا پڑھتے ہیں جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے یہی لوگ اس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اور جو اس کو نہیں مانتے وہ خسارے پانے والے ہیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 121)

☆ اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 204)

☆ مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ (سورۃ انفال 8 آیت 2)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“ بشکر شیعہ بک اینجینی کراچی)

قارئین کرام ورائز حضرات السلام علیکم! جولائی 2014ء کا ڈرڈائجسٹ آپ کے زیر نظر ہے۔ اور جولائی میں ہی رمضان المبارک اور یہ النفر ہے۔ اس لئے آپ سب کو رمضان المبارک کا نیکو بھرا مہینہ مبارک ہو اور پھر عید مبارک بھی۔ اللہ تعالیٰ کا ہم پر لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک اور بابرکت ماہ سے نوازا۔ قارئین کرام رمضان المبارک کا تقدس ہمارے ذہنوں میں ہے کہ اس ماہ ہر ایک نبی کے بدلے ستر کنا ثواب ملتا ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ نیکی کے لئے عمل کریں اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کا بھی خیال رکھیں، ان لوگوں کا جو کہ ہمارے نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم مستحق افراد کے ساتھ نیک سلوک کریں اور اپنی خوشیوں میں بھی ان کا خیال رکھیں اور یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہے۔ قارئین کرام میں تہ دل سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ لوگ ڈرڈائجسٹ کو دلی طور پر پسند کرتے ہیں اور اپنی اچھی اچھی کہانیاں و دیگر تحریریں ارسال کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب پر ہمیشہ اور ہر پل اپنا فضل و کرم رکھے اور خوشیوں سے نوازے۔ (آمین)

(خالد علی فیہنگ ایڈیٹر)

مصباح کریم چوکی سے، ایڈیٹر صاحب میں گرل ہوں اور آپ نے تو مجھے لڑکا بنا رکھا ہے، میری ساری فرینڈز میرا مذاق اڑا رہی ہیں جب پہلا خط آیا تو میں نے سوچا شاید پرنٹ ہونے میں غلطی ہوگئی ہوگی مگر جون میں بھی ایسا ہی ہوا تو مجبوراً لکھ رہی ہوں، پلیز خیال رکھنا۔ انگیزامور ہے ہیں، ابھی بھی ایک پیپر باقی ہے۔ خدا کا شکر ہے آپ کی دعائیں ہیں کہ تمام پیپر بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ آپنی ساحل دعا بخاری کا خط بھی اچھا تھا۔ کوئی بھی اسٹوری انگیزام کی وجہ سے نہیں پڑھی مگر امید ہے کہ سب پسند آئیں گی۔ میں ڈرڈائجسٹ دوسرے ڈائجسٹ پڑھنے والی گرلز سے دوستی کرنا چاہتی ہوں جو Sms پر دوستی کی خواہش مند ہو، وہ بھائی خالد شاہان یا انکل ریاض حسین شاہد سے میرا نمبر لے سکتی ہیں، ڈر کے تمام اسٹاف کو میرا سلام اور ہمیں اپنا وعدہ یاد ہے جلد ہماری اسٹوری آپ کے پاس ہوگی۔ ☆☆ مصباح صاحب: آپ کو لڑکی سے لڑکا لکھنے پر دیری دیری Sorry چلے خوش ہو جائیں اب آپ مستقل لڑکی ہی رہیں گی، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حسب خواہش اچھے نمبروں سے کامیاب کرے۔ آپ کے نوازش نامہ کا اگلے ماہ بھی انتظار ہے گا۔

ارم اعجاز کراچی سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں تمام اسٹاف دوست خیر خیریت سے ہوں گے، 3 سال کے بعد ڈرڈائجسٹ دوبارہ شرکت کر رہی ہوں، امید کرتی ہوں سارے احباب مجھے خوش آمدید کہیں گے، ان دنوں میں کافی مصروف رہی لیکن ڈرڈائجسٹ نہیں، میں گاؤں گئی تھی، 5 ماہ تک گاؤں میں تھی وہاں ڈرڈائجسٹ کو کافی مس کیا، کیوں کہ ڈرڈائجسٹ وہاں نہیں ملتا، کراچی آنے کے بعد دوبارہ ڈائجسٹ سے رابطہ جوڑ لیا، سب سے Best کہانی رولو کا جاری ہے، سنہری تابوت، عشق ناگن باقی کی تمام کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں، ساحل دعا بخاری، ایس حبیب خان، ایس امتیاز احمد اور شہزادہ چاند زیب عباسی کی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں، غزل بھی اچھی لگی، بلقیس خان، عثمان غنی، ایم ابو ہریرہ بلوچ کی غزل اچھی تھی، ایک غزل بھیج رہی ہوں، پلیز شامل دیکھئے گا اللہ حافظ۔

☆☆ ارم صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ دیکھ، خط لکھنے اور اتنے عرصہ تک ڈرڈائجسٹ کو یاد رکھنے کے لئے بہت بہت شکریہ اور اب امید ہے کہ حسب وعدہ ہر ماہ نوازش نامہ معجزہ یہ بھیجتا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

شانستہ سحر راولپنڈی سے، السلام علیکم! امید ہے تمام اسٹاف ممبرز خیریت سے ہوں گے، سب سے پہلے تو معذرت چاہوں گی، پچھلی بار کہانی بھیجنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ امید ہے آپ ناراض نہیں ہوں گے میری معذرت کو قبول ضرور کریں گے، پرے میں جگہ دینے کا تہ دل سے شکریہ۔ میں کافی دن سے ماہنامہ صانعہ کے لئے کہانی لکھنے میں مصروف تھی، اب مکمل ہوئی تو ارسال کر رہی ہوں اور آپ کے لئے میری دلی دعا ہے کہ ”خدا آپ کو ڈیروں کا کامیابیاں عطا فرمائے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ اس نیک دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ خدا حافظ۔

☆☆ شانستہ صاحب: چلے معذرت قبول کرتے ہوئے قوی امید ہے کہ جلد از جلد نئی کہانی ارسال کر دیں گی اور ویسے بھی رمضان میں معصوفیات بڑھ جاتی ہیں، نوازش نامہ کا شدت سے انتظار ہے گا۔

عظیہ زاہرہ لاہور سے، السلام علیکم! ڈرڈا نجٹ کے اسٹاف اور تمام قارئین کرام کے لئے دعاگو ہوں، اس دفعہ تبصرہ ارسال کرنے میں دیر ہوگئی اور اس کی وجہ میری یہ کہانی ہے جو ڈر کے لئے بطور خاص بڑی محنت سے میں نے لکھی ہے۔ حسب وعدہ کہ اب معلوماتی کہانی کے بجائے دوسری کہانی ارسال کروں گی۔ یہ کہانی میں نے ایک انگریزی ناول سے متاثر ہو کر لکھی ہے، کہانی میں ہر کردار مناسب لگے گا۔ (انشاء اللہ) اور میں امید کرتی ہوں کہ قارئین ڈرڈا نجٹ کو بھی یہ کہانی بہت پسند آئے گی۔ میں امید کرتی ہوں جس طرح میری کہانیوں کو ادارہ نے باقاعدگی سے جگہ دی۔ اس کو بھی فوری جگہ ملے گی اور اس طرح میری محنت وصول ہو جائے گی، اس کے ساتھ ایک نظم ارسال کر رہی ہوں، امید ہے جگہ پائے گی، اب اجازت دیں، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ ہم سب کو اپنے امان میں رکھے۔ میرے لئے خاص دعا کیجئے گا، آٹھ جولائی کو میری سالگرہ ہے۔ اچھے لوگوں اچھے دوستوں کی دعاؤں کی مجھے شدید ضرورت ہے۔ اچھا اللہ حافظ۔

☆☆☆ عظیمہ صاحبہ: ہمیشہ اچھائی کا اجر اچھا ہی ملتا ہے، ہماری اور قارئین کی طرف سے آپ کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر ہر بل اپنا فضل و کرم رکھے اور خوشیوں سے نوازے۔ نئی کہانی اور آئندہ ماہ بھی تجزیہ کے لئے شکر یہ قبول کیجئے۔

شگفتہ ارم درانی پشاور سے، جون کا رسالہ ہر لحاظ سے مکمل اور بہترین تھا۔ خریدتے ہی آڈھ سے زیادہ پڑھ لیا اور یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ لکھاری بہتر سے بہترین کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ جو کہانیاں بہت پسند آئیں ان میں جن زادی، لاجا حاصل انتظار، انوکھا پیار، امیر انتظار، زندگی کا خاتمہ اور بدردحوں کا مسکن شامل ہیں۔ قوس قزح میں تمام شعرا نے بہت پراثر کام پیش کئے جنہیں پڑھ کر مزہ آ گیا۔ جن قارئین کو میری پچھلی کہانی پسند آئی ان کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ۔ ایک اور کہانی پیش خدمت ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔ اگلے ماہ تک کیلئے اجازت، ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو۔

☆☆☆ شگفتہ صاحبہ: نئی کہانی بھیجئے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، اگلے ماہ بھی نئی تحریر کا بہت بہت انتظار رہے گا۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم! ارے ارے وفادار دوستو! ہم نے ڈرڈا نجٹ میں ایک میسج کی غیر حاضری کیا لگائی کہ سب نے ہمیں بھلا دیا۔ پر ادارے کی مشکور ہوں کہ انہوں نے یاد رکھا، شکریہ ڈرڈا نجٹ! ڈر میں خطوط کی محفل تو اس بار عروج پر تھی۔ مگر ڈا نجٹ میں کچھ کی سی تھی۔ اور وہ کی صرف ہماری تھی۔ ہم جو محفل میں نہیں تھے۔ انداز میں مہارت رکھتی ہے، عظیمہ زاہرہ آگئی تے چھائی، شگفتہ ارم و رانی کیری آن! سیدہ بگل اسی طرح غریب بھیجئے، فائزہ رحمان کیا بات ہے! انداغوری آپ بھی رائٹر بن جائیں گی۔ قسط و تاریخیں اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ویسے میری اسٹوری انوکھا پیار شائع کرنے پر سرخ گلاب ادارے کو قبول ہوں۔ بھیجئے میرے تو پیچھے ہو رہے ہیں جیسے ہی ختم پہلی فرصت میں خط لکھ دیا۔

☆☆☆ بلقیس صاحبہ: چلئے پیچھے تو ختم ہو گئے اب بلیز نئی کہانی پر نظر ڈالیں کیوں ٹھیک ہے ناں۔

ندا انور غوری لاہور سے، السلام علیکم! سب سے پہلے امید کرتی ہوں کہ ڈرڈا اور ڈر کی پوری ٹیم خیریت سے ہوگی۔ مئی کا شمارہ میرے سامنے ہے اور جون کا بھی، مئی کا تو ڈر بہت اچھا تھا۔ اس کی ہر کہانی اچھی تھی۔ اور جون کا ڈر میرے پاس پڑا ہے۔ ڈر کا ٹائٹل بہت اچھا ہوا اور تر آن کی باتیں اچھی رہیں۔ سب سے پہلے تو کہانیوں کی بات ہو جائے۔ روٹو کا، انوکھا پیار، عشق ناگن، اور سنہری تابوت اچھی تھی۔ جناب مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ آپ پرانے قارئین کو بھی نہیں بلکہ نئے قارئین کو بھی جگہ دیتے ہیں۔ بہت اچھی بات ہے ہمارے خط و کڈر میں دوبارہ جگہ دینے کا شکریہ بس مجھے ایک ہی شکایت ہے۔ کہ آپ نے میری کہانی شائع نہیں کی، پہلی بار محنت کر کے میں نے ایک کہانی لکھی تھی اور وہ بھی آپ نے شائع نہیں کی۔

☆☆☆ ندا صاحبہ: نمبر آنے پر آپ کی کہانی بھی شائع ہوگی۔ ایک دو کہانیاں اور بھی لکھ بھیجیں کیونکہ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بنتا ہے۔ آپ کے خلوص نامہ آئندہ ماہ بھی بہت انتظار رہے گا۔

صاریہ سحر اسلام آباد سے، السلام علیکم! سچ کی تیاری کی وجہ سے خط نہ لکھ پائی ڈر میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اتنی کہ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں اور یہ جان کر ادور خوشی ہوئی کہ آپ کا محمد خالد شاہان سے رابطہ ہوا ہے اور یہ جان کر ادور بھی خوشی ہوئی کہ ان کی کہانی بھی ڈر میں شائع ہوگی۔ میری گزارش ہے کہ ہر ماہ شاہان صاحب کی تحریر شائع کیجئے گا۔ ہمیں اور میری فریڈ ز کا جو گروپ ہے۔ ہمیں ڈر ڈا نجٹ بہت پسند ہے۔ ایک اور گزارش کرنا چاہوں گی وہ یہ کہ ڈرڈا نجٹ ہمارا پسندیدہ ڈا نجٹ ہے۔ ہماری فیملی اسے بڑے شوق سے

پڑھتی ہے۔ آج کل کچھ کہانیوں میں کچھ ایسی باتیں تحریر ہیں۔ جو اس ڈائجسٹ کے معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ امید ہے میری بات پر غور کیا جائے گا۔ ڈرکی ترقی کے لئے میں شہد و روز دعا گو ہوں۔

☆☆☆ مار یہ صاحبہ: خوش ہو جائیں کیونکہ خالد شاہان کی کہانی شامل اشاعت ہے اب حسب وعدہ قوی امید ہے کہ آپ تمام فریڈز ہر ماہ اپنی رائے بھیجتا بھولیں گی نہیں۔

آویشہ نیازی بڑے موڈی منظر عام سے، السلام علیکم امید ہے ڈرڈائجسٹ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ جون کا شمار اپنے کزن کاشف عبید سے لیکر توڑا بہت پڑھا۔ پھر مجھے بھی خط لکھنے کا شوق ہوا۔ یہ میرا کسی ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے۔ جو میں نے ڈرڈائجسٹ کے نام کر دیا ہے۔ مجھے ڈرڈائجسٹ، بہت پسند آئے۔ میں اسی طرح خط ارسال کرنے کی کوشش کروں گی۔ آئندہ اگر آپ نے میری غزل اور چھوٹی موٹی تحریروں کو جگہ دی تو میں آئندہ بھی لکھتی رہوں گی۔ اصل میں میرا کزن اور بھی رسالوں میں لکھتا رہتا ہے۔ میرا پہلا خط شائع کر دیجئے گا۔ میں نے بہت دل سے لکھا ہے۔ ڈرڈائجسٹ میں شامل تمام کہانیاں، بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ آخر میں ڈرڈائجسٹ کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

☆☆☆ آویشہ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کو ڈرڈائجسٹ میں شائع کہانیاں اچھی لگتی ہیں چلے حوصلہ افزائی ہوگئی۔ اور اب امید ہے کہ آپ ہر ماہ اپنا نوازش نامہ ارسال کرنا بھولیں گی نہیں۔

ایم اے خان بہاولپور سے، ڈرکی منجھل میں سب قارئین دراز سزاور جملہ اسٹاف کو داب قصہ کچھ یوں کہ تقریباً 20-15 دن پہلے ایک بک اسٹال سے ایک ڈائجسٹ خریدنے گیا تو ڈرڈائجسٹ کا اگست 2012ء کا شمارہ نظر آساور دق دیکھ کر خرید لیا۔ جب پڑھنے بیٹھا تو ایک ہی نشست میں ختم کر لیا۔ پھر اس کے بعد جون 2014ء کا شمارہ خریداجو کہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اب آتا ہوں اس بات کی طرف جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا وہ ہے رولو کا، جی ہاں رولو کا پورے رسالے پر یہ اسٹوری کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ بس الفاظ نہیں تعریف کے لیے میں دو تین اور بھی ماہناموں کا مستقل قاری ہوں لیکن خط کسی میں بھی نہیں لکھا یہ اسٹوری مجھے بہت پسند آئی ہے پھر میں دوبارہ اسی بکسٹال پر گیا اور رولو کا کے کتابی حصے نمبر 5 اور 3 طے وہ بھی لے آیا آپ کیا مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ رولو کا کے کتنے حصے مارکیٹ میں آچکے ہیں تاکہ میں نام لے کر سب ہی خرید سکوں اس کے بعد سنہری تابوت کمال واہ ایم اے راحت واہ حسب روایت آپ کا یہ ناول بھی حسب سابق ناڈی طرح کمال لگتا ہے۔ بس اب انتظار ہے کہ کب یہ کتابی شکل میں چھپ کر آئے رولو کا اور سنہری تابوت میں کچھ ایسی خاص بات ہے کہ جب پڑھنے کا مزہ آئے لگتا ہے تب کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ میں رولو کا کے شروع کے اور اب تک کے تمام کتابی حصے لیتا چاہتا ہوں اس کا کیا طریقہ کار ہوگا ڈرڈائجسٹ میں شروع کا سلسلہ قرآن کی باتیں یہ مجھے بہت اچھا لگا امید ہے ڈر سے میرا سلسلہ جڑ جائے گا اب اجازت چاہتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ ڈرڈائجسٹ کے تمام اسٹاف قارئین اور راز سز کا کامیاب و ناصح ہو آمین۔

☆☆☆ ایم صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، بہت بہت شکریہ کہ آپ کو ڈرڈائجسٹ اچھا لگا اور اس کی کہانیاں خاص طور سے رولو کا بہت پسند آئی، رولو کا کے کل 8 حصے چھپ کر مارکیٹ میں آچکے ہیں۔ اگر آپ ان کو خریدنا چاہتے ہیں تو بذریعہ مئی آرڈر یا ایزی پیسہ کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ چلے آپ کا ڈرڈائجسٹ سے سلسلہ جڑ گیا۔ اب آپ کے خلوص نامہ کار ہر ماہ انتظار رہے گا۔

Thanks

محمد ندیم عباس ہوائی چوکی سے، جون کا ڈرڈائجسٹ مجھے 22 مئی کو مل گیا تھا مگر ایگزام تھے جو آج ہی ختم ہوئے ہیں۔ کہانی تو صرف ایک ہی پڑھی ہے۔ تصویر کا شاہکار جو کہ بھائی رفعت محمود نے لکھی تھی بہت پسند آئی۔ خالد شاہان بھائی شکریہ جو آپ بھی ڈرڈائجسٹ میں شریف لائے۔ اور طالب حسین ہوائی ابھی موسٹ ویلکم۔ آپ تو بہت تیز اور چالاک نکلے باقی غزلیں اور اشعار بھی بہت اچھے تھے لو بھائی ابو ہریرہ اور ابو ذر غفاری آپ کو بھی مبارک ہو اور ویلکم۔

☆☆☆ ندیم صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ٹھنکس ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ تمام فریڈز کو امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب و کامران کرے۔ اگلے ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کاشدت سے انتظار رہے گا۔

رضوان حسین رحمت آباد فیصل آباد سے، امید کرتا ہوں کہ ڈرکی پوری ٹیم اور قارئین کرام خیریت سے ہوں گے۔ میں ڈرکا

بہت پرانا قاری ہوں مگر شرکت پہلی بار کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے مجھے مایوس نہیں ہو پڑے گا۔ جون کا شمارہ 24 مئی کو خریدیا۔ تمام رائیٹرز نے انتھک محنت کی۔ لیکن ایس، امتیاز صاحب کی کہانی بدروحوں کا مسکن ان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عطیہ صلابہ کی ”شکاری“ بھی ویڈیو کی خوش آئند تصویر اور عشق ناگن بہت پسند آئیں۔

☆☆ رضوان صاحب: ڈرڈا بجسٹ میں خوش آمدید خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی خط بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکر یہ قبول کیجئے۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! امید ہے ادارے سے وابستہ تمام افراد خیر و عافیت سے ہوں گے! ماہنامہ ڈرڈا بجسٹ جون کا شمارہ 21 تاریخ کو ملا، سرورق اچھا تھا۔ ایڈیٹر صاحب میں آپ سے ناراض ہوں، آپ نے ہمیں ڈر سے نکال باہر کیا ہے۔ یعنی نوٹ کا بورڈ لگا رکھا ہے۔ پلیز! مہربانی فرمائیں۔ خطوط کی تحفیل میں میری سب سے پیاری بہن ساحل دعا بخاری کا خط بہت ہی اچھا لگا۔ میری گلدیاری بہن، باقی خطوط بھی ٹھیک ٹھاک لگے، تمام دوستوں کو سلام! ڈرڈا میں بہترین کہانیوں میں، جن زادی، اسیر انتظار، اور انوکھا پیار، بدروحوں کا مسکن، مالکن، شکاری نے یہ درجہ حاصل کر لیا۔ قسط وار تحریر بھی زبردست انداز میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ نئی کہانی میں میری محنت رائیگن نہیں جائے گی۔ ورنہ اس بار پکا ناراض ہو جاؤں گا۔

☆☆ عثمان صاحب: اب تو ناراضگی ختم ہوگئی ناں، ہم نے آپ کو مزید ناراض ہونے سے بچالیا، اور وچ ڈاکٹر شائع ہوگئی، مضامین خرید کر کھانچے گا اور دوست احباب کو بھی کھلا دیتے گا۔ آپ کی محنت رائیگن نہیں جائے گی۔

راجہ باسط مظہر حیدرآباد سے، السلام علیکم! امید کرتے ہیں کہ ڈرڈا بجسٹ کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوگی۔ کافی ٹائم ہو گیا ڈرڈا بجسٹ میں حاضری دیئے ہوئے، اصل میں مصروفیات کچھ زیادہ ہوگئی تھیں، واصل تین ماہ سے ڈرڈا بجسٹ کے لئے ایک مکمل ناول لکھ رہا تھا۔ بنام ”ایجنٹ بلیک کمانڈ“ امید ہے کہ شامل اشاعت فرما کر شکر کا موقع ضرور دیں گے، ناول ہر لحاظ سے ڈرڈا بجسٹ کے لئے بہترین ثابت ہوگا اور ایک گزارش تھی کہ یہ کہانی میرے اپنے دماغ کی تخلیق ہے۔ اگر کہانی میں موجود شاعری آپ کے نقطہ نظر سے غور طلب ہوئی تو پلیز! غور فرما لیجئے۔

☆☆ باسط صاحب: نئی کہانی بھیجنے کے لئے شکر یہ قبول کریں، کہانی اچھی ہے اپنے مقررہ وقت پر ضرور شائع ہوگی۔ ویسے آپ ہر ماہ اپنی رائے کہانیوں کے متعلق ضرور ارسال کر دیا کریں۔ Thanks۔

کاشف عبید کاوش بھٹنور سے، نہایت ادب و احترام کے ساتھ السلام علیکم! قوی امید ہے کہ ڈرڈا بجسٹ کے تمام قارئین بھی خیریت سے ہوں گے۔ جون کا ڈرڈا بجسٹ 21 مئی کو اپنے کمرے میں سائڈ ٹیبل پر پایا۔ جون کا ڈرڈا بجسٹ بذریعہ ڈاک ارسال کرنے کا بہت بہت شکر یہ، ڈا بجسٹ میں میرے خط اور غزل کو جگہ عطا کرنے کے لئے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔

☆☆ کاشف صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے آپ کا بہت بہت شکر یہ، آپ کی کہانی وقت آنے پر ضرور شائع ہو جائے گی۔ آئندہ ماہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

نساء اللہ فہیم بٹگرام پشاور سے، السلام علیکم! میں ڈرڈا بجسٹ کا پرانا قاری ہوں اور ہر ماہ ڈرڈا بجسٹ بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ مجھے ڈرڈا بجسٹ بہت پسند ہے، اور میں ڈرڈا بجسٹ ایبٹ آباد سے منگواتا ہوں۔ یہ میرا ڈرڈا بجسٹ سے محبت اور پسندیدگی کا ثبوت ہے۔ امید ہے میری محبت کا ثبوت جواب ملے گا۔

☆☆ نساء اللہ صاحب: ڈرڈا بجسٹ میں خوش آمدید، ڈرڈا بجسٹ سے آپ کی محبت و پسندیدگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اب امید کرتے ہیں کہ آپ ہر ماہ خط بھیج کر اپنی محبت کا ثبوت دیتے رہیں گے۔ شکر یہ۔

طاہر اسلم بلوچ سرگودھا سے، السلام علیکم! جون کا ڈرڈا بجسٹ پڑھا، بہت خوب صورت کہانیوں سے بھر پور تھا، میں ڈرڈا بجسٹ عرصہ ایک سال سے پڑھ رہا ہوں اور بہت شوق سے پڑھتا ہوں ڈرڈا بجسٹ میں پہلی بار لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں اور ایک خوب صورت کہانی لے کر حاضر ہوا ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ میری کہانی ضرور شائع کر دیں گے، میری طرف سے ڈرڈا بجسٹ کے تمام قارئین، رائٹرز اور ڈرافٹس کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام قبول۔

☆ ☆ ظہار السلام صاحب: ڈرڈائجسٹ میں دیکھم، آپ کی کہانی ضرور شائع ہوگی، تھوڑا انتظار کریں، امید ہے آئندہ ماہ بھی اپنی کاوشیں ضرور بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

فرحان احمد نصیب کراچی سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ ڈرڈائجسٹ میں خیریت سے ہوگی اور تمام قاری اور لکھاری بھی مزے میں ہونگے۔ ادارے کا بے حد شکریہ کہ مجھے یاد رکھا اور میرے پیچھے ہونے خطوط، غزل اور لطیفہ وغیرہ ایک ساتھ شائع کرنے کے بجائے الگ الگ ماہ میں شائع کئے تاکہ میرا نام آتا رہے۔ جس کے لئے میں دل سے مشکور ہوں۔ جون 2014ء کا پرچہ مجھے اب تک نہیں ملا اس لئے تبصرہ نہیں کر سکتا۔ سادہ راجا بہن پلیئر سستی چھوڑیں اور حاضری دیں۔ میں ڈرڈائجسٹ سب سے پہلے آپ کی کہانی تلاش کرتا ہوں اور بلیکس خان آپ ایک کہانی بھیج کر کہاں کھو گئیں؟ پلیئر! کچھ نیا لکھ بھیجیں۔ آخر میں ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

☆ ☆ فرحان صاحب: ڈر کے قارئین بہت ذہین ہیں ان میں آپ بھی شامل ہیں، کبھی کبھار کوئی کہانی درغائی کیپڈر سے نکل جاتی ہے، آپ کی کہانی اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی۔ اپنا خیال رکھئے گا۔

طارق محمود کامراہ کلاں سے، السلام علیکم! محترم ایڈیٹر صاحب پہلی دفعہ ڈر کے لئے کچھ لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ بزم میں تاخیر سے آیا ہوں جس کے لئے معذرت، ڈر بہت اچھا جا رہا ہے، کافی عرصہ سے پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے میرا دل بھی جا پا کچھ لکھنے کو تو تین کہانیاں اور دو غزل بھیج رہا ہوں، کسی قریبی شمارے میں جلد دے کر ممنون کریں۔ شکریہ۔ وہ بھی اگر آپ کو پسند آگئیں تو اگر کہانیاں معیار کے مطابق نہیں تو پلیئر کا نیڈ لائن ضرور دیجئے گا۔

☆ ☆ طارق صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، امید ہے کہانیاں اچھی ہوں گی، اصلاح کر کے کوئی نہ کوئی ضرور شائع ہوگی۔ امید ہے آپ آئندہ بھی شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔

ضرغام محمود کراچی سے، کچھ عرصہ سے صاحب فروش ہوں، لہذا ڈی وی دیکھنا اور کتابیں پڑھنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے، ہا کر سے کہہ کر مختلف ڈائجسٹ وغیرہ منگوائے تو اس نے ڈرڈائجسٹ بھی لا کر دیا، ڈرڈائجسٹ پڑھا، بہت انوس ہوا، ارے..... ڈریئے نہیں، انوس اس لئے ہوا کہ اتنا اچھا ڈائجسٹ پہلے کیوں نہیں پڑھا۔ واقعی ڈرڈائجسٹ بہت اچھا ہے۔ جس طرح بچپن میں جھولوں پر بیٹھ کر اور نو عمری میں ہارمودی دیکھ کر ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک لہر دو تھی ڈرڈائجسٹ پڑھ کر بالکل ایسا ہی لگا ویسا انسان بھی خوب ہے اپنے ڈر سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ ڈرڈائجسٹ ایک مکمل ڈائجسٹ ہے اللہ تعالیٰ اس کو دن رات چو گئی ترقی عطا فرمائے۔ آئین، ماہ جون کے ڈائجسٹ پر تبصرہ مکمل ڈائجسٹ پڑھنے کے بعد کروں گا اس خط کے ساتھ ایک تحریر "خونی حویلی"، روانہ کر رہا ہوں برسوں بعد قلم اٹھایا ہے۔ پلیئر ایک Sms کے ذریعے مجھے اطلاع دیجئے گا کہانی کیسی لگی اور ڈر کے معیار پوری اتری یا نہیں۔

☆ ☆ ضرغام صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، یہ آپ کا حسن نظر اور ذوق ہے کہ ڈرڈائجسٹ آپ کو اچھا لگا۔ اس کے لئے بری ویری تھینکس، کہانی ابھی پڑھی نہیں مگر قوی امید ہے کہ اچھی ہوگی، غفریب شائع ہو جائے گی۔ امید ہے ہر ماہ آپ شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔ جہن قلم سے۔

فیضان فلک رحیم یار خان سے، السلام علیکم! جون کا شمارہ ہمیشہ کی طرح دل کو خوش کر گیا، ہر ورق ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگا۔ قرآن کی آیات کا ترجمہ پڑھ کر دل میں ایمان کی شمع مزید روشن ہوگئی، خدائے پاک ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ کہانیوں میں شمارہ دو چاند زیب کی کہانی "خون کا عفریت" سب سے پہلے پڑھی۔ ایس امتیاز صاحب کی کہانی "بدر دوح کا مسکن"، ایک دلچسپ کہانی تھی، ردلو کا "بدر دوح کا مسکن"، ایک دلچسپ کہانی تھی، ردلو کا، سنہری تابوت اور عشق نامن بھی اچھی رہی، عطیہ زاہرہ کی کہانی ہر دفعہ کی طرح دماغ کو جھنجھوڑنے والی تھی، ساحل کی کہانی "اسیر انتظار"، بہتر کاوش رہی۔ باقی سب کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ خدائے ذوالجلال پاکستان کو امن، سکون اور محبت کا گہوارہ بنا دے۔ آمین۔

☆ ☆ فیضان صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، امید ہے آپ ہر ماہ نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔

-Thanks-

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! آپ کی خیر و عافیت اور نیک و عاؤں کے ساتھ اس بار خط کافی لیٹ ہو گیا ہے جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، کچھ کام کی مصروفیات اور حالات ہی ایسے تھے آج کل وقت فارغ کم ہی ہوتا ہے گرمی کا آغاز اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ جیسے عذاب سے زندگی بیزار ہے، آج بھی شہر جانا نصیب ہوا بنگال پر ماہ مئی کا تازہ پرچہ دیکھا بہت خوب صورت اور حسین تحریروں سے مزین تھا۔ اندھیرے میں جیسے چراغ جلتے ہوں۔ آپ کا ہمارے ساتھ تعاون بھی خط تحریر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ سرورق پہلے سے زیادہ بہتر اور دلکش تھا۔ یہ ایک معیاری پرچہ ہے جس کا ہمیں مقررہ تاریخ پر بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے، ڈر ڈائجسٹ کے سارے سلسلے انگوٹھی میں تکینے کی طرح فٹ ہیں۔ مثلاً قرآن کی باتیں، خطوط، قوس قزح، غزلیں اور کہانیاں وغیرہ غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔

☆☆☆ اسلم صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دل سکون اور بہت خوشی ہوتی ہے، جس ماہ آپ کا خط نہیں آتا تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کچھ کی رہ گئی ہے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے اور خوشیوں سے نوازے۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ رواں کا ڈر ڈائجسٹ ہمارے سامنے ہے، خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام سلسلے خوب رہے، اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لا جواب رہا، انٹیکز لگانے کا شکریہ! میٹرز آپ کے پاس ہیں۔ پلیز دیکھئے گا۔ مزید Ad میٹرز میں۔ مد لغت (ترجمہ)، چار پائی (مراسلہ)، غزل، ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں، تجزیہ جلد لکھیں گے۔ آپ کو ہماری طرف سے اور اسٹاف اور ڈر ڈائجسٹ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دو پوزر کو دعا سلام، پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆☆ امتیاز صاحب: اپنا خیال رکھئے گا، کما نہیں ہیں اور خوش رہیں۔ یہی دعا ہے میری آئندہ ماہ پھر ملیں گے۔ اللہ حافظ۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، السلام علیکم! جون کا ڈر 20 مئی کو موصول ہوا، سرورق خاصا ڈراؤن تھا۔ سرورق سے آگے جانے کا ارادہ کیا اور آگے چلے دو دوستوں کی محفل میں آصفہ سراج لیڈ کرتی نظر آئیں۔ ہماری کہانی شہر تماشہ کو بھی پسند کر ڈالا شکریہ جی! اساتیل صاحبہ اپنے منفرد انداز سے نظر آئیں۔ ایس امتیاز احمد صاحب! بہت Busy آدمی ہیں۔ ہم سب کے پرزور اصرار پر بھی تبصرہ نہ لکھیں گے۔ جناب! ملکی حالات خراب ہیں ہر روز سڑکوں پر ایک عدد دھرتا ہوتا نظر آتا ہے۔ امتیاز بھائی! فوری تبصرہ لکھیے ورنہ ایک عدد دھرتا آپ کے لئے ہوتا نظر آتا ہے۔ خیر دوستوں کی محفل میں مزہ آیا، لڑائی، جھگڑا، نکتہ چینی اور تعریفوں کے بل، یہ سب وہاں ہوتا ہے جہاں محبت کے پھول ہوں! کچھ باتیں Stories کی..... علیہ صاحبہ، ڈر فیملی میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ خوب صورت طرز تحریر، بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مغربی طرز کی تحریر شکاری نے دل موہ لیا۔ راشد صاحب! اچھے ذکاور ہیں کمال کی تحریر..... بقیں صاحبہ! تصویر کا شاہکار لے کر حاضر ہوئیں۔ ویری گڈ، دعا صاحبہ! آپ کی تحریریں اچھی ہوتی ہیں۔ مختصر مگر براثر! ایس حبیب خان! معاہدہ لے کر جلوہ گر ہوئیں۔ گڈ۔ غزلوں میں راصل بخاری، سائل بخاری کا انتخاب اور احسان سحر کی شاعری اچھی لگی..... ویری گڈ، غرض اور آل..... سارا پرچہ اچھا رہا! اور ان تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے مجھ ناچیز کی تحریروں کو پڑھا اور پھر پسند بھی کیا، Thanks you so much!..... جاننا، حقیقی تحریر، میں چاہوں گا ضرور شائع ہو..... شکریہ۔ آپ کے پاس میری تحریروں موجود ہیں۔ امید ہے گراچی ہوئیں تو ضرور سامنے آئیگی۔ ہمیں مکمل اعتماد ہے ڈر پر..... کوئی جلدی نہیں۔ جناب! تم کھانے کا موسم مبارک ہو! ٹھنڈے شربت اور آئس کریم کا سیزن مجھے بہت پسند ہے۔ جمھور کی ملک شیک اور لوڈ شیڈنگ..... خیر پپی ریٹنی سیزن! بارش رکے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ لگے رہو دوستو! بس سیلاب نہ آنے پائے۔ سیلاب کے بعد امداد اور امدادیں امراء نے مزنے کرنے ہیں۔ غریب ڈوبتا ہے تو ڈوبنے دو۔ اسے جینے کا حق ہی کیا ہے۔ تڑپ کر جینے سے بہتر ہے مر ہی جائے..... اگلے ماہ کے ڈر کا شدت سے انتظار..... خوش رہیں..... اعزازی کا پانی آف جون کا دل شکریہ!.....

☆☆☆ مدثر صاحب: واقعی آپ کی بات صحیح ہے جہاں محبت، چاہت، خلوص ہو وہاں ایسی باتیں ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو خوش و خرم اور سکھی رکھے (آمین) امید ہے امتیاز بھائی ضرور لب کشائی کریں گے۔

روح کا انتقام

محمد خالد شاہان - صادق آباد

چشم زدن میں نوجوان کی آواز بھاری اور کرخت ہو گئی، اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل کر معمر شخص کی طرف بڑھیں اور پھر وہ معمر شخص نیچے سے اوپر کو اٹھنے لگا اور وہ ہوا میں معلق ہو گیا اور زبان باہر کو نکل کر لمبی ہو گئی کہ پھر.....

ایک روح کا عجیب و غریب شاخسانہ جو اپنے دشمن سے بدلہ لینے کے لئے سرگرداں تھی

تھے۔ مگر وہ وجود دکھائی نہیں دے رہا تھا جس کے چلنے سے نشانات بن رہے تھے۔

اگر کوئی جیتا جاگتا انسان ان ابھرنے والے پیروں کے نشانات کو دیکھ لیتا تو دہشت سے اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل یقیناً دھڑکنے لگا جاتا۔

اسی لمحے سامنے سے کسی گاڑی کی تیز روشنی نظر آئی اور سڑک کے کنارے بننے والے پیروں کے نشانات بننے بند ہو گئے۔ جس کا واضح مطلب یہی نکلتا تھا کہ وہ ان دیکھی روح ایک لمحے کو شاید کی تھی۔ مگر پھر اگلے لمحے وہ پھر چل پڑی تھی۔

مگر اب وہ خاصی تیز رفتاری سے آگے ہی آگے چل رہی تھی، کیونکہ پیروں کے نشانات اب جلدی جلدی بن رہے تھے۔

ذرا آگے کی سڑک سے ملحقہ کچا مگر قدرے کشادہ اور ناہموار راستہ اندر تاریک جنگل میں چلا گیا تھا۔ قدموں کے نشانات اب تیزی کے ساتھ اس جانب دوڑے جارہے تھے۔

ادھر اس گاڑی کی روشنی جو اس کی ہیڈ لائٹس کی تھی بتدریج نزدیک آتی جا رہی تھی۔ وہ ایک کار تھی، پھر یوں ہوا کہ کار کی رفتار آہستہ ہوتی چلی گئی، اور اگلے ہی لمحے اس

وہ دھیمی دھیمی اور پراسرار چاندنی میں نہائی ہوئی رات یوں سک رہی تھی جیسے کوئی جوان سال خوبرو دو شیزہ اپنے سیاہ پال کھولے ماتم کٹاں ہو، یہ بہاؤ نگر کا مضافاتی اور جنگلاتی علاقہ تھا۔ تاریک کی چمکتی ہوئی ایک کچی سڑک آگے جا کر تین حصوں میں منقسم ہو کر سامنے تاریک جنگل کے سینے میں پوسٹ ہو رہی تھی۔ چار سو گھمبیر سنائے کا راج تھا۔ البتہ کبھی یوں ہوتا کہ اگر کوئی تیز رفتار گاڑی طوفانی رفتار سے گزر جاتی تو اس کے زنائے دار آواز کی وجہ سے اس پر ہیبت ماحول کے سکوت میں ذرا دیر تک تھر تھراہٹ طاری رہتی اور پھر پراسرار سناتا ہر سوسلط ہو جاتا۔

ماحول کو پراسرار بنانے والے سرس کے باسیوں کی طرح کھڑے پیڑوں میں جھدر سڑک کنارے بھر بھری مٹی بھری ہوئی تھی، وہاں کسی ان دھیمی روح کے پیروں کے نشان یوں بننے جارہے تھے جیسے کوئی دھیرے دھیرے چہل قدمی کے انداز میں آگے ہی آگے بڑھ رہا ہو۔ مٹی پر ابھرنے والے پیروں کے نشانات کسی عورت کے معلوم ہوتے تھے۔

لیکن ایک بات دہشت ناک حد تک عجیب تھی کہ زمین پر بننے والے پیروں کے نشانات تو واضح ہو رہے



کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی تو اسی لمحے مشتاق احمد کا پاؤں بریک پر پڑ گیا۔ ٹائریک دم جام ہو کر کچے راستے پر آگے کو گھسیٹتے چلے گئے۔

جواد کی پھٹی ہوئی آنکھیں ونڈا سکرین کے پار کسی کو دیکھنے کی کوشش میں موجود تھیں۔

”کیا ہوا ہے جواد بیٹے؟“ مشتاق احمد نے اپنی گردن گھما کر عقبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بیٹے کی جانب دیکھا اور تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ابو..... آ..... آپ نے کچھ نہیں دیکھا..... سامنے“ قدرے رک رک کر جواد نے کہا۔ اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں جیسے ونڈا سکرین کے پار گڑسی گئی تھیں۔

”نہیں بیٹا مجھے تو کچھ نہیں دکھائی دیا، کس کی بات کر رہے ہو..... تم نے آخر کسی بات پر چیخ ماری۔“

”جواد ایسا تم نے کیا دیکھ لیا تھا۔“ اس کی امی نے قدرے اچنبھے کی حالت میں پوچھا۔

”امی مجھے یوں لگا جیسے..... جیسے کوئی انسان شاید وہ کوئی عورت تھی۔ جو اچانک ہی کار کے سامنے آ گئی تھی۔“ وہ جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔

”اوہو! کیا تمہارا وہم ہو گا بیٹا۔ والدہ نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”نہیں امی..... میں نے خود دیکھا تھا اسے انہی آنکھوں سے حیرت ہے وہ آپ دونوں کو کیوں نظر نہیں آئی۔“ جواد حیرت سے بولا۔ جواد کے اٹل لہجے نے

مشتاق احمد کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لہذا انہوں نے اپنی کار کے شیشے اتارے اور گردن باہر کو نکال کر دیکھنے لگے، مقصد اپنے بیٹے کی تسلی کرنا بھی تھا۔ باہر چاروں

طرف گہرا سناٹا تھا۔ البتہ قبرستان کا پرہول ماحول ہلکی چاندنی میں پرہیت منظر پیش کر رہا تھا۔ بڑا ڈراؤنا اور

بیٹناک سناٹا دلوں پر سکتہ طاری کر رہا تھا۔

”اوہو مشتاق..... تم بھی کیا بچے کے ساتھ بچہ بن گئے۔ گاڑی تو چلاؤ۔ اس دیرانے میں کیوں کھڑی کر رکھی ہے۔“ اب سلمیٰ نے قدرے بیزاری سے کہا۔ یہ الگ

بات تھی کہ ان کا بچہ خاصا متوحش ہو رہا تھا۔

لے لے ناہار رات لے لی جانب موڑ کاٹا جھڑ کچھ پہلے دیو داتا..... دھڑاتی ہوئی روح غائب ہوئی تھی۔

پہلے راستے پر اترتے ہی کار نے ہچکولے کھانے شروع کر دیئے۔

اسٹیئرنگ پر آہنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کار کی رفتار قدرے کم کر دی گئی تھی۔ اب کار دھیمے دھیمے ہچکولے کھاتی ایک پرانے کھنڈر کے قریب سے گزر رہی تھی۔

مشتاق احمد چالیس کے لپیٹے میں تھے، برابر والی سیٹ پر ان کی بیوی سلمیٰ اور پھٹی سیٹ پر جوان بیٹا، جواد براجمان تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت بلا کی معصومیت اور

آنکھوں سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔ مشتاق احمد کی نگاہیں ونڈا سکرین کے پار..... کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دیران راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار نہ جانے کیوں ان کے سپاٹ چہرے پر ایک لمحے کے لئے مہرہ تشویش کے

آئینار نمایاں ہو جاتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جلد سے جلد اپنی منزل تک پہنچ جانا چاہتے ہوں۔ شاید رات زیادہ

اتر آئی تھی۔ اس لئے وہ ذرا فکر مند بھی تھے۔

درحقیقت انہیں سرے شام ہی اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر بد قسمتی سے راستے میں ٹائریک بے رخی کی وجہ سے لیٹ ہو گئے تھے۔ سفر کی ابتدا میں یہ مختصر سا

خاندان بڑے پر لطف انداز میں سفر سے محظوظ ہو رہا تھا۔ مگر پھر جیسے جیسے رات گہری اور منزل قریب ہونے لگی تو باتوں کا سلسلہ بھی بتدریج متوقف ہوتا چلا گیا اور ان

سب کو ایک پرسراری چپ لگ گئی۔

کار نے معا ایک تنگ ساموڑ کاٹا۔ اور اس کے بعد وہ ایک سنسان قبرستان کے پاس سے گزرنے لگی۔ جو چاند

کی ہلکی اور اداس روشنی میں بے حد پرسرار لگ رہا تھا۔ اچانک پھر جانے کیا ہوا کہ ایک دم مشتاق احمد نے کار کی رفتار تیز کر دی..... رفتار تیز ہونے کی وجہ سے کار کچے اور

ناہوار راستے پر تیزی کے ساتھ ہچکولے کھانے لگی۔

”مشتاق کیا ہوا..... آہستہ چلو..... دیکھو راستہ کتنا خراب ہے۔“ معائن کی بیوی نے کہا۔

اگلے ہی لمحے عقبی سیٹ پر بیٹھا ہوا ان کے بیٹے جواد

مشتاق نے بیوی کے بے لاگ تبصرے پر گامڑی کو گیر میں ڈالا اور آگے بڑھا دی۔ تاہم وہ اپنے بیٹے کو نشانی دیتے ہوئے مختصر بولے..... ”بیٹے..... ایسے ماحول میں اس قسم کے وہم ہونا کوئی حیرانی کی بات نہیں..... یہ ضرور تمہارا وہم ہی تھا۔“

جواد ان کی بات پر خاموش ہو رہا..... لیکن اس کے چہرے پر یہ بات ظاہر تھی، کہ وہ اپنے والد کی بات سے متفق نہیں، وہ کسی طور پر بھی اس پر اسرار حقیقت کو اپنے وہم پر محمول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس نے اپنی جگہ جاتی آنکھوں سے سامنے کار کی ونڈ اسکرین کے پار کی عورت کا سایہ دیکھا تھا، جس کے چہرے کے نقوش واضح نہ تھے۔ تاہم اپنے خدوخال سے وہ کوئی عورت ہی نظر آرہی تھی، اور ایسا محسوس ہوا تھا، جیسے وہ ایک دم کار کے نیچے آگئی ہو.....

مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، یہ بات جواد کو متحیر کئے دے رہی تھی۔ وہ پر اسرار سایہ صرف اسے ہی کیوں نظر آیا، وہ ساریہ اس کے امی ابو کو کیوں نہ دکھائی دیا تھا..... جو بالکل سامنے اگلی سیٹ پر براجمان تھے۔

بہر طور سفر ایک بار پھر خاموشی کے ساتھ مگر قدرے سست روی کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی اس بات کو تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک جواد اپنی ماں سے بولا..... ”امی ابھی آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔“

”ارے لڑکے تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے..... میں تو چپ بیٹھی ہوئی ہوں، کافی دیر سے۔“ اس کی امی گڑبڑا کر بڑے تیز لہجے میں بولیں۔

”کیا ہوا بیٹا تم نے کیا سنا..... تمہاری امی نے تو کچھ بھی نہیں کہا..... میں ان کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا ہوں۔“ مشتاق احمد بولے۔

”جی..... جی ابو مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی ہو..... میں سمجھا شاید امی نے دھیرے سے مجھ سے کچھ کہا ہے۔“

”اس کا دماغ چل گیا ہے۔“ سلمیٰ نے کہا۔ جواد کی اس بات کو بھی سلمیٰ نے اسی وہم پر محمول کیا تھا۔ جبکہ جواد کا

اس سلسلے میں خیال مختلف تھا۔ اس کے ذہن میں اب کئی قسم کے جواب طلب سوالات گردش کر رہے تھے۔

وہ ویسے بھی فطرتاً ہی وہ نچر پسند لاکا تھا۔ سفر جاری رہا تھا۔ اسی لمحے معا پھر جواد کو اپنی سماعت سے مرتعش سی آواز سنائی دی جیسے کسی نے گہرے سانس لئے ہوں..... اور سرگوشی کی ہو..... لیکن وہ الفاظ اس عجیب انداز میں ادا کئے گئے تھے کہ وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

مگر اب وہ یہ بات اپنی امی اور ابو کو بتا کر دوبارہ مذاق کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ ویسے بھی وہ خود کافی مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔

ادھر مشتاق صاحب کو مدہم چاندنی میں کسی آبادی کے دھندلے آثار دکھائی دیئے تو انہوں نے کار کی رفتار ذرا تیز کر دی تھی..... اب راستہ بھی کافی حد تک ہموار ہو چکا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے کچے کچے مکان کے دھندلے خاکے واضح ہونے لگے۔ وہ چک 64 کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ ذرا دور ایک قدرے اونچے نیلے پر ایک قدیم طرز کی حویلی کی عظیم الشان عمارت نظر آئی۔ یہ چوہدری اسد کی حویلی تھی۔

کار کچے کچے راستوں اور گلیوں سے گزرتی ہوئی شمال کی سمت مڑ گئی۔ جہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی بہتات تھی۔ مکان اب پیچھے رہ گئے تھے۔ پھر ایک ٹیلے کو کر اس کر کے کار رکنی گئی۔ سامنے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں منبالے پتھروں سے بنی ایک عمارت نظر آرہی تھی۔ جو اپنی مخصوص قدیم طرز کی بناوٹ کے باعث بڑی پر شکوہ لگ رہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ گہرے سکوت اور عجیب سی اداسی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”لو بھئی آگئے۔ اپنی منزل پر۔“ مشتاق صاحب کار کے اسٹیرنگ پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولے۔ اور ساتھ ہی کار کا ہارن دو تین مرتبہ بجا دیا۔ حویلی کے آگے مختصر سا بانچہ بنا ہوا تھا..... اور پھولوں کی کیاریاں صدر دروازے تک چلی گئی تھیں۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔ اور ایک بوڑھا اپنے ہاتھ میں ایک لائٹن تھاے نمودار ہوا۔ اس بوڑھے کو یہ لوگ پہلی نظر میں پہچان گئے تھے۔ یہ دینو بابا تھے

جنہوں نے مشتاق احمد کو گودوں میں کھلایا تھا۔ دینو بابا کا مشتاق احمد بہت احترام کرتے تھے۔ دینو بابا کو دیکھ کر یہ لوگ کار سے اتر آئے۔ دینو بابا کا ایک بیٹا بھی تھا جس کا نام حیدر تھا۔

جب کبھی بھی مشتاق احمد یا ان کے عزیز وغیرہ اس پر فضا علاقے میں بغرض سیر و تفریح کے لئے آتے تو اس حویلی میں ٹھہرتے تھے۔ اور کوئی عزیز یہاں سیر و تفریح کے لئے آتا تو دو روز پہلے دینو بابا کو اطلاع بھیج دیتا تھا اور اس طرح دینو بابا حویلی کی صفائی تھرائی کر دیتے تھے۔

”دینو بابا کیسے ہو؟“ مشتاق احمد ذرا آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

”اللہ کا کرم ہے سب اور آپ خیریت سے پہنچ گئے۔ بڑی رات کر دی آپ نے۔“ دینو بابا بولے۔ ”آ جاؤ بیٹا اندر آ جاؤ۔“ دینو بابا جواد اور نسلی سے بولے۔ اور اپنی رہنمائی میں تینوں کو ساتھ لیتے ہوئے غلام گردشوں اور بل کھاتے زینوں سے ہوتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں لے آئے، کمرے کی آرائش بڑی خوب صورت تھی۔

باہر سے حویلی جتنی قدیم طرز کی لگتی تھی۔ اندر سے اتنی ہی جدید ساز و سامان سے آراستہ تھی، یہ لوگ تھکے ہوئے تھے۔ لہذا کھانا کھاتے ہی سو گئے۔ جواد بھی سونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ لیکن جتنی بے کلی کے باعث اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

رات دبے پاؤں آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور اس پر جھوٹا ہوا مہین پرده خراماں خراماں کرتی ہوا کی وجہ سے ہل رہے تھے۔

جواد کی مسہری کے عین سامنے دیوار گیر کلاک رات کے دو بج رہا تھا۔ اس قدر سنائے میں کلاک کی سوئی کی آواز جواد کے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔

جواد اپنی مسہری پر لیٹا اپنے ساتھ پیش آئے ان پراسرار واقعات کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ جس نے اس کی نیند اڑا کر رکھ دی تھی، کار کے آگے یک دم کسی

عورت کا پراسرار سایہ آ جانا، پھر اپنے کانوں میں کسی نسوانی سرگوشی کی سرسراہٹ یہ سب اسے بے چین کئے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کو تو اس کے ذہن میں بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس کا وہم ہی ہو۔ جو بقول اس کے والد مشتاق احمد کے کہ یہ سب دیران اور ہولناک ماحول کی کارستانی ہوتی ہے۔ جو انسان کی قوت کو مہینز کر کے اس پراسرار انداز میں حملہ آور ہوتی ہے۔

معا کرے کے دروازے کے دونوں پٹ زور سے آپس میں ٹکرائے۔ اور جواد کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ چونکا۔ وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ پھر وہ آہستگی سے چلتا ہوا۔ دو بجے کے قریب آیا۔ سامنے باہر کا ماحول ہولناکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ آسمان دور تک بالکل صاف تھا۔ دور تک چاندنی اور ان گنت ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی روشنی میں اسے ٹیلوں کی چوٹیاں نظر آئیں۔ جو نشیب میں گھنے اور تاریک جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کو جواد کو وہ نظارہ بڑا بھلا لگا۔ بہر طور جواد کو درتچے کے دونوں پٹ زور سے بجنے کی وجہ یہی سمجھ آئی تھی کہ ہوا کے کسی تیز جھونکے نے دونوں پٹ کو آپس میں ٹکرا دیا ہوگا۔

لیکن اسے ہوا کا کوئی تیز جھونکا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ دوسرے اسے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا۔ دونوں پٹ جو اندرونی سمت کھلتے تھے۔ لہذا ان کے خود بخود کھل کر بجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جواد کا دل یہ سب کچھ سوچ کر یکبارگی زور سے دھڑکا۔ بہر طور اس نے دوبارہ دونوں پٹ اندر کی طرف کھول کر اٹکا دیئے۔ تاکہ دروازہ کھلا رہے اور ہواؤں کا آنا جانا جاری رہے۔

لیکن ابھی وہ واپس اپنی مسہری کی جانب پلٹا ہی تھا کہ اچانک اسے یوں لگا جیسے اس کے قریب ہی کسی نے زور سے گہرا سانس کھینچا ہو۔ وہ ہٹک گیا۔ لیکن رکا نہیں۔ دچھٹا انداز میں اطراف کی سن گن لیتا، مسہری تک پہنچا۔

اور دھیرے دھیرے ٹھٹھکے ہوئے انداز میں مسہری پر دراز ہو گیا۔ اسی لمحے پھر اس کی سماعت سے پراسرار نسوانی سرگوشی ٹکرائی۔ اور اس بار بہت واضح تھی۔ ”بیٹا تم

آگئے..... اور میں سکون میں ہوا جاؤں گی..... مجھے.....
مجھے اب طاقت مل جائے گی۔“

سرگوشی سن کر جواد کو پہلی بار اپنی ریڑھ کی ہڈی میں
سر دہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مگر پھر ایک عجیب بات یہ
ہوئی کہ اسے یوں لگا کہ جیسے وہ خود بخود دیندگی گہری اور
پر سکون وادی میں اترتا چلا جا رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ
پر سکون نیند میں ڈوب چکا تھا۔

اگلے دن علی الصبح جواد کی آنکھ کھل گئی بلکہ اسے دینو
نے اسی کے کہنے پر اتنی صبح جگا دیا تھا۔ رات والے واقعے
کو جواد نے سردست راز میں رکھنا ضروری سمجھا تھا۔ وہ
اب پہلے اس گاؤں کی صبح کے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔
جواس کی کمزوری تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ گاؤں کی صبح
اور شام کے مناظر بڑے دل فریب ہوتے ہیں۔ صبح کی
سیر کے لئے جواد نے دینو بابا کے بیٹے حدی کو ساتھ لیا۔

حدی ایک سیدھا سادا اور مصوم سالک کا تھا۔ وہ حدی کے
ساتھ باہر چھل قدمی کرتا ہوا حویلی سے ذرا آگے نکل
آیا۔ بہت جلد دونوں آپس میں مل گئے تھے۔ کیونکہ
جواد بہت عرصے بعد آیا تھا، بہاؤ نگر کے علاقے یعنی بچن
آباد بڑے خوب صورت پر فضا علاقے میں واقع تھا۔ دور
ننگ بننے کی چادر زمین پر پڑھی ہوئی تھی۔ ایک جانب
طویل جنگلی پہاڑی سلسلہ تھا۔ جس کی دلفریب ڈھلوانوں
پیشینی جنگل بنے ہوئے تھے۔ اور جہاں سے ان گنت
خوش رنگ پرندوں کے زور زور سے بولنے اور چھپھانے
کی جمل ترکیب آوازیں آرہی تھیں۔ دینو کا بیٹا حدی نے
متا کیا کہ یہ دودن کا جنگل اور ٹیلے ٹی سوسل تک پھیلے ہوئے
ہیں۔ جو آگے جا کر ایک اور جنگل میں مل جاتے ہیں۔
جواد ان معلومات سے کافی محفوظ ہو رہا تھا۔ اسے ٹیلے اور
دھلاط آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے سفید ٹکڑے روٹی
کے گالوں کی طرح تیرتے ہوئے بھلے نظر آ رہے تھے۔
جماد ہری ہری گھاس والے ایک ٹیلے پر مشرق کی سمت اپنا
مذمکھول کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنے ہونٹ تختی سے بند کرنے
لے بعد اندر کو گہرا سانس کھینچا اور پھر دیر دیر سے
سانس کو باہر خارج کرنے لگا۔ اس کے بعد اسے یوں لگا

جیسے کہ اس کے جسم میں ہڈی نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔

وہ اب خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا اور یہی
نہیں بلکہ اپنے اندر اعصابی قوت بھی محسوس کر رہا تھا۔
ایک غیر معمولی اعصابی قوت اور پھر اس کے بعد وہ حیدر
کے ساتھ واپس حویلی میں آگئے..... جہاں حویلی کے
باغیچے میں اس کے اہی ابوتا شتے میں مصروف تھے۔ اس
کی اہی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے پیار سے
کہا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ورزش وغیرہ کرنے
کی کیا ضرورت ہے۔ تم کون سا فریبہ جسم ہو۔“

”اونو ای ورزش سے محض جسمانی نہیں بلکہ ذہنی
سکون بھی ملتا ہے۔“ جواد جوس کا گھاس اپنی اہی سے لیتے
ہوئے بولا۔ ”اس سے قوت فیصلہ مضبوط اور روح کو سکون
ملتا ہے۔“

”اچھا ابھی رہنے دو اپنی تقریر۔“ اس کی اہی جان
چھڑانے والے انداز میں بولیں۔ سدرہ کی بات پر مشتاق
احمد نے مسکرانے پر اکتفا کیا اور جواد بھی اپنے باپ کی
طرح مسکرا کر ناشتہ کرنے بیٹھ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ اور
جواد اس بات پر غور کرنے لگا کہ ”آخر وہ کس کی سرگوشیاں
تھیں۔“ جواس کی سماعت سے نکل رہی تھیں اور گزشتہ شب
بھی اس کے کمرے میں واضح سرگوشی سنائی دی تھی۔ جس
میں متا بھری جلاوت تھی۔ اسے کسی نے بیٹا کہہ کر مخاطب
کیا تھا۔ ”سرگوشی کے الفاظ اس کے دل و دماغ میں گونج
رہے تھے۔ پھر اسے وہ بات بھی یاد آنے لگی۔ جب بچن
آباد آتے ہوئے اچانک ہی ان کی کار کے آگے کسی
عورت کا بھولہ آگیا تھا۔ مگر تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ سایہ
اس کے اہی ابو کو دکھائی نہیں دیا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں ہی
کار کی اگلی سیٹ پر براجمان تھے۔“ کیا وہ سب اس کا وہم
تھا۔ یا پھر حقیقت، کوئی پراسرار حقیقت یا کوئی ایسا راز جس
پر سے پردہ اٹھنے والا ہے۔ اور جواس کی ذات سے وابستہ
تھا۔ ”معا جواد کھڑے کھڑے چونک گیا۔ اس کے
خیالات منتشر ہوتے چلے گئے۔

اسے اپنے سامنے ٹھوڑے فاصلے پر ایک شاندار سچی
سجائی نکسی آئی ہوئی دکھائی دی۔ جس پر ایک حسین

ہوئے زیبا بولی۔ ”ٹھیک ہے..... مگر ذرا جلد ہی بات کرنا۔ بلکہ آج ہی بات کر لینا تو بہتر ہوگا۔ کل اسی جگہ آ کر مجھے بتادینا۔“ اس کے بعد وہ دونوں مزید کچھ دیر گھومتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر اس کے بعد دونوں واپس لوٹ آئے۔

☆.....☆.....☆

”امی وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“ جواد موقع ملنے ہی تنہائی میں اپنی امی سے بولا۔ وہ زیبا کے بارے میں پہلے ہی اپنی امی کو اعتماد میں لے چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی امی مسکراتے ہوئے اس کے گال کو پیار سے تھپتھا کر بولی۔ ”ارے بھی آخر تمہاری پسند ہے۔ کوئی غلط تو نہیں ہوگی۔ ہم تمہیں جیسے جانتے نہیں، زیبا کو راضی کرنے کے لئے تم نے کتنے پاڑے بیلے ہوں گے۔ یہ تو وہی جانتی ہوگی۔ چلو میں تمہارے ابو سے آج رات ہی بات کر کے دیکھوں گی۔“ امی نے کہا۔ اور جواد مطمئن ہو گیا۔

اس وقت رات کے دس بجے کا عمل ہوگا۔ اور مشتاق احمد اپنے اسٹڈی روم میں موجود تھے۔ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز پر وہ چونکے۔ پھر بس کہتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا تو اپنی بیوی سلمیٰ کو اندر آتے دیکھ کر کتاب بند کر دی۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن جواد نے خوشی خوشی زیبا سے ملاقات پر اسے خوشخبری سنائی کہ اس کی امی نے ابو سے اس سلسلے میں بات کر لی ہے۔ اور انہوں نے اس کے ابو سے اشارتاً تذکرہ بھی کر ڈالا ہے۔ ایک آدھ روز میں امید ہے کہ یہ معاملہ طے ہو جائے۔ زیبا یہ سن کر ایک دم خوش ہو گئی۔ اور اسی خوشی میں اس کے جی میں جانے کیا سناں کہ وہ جواد کو اپنی حویلی میں اپنے والد چوہدری اسد سے ملوانے کی غرض سے لے آئی اور جواد نے بھی اس کے ہمراہ جانے پر ذرا بھی تامل نہ کیا۔ زیبا اسے اپنی بھٹی میں لے کر حویلی میں آ گئی۔ ”زیبا تمہاری حویلی تو بہت شاندار ہے۔“ جواد ایک ہال نما کمرے میں جو غالباً نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ پہنچ کر خاصا

شہزادی جیسی شان والی لڑکی براجمان تھی۔ جواد اس وقت اکیلا ہی سیر کو نکلا تھا۔ جواد یک جگہ اس پری پیکر کو دیکھنے میں محو تھا۔ وہ اسی جانب آ رہی تھی۔ اس لڑکی کا چہرہ متاثر کن تھا۔ اس کے چہرہ کے انوکھے پن نے جواد کو بالکل ہی محو کر کے رکھ دیا تھا۔

آنے والے پری پیکر نے باگیں کھینچ لی تھیں۔ فوراً دونوں گھوڑے ہنہنا کر رک گئے۔ وہ لڑکی جواد پر نظریں جمائے نیچے اتری۔ اس کے قریب آئی..... دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پھر شاید دونوں کے دلوں نے بیک وقت اس بات کی گواہی دی کہ عرصے سے ان کا دل ایک دوسرے کے لئے چپکے چپکے تڑپ رہا تھا۔ بس پھر صدیوں کا سف الفت لکھوں میں طے ہوتا چلا گیا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ رہے۔

لڑکی کا نام زیبا تھا۔ وہ ٹخن آباد کے چوہدری اسد کی اکلوتی بیٹی تھی، دونوں کے درمیان رکی بات چیت ہوئی اور پھر دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے واپس جدا ہو گئے۔ اس کے بعد دونوں نے ملاقات کا معمول بنالیا۔ اور جلد از جلد ایک دوسرے کے ہو جانا چاہتے تھے۔ وجہ یہ کہ جواد اور اس کے ابو کا حویلی میں قیام گھوڑے ہی عرصے کے لئے تھا۔ کیونکہ مشتاق احمد شہر کے ایک کالج میں پروفیسر تھے اور گھوڑے دنوں کی چھٹیاں لے کر تفریح کرنے نچن آباد آئے تھے۔

”جواد تم اپنی امی ابو سے اس معاملے کی بات تو کرنا، آخر زیبا نے اس سے یہ کہہ ہی دیا تو جواد تذذیب کا شکار ہو گیا۔ کیونکہ اسے خود زیبا کے بارے میں اپنی امی ابو سے بات کرنا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ جواد کو خاموش پا کر زیبا دوبارہ بولی۔ ”تم کہو تو میں خود ہی پہل کروں۔ اور اپنے ابو کے ساتھ تمہاری حویلی آ جاؤں۔“

”اے..... نن..... نن نہیں۔“ جواد یکدم چونکا۔ ”یہ ابھی درست نہیں ہوگا..... اچھا تم ٹھہرو میں پہلے اپنی امی سے بات کروں گا۔ دیکھوں گا کہ وہ اس سلسلے میں مجھے کیا مشورہ دیتی ہیں۔“ جواد کی بات سن کر زیبا کے چہرے پر ذرا تردد کے آثار نمودار ہوئے۔ جواد کو مخاطب کرتے

”اے لے جاؤ یہاں سے زیبا..... دور لے جاؤ
اے میری نظروں سے۔“ چوہدری اسد نے بوکھلائے
ہوئے قدرے درشت لہجے میں زیبا سے بولا۔

”بیچاری زیبا تو خود عجیب پریشانی و شش و پنج میں تھی
کہ اتنے میں چوہدری اسد خود ہی اٹھ کر وہاں سے
چلا گیا۔

”زیبا یہ تمہارے ابو کو کیا ہو گیا۔“ جواد حیرت سے
بولا۔

”میرے ابو کو نہیں بلکہ تمہیں کچھ ہو گیا تھا جواد۔“
زیبا ایک ایک لفظ کو جیسے چباتے ہوئے بولی۔ دراصل
وہ خاصی پریشان ہو چکی تھی۔

”مم..... مجھے کیا ہو گیا تھا۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ،
میں اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ کیا ہوا تھا مجھے۔“

اس کی بات پر زیبا چند لمحوں کی سوچ میں رہی، پھر
جواد کو اس کی اچانک بدلتی ہوئی کیفیت کے بارے میں
بتانے لگی..... آخر میں پھر زیبا بولی۔ ”جواد تم کون ہو؟
مجھے اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ..... تمہیں ابو کے سامنے
اچانک کیا ہو گیا تھا؟“ جواد چند لمحوں کی جانب
حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے بعد
بولا۔ ”مجھے خود نہیں معلوم میں جب تمہارے ابو کو سلام
کرنے لگا تو اچانک میری آنکھوں کے سامنے تاریکی
چھا گئی۔ پھر میں خود کو جیسے بے حس و حرکت محسوس کرنے
لگا۔ جب تاریکی چھٹی تو تمہارے ابو کو میں نے جانے
کیوں خوف زدہ دیکھا..... کیا واقعی تم نے اچھی طرح
دیکھا تھا کہ میرا چہرہ خوفناک اور آواز بھاری ہو گئی تھی۔

”ہاں جواد تمہارا خوب صورت چہرہ یک دم ڈراؤنا
اور خوفناک ہو گیا تھا۔ اور تم نے ابو کو دھمکا یا بھی تھا۔“ زیبا
کی بات پر جواد پریشان سا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ
چوہدری اسد سے بھلا اس کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ میں تو
انہیں اس سے پہلے جانتا تک نہیں تھا۔ انہوں نے
میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔“

جواد کو پریشان اور ششدر دیکھ کر زیبا تشویش سے
بولی۔ ”گھبراؤ نہیں جواد یہ کوئی پراسرار معاملہ لگتا ہے۔ تم

مربوب ہوتے ہوئے بولا۔ دیواروں پر چوہدریوں کے
پورے خاندان کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ”تم یہاں
بیٹھو! میں اپنے ابو کو بتا کر آتی ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد جواد نے دیکھا کہ زیبا کے ہمراہ ایک
بھاری بھر کم جسامت کا آدمی نمودار ہوا۔ جو ساٹھ کے
لیپٹ میں تھا۔ جواد جان گیا کہ یہ زیبا کے والد چوہدری
اسد ہیں.....

جواد نے ادب سے انہیں سلام کیا تو چوہدری اسد
نے جواد کو سلام کا جواب دینے کے بعد سامنے صوفے پر
بیٹھ گئے، ابھی ان کے درمیان رکی باتیں شروع ہوئی
تھیں کہ اچانک ہی ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک دم جواد کی
حالت عجیب اور غیر ہونے لگی۔ اس کا خوب صورت چہرہ
کرخت اور بہت بھیا نک ہوتا چلا گیا۔ سامنے بیٹھے
ہوئے چوہدری اسد اور زیبا جواد کی یک لخت بدلتی ہوئی
چہرے کی ہیبت پر دم بخود رہ گئے۔ اسی لمحے جواد کے حلق
سے ایک فر فراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ وہ چوہدری اسد
سے مخاطب تھا۔ ”چوہدری پہچان مجھے میں کنول ہوں
جسے تو نے چاندنی رات میں خیرستان میں زندہ گاڑ دیا
تھا..... اب اسی چاندنی رات کے آنے میں تھوڑے ہی
دن باقی رہ گئے ہیں..... اور اتنے ہی دن اب تیری زندگی
کے باقی بچے ہیں..... یہ جواد میرا خون اور میرا بیٹا
ہے.....“ اور یہ جملہ ختم ہوتے ہی جواد اپنی اصلی شکل میں
آ گیا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی
بدلی ہوئی خوفناک کیفیت کا بالکل بھی علم نہ ہو، اور نہ ہی یہ
کہ اس نے زیبا یا اس کے والد چوہدری اسد کو خوفناک
انداز میں دھمکایا تھا۔

زیبا نے بغور اپنے ابو کی طرف دیکھا تو دمگ رہ گئی،
کیونکہ اس کے ابو کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا.....
”می..... یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ جواد تمہیں۔“ زیبا حیرت
اور خوف کے طے بلے انداز میں بولی۔

”جواد خود حیران تھا کہ دونوں باپ بنی اسے اتنے
عجیب انداز اور نظروں سے کیوں نکلے جا رہے تھے اور
چوہدری اسد کے چہرے پر خوف مایاں تھا۔

لوریاں سناتی ہے۔“ اتنا کہہ کر جواد خاموش ہو گیا۔ اور مشتاق اس کی بات سن کر بری طرح دنگ رہ گئے۔

”ابو بتائیں کہ میں کون ہوں۔ میرا ماضی کیا ہے..... مجھے تو کبھی کبھی ایسا بھی لگتا ہے کہ جیسے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہوں۔ آپ میری گزشتہ زندگی کے کسی تاریک و پراسرار پہلو کے بارے میں جانتے ہیں.....“ مشتاق احمد اپنے لاڈلے کی اس قدر زور نہی پر حیران رہ گئے..... اور ان کی آنکھوں اور چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جواد کی بات پر اپنے دل کا جوڑ چھانے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں۔ وہ خاموش سے ہو گئے۔ پھر وہ جیسے اس سے کتراتے ہوئے تسلی دے کر اپنے بیڈروم میں آ گئے۔ اندر آ کر وہ اپنی کرسی پر ڈھسے سے گئے۔ ان کا چہرہ سوچ کا غماز نظر آنے لگا۔ وہ اب گہری سنجیدگی سے جواد کے سوالات پر ان واقعات کے بارے میں غور و خوض کر رہے تھے۔

جب یہ لوگ ٹچن آباد میں داخل ہوئے تھے کہ راستے میں جواد کو پراسرار سوانی سائے نظر آیا تھا۔ اور ساتھ ہی اسے کسی کی سرگوشیاں بھی سنائی دی تھیں۔ جو جواد کو اب بھی کبھی کبھی سنائی دیتی تھیں۔ پھر جواد نے اپنے ابو کو یہ بھی بتایا کہ زبیا کے والد جوہری اسد کے سامنے کسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ ساری باتیں ناقابل یقین تھیں، لیکن بہر طور ان پراسرار واقعات کے شواہد بھی موجود تھے۔ مشتاق احمد ہر شے کو حقیقت کے تناظر میں پرکھنے کے عادی تھے۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ ان عوامل نے انہیں بالآخر ماضی کے گزشتہ باب کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر انہیں وہ برسوں پہلے کی وہ بھیا تک رات یاد آ گئی.....

آج سے تقریباً بیس سال پہلے جب مشتاق احمد اپنی بیوی سلمیٰ کے ہمراہ اپنے گاؤں ٹچن آباد سے شہر واپس جا رہے تھے۔

مشتاق احمد اپنی نوکری اور شادی کے بعد شہر میں رہتے تھے اور شہر کے ایک کالج میں وہ پروفیسر تھے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ اپنے والدین کو شہر میں اپنے ساتھ ہی رکھیں، مگر والدین اپنی آبائی بستی ٹچن آباد کو کسی

ایسا کرو اس بات کا تذکرہ اپنے ابو سے کر کے دیکھنا اور اپنے بارے میں ان سے معلومات ضرور لینا، شاید وہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں اور مجھے یقین ہے کہ انہیں ضرور تمہارے بارے میں حقیقت کا کچھ نہ کچھ پتا ہوگا۔“ زبیا کی بات پر جواد چونک سا گیا۔ پھر زبیا سے بولا۔ ”زبیا تمہیں بھی اپنے ابو کو کریدنا ہوگا۔ آخر یہ سب کچھ انہی کے ساتھ کیوں ہوا ہے۔“ اس کی بات پر زبیا پر خیال انداز میں اپنا سر ہلایا۔ پھر وہ کبھی میں سوار ہو کر واپسی کے لئے چل پڑی۔

☆.....☆.....☆

”ابو میں، میں کون ہوں۔ کیا ہوں؟ کیا مجھ سے وابستہ کوئی راز ہے کیا؟“ جواد نے اپنے ابو مشتاق احمد سے پوچھا۔ تو اس کے اس بیٹے کے اس سوال پر دنگ رہ گئے، یہ رات کا وقت تھا۔ اور یہ سب لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ جواد کی امی سلمیٰ اپنے کمرے میں جا کر سو چکی تھیں۔ جبکہ مشتاق احمد کی آنکھوں سے جانے کیوں ابھی تک نیند کوسوں دور تھی۔ اور وہ یونہی جواد کے کمرے میں آ گئے تھے۔ درحقیقت وہ کچھ دنوں سے اپنے بیٹے میں عجیب سی تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ وہ اسے اکثر گم سم اور کھوکھیا کھویا سا پانے لگے تھے۔ حسب توقع جواد ابھی تک جاگ رہا تھا۔ گہرے خیالات میں غرق تھا۔ اپنے ابو کو دیکھتے ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور پھر یہ بات چھیڑ دی تھی۔

اس کے اس عجیب و غریب اور اچانک سوال پر مشتاق احمد ایک لمحے کو بری طرح ٹھٹھکے تھے..... ”کیوں بیٹا یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے بڑے رसान سے بولے۔

”مگر ابو کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ مجھے آپ اور امی کے علاوہ بھی کوئی اور پیار کرتا ہے۔ ممتا بھرا پیار۔“ جواد بدستور کھویا ہوا عجیب سی کیفیت میں بولا۔ ”ابو کبھی کبھی تو مجھے اپنی سماعتوں میں بالکل صاف اور واضح طور پر ممتا بھری سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں، وہ کوئی پراسرار عورت ہے۔ جو سامنے نہیں آتی۔ لیکن مجھے رات کو

اے خاصاں خاصاں رسل وقت دعا ہے امت پر تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

کیا آپ کی دعا قبول ہو سکتی ہے؟

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے 212 مرتبہ مختلف مقامات پر دعا مانگنے کی ترغیب انسانوں کو دی ہے اور وہ اپنی مقدس کتاب میں کہتا ہے کہ تم مجھ کو پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا (سورۃ المؤمن ۴۰، آیت ۶۰)

اگر آپ دعا مانگ مانگ کر تھک چکے ہیں اور آپ کی دعا قبول نہیں ہوتی تو جب تمام وسائل و فطری ذرائع بھی کسی انسان کی حاجت کو پورا کرنے میں ناکافی ثابت ہوتے ہیں یا اس کی جانب سے کی جانے والی تمام تر کوششیں اس کی کسی تکلیف یا مشکل کو حل کرنے میں بالکل ہی ناکام ہو جاتی ہیں تو اس کو اپنی بے چارگی کا احساس شدت سے ہوتا ہے اور اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ کسی فوق الفطری اقتدار کی مالک ہستی دنیاوی اصلاح میں کسی سپریم پاور سے رجوع کرنا اس کے لئے ناگزیر ہے اور انسان کا کسی اقتدار کی مالک ہستی کو سپریم پاور تسلیم کر کے اس سے مدد مانگنا ہی دراصل قبولیت دعا ہے اور انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اب جبکہ اسی کے مہیا کردہ مادی ذرائع اور اسباب ناکام ہو چکے ہیں اور وہ مجبور ہے کہ اس ہستی سے مدد مانگتی ہی بڑے کی انسان کے دعا مانگنے کا محرک بنتی ہے۔ چنانچہ انسان اسی نادیدہ ہستی کو پکارتا ہے، ہر جگہ ہر وقت ہر حال میں کبھی تنہائیوں میں، کبھی مجمع میں، کبھی باآواز بلند اور کبھی چپکے چپکے اور اس پکار کے پس پردہ دراصل انسان کا یہ عقیدہ کارفرما ہوتا ہے کہ وہ جس ہستی کو پکار رہا ہے وہ ہستی نا صرف اسے دیکھ رہی ہے بلکہ اس کے دل کی بات بھی سن رہی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ اعتقاد کہ وہ ہستی اسی بات پر بلاشبہ قادر بھی ہے کہ پکارنے والا کہیں بھی ہو اس کی پکار سن کر اس کی مدد کو پہنچ کر اس کی مشکل آسان کر سکتا ہے اور ایسی مہربان ہستی صرف وہی ہے جس کو وہ اس وقت پکار رہا ہے کسی بھی انسان کے اس عقیدے سے خود بخود قرآن مجید میں اس کی تائید ہو جاتی ہے کہا جاتا ہے جمعہ کے ۲۳ گھنٹوں میں ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے جسے قبولیت کی گھڑی کہا جاتا ہے مگر آج تک کوئی یہ نہ بتا سکا کہ اس کا صحیح وقت کیا ہے یہ سعادت ڈال کر شہمت جاہ صاحب کو حاصل ہوئی کہ انہوں نے جعفر جامع کی مدد سے جو کہ قبولیت کی گھڑی کا صحیح وقت استخراج کر کے پوری امت مسلمہ پر یہ احسان عظیم کیا ہے جس کا صلہ ہم صدیوں تک نہیں اتار سکیں گے جس طرح پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح دعا کے وقت میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے ہر ملک شہر اور علاقے میں دعا کا وقت مختلف ہوتا ہے جو جدول آپ کو دی جائے گی وہ صرف 52 مہینوں پر مشتمل ہوں گی مگر جمعہ کے علاوہ بھی آپ پورے مہینے اسی وقت قبولیت دعا کے لئے اللہ تعالیٰ سے رجوع کر سکتے ہیں، قبولیت دعا کی جدول کا ہدیہ 600 روپے اگر آپ اپنا اسم اعظم نکلوانا چاہتے ہیں جس کا ورد کرنے کی وجہ سے پھر کسی عمل یا وظیفہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوگی اس کا ہدیہ 600 روپے، اگر آپ مالی طور پر پریشانی کا شکار ہیں تو جب خالی نہ رہنے کا عمل طلب کریں اس کا ہدیہ 600 روپے ہے اور کسی فرد کو جن جادو کا سامنا ہے تو نقش الہیات طلب کریں اس کا ہدیہ 600 روپے ہے، اگر کوئی بھی کام کرنے سے پہلے خراب ہو جاتا ہے یا کام کے دوران خراب ہوتا ہے یا کام ختم ہونے سے پہلے خراب ہوتا ہے تو اس کے لئے عریفہ مشکل کشا جو بیتے پانی میں نیت کر کے ڈالنا ہوگا اس کا ہدیہ 600 روپے ہے اور اگر آپ قرآن کی کمی پورنا چاہتے ہیں تو اس کے تین کورس ہیں ہر کورس کا ہدیہ 600 روپے ہے، اس کے علاوہ ہر کام میں کامیابی اور ناکامی کے لئے استعارہ خود کرنا چاہے تو 52 مہینوں پر مشتمل جدول ہر ملک شہر اور علاقے کی تیار کی گئی ہے جو پورے 365 دن کام آئے گی اس کا ہدیہ 1200 روپے ہے، یہ درم مکتبہ عالم العلوم اور مکتبہ علوم الاعمال کے زیر اہتمام چھپنے والے سپاروں اور اسلامی مطبوعات پر لگائی جائے گی، اس کے لئے ڈاکٹر شہمت جاہ اپنی خوشی کا الگ سے کوئی معاوضہ وصول نہیں کریں گے۔ مزید تفصیلات کے لئے جوابی لغافہ کے ساتھ جواب طلب فرمائیں، رقم منی آرڈر کرتے وقت اس بات کو ضرور مد نظر رکھیں کہ جو رقم آپ ارسال کر رہے ہیں وہ کسی مد میں ہیں جو چیز آپ طلب کر رہے ہیں ان کا نام لکھیں منی آرڈر اور خط و کتابت کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں۔

اقبال احمد مدنی

مکتبہ روحانی سائنس، رتن تلاؤ نزد دارود بازار کرچی

اوقات ملاقات: بذریعہ فون صبح 10 سے 11، موبائل فون: 0346-2271015، اتوار تعطیل

دور ہو گئی تھی۔ انہوں نے بوٹ بند کیا۔ اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا ہی چاہتے تھے کہ اچانک چند گز کے فاصلے ایک تیز اور کرب ناک کراہ سنائی دی تو وہ دہل گئے۔ یوں اندھیری رات اور ویرانے میں کسی انسان کی کراہ اچھے بھلے انسان کا دماغ مآؤف کر سکتی ہے، اگر کراہ دوبارہ نہ ابھرتی تو مشتاق احمد اسے اپنا وہم ہی سمجھتے، پھر وہ کراہ اب بتدریج آہوں میں بدل رہی تھی، مشتاق احمد نے اپنا دل مضبوط کیا اور آواز کی ست نارج کی، روشنی پھیلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے ایک لمحے کو ان کے جی میں آیا کہ وہ یہاں سے واپس لوٹ جائیں، مگر پھر انکا دل نہ ماتا۔

”ہوں اور اذیت ناک سسکیوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بہت تکلیف میں ہو۔ واضح طور پر اب پراسرار اور کرہ ناک آواز سوائی معلوم ہوتی تھی اور مشتاق احمد اسی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بلا خروہ اس جگہ پہنچ گئے۔ لیکن وہاں کا منظر دیکھتے ہی وہ بری طرح ٹھٹھک گئے۔

نارج کی روشنی میں انہوں نے جو بھیا نک منظر دیکھا۔ وہ اچھے خاصے مضبوط دل گردے والے انسان کو کھپکانے کے لئے کافی تھا..... مشتاق احمد بھی یہ دل ہلا دینے والا منظر دیکھ کر لرز اٹھے.....

کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے کچھڑ میں ایک عورت انتہائی جان کنی کے عالم میں پڑی سسک رہی تھی۔ اور اس کے قریب ہی ایک بہت چھوٹا سایہ پڑا تھا۔ کچھڑ میں خون کی بھی کافی آمیزش نظر آ رہی تھیں۔ وہ عورت انتہائی اذیت میں معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہی تھی اور پھر اس سے پہلے کہ متحیر کھڑے مشتاق احمد اس جاں بہ لب لٹی پھٹی عورت کی طرف بڑھتے اس گھائل عورت نے ایک آخری جھک کالیا اور ساکت ہو گئی۔ وہ مرجھ چکی تھی۔ تاہم مشتاق احمد ڈمگاتے قدموں سے ذرا قریب ہو گئے۔

قریب پڑا وہ بچہ اب اپنی ہلکی آواز سے رورہا تھا۔ مشتاق احمد کو کچھ نہ سوجھا انہوں نے بچے کو اٹھالیا۔

طرح بھی چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ انہی دنوں مشتاق احمد کی بیوی سلمیٰ کے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا تھا۔ سلمیٰ دوسرے امید سے ہوئیں۔ مگر دنوں ہی بار اولاد نہ ہو سکی۔ جس کی وجہ سے سلمیٰ کا جینی توازن بگڑنے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر بہت جلد ان کی گود ہری نہ ہوئی تو یہ اپنا جینی توازن کھو سکتی ہیں۔

بہر طور اس بات نے مشتاق احمد کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ خیر انہوں نے اپنے کالج سے ایک ماہ کی چھٹی لی اور چٹن آباد آ گئے۔ یہاں آ کر ان کی بیوی کی طبیعت نے کچھ سنبھال لیا۔ مگر جہاں کہیں بھی وہ کسی بچے کو دیکھتی اس کی آواز سنتی تو فوراً بے قرار ہو جاتی تھیں۔ مہینہ پورا ہوا تو مشتاق احمد نے چٹن آباد سے واپسی کا سفر باندھا..... فضا اور ماحول کی خوشگوار تبدیلی نے سلمیٰ پر اچھا اثر ڈالا تھا۔

بہر طور وہ واپس ہوئے اور رات کا پہر تھا، سونے پر سہاگہ کہ ایسے موسم میں موسلا دھار بارش نے آن گھیرا، وہ ابھی تک چٹن آباد کی ہنگی حدود میں تھے کہ اچانک ان کی کار کا انجن بند ہو گیا۔ شاید کار کے کاربوریٹر میں پانی چلا گیا تھا۔ ہر طرف ویرانی اور بیابانی اس پر برقی بارش اور ہر سو گھورتا تاریکی کا راج تھا۔ مشتاق احمد کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک نگاہ پچھلی سیٹ پر ڈالی۔ جہاں ان کی بیوی سلمیٰ سو رہی تھی۔ وہ اسٹیرنگ پر ہاتھ جمائے ہونٹ بھیجنے بیٹھے رہے۔ اور بارش کے رکنے کا انتظار کر رہے تھے کہ پھر جلد ان کی مراد برآئی۔ بارش کم ہوتے ہوئے تقریباً بند ہو گئی..... وہ کار کے ڈیش بورڈ کے خانے سے نارج نکال کر کار سے باہر نکل گئے۔

باہر ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ بارش کے بعد موسم عجیب ہو گیا تھا۔ مشتاق احمد اگرچہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ لیکن بہر طور فطرت اس ویرانے بیابان اور اندھیرے میں انہیں گمان آمیز اضطراب ضرور محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نارج کی روشنی میں کار کا بوٹ اٹھا کر اس کی خرابی دیکھنے لگے۔ خرابی معمولی تھی۔ جو چند منٹوں میں

اور اپنی کار میں آکر اسے ایک کپڑے سے اچھی طرح صاف کر کے اپنی بیوی کی گود میں ڈال دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی کار اشارت کر کے آگے بڑھانا چاہی پھر اچانک ان کے ذہن میں آیا کہ ”اس بد نصیب عورت کا جسد خاکیوں چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ لیکن چونکہ اب وہ مر چکی تھی۔ دوسرے نہ ہی ان کے پاس اس نازک حالت میں کوئی ایسا بندوبست تھا۔ جس سے وہ اس عورت کو دفناسکتے۔ لہذا یہ خیال ذہن سے جھٹک کر انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

گاڑی چلانے کے دوران جہاں تک ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ”اس عورت کے ساتھ ضرورتاً قابل برداشت زیادتی اور ظلم ہوا ہے۔

اب انہوں نے یہ حتمی فیصلہ کر ڈالا تھا کہ وہ اس بچے کو اپنے پاس رکھ کر بیوی کو خوشیاں پہنچائیں گے۔
ممتا کی ماری سلگنی نے اس بچے کو واقعی اپنا بچہ سمجھ کر سینے سے لگالیا۔

وہ بچہ اب جواد کی صورت میں ان کا اپنا بیٹا بن چکا تھا۔ دونوں میاں بیوی اس بچے کی خوشیوں میں خوش تھے۔ جواد سے مشتاق احمد نے آج تک یہ سنی نیز اور اندوہناک راز چھپا رکھا تھا کہ وہ انہیں کن بھیانک حالات میں ملا تھا۔ اب وہ ماضی کو اپنے دل سے نکال چکے تھے۔ ہمیشہ کے لئے.....

مگر اب بیس سال بعد جن پر اسرار عجیب و غریب حالات سے جواد گزر رہا تھا۔ ان حالات نے مشتاق احمد کو ماضی کریدنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان سارے حالات و واقعات کے تناظر میں مشتاق احمد نے تجزیہ کرتے ہوئے سوچا کہ بیس سال پرانے جس اندوہناک واقعے کو وہ دفن کر چکے تھے۔ شاید اس کے آشکار ہونے کا وقت آن پہنچا تھا..... جس کی کڑیاں جواد کی زندگی سے مل رہی تھیں اور اس پر اسرار تعلق کی بنا پر جواد آج پر اسرار حالات سے دوچار ہو چکا تھا۔ اور آخر اس نے تنگ آ کر ان سے اپنے ماضی کے متعلق پوچھ لیا تھا۔
مشتاق احمد خود شش و پنج کا شکار تھے کہ وہ جواد کو اس

اندوہناک واقعات سے آگاہ کریں تو کس طرح کریں۔“ کہیں یہ ماضی کی باتیں ان پر یا ان کی بیوی سلگنی پر یا پھر جواد پر منفی اثر نہ کر ڈالیں۔ اور پھر اپنی خیالات کے سبب انہوں نے جواد کو ٹال دیا تھا۔
لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں آخر ایک نہ ایک دن تو جواد کے سامنے یہ اندوہناک حقیقت ظاہر کرنا پڑے گی۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ خاصے ڈبل ڈول اور آہستہ رنگت کا ایک شخص گہرا رنگ کی دھونی باندھے اپنے سامنے آگ روشن کئے کسی عمل میں مصروف تھا۔ اس کے قریب چار پانی پر چوہدری اسد خاصا پریشان بیٹھا تھا۔

مندو جلدی بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے، کیا کوئی روح میرے خون کی پیاسی ہو رہی ہے؟“ چوہدری نے پوچھا۔
”تھوڑا صبر چوہدری صاحب۔“ وہ شخص اپنی آنکھیں بند کئے آرام سے بولا۔ وہ کالے جادو اور سفلی علوم کا ماہر چوہدری اسد کا خاص آدمی تھا۔ ”چوہدری جس انسان کا ماضی خونی کھیل میں ہی رہا ہو..... اسے بھی ہر مصیبت کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح تیار رہنا چاہئے۔“

”مندو.....“ چوہدری اسد حلق کے بل چیخا۔ جس میں اس کی ذہنی ابتری اور دیوانگی جھلک رہی تھی۔ ”ماتا کہ تو ہمارے خاندان کا پرانا خادم ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو ہم سے اس لہجہ میں بات کرے۔“

”چوہدری صاحب آپ ہمیں غلط نہ سمجھیں۔“ مندو شعلوں پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے بولا۔ ”میں تو آپ کو ٹھنڈا یعنی صبر کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ اچھا ذرا ٹھہریں بتاتا ہوں تمہیں۔“ پھر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بد بدلنے لگا۔ اور چوہدری اسد بے چینی اور غصے کی کیفیت میں اسے دیکھنے لگا۔

دراصل چوہدری جواد کے منہ سے نکلی باتوں کے بعد بری طرح خائف ہو گیا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یہ

اندازہ ہو رہا تھا کہ جواد کے اندر کوئی بے قرار بدروح محسوس ہوئی ہے۔ جو کہ اس کی جان کی دشمن ہے..... یا اس سے کسی قسم کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ لہذا چوہدری نے نندو کو یہ سب بتا کر اسے بدروح کے خاتمے پر مامور کر دیا تھا۔ چند لمحوں بعد نندو اپنی آنکھیں کھول کر چوہدری کے سامنے گویا ہوا.....

”چوہدری صاحب آج سے بیس برس پہلے ایک عورت اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ تمہاری جاگیر میں داخل ہوئی تھی۔ اور جسے تم نے اغوا کر کے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ اور اسے تم نے چاند کی چودہویں رات قبرستان کے قریب پھینکوا دیا۔ وہ بہت حسین اور خوب صورت تھی۔ اس کی گود میں ایک بہت چھوٹا بچہ تھا، تمہاری زیادتیوں کے باعث وہ مر گئی تھی۔

اس بچے کو کسی نے اپنی اولاد کی طرح پال پوس کر جوان کیا۔“ کچھ دیر نندو نے توقف کیا۔ پھر سے بولا۔ ”چوہدری صاحب یہ سب باتیں مجھے تین دنوں تک عمل میں مصروف رہتے ہوئے معلوم ہوئی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس بدنصیب عورت جسے تم نے اپنے ظلم کا نشانہ بنایا، اب اس کی روح کو ایک ایسی طاقت مل چکی ہے جو ٹھیک چاند کی چودہویں رات کو اپنے اس بیٹے کے شریر میں داخل ہو کر تم سے اپنے اوپر کئے ہوئے ظلم کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔“ نندو اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

نندو کی آخری بات پر چوہدری خوفزدہ ہو کر ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو نندو۔“ اور مجھے اب اس روح سے کیسے نجات مل سکتی ہے۔“

نندو نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں..... شعلوں میں یکبارگی حدت آگئی۔ اور نندو کا چہرہ آتشیں ہونے لگا۔ وہ شاید پھر کسی عمل میں مصروف ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات انتہائی گہری اور تاریک تھی۔ اور اس وقت مشتاق احمد کی حویلی کے اطراف پر اسرار ویرانی مسلط تھی۔ البتہ کہیں دور پرے گیدڑوں کے چلانے کی

آوازیں رات کے سکوت میں برہمیوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔ جواد اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا ہوا تھا کہ مغرب کی سست گھٹنے والی کھڑکی جو کہ کھلی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی میں اچانک ایک سایہ نمودار ہوا۔ جس نے اپنے منہ پر سیاہ چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ سایہ نہایت ہوشیاری سے اندر کودا۔ وہ چند لمحے ساکت رہ کر سن گن لیتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں پھر شکرے جیسی چمک پیدا ہوئی، اس نے غالباً سامنے جواد کو گہری نیند میں سویا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ مسہری کے پاس بڑھنے لگا۔

وہ چوہدری اسد کا بھیجا ہوا ایک آدمی تھا۔ جو اس کے حکم کے مطابق جواد کو موت کے گھاٹ اتارنے آیا تھا کیونکہ نندو نے چوہدری کو اس عورت کی روح سے نجات دلانے کا یہی طریقہ بتایا تھا وہ کسی طرح سے اس کے بیٹے جواد کو ہلاک کر ڈالے تو اس عورت کی روح بے بس ہو جائے گی..... کیونکہ وہ صرف اپنے بیٹے جواد کے جسم میں ہی داخل ہو کر چوہدری اسد کو ہلاک کر سکتی ہے۔ اور یہ موت کا کھیل اپنے انجام کو چاند کی چودہویں رات میں ہی پورا ہو سکتا تھا۔

جس شخص کو چوہدری نے جواد کے قتل پر لگایا تھا۔ اس کا نام دلاور تھا۔ جسے چاندنی رات سے قبل جواد کو ہر صورت میں مارنا تھا۔

اب وہ جواد کے سر پر کھڑا تھا۔ پھر اس قاتل نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنی چادر کے اندر سے ہاتھ باہر نکالا، اس کے ہاتھ میں ایک لمبے پھل والا خنجر چمک رہا تھا۔ اس نے ایک نظر سامنے دنیا دیا فیماں سے بے خبر جو خواب جواد کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ جواد کے منہ پر رکھا۔ تاکہ چیخنے کی آواز منہ سے نہ نکل سکے۔ اور خنجر والا ہاتھ بلند کیا۔

لیکن اس سے پہلے کہ اس پر وار کرتا..... معا جواد کی آنکھیں عجیب انداز میں کھل گئیں۔ اس کی پھرائی ہوئی آنکھوں میں جانے کیا بات تھی کہ قاتل کا خنجر والا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اور جواد ایک دم مشینی انداز میں

مسہری سے اٹھ بیٹھا۔

چاہتا تھا۔

صبح ہوتے ہی ایک لمبے پھل والا خنجر جواد کے کمرے سے ملا تھا۔ اس وقت مشتاق احمد کے ہاتھوں میں تھا، اور ان کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار پھیلے ہوئے تھے۔ جواد بھی ان کے قریب حیران و پریشان کھڑا تھا۔ یہ وہی خنجر تھا۔ جو گزشتہ شب دلاور کے پاس تھا۔ اور خوف کے مارے وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر وہیں گر گیا تھا۔

”اوہ میرا خواب سچا تھا۔ اس کا مطلب۔“ جواد حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”خواب کیا مطلب بیٹا.....“

”ابو میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ کوئی مجھے مارنے کے لئے میرے کمرے میں آیا ہے۔ اس قاتل کے پاس بالکل ایسا ہی خنجر تھا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ مجھ سے وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھا..... اور اپنا خنجر چھوڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کھل گئی تھی۔“ جواد نے اپنا خواب بیان کیا۔

اس کی بات سن کر مشتاق احمد مزید پریشان ہو گئے۔ وہ سوچنے لگے کہ ”کوئی پراسرار چکر ضرور ہے۔ کوئی جواد کی جان کے درپے ہے..... لیکن وہ کون ہے؟ اور کیوں جواد کی جان کا دشمن ہے؟ وہ کوئی خفیہ اور پراسرار طاقت ہے۔ جس نے جواد کو اب تک محفوظ رکھا ہوا ہے؟“ تاہم انہوں نے جواد کو ہوشیار رہنے کی تاکید کر دی تھی۔

”بیٹا اس بات کا ذکر ابھی ماں سے نہ کرنا..... ورنہ وہ پریشان ہو جائیں گی..... انہوں نے کہا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

☆.....☆.....☆

”جواد کو ختم کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“ چوہدری اسد پر خیال لیجے میں تدبیر طلب نظروں سے تندو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں اس وقت حویلی کے ایک کمرہ خاص میں موجود تھے۔ نندو نے بغور چوہدری اسد کی بات سنی اور دیر سے دیر سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ”جواد کو ختم کرنا جتنا آسان ہے اتنا ہی

انگلے ہی لمحے جواد کا چہرہ یکا یک خوفناک ہوتا چلا گیا۔ اور اس پر سیاہ رنگ کی دراڑیں سی پڑنے لگیں۔ جسے دیکھ کر قاتل بری طرح خوفزدہ ہو گیا اور فوراً دو قدم پیچھے کی جانب ہٹ گیا۔

اس نے دیکھا کہ جواد کے خوفناک چہرے پر بڑی بھیاں تک مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ تب اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی غراہٹ بھری آواز ابھری۔ ”آؤ بچھے مارو..... آؤ..... یہ خنجر میرے سینے میں پیوست کر دو۔“ اس کے ساتھ ہی جواد کا چہرہ اس کے شانوں پر لٹو کی طرح گھونسنے لگا..... دلاور یہ ڈراؤنا منظر دیکھ کر چیختا ہوا بھاگا۔ اس نے آؤ دیکھنا تاؤ..... اور کھڑکی سے باہر کو دیکھا..... اس کے بعد جواد کا چہرہ اپنی اصل صورت اختیار کر گیا۔ اور وہ پہلے کی طرح گہری نیند سو گیا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری اسد کے بھاری ہاتھ کا زور دار تھپڑ دلاور کے گال پر پڑا..... اور وہ چند قدم پیچھے کو لڑکھڑاتا چلا گیا..... ”لعلت وہ تجھ پر بزدل کی اولاد۔“ چوہدری اسد زور سے پھنکارتے ہوئے بولا۔ ”تجھے سمجھا کر بھیجا تھا، روح میں بھی اتنی طاقت نہیں آئی کہ وہ کسی کو نقصان پہنچا سکے۔ البتہ تیرے جیسے لوگ اگر اسی طرح ڈرنے لگے تو اس روح کو طاقت مل جائے گی۔ اور وہ ہم سب کا خون پی جائے گی۔ بے وقوف..... روح کو صرف چاندنی رات میں ٹھکتی مل سکتی ہے..... وہ جواد کی صورت میں خوفناک چہرے بنا کر خوفزدہ تو کر سکتی ہے۔ مگر اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کسی کا کچھ بگاڑ سکے..... اور تو نے بد بخت وہ موقع گنوا دیا..... مجھے اب ہر قیمت پر جواد کا مردہ جسم چاہیے۔ ورنہ میں تجھے مردہ کر دوں گا..... جواد جی ہو جا یہاں سے۔“

دلاور وہاں سے دم دبا کر چلا گیا۔ اور چوہدری اسد کے چہرے پر شدید تدبیر کے آثار پھیلتے چلے گئے۔ وہ ہر قیمت پر جواد کو چودہویں کی رات سے پہلے ختم کرنا

کے بعد اچانک بولا۔ کسی طرح جواد اگر دوبارہ حویلی میں آجائے تو میں خود ہی اسے ہلاک کر سکتا ہوں۔“ نندو کے لہجے میں ایسا ایک سیفا کی عود آئی۔

نندو کی بات سن کر چوہدری کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”لیکن نندو۔ جواد یہاں کیسے آئے گا ہو سکتا ہے کہ اس کے والد نے اس کے یہاں آنے پر پابندی لگادی ہو۔“

”لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔۔۔۔۔ کیونکہ جواد تمہاری بیٹی سے بہت محبت کرتا ہے۔۔۔۔۔ وہ اس کے کہنے پر یہاں ضرور کھنچا چلا آئے گا۔ بس تم کسی طرح سے اپنی بیٹی سے کہو کہ وہ جواد کو لے کر یہاں آئے۔“ نندو نے کہا تو چوہدری یکدم بولا۔ ”اس طرح اسے میری بیٹی کے ذریعے یہاں بلا کر تم اگر جواد کو ہلاک کرو گے تو کیا مون بدل نہ ہوگی۔“

”نہیں یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اپنا کام صفائی سے کرنا جانتا ہوں۔ ویسے چوہدری صاحب اگر اپنی جان بچانی ہے تو یہ سب کرنا ہی پڑے گا۔“ ٹھیک ہے نندو تم صحیح کہتے ہو، میں زیبا سے کسی بہانے جواد کو یہاں بلواؤں گا۔“ چوہدری نے خوش ہو کر کہا۔

☆.....☆.....☆

فضا اس وقت نرم آلودہ ہوا سے خشک ہو رہی تھی۔ دن کا وقت تھا۔ ایک جمیل کنارے سرسبز گھاس پر زیبا اور جواد ساتھ بیٹھے تھے۔ مگر ان کے متشکر چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوشگوار ماحول کی اثر پذیری سے یکسر بے نیاز تھے۔ قریب ہی زیبا کی شاندار جسمی کھڑی تھی۔ زیبا کچھ زیادہ ہی متشکر نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ جواد اسے گزشتہ شب کے اس واقعے سے آگاہ کر چکا تھا۔ کہ کوئی اسے قتل کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ ”جواد تم ایسا کرو وہ خیر جو تمہارے کمرے میں قاتل چھوڑ کر بھاگا تھا۔ وہ مجھے دکھاؤ۔“ مون نے جواد سے کہا۔

جواد کچھ چونکا اور مستغزائے اعزاز میں بولا۔ ”تم اس کا کیا کرو گی، اسے ابونے سن بیاں کر رکھا ہے۔“ جو مون نے آہٹ کیا چھوٹا سا قصبہ ہے۔“ اگر یہاں کہیں

مشکل بھی ہے چوہدری صاحب۔۔۔۔۔ نندو نے کہنا شروع کیا۔ ”آسان اس لئے کہ جواد کو کسی بھی وقت اور کسی بھی طریقے سے ہلاک کیا جاسکتا ہے اور اس کی ماں کی روح بھی طاقت کے زور پر اسے نہیں بچا سکتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ روح اپنے بیٹے جواد کو بروقت کسی ایسے طریقے سے صاف بچالیتی ہے کہ اسے ہلاک کرنے والا خود خونزدہ ہو کر بھاگ اٹھتا ہے۔ جیسا کہ دلاور کے ساتھ ہوا۔ حالانکہ اگر وہ اس کے خوفناک چہرے کی پرواہ نہ کرتا۔ اور وہ خنجر جواد کے سینے میں اتار دیتا تو اس کا بال بھی بیک نہ ہوتا۔ جواد بھی ہلاک ہو جاتا۔ اور تمہیں بھی اس روح سے نجات مل جاتی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، نندو، میں دلاور کو دوبارہ اچھی طرح سمجھا کر بھیجوں گا۔“ مجھے یقین ہے کہ وہ اس بار جواد کا ضرور کام تمام کر کے لوٹے گا۔“ چوہدری مضبوط اور پر امید لہجے میں بولا۔

”دلاور کو دوبارہ بھیجنے کی غلطی نہ کرنا چوہدری صاحب۔“ نندو نے کہا۔ دلاور کے ناکام واپس لوٹنے سے جواد اور اس کے والد ہوشیار ہو گئے ہوں گے۔۔۔۔۔ دلاور کو اگر تم دوبارہ بھیجو گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس بار ان کے ہتھے ہی چڑھ جائے۔“

”میں کسی سے نہیں ڈرتا نندو۔۔۔۔۔ اگر مجھے جواد کے ساتھ اس کے پورے خاندان کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا پڑا تو ہرگز دریغ نہیں کروں گا۔“ چوہدری بولا۔ ”پر سکون چوہدری صاحب!“ نندو اپنی گھنٹیوں کو سکیر کر بولا۔ ”یہ مت بھولو کہ تمہاری بیٹی زیبا جواد کو پسند کرتی ہے۔ اگر اسے پتہ لگ گیا کہ تم اس کے جان کے دشمن ہو تو۔۔۔۔۔“ اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

نندو کی بات سن کر چوہدری اسد کے چہرے پر گہری الجھن اٹھ آئی۔

”نندو پھر تم ہی متاؤ۔ کیا کیا جائے۔۔۔۔۔ چاندنی رات تو سر پر آن پہنچنے والی ہے۔“ چوہدری اسد کے لہجے میں اس بار لرزش تھی۔ موت کی لرزش۔۔۔۔۔

نندو چند طعنے کسی گہری سوچ میں غطلاں رہنے

یادیں

زندگی کے طویل سفر میں نہ جانے کتنے لوگ ملتے ہیں اور ٹھٹھرتے جاتے ہیں کچھ تمام عمر ساتھ رہنے کے باوجود بھی دل کو اچھے نہیں لگتے کچھ لوگ چند لمحوں کے ہمسفر ہوتے ہیں اور پہلی ملاقات میں دل پر چھا جاتے ہیں مگر ایسے دل پسند لوگ ہمارے نصیب میں کہاں وہ اپنی انمول یادوں کا خزانہ تجھے میں دے کر زندگی کی انجانی راہوں پر کھوجاتے ہیں مگر کبھی کوئی بات کوئی احساس یادوں کے تمام در پیچ کھول دیتا ہے ان کی پیار بھری باتیں یاد آتی ہیں وہ لمحے یاد آتے ہیں جو ان کے ساتھ گزارنے ہوتے ہیں۔

ٹپک پڑتے ہیں آنسو جب یاد تہاری آتی ہے
یہ وہ برسات ہے جس کا کوئی موسم نہیں ہوتا
(طاہر اسلم بلوچ - سرگودھا)

کے لئے کچھ تو بتاؤ، کیا تم نے اس خنجر کے مالک کو پہچان لیا ہے۔“ جواد نے کہا۔

”یہ میں تمہیں کل بتاؤں گی۔ ویسے یہ خنجر میں نے پہچان لیا ہے کہ کس کا ہے..... لیکن پہلے میں اپنے طور پر تسلی کرنا چاہتی ہوں، اس کے بعد میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ جس نے تمہیں ختم کرنے کی کوشش کی۔“

ایک ایک زبیا کی آنکھوں میں چنگاریاں کوندنے لگیں، غصے کی وجہ سے بہر حال زبیا اب جواد کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھی، اور جواد کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرتی ہوئی وہاں سے چلی آئی.....

زبیا اپنی حویلی پہنچی تو سخت تذبذب کا شکار تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ”آیا وہ اس خنجر کے بارے میں جو وہ جواد سے لے کر آئی تھی۔ کھلے بندوں اس شخص سے پوچھنے یا بھر سر دست خاموش رہے۔ اور حتماً انداز میں اس شخص کی مگرانی کرتی رہے۔“

کسی کا گرا ہوا برتن بھی میں دیکھ لوں تو مجھے پتا چل جائے گا کہ وہ کس گھر کا ہے۔ میرا پورا بچپن یہاں گزرا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں وہ خنجر دیکھ کر پہچان جاؤں کہ وہ کس کا ہے۔“

جواد زبیا کی بات پر ٹھٹھا۔ پھر وہ پرچوس لیجے میں بولا۔

”ارے سواہ..... تم تو پوری جاسوس نکلی..... مجھے بھی یقین ہے کہ تم ضرور اس خنجر کو دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچ سکتی ہو۔ تم ایسا کرو ابھی چلو میرے ساتھ۔ اسی بہانے تم میری امی ابو سے بھی مل لوگی۔ آخر تمہیں کبھی تو ان کے سامنے آنا ہے۔“

زبیا کے چہرے پر چند ثانے تردد کے آثار ابھرے..... پھر وہ راضی ہو گئی..... وہ دونوں حویلی پہنچ گئے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ سوائے حویلی کے پرانے خدمت گار دیو بابا اور حیدر کے..... جواد زبیا کو لئے اندر ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے حیرت سے بولا۔ لگتا ہے ابو اور امی کہیں گئے ہوئے ہیں۔“

”زبیا تم یہاں بیٹھو میں ابھی آیا۔“ یہ بول کر جواد تیزی سے بالائی منزل کی طرف بڑھا۔ دراصل بالائی منزل کا کمرہ اس کے والد کا تھا۔ اور اس کمرے میں خنجر موجود تھا۔

جواد نے جلدی سے الماری کھولی، پھر کپڑے میں لپٹے ہوئے خنجر کو احتیاط سے سنبھالے ہوئے نیچے زبیا کے پاس لے آیا..... زبیا نے خنجر کو بخور دیکھا۔ تو بری طرح چونک پڑی۔ جواد بھی اس کے بدلے ہوئے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

”کیا تم نے پہچان لیا یہ کس کا خنجر ہے؟“ جواد نے پوچھا۔

”زبیا حیرت اور اچنبھے میں مبتلا تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خنجر اور اس کے مالک کو پہچان چکی ہے۔ لیکن اس شخصیت کے بارے میں وہ متروک تھی۔ تاہم اس نے جواد کی بات کا چھوٹا سا جواب دیا۔ ”جواد کیا یہ خنجر تم مجھے دے سکتے ہو؟ بعد میں تم بے شک مجھ سے لے لین۔“

”ہاں تم بے شک اسے ساتھ لے جاؤ۔ لیکن خدا

کیفیت پر قابو پائے رکھا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے ابو اور نندو مل کر کسی سازش کے تانے بانے بننے میں ایک دوسرے کے شریک ہیں اور جواد کو جوہلی بلانا اسی سازش کی ایک کڑی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن پھر بھی زیبا نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تو اس کے ابو بولے۔ ”شاباش بیٹی، بس پھر جلدی سے اسے یہاں لے آؤ، کسی دن۔“ اور یہ سن کر زیبا اثبات میں سر ہلانے لگی۔

فیصلہ کن گھڑی آن پہنچی تھی۔ قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا تھا۔ اگرچہ اس میں جواد کی زندگی کو بھی خطرہ تھا۔ لیکن مستقل خطرناک اور جان لیوا صورت حال کا سامنا کرنے سے بہتر تھا کہ ایک ہی مرتبہ منٹ لیا جائے۔ زیبا نے نندو پر اب کڑی نظر رکھنا شروع کر دی۔ اس لئے کہ وہ خنجر بھی اسی کا تھا۔ جسے ایک دن زیبا جوہلی کے عقب میں بنے ہوئے اس کے کمرے میں دیکھ چکی تھی۔ بچپن میں نندو کو زیبا جادوگر چاچا کہا کرتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اسے کوئی روک ٹوک نہ تھی، اس کا شہاب یقین میں بدل گیا تھا کہ نندو اور اس کے ابو کی ملی بھگت سے ہی جواد کے لئے موت کی سازش تیار کی جا رہی ہے۔ اس کے پیچھے کیا راز تھا کہ وہ دونوں معصوم جواد کی جان کے کیوں درپے تھے۔ زیبا یہی سب معلوم کرنے کے لئے آخر ایک دن جواد کو لے کر اپنی جوہلی آن پہنچی۔

چوہدری اسد کی آنکھوں میں جواد کو دیکھ کر ایک خاص سی چمک لہرائی تھی۔ پھر وہ اس کے قریب آ کر رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ”دیکھو بیٹے جواد۔ گھبرانا نہیں تم پر ایک گندی بدروح کا سایہ ہے۔ وہ کسی بھی وقت تمہیں یا زیبا کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔“

اسی اثنا میں نندو بھی وہاں آن موجود ہوا وہ بغور جواد کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔ نندو کو دیکھتے ہی زیبا نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ زیبا اب نندو کو سخت ناپسند کرنے لگی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نندو کا کا تمہ کر دے۔

ادھر نندو بڑی عجیب نظروں سے جواد کو نگے جا رہا

پھر اسے اپنا دوسرا خیال زیادہ بہتر محسوس ہوا۔ کیونکہ وہ اس شخص کو خنجر کے حوالے سے پہچان چکی تھی۔ اور اسے سو فیصد یقین تھا کہ یہ خنجر اس شخص کا ہے۔ لیکن اگر اس نے صاف انداز میں اس سے خنجر کے بارے میں پوچھ لیا تو وہ نہ صرف صاف صاف مکر جائے گا بلکہ محتاط بھی ہو جائے گا۔ اور اس طریقے سے قاتل کو بے خبر رکھا جائے اور اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کی وہ کوشش کرے گی۔ اور پھر اس پر اسرار راز سے پردہ اٹھائے گی کہ آخروہ جواد کو کیوں قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی جواد سے کیا دشمنی ہے؟“ اسی اثنا میں چوہدری نے اسے اپنے پاس بلایا۔

”بیٹی زیبا تم نے دوبارہ جواد سے نہیں ملوایا۔ آخر تمہارا کیا پروگرام ہے۔ کیا تم واقعی اس سے شادی کے بارے میں سنجیدہ ہو۔“ چوہدری نے پوچھا تو نہ جانے کیوں زیبا کو اپنے باپ میں سازش کی محسوس ہوئی۔ کیونکہ اسے ابھی تک یاد تھا کہ جواد جب پہلی بار آیا تھا اور اس کے ابو سامنے آئے تھے تو ایک انتہائی ڈراؤنا واقعہ پیش آیا تھا۔ جس سے بری طرح خائف ہو کر اس کے ابو نہ صرف جواد کو دھتکار کر جوہلی سے نکل جانے کو کہا تھا بلکہ زیبا کو بھی جواد سے ملنے سے روکنا چاہا تھا۔ لہذا آج اپنے ابو کے منہ سے یہ سن کر کہ وہ دوبارہ جواد سے ملنا چاہتے ہیں۔ آخر کیوں؟ زیبا کو گہری سوچ میں غلطاں دیکھ کر چوہدری اسد نے دوبارہ قدرے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیٹی چپ کیوں ہو۔ جانتا ہوں میں اس کی وجہ..... سنو میری بات غور سے۔“ چوہدری اس چند لمبے توقف کر کے بولے۔ ”بیٹی جواد پر کسی بدروح کا سایہ ہے۔ اس میں جواد کا یقیناً کوئی تصور نہیں ہے۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہیں وہ تمہیں نقصان نہ پہنچادے۔ میں اس لئے اسے یہاں بلانا چاہ رہا ہوں۔ کہ اس پر سے بدروح کا سایہ اتارا جائے اور تم جانتی ہو کہ یہ کام نندو سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا۔“

اپنے ابو کے منہ سے نندو کا نام سن کر اچانک ہی زیبا کے اندر نفرت کا لاوا سا بجھنے لگا۔ تاہم اس نے اپنی

سایہ ہے۔ اور نندو اس سائے کو اس پر سے اتارنا چاہتا ہے۔ کیا تم نہیں چاہتی کہ جواد بدروح سے نجات حاصل کر لے۔“ چوہدری اسد نے درشت لہجے میں اسے سمجھایا۔

”مگر زیبا کو تو کسی اور ہی سازش کی بو آ رہی تھی۔ اچانک اندر سے جواد کی ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ جس نے زیبا کو سرتاپا لرزا کر رکھ دیا۔ پھر ایک تو اتر کے ساتھ جواد کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ جنہوں نے زیبا کا دماغ سنسنا کر رکھ دیا۔ اس نے پوری قوت سے دروازے کو دھکا مارا۔ تو دروازہ اندر کو گرتا چلا گیا اور خود زیبا اندر جا گری۔

اندر کا منظر دیکھتے ہی وہ دھک سے رہ گئی۔ نندو جواد کی گردن اپنے ہاتھوں سے دبوچے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر زیبا جیسے ہانگل ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی دائیں ٹانگ کی ایک بھر پور ضرب نندو کے پہلو میں رسید کی تو اگلے ہی لمحے نندو کے حلق سے تیز چیخ ابھری اور فوراً ہی جواد کی گردن اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ زیبا نے اس پر بھی بس نہ کیا۔ اس پر تو جیسے جنون سوار ہو چکا تھا۔ ادھر نندو اس اچانک صورت حال پر ششدر رہ گیا تھا۔ وہ زیبا کو خونی نگاہوں سے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر کھٹکھٹکیا.....

”چوہدری صاحب یہ..... یہ آپ کی بیٹی کو کیا ہو گیا ہے.....“ مگر اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ کیونکہ زیبا نے اسے ایک اور زوردار ٹھوکر مار دی تھی۔

”میں..... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی.....“

زیبا پر جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ مگر عین وقت پر چوہدری اسد بیچ میں آ کر اپنی بیٹی کو سنبھالتے ہوئے چلا کر بولے۔ ”ہوش میں آؤ زیبا، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”میں ابو یہ جواد کو مارنے لگا تھا۔“ زیبا ہانپتے ہوئے بولی۔ پھر جواد کی جانب متوجہ ہوئی، جو اپنا کلا دھیرے دھیرے مسل رہا تھا۔ ”تم ٹھیک تو ہو جواد۔“

لگا ہوا لگا ہوا ہاتھ اپنے وہ لگا ہوں ہی نگاہوں میں جواد کو اپنے نالک لٹا چاہتا ہو۔ پھر نندو ہولے سے جواد کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”جواد آؤ میرے ساتھ۔“ یہ لہجہ ہی نندو واپس مڑا تو پاس کھڑی زیبا نے دیکھا کہ وہ اس کی مشینی انداز میں حتیٰ کہ اس سے بھی لا تعلق ہو کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا نندو کے پیچھے ہویا۔

”زیبا نے چونک کر جواد کو آواز دی تو چوہدری اسد نے فوراً ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لیکن جواد کو اس طرح بے یار و مددگار نندو جیسے مکار فاضل کے رحم و کرم پر زیبا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ لہذا وہ اپنے والد کی پرواہ کئے بغیر جواد کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ تو غصے سے اس کے ابو چلائے۔ ”زیبا رگ جاؤ۔ نندو کو اپنا کام کرنے دو۔“ لیکن زیبا اپنے ابو کی بات نظر انداز کرتی ہوئی جواد کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ نندو اپنے پیچھے جواد کو لئے ہوئے حویلی کے عقب میں بنے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آ گیا۔

زیبا نے بھی اندر داخل ہونے کی کوشش کی مگر وہ یہ دیکھ کر بری طرح چونک گئی کہ جواد نے مکمل ٹرانس کی حالت میں کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر زیبا زور زور سے دروازہ پٹنے لگی۔ ”جواد جواد دروازہ کھولو۔ یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو تم، نندو تمہیں جان سے مار دے گا۔ دروازہ کھولو..... جواد.....“ مگر اندر سے کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی۔

تھوڑی دیر میں ہی دوڑتے ہوئے چوہدری اسد وہاں آن دھمکے، وہ غصے میں پھرے نظر آ رہے تھے، مگر زیبا نے ان کی بھی ذرا پرواہ نہ کی۔ اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”ابو..... ابو“ خدا کے لئے نندو سے کہیں کہ وہ جواد کو چھوڑ دے..... وہ اسے اندر لے گیا ہے۔“

اور پھر زیبا پر اچانک دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ صورت حال یوں اچانک ہی پلٹا کھا جائے گی، خود کو سنبھالو زیبا یہ کیا بچکانہ پن ہے۔ جواد پر بدروح کا

مارنا چاہتے ہو؟“

”بولو۔۔۔۔۔“ مشتاق احمد چند قدم آگے بڑھ کر پستول

والا ہاتھ ہلاتے ہوئے درشت لہجے میں بولے۔

”اجنبی چند لمحے تذبذب کا شکار رہا پھر بولا۔

”صاحب۔۔۔۔۔م۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ اگر میں نے

آپ کو بتادیا تو چوہدری مجھ سمیت میرے پورے

خاندان کو مار دے گا۔“

”اگر تو نے میرے سامنے زبان نہ کھولی تو میں بھی

تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مشتاق احمد نے پھنکارتے اور

اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے

کہا۔ ”اسی میں ایک تیری بھلائی ہوگی کہ اگر تو مجھے سب

کچھ سچ بتا دے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ تو میں کوئی ایسی

صورت نکال لوں گا کہ تیری جان بچ جائے۔“ یہ سن کر

اجنبی قاتل کے چہرے پر رضامندی کے تاثرات

ابھرے پھر وہ بتانے لگا۔ ”میرا نام دلاور ہے۔“

چوہدری اسد اپنی حویلی میں بیٹھا دلاور کا منتظر تھا۔

جسے اس نے تندو کی جانب سے جواد کو ہلاک کرنے کے

سلسلے میں ناکامی پر پھر دوبارہ جواد کو قتل کرنے کے لئے

بھیجا تھا۔۔۔۔۔ اور زیبا باپ سے ناراض ہو کر نہ جانے کہاں

چلی گئی تھی۔ چوہدری جانتا تھا کہ زیبا خود ہی ایک دوروز

میں لوٹ آئے گی۔ لہذا اس سلسلے میں اتنی پریشانی کی

بات نہ تھی۔

ایک ملازم نے آ کر چوہدری کو اطلاع دی کہ

مشتاق احمد آئے ہیں۔ یہ سن کر چوہدری اسد کے ذہن

میں ایک جھماکہ سا ہوا، کئی خیالات اس کے اندر گڈمڈ

ہونے لگے۔ تاہم اس نے ملازم سے مشتاق احمد کو اندر

آنے کا کہہ دیا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ مشتاق احمد جواد کے

والد ہیں، لہذا وہ سوچنے لگا کہ ”آخروہ یہاں کیا کرنے

آئے ہیں۔“

اتنے میں مشتاق احمد اس کے سامنے آن موجود

ہوئے اور آتے ہی بولے۔ ”چوہدری صاحب آپ کی

جاگیر میں میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ کسی ظالم نے میرے

بچے جواد کو قتل کر دیا ہے۔ میں اسے دفن کر آیا ہوں۔“

”ہاں میں ٹھیک ہوں، وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔

”ابوندو کو کہیں کہ یہاں سے چلا جائے۔ ورنہ۔“

زیبا غصے سے بولی۔ اور چوہدری اسد نے موقع کی نزاکت

کو سمجھتے ہوئے تندو کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔

☆.....☆.....☆

مشتاق احمد بالائی منزل کے کمرے سے باہر کا

جائزہ لے رہے تھے۔ رات کے تقریباً ایک بجے کا عمل

ہوگا کہ اچانک ان کی نگاہ اپنے بیٹے جواد کے کمرے میں

کھلنے والی کھڑکی پر پڑی، کوئی انسانی ہیولہ نقاب لگا کر

آگے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مشتاق احمد کا دل دھڑکتا ہوا

محسوس ہوا۔ انہوں نے بجلی کی تیزی کے ساتھ اپنی جیب

سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑا۔ تین دن کی نگرانی کے

بعد آج انہیں اپنی محنت باآرہوئے کی امید ہونے لگی۔

انہیں جواد کی طرف سے اطمینان ہوا کیونکہ انہوں نے

اس دن کے بعد سے جب اس پر حملہ ہوا تھا۔ جواد کا کمرہ

بدل دیا تھا۔ البتہ اس کے کمرے میں بستر پر چادر اور نیکیے

ملا کر یوں رکھ دیئے تھے جیسے کوئی سو رہا ہو۔

خیر دے قدموں چلتے ہوئے مطلوبہ کمرے کے

دروازے کے قریب پہنچ کر جھری سے آنکھ لگائی۔ کیا

دیکھتے ہیں کہ وہ ہیولہ جواد کے بستر کی جانب بڑھ رہا

ہے۔ اسی اثنا میں مشتاق احمد آہستگی سے دروازہ کھولنے

لگے ان کی پہلی کوشش یہی تھی کہ فائر کئے بغیر اسے قابو

کر لیں۔ تاہم کسی خطرے کے پیش نظر انہوں نے پستول

تھامے رکھا۔ ادھر وہ اجنبی مسہری کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اور اس کی ساری توجہ بستر کی جانب ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ

مشتاق احمد کو اندر داخل ہوتے دیکھ نہ سکا۔ جو کہ اب

دروازہ کھول کر اندر آ چکے تھے۔

”خبردار حرکت مت کرنا، ورنہ بھون کے رکھ دوں

گا۔“ اجنبی مشتاق احمد کے ہاتھوں میں پستول دیکھ کر اپنی

جگہ دم بخود رہ گیا۔۔۔۔۔

”میں اپنے بیٹے کے دشمن سے کسی طرح کی بھی

رعایت سے کام نہیں لوں گا، تمہاری بھلائی اسی میں ہے

کہ مجھے سچ بتاؤ کہ تم کون ہو اور کیوں میرے بیٹے کو

اب چوہدری اسد مطمئن ہو گیا تھا۔ اور مشتاق احمد بھی اطمینان سے واپس حویلی لوٹ آئے تھے۔
ادھر جواد کو بھی اصل حقیقت سے آگاہی ہو چکی تھی۔ اسے اب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ مشتاق احمد کا بیٹا نہیں، وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ کن دردناک حالات میں وہ مشتاق احمد کو ملا تھا۔ اور اپنی ماں کنول کے اوپر ہونے والے ظلم پر بھی اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لیکن وہ ایک باحوصلہ نوجوان تھا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری اسد اس بات پر حیران تھا کہ آخر دلاور اپنا کام کر کے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ پھر وہ یہ سوچ کر خود ہی مطمئن ہو گیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی چند روز کے لئے کہیں غائب ہو گیا ہو۔

اس رات چودھویں کا چاند بھرپور انداز سے منحنی آباد پر اپنی چاندنی نچھادر کر رہا تھا۔ گاؤں کے تمام بایسویں کو نہ جانے کیوں آج رات کا چاند زبردست جو بن پر محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج چاند کی آخری رات ہو۔ تمام لوگ آج وقت سے پہلے ہی سو گئے تھے۔

ادھر مشتاق احمد پر اس وقت انتہائی عجیب و غریب کیفیت طاری تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ آج کی رات خوبی اور پراسرار ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا ہے۔ لیکن کیا یہ سب ممکن ہوگا۔ وہ یونہی آہستگی سے چلتے ہوئے جواد کے کمرے میں آئے تو انہوں نے اسے گہری نیند میں ڈوبا ہوا دیکھا۔ ان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کسی بھی لمحے پراسرار کھیل کی ابتدا ہونے والی تھی۔ اور وہ یہ سب اپنی جابجائی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ معائن پر غنودگی کے حملے ہونا شروع ہو گئے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ وہ نہ سوئیں۔ مگر چند لمحوں بعد ہی وہ بھی نیند کی وادیوں میں اترتے چلے گئے۔

باہر چاند اپنے جو بن پر تھا۔ ٹھنڈی ہوا ہر گد کے پتوں کے درمیان سے جب گزرتی تو پتے پر اسرار

مشتاق احمد بدستور غم سے ڈوبے ہوئے لہجے میں بولے۔
مشتاق احمد کی آہ وزاری سے چوہدری اسد کو سکون محسوس ہوا اور وہ خاصا مطمئن و مسرور ہوا۔ اب وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ دلاور نے اپنا کام خوش اسلوبی سے کر دیا تھا تاہم وہ بڑے درشت لہجے میں بولا۔ ”تو میں کیا کروں۔ کوئی تھانیدار ہوں۔ میں یہاں کا۔ پھر بھی چونکہ یہ سب میری جاکیر میں ہوا ہے۔ اسی لئے میں تمہاری مدد کی کوشش کروں گا۔ تم جاسکتے ہو۔ میرے آرام کا وقت ہو رہا ہے اب۔“ یہ کہہ کر وہ بڑے پر غور انداز میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

”ظالم تو بہت جلد اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔“
مشتاق احمد نے چوہدری اسد کے وہاں سے جاتے ہی دل میں سوچا اور وہاں سے لوٹ آئے، ان کی چال کامیاب رہی تھی، کیونکہ انہوں نے دلاور سے سب کچھ اگلا کر اسے اپنی حویلی کے ایک کمرے میں قید کر دیا تھا، اور اس سے کہا تھا کہ ”چاندنی رات میں جب ظالم چوہدری کنول کی بے چین روح کے انتقام کا نشانہ بن جائے گا تو وہ اسے جھوڑ دیں گے۔ دراصل دلاور کے ذریعے انہیں اصل حقیقت کا علم ہو چکا تھا کہ چوہدری اسد کیوں ان کے بیٹے جواد کی جان کا دشمن ہے۔

اگرچہ انہیں ان ساری باتوں پر مشکل ہی سے یقین آیا تھا۔ لیکن گزشتہ حالات و واقعات کی روشنی میں انہیں یہ سب درست ہی نظر آ رہا تھا۔ جواد کی اصل ماں.....
کنول آج سے بیس سال قبل انتہائی جان کنی کے عالم میں جواد کوڑھ پتا چھوڑ کر چوہدری اسد کے عبرتناک ستم کا نشانہ بن کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اور اب اس کی بے چین روح اپنے بیٹے کے جسم کی طاقت حاصل کر کے چوہدری سے اپنے اوپر کئے گئے ظلم کا بدلہ لینا چاہتی تھی..... اور یہ سب چاند کی چودھویں رات کو ہی ممکن تھا۔ جس میں اب ایک دن رہ گیا تھا۔

لہذا ان سب باتوں کے تناظر میں مشتاق احمد نے اب یہ چال چلی تھی کہ چوہدری اسد کو چاندنی رات سے پہلے ہر ممکن طریقے سے قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ لہذا

تماشائیوں کی طرح تالیاں پیٹتے ہوئے محسوس ہوتے۔ جواد گہری نیند میں تھا کہ معا ایک سفید روشن لکیر فضا میں تیری ہوئی اس کی ناک کے راستے جسم میں اتر گئی۔۔۔۔۔۔ جواد نے لیٹے لیٹے یکدم اپنی آنکھیں یوں کھول دیں۔ جیسے بجلی کا سوچ اچانک ہی آن کر دیا گیا ہو۔ پھر وہ مسہری سے اٹھ کر یوں چل دیا۔ جیسے کسی نے اس کے جسم میں بجلی بھردی ہو۔ وہ بلا خوف و خطر ننگے پاؤں حویلی سے باہر آ گیا۔ اب اس کا رخ چوہدری اسد کی حویلی کی جانب تھا۔

ادھر چوہدری اسد اپنے کمرے کی شاندار مسہری پر گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک کسی کھٹکے کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے جواد کسی زندہ لاش کی طرح کھڑا اسے انگارہ برساتی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ چوہدری اسد کی جواد کو دیکھ کر کھسکی بندھ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کنول کی روح اس سے انتقام لینے آ چکی ہے۔ اتنے میں جواد کا چہرہ یکا یک تیز روشنی میں جیسے نہا گیا۔ اور آنکھیں پھیل کر سرخ انگارہ سی بن گئیں۔ جواد کے حلق سے فرفرائی ہوئی خوفناک آواز چیخ کی صورت میں برآمد ہوئی کہ اتنے میں چوہدری اسد پاگلوں کی طرح چلاتے ہوئے نند کو آواز سن دینے لگا۔

”اے چیخ۔۔۔۔۔۔ اور چیخ۔۔۔۔۔۔ چوہدری۔۔۔۔۔۔ آج تیری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔“ کنول کی روح جواد کے جسم سے بول رہی تھی۔ اب جواد کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل کر چوہدری کی طرف بڑھیں اور پھر چوہدری فرش سے اوپر کواٹھنے لگا، وہ ہوا میں معلق ہو گیا، اس کی زبان لمبی ہو کر باہر نکل پڑی اور آگے کو بڑھ کر چوہدری کے چہرے پر تنگ گئی پھر چوہدری کی دردناک اور کرناک آواز کمرے کی فضا کو منتشر کرنے لگی۔ چوہدری کی تکلیف ناقابل برداشت اور اذیت سے پر تھی، پھر چوہدری کی زبان سمٹ کر اصلی حالت میں آ گئی تو اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ”مجھے معاف کر دو معاف کر۔“

”نہیں چوہدری تو۔۔۔۔۔۔ تو اس سے بھی زیادہ سزا کا مستحق ہے یہ سزا تو تیرے لئے کچھ بھی نہیں۔ کنول اپنا چہرہ چوہدری کے سینے سامنے لے آئی اور غراتے ہوئے



دل کا خون

احسان بحر سمیا نوالی

نوجوان کو ایک دن خبر ملی کہ موت بہت قریب آگئی ہے، اس حقیقت کو جان کر نوجوان بپھر گیا، اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں وہ چیخ پڑا، کیا محبت پر میرا کوئی حق نہیں محبت دور چلی گئی اور میں.....

آرزو، تمنا اور خواہش کے لباوے میں لپٹی ہوئی دل کو ریزہ ریزہ کرتی حقیقت پر مٹی رو داد

لکھا جائے۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے، کے خبر کر آنے والے وقتوں میں جو منصوبہ بنارہا ہے وہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

لیکن افسوس کہ حالات نے یوں ٹھوکروں میں رکھا کہ کبھی سر کی طرف نظر ہی نہ گئی۔ یوں وقت کے پاؤں میں پڑے سکتے رہے کہ کہیں سے چند بوند زندگی نصیب ہو، مگر لمحوں نے اپنے گزرنے کے نقش ہمارے

زندگی کے آخری ایام میں سفید چادر والے بستر پر لیٹ کر اپنے ماضی کے جھروکوں میں جھانکنا اور پھر اندھیرے میں کھوجانا کس قدر کرب ناک ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے، میں ملک کا ایک گمنام رائٹر ہوں جو ساری زندگی اسی تنگ دود میں لگا رہا کہ خون دل سے فقط اک ایسا شہ پارہ تخلیق کر جاؤں کہ اس دنیا سے جانے کے بعد بھی ادب میں میرا نام جلی حروف میں

بچپن شہر کے فٹ پاتھوں کی زینت رہا کوڑے کے ڈھیر پر پلنے والے بچوں کو نرم گرم بستر کہاں نصیب ہوتے ہیں، سنا کرتے تھے کہ انسان کی زندگی کا ایک حصہ دکھ میں ایک حصہ مشقت میں اور ایک حصہ سکھ میں گزرتا ہے، خود پر غور کرتا ہوں تو میرا شمار کون سے انسانوں میں ہوتا ہے، جن کی فضا ساری زندگی دکھی ہی دکھی رہی۔

باندھ دیا جائے، اس کو محدود کر دیا جائے تو کچھ ہی عرصے میں نقصان زدہ ہو جاتا ہے کسی جو ہڑکی طرح، اور میں اپنے دماغ کے سچ کو متعفن ہونے سے بچانا چاہتا تھا۔ سو کاغذ تو کا لے کر تار بالیکن پھر اس کی تشہیر کرنا بند کر دی۔

انہی دنوں ملک کے نامور رسالے کی طرف سے مجھے لکھنے کی آفر ہوئی، اس رسالے کے لئے میں نے تقریباً بارہ کے قریب مختصر افسانے لکھے۔ جنہیں بعد میں کتابی صورت میں اسی ادارے کی طرف سے شائع بھی کیا گیا اور وہ کتاب میری زندگی کی بہت بڑی پہلی اور آخری خوشگوار تہذیبی کا شاخسانہ تھی۔

بہت عام سے دنوں میں سے ایک دن وہ بھی تھا۔ جب میں کافی دیر سے بے مقصد سڑکوں کی خاک چھاننے کے بعد اپنے فلیٹ کی طرف آیا تو سیڑھیوں پر ایک ڈاکو نے دانستہ روک لیا۔

”آپ ہی احسان صاحب ہیں.....؟“

”جی ہاں۔“

”جناب آپ کا خط۔“

”میرا خط اور.....“ میں حیرت زدہ تھا کہ آج تک میرا کوئی خط یوں گھر کے پتے پر نہیں آیا تھا.....
حیران ہونا قدرتی بات تھی۔

”جی جناب تو پر تاب صبح رسالے کے دفتر گیا تھا، انہوں نے گھر کا پتہ بتا دیا کہ آپ کافی دنوں سے وہاں گئے نہیں تھے۔“

”اچھا!“ میری حیرت قدرے کم ہو گئی۔ ڈاکیہ خط تھا کر چلا گیا، میں بیڑھیاں چڑھ کر اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ بینڈ رائٹنگ قطعی ابھی تھی۔ لفافہ کھولا تو مختصر سا مضمون لگا ہوں کے سامنے تھا۔

محترم، احسان سحر!

آپ کی چند تحریریں نگاہوں سے گزریں، بلاشبہ اپنی مثال آپ تھیں، لیکن مجھے ”رہبر عشق“ سب سے زیادہ خوب صورت لگی۔ لیکن میں اس کے اختتام سے کچھ مطمئن نہیں ہوں۔ وارث کی موت دکھا کر تو آپ نے محبت کو سرنگوں کر دیا، کیا آپ کے خیال میں

کیا دیا اس زندگی نے مجھے، ایک بے کار بے
معروف وجود ہی رہا ہوں میں سب کے لئے، میں کبھی
بھی تو کسی کے لئے بہتر نہیں رہا۔

قرطاس میرے لئے شطرنج کی بساط تھی اور لفظ میرے، چالیں بدل بدل کر دلچسپ کھیل کھیلتا میرا مشغلہ تھا اور یہ لفظ ہی تو تھے جو میری تنہائی کے ساتھی تھے۔ جب میں اپنے جنگ و تار یک ایک کمرے میں فلیٹ کی بالکونی میں تنہا بیٹھا ہوتا تو یہ لفظ میرے سامنے غلاموں کی طرح سر جھکائے آ جاتے تھے۔ تقاضا کرتے تھے کہ ان سب کو جمع کروں اور ایک نئی تخلیق بنا دوں۔ شروع شروع میں میری تحریریں عام قاریوں کی ذہانت سے متصادم ہوتی تھیں۔ ایک بار ایک رسالے کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا۔

”احسان صاحب آپ وہ تھیں جو عام لوگوں کی سمجھ میں بھی آ سکے اور ان کی دلچسپی کا سامان بھی ہو.....“

”یعنی.....“ میں نے انڈیٹر سے کہا۔

”یہی جو عام سے موضوعات ہوتے ہیں، جیسے عشق و محبت، گھریلو معاشرتی کہانیاں۔“

”یعنی میں قلم پر پہرے بیٹھا دوں۔ وہ لکھوں جو لوگ چاہتے ہیں۔ معاشرے کے ناسور بننے اور کھولنے دوں۔ ان ننگوں معاشرے کے اپانچ پن کو دیکھ کر بوتلی طرح آنکھیں بند کر لوں۔“

جناب! قلم بہت مضبوط ہتھیر ہے۔ مجھے اس کا صحیح استعمال کرنے دیں۔“

میں اپنے سلسل زوہ فلیٹ میں بیٹھا مسلسل کھول رہا تھا۔ دراصل جو جھوٹا ہوتا ہے ناں وہ چشمے کے شفاف پانی کی طرح ہوتا ہے، پھوٹتا رہتا ہے، اگر اس پر بند

کردار کے ساتھ انصاف ہوا ہے.....؟

دراصل کامیابی کا وہ زینہ تھا، جس پر چڑھ کر میں اپنا خواب پاسکتا تھا، شگفتہ دوسری لڑکیوں سے قطعی مختلف تھی سب سے الگ سب سے منفرد، سب سے کہیں زیادہ حساس اور سلجھی ہوئی، اسے میرے ایک کمرے کے سلن زدہ فلیٹ میں بھی میرے ساتھ رہنا گوارا تھا۔ لیکن میرے نصیب میں تو ٹھوکریں تھیں۔ بھلا مجھے کہاں چند لمحے کی محبوب کی زلفوں کے سائے تلے سستانے کی مہلت مل سکتی تھی۔ کچھ لوگوں کی ساری زندگی مسافت میں ہی نکلتی ہے۔ گھر سے نکلتے ہیں تو سفر ہی سفر درپیش ہوتا ہے۔ ایک خوش فہمی سی ہوتی ہے کہ منزل پر پہنچ گئے ہیں لیکن جب غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ منزل کہاں ہم تو ابھی تک وہیں ہیں، جہاں سے چلے تھے۔

شگفتہ کا قلمی بیک گراؤ نہ تھا، وہ میری طرح تنہا نہیں تھی، بھرے پرے کنبے کی فرد تھی، وہ مجھے بتایا کرتی تھی کہ احسان مجھے اپنے گھر میں سوائے ماں کے اور کوئی نہیں سمجھتا، سو جب اس نے اپنی امی سے میرے بارے میں بات کی تو وہ مان گئیں۔ لیکن اس کے سب گھر والے میری مخالفت میں ڈٹ گئے۔

”شگفتہ کا رشتہ اس لڑکے سے کرنے سے بہتر ہے کہ ہم شگفتہ کو فٹ پاتھ پر بیٹھا دیں، بھلا یہ کیا دے سکتا ہے، اسے؟ اور کیا ہے اس کے پاس؟“

میں نے خود پر غور کیا اور ہاں واقعی کیا دے سکتا ہوں، میں شگفتہ کو، محبت اور صرف محبت، اور یہ تو کوئی بھی دے سکتا ہے۔ اسے زندگی کے سکھ اور خوشیاں تو نہیں دے سکتی ناں۔ ”مجھے اپنی ذات ایک بے وقت پتھر سے بھی زیادہ بے قدر لگی، محبت کی جس مندر پر مجھے شگفتہ نے بیٹھا کر میری پرستش کی تھی، اس کے بڑوں نے مجھ سے ورثہ وہ مقام چھین لیا۔

یکدم اتنی اونچائی سے پستی میں گر جانا اور میرا دل ٹوٹ کر کئی حصوں میں بٹ گیا۔ میں نے شگفتہ کی خوشیوں کی خاطر کئی پلان بنائے تھے۔ اگر وہ میری زندگی میں آجاتی تو تمام عمر اس کی آنکھوں کو ترستی۔ اس کے ہونٹ ہر ہل مسکراہٹ سے آشکار ہتے، لیکن میری ساری

شگفتہ جبین

وہی صنف نازک کی نازک آمیز سوچ ”یہ لڑکیاں ہمیشہ سب اچھا ہے“ ہی کیوں چاہتی ہیں؟ خیالوں کی جنت میں رہنے والیاں یہ نہیں جانتی کہ زندگی خواب نہیں ہے، سچی تو جب اس زندگی کے سیاہ تاریک پہلو سے آشنا ہوتی ہیں تو ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں۔“

میں نے خط پڑھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ ایک دو دن بعد یونہی خیال آیا کہ کیوں نہ خط کا جواب دیا جائے اور پھر میں نے بھی چند الفاظ تحریر کر کے ڈاک کے سپرد کر دیئے۔

محترمہ شگفتہ جبین صاحبہ!

سلام مسنون! آپ کا خط ملا پڑھ کر خوشی ہوئی کہ میری تحریریں آپ نے پڑھیں، رہی بات ”رہبر عشق“ کی تو اس کا اس سے بہتر اینڈ میرے ذہن کے گوشے میں نہیں تھا۔ وارث کا مرثیہ محبت کو سرنگوں نہیں سرخرو کر گیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ محبت کی انتہائی کیفیت تھی جس میں اس نے یہ قدم اٹھایا اور یہ اس کے جذبول کے خالص پن کی دلیل بھی تھی۔

’خیر اندیش، احسان‘

یوں خط و کتابت کا ایک سلسلہ چل نکلا، پہلے ایک دوسرے سے مانوسیت ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ الفت محبت میں بدلتی چلی گئی، بہت ہی قلیل وقت میں ہم نے صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا لیکن بہت اچھی طرح جانتے تھے، سوز زندگی کا اہم ترین فیصلہ ہم نے ایک دوسرے کے حق میں کیا، میں تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ سو شگفتہ کا وجود مجھے جیسے کا بہانہ لگا۔ ان دنوں میں نے اپنے نہایت ہی عزیز دوستوں کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ ہر انسان کی زندگی میں ایک مخلص ساتھی بھی شامل ہو جائے تو اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔

شگفتہ کی محبت میرے پاس موجود گئی چنی چنی محبتوں میں سب سے زیادہ اہم اور انمول تھی، اس کا ساتھ ہی

سوچیں یک لخت وقت کے بھنور میں ڈوب کر رہ گئیں اور خواب خس و خاشاک کی مانند بکھر کر رہ گئے۔

اس شب اس کے لکھے ہوئے خطوں کو جلاتے ہوئے میں نے اپنے اندر کے رائٹر کو بھی ختم کر دیا۔ مار دیا اس احسان سحر کو جو کبھی رستے ہوئے تاسوروں کا علاج کرنا چاہتا تھا۔ توڑ دیا وہ قلم جو انقلاب لانا چاہتا تھا۔ ساری دنیا سے روٹھ گیا۔

کیا محبت پر میرا کوئی حق نہیں، میں نے کیا گناہ کیا ہے جس کی سزا انتہائی کی صورت میں مجھ پر مسلط ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک کسی آنکھ میں اپنے لئے محبت نہیں دیکھی۔ مجھے ہمدردی نہیں محبت چاہئے تھی۔ اور وہ محبت میرے اتنے قریب آ کر مجھ سے دور چلی گئی۔ دنیا نے مجھ سے میرا واحد جینے کا سہارا چھین لیا۔ کئی دن یونہی فلیٹ میں بند رہا۔ گھٹ گھٹ کر جیتا رہا کہ بزدل تھا۔ خودکشی نہیں کر سکتا تھا مگر موت کا انتظار تو کر سکتا تھا۔ سو وہ میں نے کیا۔

میری زندگی میں اس قدر اندھیرے تھے کہ روشنی کی واحد کرن کو نگل گئے، شگفتہ کسی اور کے آنگن کا چاندنی توجس کی تھی اس کے آنگن میں روشنی پھیلا رہی تھی اور میں پچھلے تین سالوں میں تنہا اپنی زندگی کے اندھیروں کے ساتھ نبرد آزما تھا کہ ایک دن خبر ملی کہ موت بہت قریب آ گئی ہے۔ دل نے ایک عافیت سی محسوس کی۔ ایک دن یونہی تنہا پارک کے ایک گوشے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا کہ کسی نے مجھے پکارا۔

”احسان۔“ آواز مانوس تھی سو میں نے پلٹ کر دیکھا، سامنے ہی میرا ایک پرانا دوست عادل کھڑا تھا۔ ”عادل۔“ میں نے جواب میں یقین دہانی چاہی تو وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

”کہاں رہتا ہے یار تو؟“ اس نے بے تعلقی سے میرا ہاتھ تھا ہاتھ ایک دم چونک اٹھا۔

”ارے تجھے تو بہت تیز بخار ہے، چل میرے ساتھ الٹرے پاس۔“

”ارے ہارمہ! وہی خود ہی لہیک ہو جائے گا۔“

تم بتاؤ کیسے ہو.....؟“

”باقی باتیں بعد میں پہلے تم چلو ڈاکٹر کی طرف.....“

اور پھر ضد کر کے مجھے وہ ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

”کثرت سگریٹ نوشی سے ان کے پیچھے دے ختم ہو چکے ہیں اور آپ کے دوست ہڈیوں کی کئی بلی کا شکار ہیں، مرض خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے ان کا فوری طور پر ہسپتال میں ایڈمٹ ہو جانا ہی ان کے لئے بہتر ہے گا۔“ نسخہ لکھ کر عادل کو پکڑاتے ہوئے ڈاکٹر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ عادل نے نہایت ہی افسوس بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور مجھے لے کر کلینک سے باہر آ گیا۔

”احسان کیا تم اتنے بے خبر تھے؟“ لہجے میں سوال سے زیادہ شکایت تھی۔

”نہیں۔“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

”پھر تم نے اپنی طرف سے لاپرواہی کیوں برتی.....؟“

”اس لئے کہ زندگی کے دامن میں میرے لئے کچھ نہیں، نہ تھا نہ ہے اور نہ ہوگا، پھر فائدہ۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

اس دن تو عادل مجھے فلیٹ چھوڑ گیا تھا۔ لیکن بعد میں وقفے وقفے سے میری خبر گیری کو آتا رہتا۔ دواؤں کا خرچ بھی اسی نے اٹھا رکھا تھا۔

ایک دن جب وہ آیا تو میں کھانسی کے مارے نڈھال ہو رہا تھا۔ بستر کی چادر اور خود میرے کپڑے خون سے بھرے پڑے تھے۔ اس دن اس نے میری ایک نہ سنی اور لی بی گینی ٹوریم میں مجھے ایڈمٹ کروادیا۔ مجھے آج یہاں آئے ایک ماہ ہو گیا ہے۔ بستر علالت پر پڑا موت کا منتظر، میں اکثر سوچتا ہوں کہ ”کچھ لوگوں کے دلوں کی سر زمین ہمیشہ غمخیزی کیوں رہتی ہے۔“





بے گناہ

رضوان بھٹی - محراب پور

عامل کے مٹھی کھولتے ہی مٹھی سے ہانی کے چند قطرے نکلے اور سامنے وجود پر پڑے تو اس وجود کی فک شگاف چیخیں در و دیوار کو دھلانے لگیں اور پھر اس وجود سے دھواں اوپر کو اٹھا اور غائب ہو گیا اور پھر ایک منظر رونما ہوا۔

خواہ مخواہ دوسروں کو پریشان کرنے والے خود بھی کہیں کے نہیں رہتے۔ حقیقت کہانی میں ہے

پر نہیں آباد پہنچ گیا۔ کہنی کا عمل عمل پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ ان لوگوں میں سے کچھ اس کے شناسا تھے اور کچھ نئے بھرتی ہوئے تھے۔ ”آپ سب لوگ میری بات دھیان سے سنئے.....!“ اس نے سب کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرا نام واحد علی ہے۔ اس پروجیکٹ کی تکمیل تک ہم سب ساتھ رہیں گے۔ ساتھ کام کریں گے، لیکن

وہ پیسے کے حساب سے انجینئر تھا، گاؤں دیہات میں پل یا نہریں بنانے کے حوالے سے ایک کہنی میں گزشتہ دس سال سے اپنی خدمات انجام دے رہا تھا۔ دو روز پہلے اس کہنی کی طرف سے اسے حکم ملا کہ ”ریش آباد میں نہر کھدائی کرنی ہے، وہاں چلے جاؤ.....“ اور ساتھ ہی اسے کام کے متعلق کاغذات بھی موصول ہوئے۔ وہ رخت سفر باندھے مقررہ وقت

”اوجی..... میں اس گاؤں کا بڑا زمیندار ہوں۔ میرے پاس آٹھ مربع زمین ہے۔ آسان لفظوں میں دو سو ایکڑ..... یہاں میری بات مانی جاتی ہے جیسے میں کہوں ویسا ہی ہوتا ہے۔ بندہ ناچیز کو خادم حسین کہتے ہیں، یہاں کے لوگ بہت اعلیٰ ظرف کے مالک ہیں۔ آپ بے فکر ہو کر کام کریں۔“

”بہت شکریہ..... دراصل ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ جہاں بھی کام کریں وہاں کے لوگ ہمیں تنگ نہ کریں۔ بلکہ ہماری مدد کریں تاکہ ہم ان کے بھلے کو اور بھی بھلا کر سکیں۔“ واحد نے کہا تو خادم حسین کھل کھلا کر ہنس دیا۔

”آپ اچھے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آج رات آئیے تاہمارے غریب خانے پر..... کوئی نگر پانی ہو جائے۔ اسی بہانے باتیں بھی ہو جائیں گی اور میل ملاقات کا وقت بھی مل جائے گا۔“ خادم حسین نے کہا۔

”جی جی ضرور..... آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ ہمیں اس قابل سمجھا..... آج رات تو نہیں..... ہاں البتہ جمعہ کی رات کو ضرور آؤں گا۔“

واحد علی نے کہا..... خادم حسین نے پہلے پہل تو بہت اصرار کیا کہ آج ہی آنا ہوگا، مگر واحد علی نے کام کی زیادتی کا بہانہ بٹا ڈالا۔

جمعہ کی رات بھی آن پہنچی..... درمیان کے دو تین دن میں واحد علی نے کام کا آغاز کروا دیا تھا۔ قریباً چھ ماہ کا یہ پروجیکٹ اپنے شروعاتی مراحل میں تھا۔ مشینری کے ساتھ ساتھ چھوٹا موٹا سامان بھی کمپنی کی طرف سے رفتہ رفتہ آ رہا تھا۔

اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا..... بہر حال خوش آئند بات یہ تھی کہ کام کا آغاز ہو چکا تھا۔

واحد علی خادم حسین کی بڑی سی حویلی کے سامنے موجود تھا۔ ایک نوکر کے ذریعے اس کی آمد کی اطلاع جیسے ہی پہنچی تو خادم حسین ویسے ہی واحد علی کے پاس پہنچا۔

”اوجی معافی چاہتا ہوں..... آپ کو یہاں کھڑے ہونے کی تکلیف دی۔ آئیں جی آئیں.....“

ایک بات کا آپ سب نے دھیان رکھنا ہے، کام کے وقت کام، ہی مجھے اچھا لگتا ہے مجھے فصول باتیں پسند نہیں، سچے دل سے اپنے کام سے کام رکھنا ہے، یہی میرا شیوہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ کام کرنے والے تمام لوگ بھی یہی اصول اپنائیں۔ وگرنہ.....

”! واحد نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی، اور شہادت کی انگلی ہوا میں گھمانے لگا۔ اس کا اشارہ سب لوگ سمجھ گئے تھے۔ تبھی وہ سر ہلانے لگے۔

کمپنی نے یہ پروجیکٹ شروع ہونے سے پہلے تمام منسلک لوگوں کی رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست کر دیا تھا۔ رئیس آباد میں ہی ایک گھر کرائے پر حاصل کیا۔ اور ان سب لوگوں کو یہاں رہائش کا انتظام کر دیا۔

رئیس آباد رقبہ کے لحاظ سے اتنا بڑا نہ تھا اسے گاؤں کا درجہ دیا جاسکتا تھا۔ یہاں کے لوگوں کی آمدنی کا انحصار زراعت پر تھا۔ وہ لوگ کاشت کار تھے، جو بوتے تھے، وہ کاٹ کر قریبی شہر کی منڈیوں میں فروخت کر آتے تھے۔ لوگ بھی اچھے تھے، ملنسار اور مخلص۔ جیسے ہی انہیں خبر ملی کہ حکومت نے ان کے گاؤں پر بھی نظر کرم کی ہے اور یہاں کانہری نظام بہتر کرنے کے لئے پروجیکٹ شروع کیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر اس پروجیکٹ پر کام کرنے کے لئے شہر سے لوگ بھی آ گئے ہیں تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔

گاؤں کے بڑے آدمی آپ اسے چاہے چوہدری کہہ لیجیے یا رئیس یا پھر ڈیرا..... کو جیسے ہی علم ہوا کہ کمپنی کے لوگ آئے ہیں تو وہ فوراً ان کے پاس پہنچا۔

”میں نے سنا ہے کہ..... ہمارا کانہری نظام بہتر ہو جائے گا اور گاؤں کی آخری زمین تک پانی میسر ہوگا، کیا یہ سچ ہے؟“

”جی ہاں..... آپ نے درست سنا ہے، دراصل رئیس آباد اب گاؤں کے حساب سے بڑا ہو رہا۔ چاہے آبادی کا رقبہ وسیع نہیں ہے، لیکن آبادی تو وسیع ہے ناں۔ آپ مجھے اس کے حوالے سے بتائیں کہ یہاں کیسے لوگ رہتے ہیں؟“ واحد علی نے پوچھا۔

”ہمارے بڑوں کی ریت ہے کہ مہمان کو کھلی جھوٹ دے دو۔ وہ چاہے جو مرضی ہو لے..... برا نہیں ماننا..... اور میں اپنے بڑوں کی ہر بات ماننا ہوں۔“

”عجیب انسان ہے یہ بھی.....!“ واحد علی نے دل میں سوچا۔

”آئینہ صاحب..... یہ ہمارا مہمان خانہ ہے..... آئیے!“ خادم حسین نے کہا اور ایک کمرے کی سمت بڑھ گیا۔

”بہت خوب.....!“ واحد علی جب اندر داخل ہوا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا..... یہ مہمان خانہ نہ تھا گویا کانفرنس روم تھا۔ بہت ہی اعلیٰ قالین کے اوپر پرانا طرز اختیار کے ہوئے خوبصورت فرنیچر..... اور ساتھ ہی دیواروں پر خوبصورت رنگ و روغن..... ”پھر وہی بات..... جناب آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے اعلیٰ ظرفی..... اب میزبان کو اتنا شرمندہ مت کریں۔ آپ تسلی سے بیٹھیں میں ابھی آیا۔“ خادم حسین نے کہا اور کمرے سے باہر چل دیا۔ اس کے جاتے ہی کمرے کے روشن دانوں میں سے کوسے کے سائز کے دو الوبرا آدے ہوئے اور ان کے پیچھے ہی دو عدد چمگاڑیں بھی اندر آن پہنچی..... ان چاروں کا رخ واحد علی ہی کی طرف تھا۔ وہ نہایت تیزی سے اس کی طرف آئے۔ اور کانوں کے قریب سے ہوتے ہوئے یہ جاہدہ جا..... واحد علی سنائے کے عالم میں دم بخود کھڑا رہا۔ اسے اس اچانک سانحہ کی امید نہ تھی.....

”اوجی..... آپ ابھی تک کھڑے ہیں..... بیٹھتے کیوں نہیں..... کیا ہمارا فرنیچر اس قابل نہیں کہ اس پر بیٹھا جاسکے!“ عقب سے خادم حسین کی آواز گونجی۔

”آں..... ہاں..... ہاں..... بیٹھتا ہوں.....“

بیٹھتا ہوں.....!“ واحد علی نے فوراً اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔ اور ایک صوفے پر براجمان ہوا۔

”گھبرائیے مت آپ..... اسے اپنا ہی گھر سمجھئے.....!“ خادم حسین نے رکی جملہ کہا..... اور مسکراتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ہاں جی..... تو اب اپنے متعلق بتائیے

اندرائیں.....“ خادم حسین نہایت فریفتہ ہو رہا تھا، واحد علی کو اس کی یہ ”مسکینیت“ نجانے کیوں ایسے لگی کہ جیسے وہ کسی امید سے یہ سب کر رہا ہو۔

”آئیں جی آئیں..... یہ میرا غریب خانہ ہے۔“ حویلی میں اندر داخل ہو کر خادم حسین نے ہاتھ پھیلا کر چاروں طرف اشارہ کر کے کہا۔

”اوہ..... بہت خوب..... آپ واقعی ذوق پسند شخص ہیں۔ آپ کے ذوق کی داد دیتا پڑے گی۔“ واحد علی اندر سے حویلی دیکھ کر واقعی حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ حویلی شہر کی کسی خوبصورت کونھی سے کم نہ تھی اور حویلی کے چاروں طرف نہایت سلیقے سے خوب صورت بھانت بھانت کے درخت لگائے گئے تھے۔ بلکہ چھوٹی چھوٹی گھاس اگا کر خالی زمین کو پارک کا درجہ بھی دیا گیا تھا۔

”اوجی..... آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ ورنہ بندہ تو تاجہ ہے۔ بس فارغ بیٹھا ہوتا ہوں تو ان درختوں سے اور گھاس پھوس سے شغل میلہ لگا لیتا ہوں۔“ خادم نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کیا آپ..... گھر میں اکیلے رہتے ہیں۔!“

واحد علی کو خادم حسین کی بات عجیب سی محسوس ہوئی تو پوچھ ڈالا۔ لیکن خادم حسین نے اس بات کا جواب فوراً نہیں دیا۔ حتیٰ کہ وہ شاید فطرتاً ہی ہر بات یا ہر کام جلد بازی میں کرنے کا عادی تھا۔

”اکیلا تو نہیں..... خیر چھوڑیں..... آئیں، اس طرف آئیں۔!“ واحد علی اس کے چہرے کے مژدے زاویے پر پریشان سا ہو گیا اسے احساس ہوا کہ اس نے بہت جلد بہت قریبی سوال پوچھ ڈالا۔ وہ نہایت زدہ سا ہو گیا اور آگے بڑھنے لگا۔ خادم حسین بھی چپ چاپ اس کی رہنمائی کرتے ہوئے حویلی کی ایک سمت بڑھے جا رہا تھا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں۔ اگر آپ کا دل میرے سوال سے.....!“

واحد علی نے چلتے چلتے کہا چاہا مگر خادم حسین نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کرادیا۔

آپ.....“ خادم حسین نے کہا واحد علی نے پہلے تو روشن دانوں کی سمت دیکھا..... پھر داخلی دروازے پر نظر جمادی۔

گاوں کا روایتی کھانا کھا کر اور لی کے دو گلاس پیٹ کی جنیم میں ڈال کر واحد علی گھر باہر کافی حد تک دور ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک وہ الو اور چگاڈڑ کے حملے سے پریشان ضرور تھا۔

خادم حسین کو واحد علی نے اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے چیدہ چیدہ واقعات سنا ڈالے تھے۔ اور کامیابیاں بھی گوش گزار کر دی تھیں۔ خادم حسین کافی حد تک واحد علی سے متاثر ہو چلا تھا۔

”خادم صاحب..... اب آپ مجھے اجازت دیجیے۔“ واحد علی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ خادم حسین بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اسی وقت آسمان پر زور سے بجلی کڑکی..... ایک لمحے کے لئے روشنی روشن دانوں سے اندر آئی اور مہمان خانہ جگمگسا گیا۔

”میرے خیال میں بارش ہونے والی ہے۔“ خادم حسین نے قیاس آرائی کی اور اس کے ساتھ ہی باہر سے بارش برسنے کی آواز بھی آنے لگی۔

”لو جی..... اندازہ درست نکلا..... بارش ہو رہی ہے۔ آپ اب جانا پسند کریں گے۔“ خادم حسین نے ازراہ مذاق کہا اور ہنس دیا۔

”آپ یہاں بیٹھیں..... جب بارش رکے گی تو چلے جائیے گا۔ میں ذرا باہر کا چکر لگا کر آتا ہوں۔“ خادم حسین نے کہا اور واحد علی کا جواب سنے بغیر مہمان خانے سے باہر نکل گیا۔

اس کے نکلنے ہی ایک بار پھر..... دواو اور دو عدد چگاڈڑیں دروازے سے برآمد ہوئیں۔ اور واحد علی کے کان کے قریب سے ہوتی ہوئی روشن دان سے یہ جاہد جا..... واحد علی اس مرتبہ بھی تیار نہ تھا مگر ایک امکان کے پیش نظر وہ ہشاش بشاش ضرور تھا۔ اس مرتبہ وہ زیادہ نہیں گھبرایا۔ بلکہ غور کرنے لگا۔

”بھاگ جاؤ..... بھاگ جاؤ.....“ اسے یوں

محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی نہایت آہستگی سے اسے تنبیہ کر رہا ہو..... وہ اسے اندر کی آواز سمجھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ اور بارش بھی کہ رکنے کا نام نہ تھا۔ خادم حسین کے بہت زیادہ اسرار پر واحد علی نے یہاں سونے کا ارادہ کر لیا تھا اور ایک ملازم نے مہمان خانے میں ہی واحد علی کا بستر لگا دیا تھا۔

رات کا آخری پہر تھا جب واحد علی کی آنکھ کھلی..... اس نے ناچاہتے ہوئے بھی روشن دانوں کی سمت دیکھا..... باہر بارش اب بھی جاری تھی..... بجلی کی کڑک بھی سنائی دے رہی تھی۔ اور جیسے ہی بجلی چمکی..... روشن دانوں میں بیٹھے ہوئے دواو اور دو چگاڈڑیں بھی حرکت میں آگئیں الو اڑتے ہوئے واحد علی کی سمت بڑھے۔ چگاڈڑیں ان کے عقب میں آئیں اور یہ چاروں واحد علی کی آنکھ کے پاس سے گزرے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اس مرتبہ تو واحد علی سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ چیخ پڑا..... لیکن اپنی چیخ پر بہت جلد اس وقت قابو پایا..... جب اسے ایک نسوانی چیخ سنائی دی..... کوئی عورت یاڑکی چیخ رہی تھی اسی جویلی میں..... مہمان خانے کے آس پاس..... واحد علی اٹھا اور دروازے کی سمت بڑھا..... اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولت..... دروازہ خود کھل گیا..... اور واحد علی فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

”کیا ہوا واحد علی.....!“ کھلے دروازے میں سے خادم حسین برآمد ہوا اور پوچھا۔ لیکن واحد علی فرش پر چٹ آنکھیں پھاڑے اسے نکلے جا رہا تھا۔ خادم حسین نے آگے بڑھ کر اسے جھنجھوڑا۔ آسانی بجلی ایک بار پھر گرج کے ساتھ چمکی..... اور جیسے واحد علی کو ہوش آ گیا۔ یہ ”یہ..... وہ..... یہ..... الو..... چگاڈڑ..... یہ..... چیخیں.....!“

”کیا ہوا واحد علی..... کیا ہوا..... ہوش میں آؤ..... یہ میں ہوں خادم حسین۔“ ”ہاں خادم حسین.....!“ واحد علی اب مکمل طور پر سنبھل چکا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خادم حسین کو دیکھ

کر مکر ادیا۔

اس کی ہمت بندھائی۔

”مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہوا..... اسے مارنا پھینکا فضول تھا..... بس میں نے آزاد پرندے کے پر کاٹ دیئے۔ اس سے اس کی آزادی واپس لے لی۔ اور ایک کمرے میں قید کر دیا..... دو سال سے وہ قید میں ہے۔ رات کو چلائی رہتی ہے گالیاں بھی دے ڈالتی ہے اگر کوئی کھانے پینے کا سامان دینے جائے تو اس پر حملہ کر دیتی ہے۔ بس اب تو ایک کھڑکی کے ذریعے ہی اسے کھانا پینا مہیا کیا جاتا ہے۔ ہر ماہ اسے بے ہوش کر کے نہلا دھلا کر نیا لباس پہنایا جاتا ہے۔“ کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہوا۔

”میری زندگی کی خواہش تھی کہ میری بچی تعلیم مکمل کر لے تو اس کے ہاتھ پیلے کر دوں..... مگر تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی اس نے نہیں رہا دیا۔“

”کیا آپ..... مجھے اپنی بیٹی دکھا سکتے ہیں۔“

واحد علی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”میری بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہو.....“ خادم حسین نے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گر پڑے واحد علی نے یہ دیکھا تو اٹھ کر خادم حسین کے پاس پہنچا۔

”خدا نے ہر مرض کا علاج رکھا ہے..... میرا دل کہتا ہے کہ معاملہ یہ نہیں جس کی آپ سزا سے دے رہے ہیں۔“

”تو کیا آنکھوں دیکھا حال بھی جھوٹا ہوتا ہے؟“

”ہاں..... بعض اوقات ایسا ہوتا نہیں جو دیکھا جاتا ہے۔“ میں نے کہا اور خادم حسین اٹھ کھڑا ہوا۔

”آئیں..... میں آپ کو لے چلتا ہوں.....؟“

خادم حسین نے کہا اور آگے چل دیا۔

قید والا کمرہ مہمان خانے سے زیادہ دوڑ نہیں تھا اسی وجہ سے شاید جیج و پکار مہمان خانے سے سنائی دے رہی تھی۔

”لو..... یہ دیکھ لو..... یہ میری بیٹی محرش ہے.....“ خادم حسین نے کمرے کی کھڑکی کے پٹ کھول

”آؤ..... بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ واحد علی نے کہا اور صوفے کی سمت بڑھ گیا نسوانی چیخ آس پاس سے ایک بار پھر گونجی..... پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دی۔ واحد علی نے مڑ کر خادم حسین کی طرف دیکھا وہ شرمندہ سامنے بیچے کئے کھڑا تھا۔

”خادم حسین..... بیٹھو.....!“ واحد علی نے کہا تو وہ بھی بیٹھ گیا۔

”اگر مجھے کچھ عزت دیتے ہو تو برائے مہربانی مجھے بتاؤ کہ یہ..... نسوانی چیخیں کہاں سے آرہی ہیں کون ہے۔ کیا ماجرہ ہے۔؟“ واحد علی نے پوچھا۔

”بس اب تو آپ کو بتانا ہی پڑے گا۔“ خادم حسین نے کہا اور سوچتے ہوئے روشن دان کی سمت تکتے ہوئے گویا ہوا۔

”خدا کا دیا ہوا میرے پاس سب کچھ ہے..... مال و دولت، عیش و عشرت اور بیوی و اولاد..... مگر اولاد کے حوالے سے کچھ گڑبڑ ہو گئی..... اللہ تعالیٰ نے ایک خوبصورت بیٹی سے نوازا۔ چوبیس سال تک وہ ہمارے ساتھ رہی..... مگر گزشتہ دو سال سے وہ ہمارے ساتھ ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ خادم حسین کی خاموشی طویل ہوئی تو واحد علی پوچھ بیٹھا۔

”مطلب یہ کہ دو سال پہلے پونیورسٹی کے گروپ کے ساتھ میری بیٹی بھی پبلک پارٹی میں شریک ہوئی تھی..... مگر جب وہ وہاں سے واپس آئی تو وہ دیہات کی لڑکی نہیں لگتی تھی بلکہ شہر کی تیز طراروں کا سا روپ اپنائے ہوئے نئی لباس اس کے بدن پر برائے نام تھا، بال کٹے، آنکھیں مد ہوش، چال ڈنگالی، اور سب سے بڑھ کر ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ وہ لہراتے لہراتے میرے گلے لگ گئی۔ وہ نشے میں مکمل طور پر دھت تھی۔ ایسی دھت کہ باپ تک کی تیز نہ سمجھی اور.....!“ خادم حسین کا چہرہ پھر نیچے ہو گیا۔

”گھبراؤ نہیں..... پھر کیا ہوا.....؟“ واحد علی نے

کے لحاظ سے اب بھی یوں تھے کہ دونو جوانوں کو پلک جھپکتے مارا گراتے۔

ایک شام واحد علی اور امجد عباس بیٹھے چائے سے شغف کر رہے تھے کہ ایک شخص دوڑا دوڑا آیا۔

”وہ جی..... وہ جی خادم حسین صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔“

”کیوں..... خیریت تو ہے ناں.....؟“

”بس خیر نہیں ہے ان کی بیٹی سحرش بی بی نے ایک ملازمہ پر حملہ کر دیا ہے۔“

”کیا.....!“ وہ دونوں اچھلے۔

”جی ہاں..... اور ملازمہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔“

”اوہ خدایا..... یہ کیا کر دیا پاگل سحرش نے.....!“ واحد علی نے کہا اور سر پکڑ لیا۔

”بس آپ جلدی جلدی چلیں۔“

”ٹھیک ہے..... تم چلو ہم آتے ہیں۔“ واحد علی نے کہا تو وہ شخص چلا گیا۔

”کیا ماجرہ ہے؟“ امجد عباس نے پوچھا۔

”میں نے آپ کو بتایا تھا ناں خادم حسین کی بیٹی کے حوالے سے..... اس نے جو گڑبوک ہے۔ وہ آپ کے گوش گزار ہے۔ چلئے اب انھیں..... ذرا حویلی ہوا آتے ہیں۔“ واحد علی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ امجد عباس بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆.....☆.....☆

ملازمہ واقعی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ خادم حسین نے بتایا کہ سحرش نے کھڑکی سے اسے اپنے پاس بلایا تھا جیسے ہی وہ پاس گئی تو سحرش نے حملہ کر دیا.....

اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ان دونوں نے ملازمہ کی لاش دیکھی تو حیرت زدہ رہ گئے۔ ملازمہ کا چہرہ مکمل طور پر مسخ شدہ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہتھوڑے کا وار کر کر کے چہرہ کو مسخ کیا گیا ہے۔

”واحد..... ذرا ادھر غور کرو۔“ امجد عباس نے ملازمہ کی گردن کی سمت اشارہ کیا۔

کر کہا..... واحد علی نے اندر جھانکا..... کمرے میں روشنی تھی..... اور کمرے کے ایک کونے میں سحرش گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی..... لباس اس کے بدن پر اب بھی برائے نام تھا..... اور بدن پر گوشت بھی برائے نام رہ گیا تھا..... یوں لگ رہا تھا جیسے ڈھانچے پر کھال چڑھا دی ہو۔ واحد علی نے کمرے کا جائزہ لیتا چاہا.....

کمرہ بالکل خالی تھا سونے کے لئے چٹائی کے علاوہ کوئی دوسری شے موجود نہ تھی..... واحد علی نے چھت کی سمت دیکھا..... اور چھت سے روشن دان کی طرف دیکھا

تو جھری جھری لے اٹھا..... دونوں الوروشن دان میں برآجمن تھے۔ اور اپنی چمکتی آنکھوں سے اسے گھورے جارہے تھے۔ دوسرے روشن دان پر بدستور دونوں چمکا دوڑوں کا ڈیرا تھا۔

واحد علی سب کچھ دیکھ چکا تھا..... مگر سحرش کا چہرہ ٹھیک سے نہ دیکھ پایا تھا۔

”خدا رحم کرے..... بہت افسوس ہوا.....!“

واحد علی نے کہا اور مہمان خانے کی سمت بڑھ پڑ گیا۔

☆.....☆.....☆

خادم حسین کی خیانت کا لطف اٹھائے ہوئے واحد علی کو پورا ہفتہ گزر چکا تھا۔ پروجیکٹ پر کام زور و شور سے جاری تھا..... اس ہفتے میں تین مرتبہ خادم حسین واحد علی سے ملنے آچکا تھا..... ان دونوں کے درمیان اب خاصی گاڑھی اینانیت بن گئی تھی..... خادم حسین سحرش کے حوالے سے گو کافی مایوس تھے، لیکن

واحد علی سے ایک ہلکی سی امید ضرور لگائے بیٹھا تھا کہ شاید وہ سحرش کو راہ راست پر لے آئے۔

واحد علی نے کام کی زیادتی کی وجہ سے کمپنی والوں کو آگاہ کیا اور مطالبہ کیا کہ ایک اور انجینئر بھیجا جائے اور اگلے ہی دن کمپنی نے ایک باریش انجینئر بھیج دیا۔ واحد علی کی اس کے ساتھ کافی اچھی بنتی تھی۔ وہ پہلے بھی دوپروجیکٹ پر ایک ساتھ کام کر چکے تھے۔

امجد عباس بہت بزرگ اور تجربہ کار انجینئر تھے لگ بھگ ستاون بہاریں دیکھ چکے تھے، اور جسامت

”ہاں..... یہ تو کسی.....!“ واحد علی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”جی ہاں..... یہ کسی پرندے کے پنجے کے نشان ہیں۔ غالباً..... الو.....“

امجد عباس نے کہا اور جیب سے موبائل نکال کر اس نشان کی تصویریں نکال لیں۔

”اور یہ دیکھیں..... یہ کچھ مختلف سا نشان ہے۔“ واحد علی نے گردن سے نیچے سینے کی شروعات پر انگلی کا اشارہ کیا۔

”ہاں..... یہ واقعی مختلف ہے..... یہ ایسا ہے جیسے نو چا گیا ہے۔ مگر انسانی انگلیوں کے نوچنے سے ایسے نشان نہیں بنتے..... واحد علی..... معاملہ کچھ اور ہے.....“

امجد عباس نے کہا اور اس نشان کی بھی تصویریں لے لیں واحد علی نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی میں جھانکا..... سحرش کمرے کے وسط میں اکڑوں بیٹھی تھی اور نہایت خونخوار نظروں سے اسے گھورے جارہی تھی اس کے بال مکمل طور پر بکھرے ہوئے تھے اور بازو..... ایک لمحے کو یوں گمان ہوا جیسے چکاڑکے بازو ہوں آنکھیں الو کی ہوں..... بڑی بڑی اور خوف ناک..... واحد علی نے جبرجبری لی اور روشن دانوں کی سمت دیکھا..... اب وہ خالی تھے نہ تو وہاں الو تھے اور نہ ہی چکاڑکیں۔

امجد عباس نے بھی یہ سب باتیں نوٹ کیں..... خادم حسین کو دلا سہ دیا۔ اور ملازمہ کے لواحقین کو بھی صبر کرنے کی تلقین کی۔

☆.....☆.....☆

اسی رات امجد عباس اپنے لیپ ٹاپ پر موبائل سے کھینچی گئی تصویریں ڈال کر غور کر رہے تھے..... واحد علی بھی پاس ہی تھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چکر کیا ہے؟..... خادم حسین نے سحرش کو فاشی کے جرم میں قید کیا تھا مگر یہ قید پر اسراریت اختیار کرتی جارہی ہے.....“ واحد علی نے کہا۔

☆.....☆.....☆

”ہاں..... بات تو تمہاری درست ہے.....!“

امجد عباس نے کہا اور پھر چونکے۔

”اچھا ایک کام کرو..... تم ابھی خادم حسین کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ جو سامان یا سفری بیگ سحرش پینک سے واپس لائی تھی وہ کہاں ہے۔ اگر موجود ہے تو لے آؤ..... قافٹ جاؤ.....!“ امجد عباس نے کہا..... اگر یہ ہی حکم واحد علی کو کسی اور نے دیا ہوتا تو یقیناً وہ عمل نہ کرتا مگر یہاں معاملہ اور تھا..... وہ فوراً اٹھا اور باہر کی طرف چل دیا۔

☆.....☆.....☆

سفری بیگ جوں کا توں خادم حسین نے واحد علی کے حوالے کر دیا تھا۔ اور اب امجد عباس واحد علی سمیت چھان بین میں مصروف تھے۔ بیگ میں کچھ خاص نہ تھا، کپڑے، جیولری اور میک اپ کے سامان کے علاوہ ایک عدد ویڈیو ریکارڈر بھی تھا۔

”شاید..... اس مسئلے میں یہ ہماری مدد کر سکے۔“ واحد علی نے کہا اور امجد عباس نے ویڈیو ریکارڈر کو اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ منسلک کر دیا۔

ویڈیو ریکارڈر میں چھوٹے چھوٹے ویڈیو کلپ تھے چند ایک سفر کے تھے جس میں پینک میں شریک سب لوگوں کی ویڈیوز تھیں پھر ایک ساحل کنارے کی ویڈیو تھی۔ آخری ویڈیو نے ان دونوں کو پریشان کر دیا۔ وہ ایسے کہ ویڈیو میں تھا کہ پینک کے تمام لوگ ساحل کنارے کپڑے بچھائے گول دائرہ بنائے بیٹھے تھے ان سب کے چہرے خوشیوں سے پرستے۔ اور شاید وہ کچھ کھانے لگے تھے۔ اتنے میں ایک مردانہ آواز میں سحرش کو ریکارڈ کرنے کی آواز تھی۔ اور پھر گیسرے کا فوکس ان لوگوں کو دور کرتا گیا..... ہر گزرتے لمحے یہ سب لوگ چھوٹے ہوتے گئے یعنی سحرش جو کہ ریکارڈنگ کر رہی تھی ان سب سے دور ہوتی گئی اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے کمرہ گر گیا۔ اب ریکارڈر کا فوکس ساحل کی طرف تھا..... اور سحرش کی گھبرائی آوازیں آ رہی تھیں وہ کہہ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”چھوڑ دو..... چھوڑ دو مجھے..... میں ایسی لڑکی نہیں ہوں..... پلیز! مجھے چھوڑ دو..... میں یہ نہیں ہي سکتی..... اور میں کچھ بھی نہیں کر سکتی..... تم ذلیل

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

انسان..... گھٹیا..... آہ..... چھوڑ دو..... چھوڑ دو مجھے.....“ اور سحرش کی رونے دھونے کی آواز آنے لگی۔
 ”اوہ ریکارڈ تو آن ہے! اب مزہ آئے گا۔“ وہی مردانہ آواز سنائی دی..... اور پھر ریکارڈ کسی نے اٹھالیا اب اس کا فوکس سحرش تھی امجد عباس اور واحد علی یہ منظر نہ دیکھ پائے۔ ان کی آنکھیں شرم سے نیچے ہو گئیں سحرش مکمل طور پر لباس سے عاری کھڑی تھی اور پھر ویڈیو ریکارڈ بند کر دیا گیا ان دونوں نے سر پکڑ لیا۔
 ”واحد علی..... اس ویڈیو سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ جیسے تم کہہ رہے تھے کہ کوئی پراسرار چکر ہے ضرور.....“ امجد عباس نے کہا۔

”مجھے اب بھی محسوس ہو رہا ہے..... کہ کچھ گڑبڑ ہے ضرور..... اچھا ایک منٹ..... یہ آخری ویڈیو ذرا پیچھے کیجیے گا..... وہ شخص جب کیمرا اٹھاتا ہے تو اس کا چہرہ بھی سامنے آتا ہے میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ واحد علی نے کہا تو امجد عباس نے ویڈیو پیچھے کر دی۔

”ہاں..... بس یہی..... یہ کون ہے.....؟“ واحد علی نے پوچھا۔
 ”یہ شاید کوئی اور ہے..... یہ اس پکنک پارٹی میں نہ تھا۔“

”سچ کہہ رہے ہو.....؟“
 ”جی ہاں..... پیچھے کی تمام ویڈیوز میں نے بغور دیکھی ہیں۔“

”تو اس کا مطلب..... سحرش بے وجہ قید کاٹ رہی ہے۔ وہ تو مجرم ہے ہی نہیں.....“ امجد عباس نے تشویش زدہ ہو کر کہا۔

”یہ بات تو ہے۔“ واحد علی نے کہا۔
 خادم حسین کو ساری صورتحال واحد علی نے اگلے دن بتائی اور سحرش کے متعلق اس حوالے سے راضی کیا کہ یہ بے گناہ ہے پہلے پہل اس کا علاج کروایا جائے پھر سحرش کو اس حال میں پہنچانے والے تمام لوگوں کو کیفر کر دیا کہ ایک پہنچایا جائے۔ وہ بمشکل راضی ہوئے۔ اس کی زبان پر بس ایک ہی لفظ تھا۔

”یہ شہر کی آوارہ بن گئی ہے..... آسان لفظوں میں جسے فاش کہتے ہیں۔“ بحث و تکرار کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ سحرش کو بے ہوش کر کے واحد علی شہر کے کسی اچھے اسپتال میں لے جائے..... اور اس کا علاج کروایا جائے۔

☆.....☆.....☆

سحرش کو اسپتال میں داخل کروائے چارہاہ گزر چکے تھے۔ اب اس کی جسامت میں کوئی بڑھاد آ یا تھا..... تھوڑا بہت گوشت نظر آنے لگا تھا اور ڈاکٹرز بھی اس سے مطمئن تھے کیونکہ ان چارہاہ میں کوئی حماقت سرزد نہیں ہوئی تھی۔

ایک دن یونی بیٹھے بیٹھے خادم حسین نے پوچھا۔
 ”واحد علی..... آپ کو یہ کیوں لگتا ہے کہ سحرش بے صورت ہے۔“

”وہ دراصل..... ہم نے سحرش کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھی ہے۔ اس کے ساتھ کسی نے زبردستی کی ہے۔“ واحد علی نے منہ نیچے کر لیا۔

”کیا کس نے..... اوہ خدا..... یہ کیا کہہ رہے ہو.....“ خادم حسین بھڑک اٹھا..... وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

”جی ہاں..... درست کہہ رہا ہوں..... اگر آپ چاہیں تو آپ کو بھی دکھا دوں.....“ اس غصیٹ کی تھوڑی سی جھلک نظر آتی ہے۔ شاید آپ اسے دیکھ کر پہچان سکیں۔

”ضرور..... میں ضرور دیکھوں گا!“ خادم حسین نے کہا۔

واحد علی نے امجد عباس کے لیپ ٹاپ پر خادم حسین کو سحرش کی ویڈیو دکھائی..... اور اس شخص کی جھلک پر ویڈیو روک لی۔

”یہ ہے وہ شخص..... آپ کی بیٹی کا گناہ گار.....“ واحد علی نے کہا۔ لیکن خادم حسین گویا سکتے کے عالم میں تھا..... وہ بس لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ابھری تصویر کو سنکے جا رہا تھا اس کی آنکھوں میں گویا خون کھولنے لگا تھا۔

نظر دوڑائی اور کمرے سے باہر آ کر حویلی کو گھورنے لگا۔
”کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔؟“ خادم حسین بھی باہر آ گیا۔

”یہ سامنے کس کا کمرہ ہے۔۔۔؟“
”حشرش کا۔۔۔۔۔ جہاں اسے قید کیا تھا۔۔۔۔۔؟“
”ہوں!“ واحد علی نے ہامی بھری اور حشرش کے کمرے کے روشن دانوں کو کٹنے لگا۔

”اچھا ایک بات تو بتائیں۔۔۔۔۔ یہ الو اور چوگا ڈڑے کے محبت ہے۔۔۔۔۔ راحت کو یا حشرش کو۔“ واحد علی نے پوچھا۔

”ایسی عجیب و غریب مخلوق سے کوئی خبیث ہی محبت کر سکتا ہے راحت کو الو پالنے کا بہت شوق تھا۔ چوگا ڈڑیں بھی شوق سے رکھتا تھا۔“

”بس۔۔۔۔۔ تو پھر سارا معاملہ حل ہو گیا۔“ واحد علی نے تالی بجائی۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔۔۔؟“ خادم حسین چونکا۔
”یہاں کے کسی اچھے سے بزرگ کو پکڑیں جو نورانی علم رکھتا ہو۔۔۔۔۔ اور مجھ سے ملوائیں۔ اب انشاء اللہ جلد حشرش صحت یاب اور بالکل صحت یاب ہو کر حویلی آئے گی۔“ واحد علی نے کہا۔۔۔۔۔ اور خادم حسین کی بات سے بغیر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

بزرگ کا بندوبست ہو گیا تھا۔ واحد علی، امجد عباس، خادم حسین اور وہ بزرگ ایک کار میں بیٹھے اسپتال کی سمت روانہ تھے واحد علی نے ساری رواداد امجد عباس اور بزرگ کے گوش گزار کر دی تھی اور بزرگ رحمت اللہ سمجھ گئے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔۔۔۔۔ وہ معاملہ کی تہ تک پہنچ چکے تھے۔

لیکن جیسے ہی وہ اسپتال پہنچے ایک نہایت بری خبر نے ان سب کا استقبال کیا۔ چند منٹ پہلے ہی حشرش نے ایک نرس پر حملہ کر دیا تھا اور نرس کو جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

ان سب نے نرس کی لاش دیکھی۔۔۔۔۔ یہ لاش اس ملازمہ کی لاش سے مختلف نہ تھی۔۔۔۔۔ اسپتال کے اسٹاف

”بد بخت انسان! تیری یہ مجال۔۔۔۔۔“ خادم حسین غصہ سے دھاڑا۔

”سکون اختیار کریں۔۔۔۔۔ سکون۔۔۔۔۔ ذرا نرمی برتیں خادم صاحب ذرا نرمی۔۔۔۔۔ اس مسئلے کو گگ بھگ تین سال ہونے والے ہیں۔“ واحد نے کہا۔

”ہاں بات تمہاری درست ہے۔۔۔۔۔ مگر یہ شخص تو۔۔۔۔۔ یہ شخص۔۔۔۔۔“ خادم حسین نے بیٹھ کر سر پکڑ لیا۔
”کیا آپ اسے جانتے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”جانتا۔۔۔۔۔“ خادم حسین نے نہایت حقارت سے لیپ ٹاپ پر ابھرے شخص کو دیکھا اور زمین پر تھوک دیا۔
”اس ذلیل انسان کو تو میں نے چار سال پہلے خود زندہ در گور کر دیا تھا۔“ خادم حسین کی بات سن کر واحد علی اچھل پڑا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خادم حسین۔۔۔۔۔؟“
”جی ہاں۔۔۔۔۔ چار سال قبل اس وحشی انسان نے حشرش کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن حویلی میں شور و غل سے سب منع ہو گئے۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ تو میں نے اپنے بھتیجے کو زندہ ہی دفن کر دیا تھا۔ یہ میرا بھتیجا ہے۔ راحت۔۔۔۔۔ دراصل یہ اور اس کا باپ نہایت لالچی انسان تھے۔ باپ دل کے مرض میں مبتلا تھا۔ اس لئے جلد مر گیا۔ رہا اس کا بیٹا۔۔۔۔۔ تو وہ حشرش کو پھانسل کر میری ساری دولت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن حشرش اس کے منہ پر تھوکتی بھی نہیں تھی۔ نجانے یہ کیسے زندہ ہو گیا۔۔۔۔۔؟“ خادم حسین واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

”آپ مجھے وہ جگہ دکھائیں گے جہاں اسے زندہ دفن کیا تھا۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔“ واحد علی نے پوچھا تو خادم حسین کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

حویلی کے عقب میں ہی ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا۔۔۔۔۔ خادم حسین واحد علی کو لے کر اس میں داخل ہو گیا۔۔۔۔۔

”یہاں۔۔۔۔۔ یہاں دفن کیا تھا۔۔۔۔۔“ خادم حسین نے اشارہ کیا۔۔۔۔۔ واحد علی نے بغور وہ جگہ دیکھی اور گرد

نے سحرش کو بیڈ پر باندھ دیا تھا۔
 ”رحمت اللہ صاحب..... یہ دیکھیں..... چہرہ مسخ
 ہے..... الو کے اور چمکاڑے کے نوچنے کے نشانات بھی
 ہیں..... اور یقیناً یہ دونوں..... دونوں نہیں بلکہ چاروں
 یہاں کہیں ہوں گے۔“ واحد علی نے کہا اور اوپر کی سمت
 دیکھنے لگا..... دونوں الو اور دونوں چمکاڑے اوپر روشن
 دان میں ہی بیٹھے تھے۔ جبکہ سحرش بے ہوشی کی حالت
 میں بیڈ پر بندھی پڑی تھی۔

”بس..... اب آپ اس راحت کی گندی روح
 سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کیجیے.....“ واحد علی نے امجد
 عباس کے منہ کی بات چھین لی۔ خادم حسین نہایت
 پریشان حالت میں سب کو تنگے جا رہا تھا۔
 رحمت اللہ نے ان سب کو اپنے قریب کیا اور
 اشارتی دائرہ سا کھینچا۔

”اس حصار سے باہر مت جانا.....“ انہوں نے
 آنکھیں بند کیں..... اور حصار کے بیچ میں بیٹھ گئے.....
 وہ تینوں بھی رحمت اللہ کی دیکھا دیکھی بیٹھ گئے۔

رحمت اللہ نے آنکھیں بند کیں اور زیر لب کچھ
 پڑھنے لگے جیسے جیسے وہ پڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے
 ان کا لہجہ اور آواز تیز ہو رہا تھا اور اس کا اثر سامنے بیٹھی
 سحرش کے علاوہ اوپر بیٹھے الو اور چمکاڑے پر بھی ہو رہا تھا
 انہوں نے بند کمرے میں اثرنا شروع کر دیا وہ اثر اڑا کر ان
 پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے..... مگر یہ چاروں حصار میں
 تھے اس لئے وہ ان کا بال بھی پیکانہ کر سکے..... اسپتال
 کے اسٹاف کو انہوں نے یہاں آنے سے پہلے ہی منع
 کر دیا تھا کمرے کے باہر کھرام بجا ہوا تھا آخر ایک نرس کا
 قتل ہوا تھا لیکن وہ سب جانتے تھے کہ یہ میڈیکل مسئلہ
 نہیں بلکہ لولی آئی، اسرار مسئلہ ہے۔

رحمت اللہ کی آواز اہل کمرے میں گونجنے لگی
 الو اور چمکاڑے نہیں سمجھتے تھے..... اور سحرش کا بندھا
 ہوا منہ بھی ٹھہر لے گا اور پھر اچانک..... سحرش کے اندر
 سے..... اعلیٰ لہجہ لہا ہوا آگیا۔
 ”اوہ میرے خدا.....“ خادم حسین بڑبڑایا۔ لیکن





شب قدر

رفعت محمود - راولپنڈی

رات بڑی پرسکون، خوشیاں بھری، دل میں امنگیں پیدا کرتی،
ہر سو قہقہہ بکھیرتی، صدائے جرس کی خوشنما سر ہوا کے
دوش پر لاتی ہوئی روداد مگر صبح کا سورج طلوع ہوا تو ہر
طرف ماتم ہی ماتم تھا

احکام خداوندی سے انحراف لوگوں کیلئے دل و دماغ کو بہوت کرتی ذہن سے محو نہ ہونوالی کہانی

سو جاتے اور آنے جانے والوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا تو وہ اور
اس کی بیوی آپس میں باتیں کیا کرتے۔ کچھ دیر نہ گزرتی
تھی کہ اس کی بیوی غربت کا رونا رونے لگتی۔ ”خدا بخش وہ
زور سے کہتی۔ گاؤں میں آپ سے کم علم رکھنے والے اچھی
زندگی گزار رہے ہیں اور عزت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔
مگر ہم ہیں کہ ذلت و غربت کے اسیر ہیں۔“

خدا بخش سوچنے لگتا کہ ”کیا کوئی ایسی صورت
ہو سکتی ہے کہ میں مسجد مدرسے کو چھوڑ کر زمین داری
کرنے لگوں اور زمین داروں کی طرح عیش کی زندگی

خدا بخش غنڈہ لہو کی مسجد میں امام تھا۔ وہیں
اس نے ایک مدرسہ بھی کھول رکھا تھا۔ جہاں دن میں
چھوٹے چھوٹے بچے اس سے قرآن پڑھنے آتے
تھے۔ اور رات کو محلے کے لوگ دین کی باتیں سیکھنے آتے
تھے۔ اس طرح وہ اپنی روزی رزق سے بے نیاز قناعت
کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ مال دار نہ تھا مگر اس کے
چاروں بچے اور بیوی اچھی زندگی گزار رہے تھے۔
اس کی زندگی میں روزانہ کچھ ایسی تلخ گھڑیاں بھی آتی
تھیں کہ وہ زندگی سے بے زار سا ہو جاتا تھا جب بچے

بسر کرنے لگوں۔“ وہ اکثر بیوی سے ایسی باتیں کرتا مگر پھر کچھ دیر بعد خاموش سا ہو جاتا۔

”تارا“ وہ اکثر اسے کہتا۔ ”اللہ تعالیٰ نے اچھی خاصی آمدنی دی ہوئی ہے میرا کاپیشہ شریفانہ ہے اور اپنے علم کی وجہ سے گاؤں میں بڑی عزت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سب کچھ تو دے رکھا ہے کس چیز کی کمی ہے۔“

اس کے باوجود بیوی کے رات دن کے طغیوں نے اسے زندگی سے کچھ مایوس سا کر دیا تھا۔ وہ تمنا کرنے لگا۔ ”کاش اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسمان سے سونا برسادے تاکہ وہ بھی زمین اور باغوں کا مالک بن جائے۔“

خدا بخش نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ شب قدر سال میں ایک بار ضرور آتی ہے اور اس میں ہر دعا قبول ہوتی ہے، رمضان المبارک میں وہ ہر رات کو رزق کی فراوانی کے لئے دعا مانگنے لگا تاکہ اس کی دعا کو شب قدر نصیب ہو جائے اور اس طرح اس کی دعا قبول ہو جائے۔

ایک رات جب اس کی بیوی نے اسے بہت تنگ کیا تو وہ اس کا ہوا گیا۔ اس نے سونا چاہا تو سو بھی نہ سکا وہ بستر سے اٹھا اور گھر سے باہر دریائے سواں کے جنگل کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ وہ رات کی تاریکی میں چلا جا رہا تھا اور آسمان کی طرف منہ کئے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کر رہا تھا کہ اس کی دعا قبول ہو جائے اور پھر اس شب قدر کی رات اس کی دعا قبول ہوگی۔

اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف ایک نور دیکھا ایک فرشتہ آسمان سے اترتے دیکھا جو نہایت شیریں آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”یہ تین شیشے کی گولیاں لے، جب کبھی تو ان میں سے ایک شیشے کی گولی آسمان کی طرف پھینک کر دعا کرے گا تو فوراً ہی تیری دعا قبول ہوگی۔ اور صرف تیری تین ہی دعائیں قبول ہوں گی۔ اس سے زیادہ کی تو امید مت رکھنا۔“

خدا بخش کے لئے یہ معاملہ بڑا ہی غور طلب تھا، وہ سوچنے لگا کہ وہ تین دعائیں کیا ہونی چاہئیں۔ اس نے مضبوطی سے تینوں شیشے کی گولیاں اپنے ہاتھ میں دبائیں، وہ کیا دیکھتا ہے کہ ان گولیوں سے نور کی

شعاعیں پھوٹ رہی ہیں، اس نے ادھر ادھر دیکھا تو کسی کو نہ پایا۔ اگر یہ تین گولیاں اس کے ہاتھ میں نہ ہوتیں تو وہ اسے خواب سمجھتا۔

آہستہ آہستہ اس کے دل سے خوف دور ہونے لگا اور وہ سمجھ گیا کہ خدا کی رحمت کو اس نے پایا ہے وہ فوراً گھر کی طرف لوٹا، اس نے صبح کا بھی انتظار نہ کیا۔ بیوی کو چکا کر سارا واقعہ اسے سنایا اور شیشے کی گولیاں اسے دکھانے لگا۔ وہ اپنی دعا کے قبول ہو جانے کے نشے میں چور تھا۔

”تارا“ وہ بیوی سے بولا۔ ”اب مانگ جو کچھ مانگنا ہے تیری ہر خواہش پوری کروں گا۔“

جب اس کی بیوی کو اس عجیب واقعہ سے کچھ سکون ہوا تو اس نے سب سے پہلے آئینہ دیکھا اس کا چہرہ آئینے میں جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ غور سے آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھنے لگی۔ جیسے آج اس نے پہلی بار آئینہ دیکھا ہو وہ ایک لمحہ کے لئے آئینہ کے سامنے کھڑی رہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مکان جائیداد اور باغوں کی آرزو بھول گئی ہو اسے ایسا محسوس ہوا اسے مال و جائیداد کی اتنی ضرورت نہیں جتنی حسن و شباب کی ضرورت ہے۔

”خدا بخش“ وہ ایک دم اپنے شوہر سے بولی۔ ”ہم باغ اور زمین کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔ آپ صرف تین ہی دعائیں مانگ سکتے ہیں اس لئے آپ سب سے پہلے یہ دعا مانگئے صبح ہونے سے پہلے پہلے میں اس دنیا کی حسین ترین عورت بن جاؤں۔ کیونکہ جو شخص زمینوں اور باغوں کا مالک ہو اس کی بیوی بھی حسین ہونی چاہئے تاکہ اس کے چہرے پر جھریوں کا جال ہو۔ جاؤ ابھی اور فوراً یہ دعا مانگو۔“

خدا بخش باہر نکلا دریائے سواں کے جنگل کا رخ کیا اور آسمان کی طرف ایک شیشے کی گولی اچھالتے ہوئے دعا کرنے لگا کہ اس کی بیوی دنیا کی حسین ترین عورت بن جائے۔

یہ دعا مانگ کر خدا بخش خاموشی سے سر جھکائے اپنے گھر کی طرف لوٹا، وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ دنیا کی حسین ترین عورت کا شوہر بن جائے گا۔ مگر کیا اس نے

جرمانہ

ایک جوڑا اپنی مومن منانے کے لئے گیا تو ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ شام میں جب وہ جوڑا اسیر کے لئے گیا تو کھانا باہر ہی کھا آیا۔ جوڑا واپس ہوٹل پہنچا تو منیجر نے کھانے کا بل پیش کر دیا۔ ”مگر ہم نے تو یہاں کھانا نہیں کھایا۔“ شوہر نے حیرت سے کہا۔

”مگر کھانا تو تیار تھا۔“ منیجر نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اگلے دن وہ جوڑا پھر کہیں گیا اور چائے پی آیا تو منیجر نے چائے کا بل پیش کر دیا۔ ”مگر ہم نے تو چائے نہیں پی۔“ شوہر نے احتجاج کیا۔ ”مگر چائے تو تیار تھی۔“ منیجر نے لاپرواہی سے کہا۔ جب وہ جوڑا واپس جانے لگا تو شوہر نے ہوٹل کے مالک کو جرمانے کا ایک بل پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ منیجر نے اس کی بیوی کو چھیڑا ہے۔ ”پر میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔“ منیجر چلایا۔ ”مگر وہ تو تیار تھی۔“ شوہر نے بے نیازی سے جواب دیا۔

(فرحان احمد نصیب - کراچیا)

ساتھ والے کمرے سے چاروں بچوں کے کھیلنے کوونے کی آواز آئی تو وہ اپنی گہری سوچوں سے بیدار ہو گیا اس نے اپنے آنسو پونچھے اور بچوں کے لئے ناشتہ تیار کرنے لگا۔

”بابا امی کہاں گئی ہیں۔“ ایک بچہ بولا۔
”وہ کسی کام سے گئی ہیں ابھی آئی ہوں گی۔“ اس نے بچے کو جواب دیا۔

”بچے ناشتہ کر کے فارغ ہوئے تو سب مدرسے کی طرف چل پڑے، اب وہ گھر میں تنہا تھا میں پھر اپنے غموں

اس بارے میں جلد بازی تو نہیں کیا اور اس کے انجام کے بارے میں غور نہیں کیا، کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے ہر قسم کے دوسو کدول سے دور کیا اور خوشی خوشی گھر کی طرف لوٹ آیا۔

صبح ہوتے ہی دنیا کی حسین ترین عورت اپنے بستر سے اٹھی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے ساحرانہ حسن کا تماشا دیکھنے لگی۔ وہ بڑی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی رہی جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ دنیا کی ملکہ حسن بن چکی ہے تو اپنے اچھے سے کپڑوں کو تلاش کرنے لگی۔ مگر اسے ان کپڑوں میں سے کوئی جوڑا پسند نہ آیا۔ وہ سوچنے لگی آج مجھے سب سے پہلے شہر جا کر اپنے لئے اچھے سے کپڑے لانے چاہئیں۔

جو کچھ روپیہ تھا وہ لے کر شہر کی طرف چل پڑی۔ جب خدا بخش سوکراٹھا تو دیکھا کہ بیوی کا کچھ پتا نہیں ہے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر وہ نہ ملی۔ وہ سوچنے لگا کہ بیوی تو ہاتھ سے گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ رات کی دعا کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے مگر وہ جانتا بھی تھا کہ اس کی بیوی بڑی پاک دامن ہے کسی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی، پھر بھی وہ سخت حیران تھا کہ یہ کیا ہوا، بیوی کہاں گئی اور کیوں گئی ہے؟

خدا بخش کا دل بڑا بے چین تھا وہ سب کچھ چھوڑ کر ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔ آنسوؤں کی بارش میں اسے کچھ بھی نہ دکھائی دیتا تھا کچھ دیر کے بعد جب آنسو رکے تو اس نے کچھ پڑھنا شروع کیا، کتاب میں لکھا تھا۔ ”اگر تمہیں غیب کا علم ہوتا تو تم تقدیر کے فیصلے کو ہی

پسند کرتے۔“

اس کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو اُمڈ آئے وہ اس سے آگے کچھ نہ پڑھ سکا۔ اس کے دماغ میں چکر سے آ رہے تھے۔ کاش وہ تقدیر پر شا کر رہتا اور ایک غیبی معاملے کے پیچھے نہ پڑتا جس کے اسے انجام تک معلوم نہیں تھا وہ کچھ دیر تک اپنے آپ کو کوستارہا پھر دل ہی دل میں کہنے لگا۔

”افسوس میں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کو چھوڑ دیا اور لالچ میں چھلانگ لگا دی۔ جس کا انجام ندامت ہے۔“

کوئی بھی نہ جانتا۔ کیا ایک مٹی پر ہیزگار ہزاروں نوابوں سے بہتر نہیں ہوتا۔

”ابودصورت بڑھے۔“ وہ اس کی سوجوں کا تانا توڑ کر بولی۔ ”میرے حسن و جمال کو تیری خدمت گزاری کھا گئی ہے، روٹیاں پکاتے پکاتے میری ساری خوب صورتی ختم ہو گئی تھی۔ ہائے میں مرجاواں میرے ماں باپ نے کس بد نصیب کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دیا تھا۔“ خدا بخش نے دیکھا کہ بیوی کو حسن کے ساتھ ساتھ تیز زبانی بھی مل گئی ہے جو پہلے کبھی نہ تھی۔

”میں جب اپنے باپ کے گھر سے آئی تھی تو کتنی حسین تھی۔“ وہ دوبارہ بولی۔ ”اس مولوی نے میری صحت اور جوان کو کھن لگا دیا ہے۔ رات دن خدمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں اور اب اللہ نے مجھے صبر کا پھل دیا ہے تو پھر اس نے میری کچھ بھی قدر نہیں کی۔ کم بخت جل گیا ہے میرے حسن سے کہتا ہے روٹی پکا۔ برتن دھو، کبھی یہ برتن میرا پیچھا چھوڑیں گے بھی یا نہیں۔ یا میں ساری زندگی برتن ہی باجھتی رہوں گی۔ اسے شرم بھی تو نہیں آتی، ایسی بات کہتے ہوئے۔“

ایسے حسین ہاتھ برتن مانگھنے کے لئے ہیں نا بابا بانیہ کام اب مجھ سے نہیں ہوتے۔ کبھی تو سوچ مجھ کے بات کر لیا کر، یا ساری عمر بے وقوف ہی رہے گا۔ میری عقل تو مدرسے کے لڑکے لے گئے ہیں۔ کہیں سے کوئی ملازم رکھ لے ورنہ گھر کا سارا کام خود کر۔

میرا دل اب بھر گیا ہے۔ کاموں سے۔ کیا مجھے ساری زندگی کبھی آرام نصیب نہیں ہوگا۔ ساری عمر میں ایک دن خوشی کا آیا تو نے خوش نہیں ہونے دیا۔ طرح طرح کی باتیں کرنے، ارے کچھ تو خیال کر لیا کر میرا۔ ہر وقت ٹٹڑی کئے چلا جاتا ہے۔ خدا جانے کس بلا کا داغ ہے تیرا، بس بھونکے ہی چلا جاتا ہے۔“

خدا بخش نے سوچا۔ ”بیوی تو ہاتھ سے گئی۔“ وہ دعا کرنے پر بہت پچھتا یا اب اس کے اندر شدید جذبہ انتقام پیدا ہو چکا تھا۔

وہ بیوی کی زبان درازی کا جواب دینا چاہتا تھا ایسا

میں ڈوب گیا کہ تارا کہاں گئی ہے ابھی تک نہیں آئی۔ کچھ دیر بعد سبزی کے لئے پیسے تلاش کرنے لگا تو چند پیسوں کے اسے گھر میں کچھ نہ ملا۔ وہ افسردہ سا ہو کر ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگا۔

دوپہر کے بعد اچانک گھر کا دروازہ کھلا اور اس کی بیوی ایک دم اندر آئی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے برقعہ اتارا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اپنے نئے کپڑوں اور زیورات کو دیکھنے لگی۔ جنہیں شہر سے خرید کر لائی تھی۔ خدا بخش کی بیوی پر نظر پڑی تو وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ جب وہ قیمتی لباس پہن کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

”خدا بخش۔“ تارا مسکرا کر بولی۔ ”آج سے آپ ملکہ حسن کے شوہر بن گئے ہیں اور ہاں آپ نے میرے جوڑے کی تعریف کی نہ میرے زیورات کی داد دی۔“ ”بھی خوب صورت جوڑا ہے۔“ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔

”آج تم نے نہ ناشتہ تیار کیا نہ جھاڑو دی۔ کیا بات ہے؟“

”اوئے بڑھے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر چیخ کر بولی۔ ”یہ نرم و نازک ہاتھ کوئی برتن دھونے کے لئے ہیں۔ جا کہیں سے کوئی کام کرنے والی نوکرانی لے آ۔“ افسوس تو نے اس حسن کی کچھ قدر نہیں کی۔ یہ جسم نرم و نازک گدوں کے لئے ہے یا تیری روٹیاں پکانے کے لئے ہے۔ یہ سن کر خدا بخش کا دل تم سے بھر گیا وہ دیکھ رہا تھا کہ وہی اپنے حسن اور زیورات کو آئینے میں دیکھے ہاں ہی اس نے سمجھنا چاہا تو وہ چڑھ گئی۔

”اس دن اس بڑھے سے میری شادی ہوئی تھی اسی دن یہی موت پھوٹ گئی تھی۔ یہ حسن تو نوابوں کے شایان شان تھا نہ کہ مسجد کے مولوی کے جو کتابوں اور مسجد کے دروازے درمیان زندگی گزارتا ہے۔“

خدا بخش نے اسے یہ الفاظ سن کر حیران سا رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ سب کچھ اس کی دعا کا کرشمہ ہے اگر میں دعا نہ کرتا تو یہ دنیا کے عام عورتوں کی طرح ہوتی اور اسے

گلے سے گائے جیسی آواز نکلتی تھی۔ اس کے کانوں میں
سوئے کی بالیاں اسی طرح آدڑیاں تھیں اور اس کے
سرخ کپڑے بھی اسی طرح اس کے جسم پر تھے۔

خدا بخش یہ دیکھ کر ہنسنے لگا۔ مگر اس کے چاروں بچے
روتے ہوئے آئے اور اس کے ہاتھ چومنے لگے۔ اور
ماں کے گناہوں کی بخشش کا اصرار کرنے لگے۔

”بابا کل تو امی نہایت حسین و جمیل تھیں اور آج ایسی
کیسے ہو گئیں۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ان کے
گناہوں کو بخش دیں۔ وہ چاہے اتنی حسین نہ رہیں مگر جیسے
پہلے تھیں ویسی ہی ہو جائیں۔“ سب سے بڑا بچہ بولا۔

اس کی بیوی چیخنے لگی اور اپنا سر زور زور سے ہلانے
لگی اور خدا بخش کی جیب کی طرف اشارہ کرنے لگی جس
میں ایک تیسری شیشے کی گولی پڑی تھی۔

”اب آخری شیشے کی گولی کے اچھالنے کا وقت
آن پہنچا تھا۔“ خدا بخش نے اپنے بچوں کے سروں پر
شفقت کا ہاتھ پھیرا اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ کوشش
کرے گا۔ اب سب جاؤ اور سو جاؤ صبح ہوتے ہی سب
کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

رات ہوتے ہی خدا بخش دریائے سواں کے
جنگل کی طرف گیا اس نے آسمان کی طرف دیکھا تو چاند
مسکراتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اپنی آخری شیشے کی گولی
آسمان کی طرف اچھال کر دعا کی کہ بیوی ویسی ہو جائے
جیسی پہلے تھی اور گھر کے حالات بھی ٹھیک ہو جائیں۔

پھر خدا بخش کے گھر کے حالات بھی ٹھیک ہو گئے اس کی
بیوی نے زبان درازی چھوڑ دی گھر کا ماحول پرسکون ہو گیا۔
اس واقعے کے بعد خدا بخش نے اپنے گھر کے
دروازے پر ایک تختی کے اوپر یہ لکھ دیا۔

”اگر تمہیں غیب کا علم ہوتا تو تم تقدیر کے فیصلے کو ہی
پسند کرتے۔ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہی سب
کے دلوں کا مجید اور راز جانتا ہے اس کے حکم کے بغیر ایک پتا
بھی نہیں مل سکتا وہی غفور الرحیم ہے باقی سب فانی ہے۔“

جواب جسے وہ تمام عمر یاد رکھے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے اس
کا، کیسی باتیں کرتی ہے۔ ایک دو دن میں اتنی زبان دراز
ہوئی۔ خدا کی پناہ، آگے نہ معلوم کتنا ظلم ڈھائے گی۔ میں
بے وقوف تھا جو سوچے سمجھے بغیر تیرے کہنے میں آ گیا۔ کسی
نے بچ کہا یہ عورت ذات بے وفا ہوتی ہے۔ ہوا کو
بدلتے دیر لگتی ہے لیکن عورت کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔

مجھے تارا مجھ سے ایسی توقع نہیں تھی۔ مجھے تیری یہ
حسین صورت زہر لگتی ہے۔ خدا تیرے حسن و شباب کو
غارت کرے۔ یاد رکھ بے وقوف عورت میں تجھے دنیا کے
لئے عبرت کا نشان بنادوں گا۔ ایک تو تو جرم کرتی ہے اوپر
سے غلط باتیں بھی کرتی ہے۔ خدا سے ڈر مجھے بڑھا
بد صورت کہتے ہوئے تجھے شرم نہ آئی۔ میں تو تیرا مجازی
خدا ہوں۔ مگر تو میری قدر کیا جانے۔ مال و دولت پر جان
دیتی ہے۔ شرافت کو نہیں پہچانتی، نیکی کی قیمت کو نہیں
جانتی۔ بے شرم عورت کل تجھے معلوم ہو جائے گا۔

خدا بخش کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہ
تھا کہ دریائے سواں کے جنگل کی طرف جا کر شیشے کی
دوسری گولی آسمان کی طرف اچھالے اور یہ دعا کرے کہ
اس کی سرکش بیوی گائے بن جائے اب وہ سکون سے تھا۔
دوسرے دن اس نے شیشے کی گولی آسمان کی طرف
اچھال کر دعا کی کہ ”میری بیوی گائے بن جائے۔“ دعا
کر کے جب وہ گھر واپس آیا تو گھر میں سکون دیکھا۔ بیوی
خاموشی سے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اچانک اسے نیند آ گئی۔

صبح ہوئی تو وہ سب سے پہلے اٹھا۔ بیوی کی طرف
دیکھا تو اس کا چہرہ گائے جیسا بنا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ
کھولا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔ چلتے چلتے چک بنی شہر
جا پہنچا وہاں کے بازاروں میں وہ ٹھونسنے پھرنے لگا۔
شام ہوتے ہی اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا اور گھر
آ گیا۔ جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا تو ایک ماتم برپا
پایا۔ بچے ڈر رہے تھے چلا رہے تھے وہ جیسے ہی اپنی کرسی
پر بیٹھا تو اس کی بیوی اس کے قدموں میں گر گئی اور اپنے
آنسوؤں سے اس کے پاؤں دھونے لگی وہ بہت رورہی
تھی وہ چاہتی تھی کہ آدمیوں کی طرح بوئے مگر اس کے



وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دمک کر دیں گی

مگزشتہ قسط کا خلاصہ

اور پھر رولو کا کے ذہن میں سوچوں کا طوفان سرا بھارنے لگا کہ سینکڑوں سال سے ویران مندر میں رات کے اس لمحے روشنی ہو رہی تو کیسے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مزید اور روشنی تیز ہو گئی تو رولو کا کے دل میں آیا کہ مندر میں جا کر دو کھینچا ہے پھر ایک اور خیال آیا کہ صبح کے وقت رامو کا کا سے معلوم کر لوں گا، اس جگہ کا نام شانی پور تھا، صبح کے وقت رولو کا نے رامو کا کا سے اس مندر کے بابت معلوم کیا تو رامو کا کا نے جو حقیقت بتائی اس سے سن کر رولو کا حیران رہ گیا۔ رامو کا کا کے مطابق ہر ماہ پونم کی رات اس مندر میں روشنی ہوتی ہے اور پھر پانکوں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے، اپنے وقت میں شانی پور بہت ہی ذرخیز اور شاداب علاقہ تھا مگر پھر نہ جانے کسی کی نظر لگ گئی کہ شانی پور ویران ہوتا چلا گیا، اکثر رات میں جوان نارپوں کا خون ہونے لگا اور ساتھ ہی ان کی عزت بھی پامال کی جانے لگی، رامو کا کا کی بات سن کر رولو کا کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ہونہ ہو اس میں ضرور کوئی گہرا راز ہے۔ اور پھر رولو کا آئندہ پونم کی رات کا انتظار کرنے لگا۔ پونم کی رات آئی تو رولو کا غائبانہ طور پر مندر میں پہنچ گیا۔ آدھی رات کے وقت اچانک مندر میں دو دیواروشنی پھیل گئی اور مندر میں موجود ناگ کے جسمے میں حرکت پیدا ہوئی، ناگ کی آنکھیں جیسے انگارہ برسائے لگیں، پھر ناگ کے منہ سے تیز روشنی نکل کر سامنے پڑنے لگی اور پھر اس روشنی میں ایک گھری نما چیز نظر آئی پھر اس گھری میں حرکت پیدا ہوئی، ارے وہ شے کچھ اور نینا بلکہ ایک خوب روو شیزہ تھی۔ ناگ کے سامنے ایک شخص بیٹھا تھا اور اس کی آواز سنائی دی، مدھو چل ناچ شروع کر، دیر نہ کر۔ ورنہ..... اور پھر وہ لڑکی اٹھی اور جنونی رقص شروع کر دیا، اور جب بندھاں ہو کر وہ گر پڑی تو وہ شخص اٹھا اور ایک ناگ کا روپ دھار کر لڑکی کو نگل گیا اور پھر ناگ کے جسمے کے منہ میں سما گیا، اور رولو کا اس کے کھوج میں لگ گیا کہ یہ معاملہ ہے تو کیا ہے۔ تو رولو کا کو معلوم ہوا کہ شانی پور کے مندر میں ایک پجاری تھا جو کہ عیاش طبیعت تھا۔ جو کہ اب مر چکا تھا رات کے اندھیرے میں اپنے پیروں کے ذریعے جوان لڑکیوں کو اٹھا لیتا تھا اور پھر انہیں بے عزت کرنے کے بعد ان لڑکیوں کو پیروں کے حوالے کر دیتا اور پھر وہ پیران لڑکیوں کا گلا بھینچ کر ان کا خون پی جاتے تھے۔ خیر رولو کا نے ناگ مندر کے پجاری کو پی چن کر بھگا کر بھگا کر بھگا کر نا شروع کر دیا۔ وہ ناگ مندر سے بھاگ گیا اس کے بعد رولو کا پھر اسے گھیر گھا کر مندر میں لے آیا۔ پھر اتنے میں ایک بھاری کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”پنڈت گوپی چند..... اب تو بتا کہ یہاں سے بھاگ کر کہاں جائے گا..... اب یہاں سے لکھتا تیرے بس کی بات نہیں..... کیا تو اب اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔“

(اب آگے پڑھیں)

اس کے بعد وہ مجسمہ فرش سے اوپر کو اٹھنے لگا اور اس حالت میں آگیا جیسا کہ وہ پہلے تھا اور پھر ناگ کی دونوں پتھریلی آنکھیں جیسے انگارہ اگلنے لگیں۔

پھر اچانک ایک دل دہلاتا منظر رونما ہوا، مجسمے کے منہ سے ایک بہت ہی دہشت ناک حقیقی خوفناک سانپ نکلا اور اس نے جو پھنکار ماری تو گوپی چند فرش سے دو فٹ تک اوپر کو چھل گیا۔

”کیا اب تو اپنے آپ کو بچا سکتا ہے..... کیا اب تو اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔“ اس طرح کی آوازیں پورے مندر میں گونج رہی تھیں۔

اور گوپی چند کرب و اذیت میں جتلا ہونقوں کی طرح چاروں طرف لرزیدہ لرزیدہ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں گوپی چند نے دیکھا کہ ناگ دیوتا کا ٹوٹا ہوا مجسمہ سمٹنے لگا اور پھر سمٹ کر مکمل مجسمہ بن گیا اور پھر



”ناگ دیوتا نہیں..... ناگ دیوتا مجھ پر سہاٹا کرو..... ناگ دیوتا میں پانی ہوں..... میں نے پاپ کیا، اب مجھے معاف کر دو..... ناگ دیوتا میں تمہارا سیوک رہا ہوں..... مجھے معاف کر دو..... ناگ دیوتا میری آتما کو سکون چاہئے..... میں بھگ رہا ہوں..... میری آتما کو کسی پل بھی چین نہیں۔

ناگ دیوتا میری سہاٹا کرو..... ناگ دیوتا میں بھاگ بھاگ کر تھک گیا ہوں..... دشمن میرے پیچھے لگ گیا ہے..... مجھے کسی پل چین نہیں لینے دے رہا۔“ اور پھر اچانک مندر کا دروازہ خود بخود دروازے کے ساتھ کھل گیا۔

پھر اتنے میں مجسمہ کے منہ سے جو سانپ نکلا تھا اس کی زبردست پھنکار سنائی دی اور ساتھ ہی اس پھنکار کے ساتھ شعلہ باہر نکلا۔ اور وہ شعلہ گوپی کی آتما تک پہنچتا کہ اس سے پہلے وہ جھٹ بجلی کی تیزی سے مندر کے دروازے کی طرف بھاگا اور دروازے سے باہر کو نکلتا چلا گیا۔

اور دروازے سے نکلے ہی آدھی طوفان کی طرح شمال کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی..... اس کے پاس منزل کا کوئی تعین نہیں تھا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک ایک زبردست جھماکہ ہوا..... وہ سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ کسی اندھ بھی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ وہ دیوار اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب وہ دیوار سے ٹکرایا تو دھماکے کے ساتھ ناقابل برداشت چنگاریاں نکلی تھیں۔ دیوار سے ٹکراتے ہی وہ کافی نیچے کی طرف گرا۔ وہ اچنبھے میں تھا اس کی بدمی میں کوئی بھی بات سامنے نہیں رہی تھی کہ یہ ہوا تو کیسے ہوا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔

ابھی وہ شش و پنج میں تھا کہ کسی آہنی ہاتھ نے اسے زبردست طریقے سے جلا لیا اور پھر اسے اوپر کی جانب بہت زور سے اچھال دیا۔ تو وہ ایک چھوٹی گیند کی طرح اوپر کو طوفانی ہوا کی مانند بڑھا۔

پھر اس آہنی ہاتھ نے اسے اوپر سے نیچے کی جانب

زوردار سے جیسے دھکا دیا۔ تو وہ اوپر سے نیچے کی طرف تیزی سے گرنے لگا۔ اور پھر وہ نیچے زمین سے ٹکراتا کہ وہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔

لیکن وہ ٹھہرا نہیں تھا بلکہ کسی آہنی شکنجے میں جکڑ چکا تھا۔ آہنی ہاتھ کی گرفت سخت سے سخت ترین ہوتی جارہی تھی..... وہ حال سے بے حال ہو گیا..... کرتا تو کیا کرتا..... کیونکہ اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا۔ اور جو کچھ بھی ہو رہا تھا رولوکا کے اشارے پر، رولوکا کے کارندے اس کے ساتھ ایسا کر رہے تھے۔

رولوکا کا اپنے کارندوں کو حکم تھا کہ ”گوپی چند کی آتما کو صرف اور صرف بھاگا بھاگا کر ہلکان کرنا ہے اور جب تک میں نہ بولوں کسی صورت بھی اس کا خاتمہ نہیں ہونا چاہئے۔“

اور یہی سوچ کر رولوکا کے کارندے گوپی چند کی آتما کو طرح طرح سے پریشان کر رہے تھے اور اسی بنا پر وہ آتما بھاگ بھاگ کر ہلکان ہو رہی تھی۔

پھر گوپی چند کی آتما کو ایک کان پھاڑ دینے والی آواز سنائی دی۔ ”پانی چل بھاگ یہاں سے..... ترنت بھاگ جا اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا اور اگر پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو جل کر خاک ہو جائے گا۔“ اس آواز کو سننا تھا کہ وہ جیسے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

بھاگتے بھاگتے اس کا برا حال تھا..... اسے لپکا یقین ہو چلا تھا کہ اب میرا خاتمہ نچیت ہے، اور اسی سبب اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کہ اتنے میں اس کی کانوں میں گھنٹیاں بجنے کی آوازیں سنائی دیں تو جھٹ اس نے آنکھیں کھول دیں اور جب اس نے نیچے زمین کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔

زمین پر سیڑیوں کی تعداد میں مرد عورت بچے بوڑھے ایک جگہ جمع تھے۔ گیر والباس میں دھوئی باندھے ہوئے ایک عمر رسیدہ شخص سر سے منجھا اور بڑے پیٹ کا مالک اپنے ہاتھ میں ایک پیتل کی بہت بڑی گھنٹی لئے کھڑا تھا اور تو اتارے گھنٹی بجا رہا تھا۔

اس جگہ جمع سارے لوگ گھنٹی باندھے ایک سمت

دیکھ رہے تھے اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ ان تمام لوگوں کے سامنے ایک بہت بڑا پتھر کے ناگ کا مجسمہ ایستادہ تھا۔

بڑے اور موٹے پیٹ کا پجاری بلند آواز سے کوئی اشلوک بھی پڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ہاتھ میں پکڑی کھنٹی کو بھی بجا رہا تھا اور پجاری کے سامنے ایک گڑھے میں آگ روشن تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پجاری سامنے بڑے دو برتنوں میں موجود شے کو اپنی منہی میں لے کر آگ میں ڈالتا تو فوراً گاڑھا گاڑھا سفید دھواں اٹھنے لگتا۔ دونوں برتنوں میں سے ایک میں صندل اور دوسرے میں چندن کا براہہ تھا۔

گوپی کی آتما نے جب یہ سب دیکھا تو اسے بڑی خوشی ہوئی کہ یہاں تو ناگ دیوتا کی پوجا ہو رہی ہے اور پھر یہی سوچ کر وہ اس جگہ آ موجود ہوئی اور پھر اس نے ایک بہت بڑے ناگ کا روپ دھار لیا۔

ناگ کا روپ دھارنے کے بعد وہ سب کے سامنے نہیں آیا بلکہ وہ ناگ کے مجسمے کے پیچھے چھپا رہا۔ اب وہ پجاری بہت زیادہ بلند آواز میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔ پجاری کے ساتھ وہاں موجود دیگر لوگ بھی پجاری کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ دہرانے لگے تھے۔

اشلوک پڑھتے پڑھتے پجاری پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پجاری اپنے آپے میں نہ ہو۔

اب شام کا اندھیرا ہر سو آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گھٹاؤپ اندھیرا پھیل گیا، اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ چھ جوان اپنے کاندھے پر گیس کی پتی رکھے ایک طرف سے نمودار ہوئے اور چھ کی چھ گیس پتیوں کو مختلف جگہ رکھ دیا۔

اب اس جگہ ایک مخصوص دائرے میں روشنی پھیل گئی تھی۔ زیادہ تر روشنی ناگ دیوتا کے مجسمے پر پڑ رہی تھی۔

اس جگہ موجود سارے لوگ جیسے مستی میں جھوم رہے تھے کہ اچانک ایک زبردست دل دہلائی پھنکار سنائی دی۔ اس پھنکار کو سن کر سارے لوگ پورے جسمانی طور سے لرز کر رہ گئے اور پھر سب کی اچھنبھ میں

پڑی ہوئی نگاہیں ایک ننگ کے مجسمے پر پک گئیں۔ وہاں پر موجود سارے لوگ اب بلند آواز سے پجاری کے پڑھتے اشلوک کو دہرانے لگے تھے۔ اب پجاری جلدی جلدی آگ میں چندن اور صندل کا براہہ ڈالنے لگا تھا۔

پھر سانپ کی زبردست بھیانک پھنکار سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست خوفناک دل کو دہلاتا، پورے جسم پر لرزہ طاری کرتا اور آنکھوں کو پتھرا دینے والا سانپ ناگ کے مجسمے کے منہ سے باہر کو نکلا۔ ”اوہ! بھگوان..... وہ سانپ تھا یا پھر ناقابل بیان بلا جو کہ اپنی سرخ انگارہ برساتی قہر آلود آنکھوں سے پورے مجمع کو دیکھ رہا تھا۔“

اچانک پھر اس نے زبردست پھنکار ماری..... اس کی ہر پتی پھنکار پچھلی پھنکاروں سے نہیں زبردست دل کو دہلا رہی تھی۔

دائرے کی شکل میں کھڑے ہمارے لوگ جیسے کہ بت بنے اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ اگر کوئی حرکت کرتا وجود تھا تو وہ پجاری تھا جو کہ ابھی بھی اشلوک پڑھنے میں مصروف تھا اور تو اتر سے اپنے ہاتھ میں موجود کھنٹی بجا رہا تھا۔

پھر اچانک پجاری نے ایک ایک کر کے وہ دونوں برتن اٹھائے جس میں چندن اور صندل کا براہہ پڑا تھا۔ دونوں برتنوں کو اس نے جلتی اور پھڑکتی آگ میں الٹ دیا۔

سارے کا سارا چندن اور صندل کے براہے کو آگ میں پڑنا تھا کہ زبردست دھواں اٹھنا شروع ہوا اور وہ دھواں اس محدود جگہ پر چاروں طرف پھیل گیا۔ دھواں اتنا تھا کہ کوئی بھی کسی کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس دوران پجاری کے پڑھتے ہوئے اشلوک کھنٹی کی آواز اور پھر ساتھ ہی ساتھ سانپ کی پھنکار سنائی دیتی رہی۔

پھر اچانک اس جگہ سے دھواں چھٹنا شروع ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا دھواں آسمان کی طرف اٹھنے لگا۔ اور چند منٹ میں ہی سارا دھواں غائب ہو گیا۔

دھواں کے غائب ہوتے ہی لوگوں کی نظریں پھر

سے سانپ پر بھڑک گئیں۔

اب پجاری کے قدم آہستہ آہستہ ناگ دیوتا کے مجسمہ کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ بہت نپا تلا قدم اٹھاتا ہوا ناگ دیوتا کے مجسمے کے قریب ہونے لگا۔

مجمع میں موجود سارے لوگ اس طرح نظر آرہے تھے کہ جیسے وہ جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ پتھر یا مٹی کے بت ہوں، ان تمام لوگوں میں کسی قسم کی بھی جنبش نہ تھی، صرف اور صرف ان لوگوں کی آنکھیں ایسی تھیں جن میں زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔

کہ اچانک پجاری کی خوفناک کرخت دہشت ناگ اور لرزہ بر اندام چیخ سنا کی دی۔ ”ناگ دیوتا..... سہانچا کریں..... ناگ دیوتا ایسا نہ کریں..... ہم منش تو غلطی کا پتلا ہیں، ہم سے جو انیائے ہوئی اسے معاف کریں، ناگ دیوتا آپ پر ہم سب کی جانیں قربان..... مگر آپ طیش اور غصہ میں نہ آئیں.....“

اب ناگ دیوتا کے مجسمے سے جو سانپ نکلا تھا اس کے منہ سے لکیر کی صورت میں شعلے نکل رہے تھے۔

پھر پجاری کی لرزیدہ آواز جیسے گونجنے لگی۔ ”ناگ دیوتا ہم سب زدوش ہیں..... ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم کہ یہ کیسے ہوا؟“

ناگ دیوتا اپنے سیوکوں پر رحم کریں..... ہماری ناملیوں کو معاف کر دیں..... ہم سو بھہ بوجھ اور عقل کے اندھے ہیں۔ آپ کا بہت بہت دھننے واہ..... آپ شجی ثالی ہیں اور ہم.....“ اور پجاری کی آواز ادھوری رہ گئی۔ اب ناگ اب سانپ کے منہ سے متواتر شعلے نکل رہے تھے اور اس کی دونوں آنکھوں سے جیسے پگاریاں.....

دراصل وجہ یہ تھی کہ ناگ کے مجسمے کے پیچھے سے ایک اور زبردست خوفناک سانپ نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ لوگوں کی پھٹی پھٹی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اب دونوں سانپ قہر آلود نظروں سے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ اور دونوں کے منہ سے شعلے نکلنے نظر آرہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ دونوں کی آنکھیں جیسے چنگاریاں برسا رہی

تھیں۔ اور وہ منظر دیکھ کر لوگ لرزہ بر اندام تھے۔

کیونکہ آج سے پہلے گاؤں کے لوگوں نے دو سانپوں کو ایک ساتھ نہ دیکھا تھا اور نہ ہی ناگ دیوتا کے مجسمے سے نکلنے والا سانپ اتنے غضب ناک حالت میں نظر آیا تھا۔

جب کبھی ایسا ہوا نہیں تو آج ایک کے بجائے دو ناگ دیوتا ایک جگہ وہ بھی غضبناک حالت میں۔

اور پھر لوگوں نے ایک اور بھانک منظر دیکھا.....

دونوں سانپ اب آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے پر اپنی پھکار کے ذریعے شعلے برسا رہے تھے۔ دونوں سانپ ناقابل فراموش انداز میں غضبناک ہو رہے تھے اور دونوں کی کوشش تھی کہ وہ اپنے مد مقابل کو نیست و نابود کر دیں۔

اور اس جگہ کھڑے ہوئے گاؤں کے سارے لوگوں پر کچکی طاری ہو گئی تھی۔

سارے لوگ اچنبھے میں تھے کہ دیکھو اب، ہوتا تو کیا ہوتا ہے۔

پجاری اپنا منہ اوپر آسمان کی طرف کر کے اشلوک پڑھنے لگا اور ہاتھ اوپر کر کے کھٹی بجانے لگا..... کہ پھر اچانک پجاری ناگ دیوتا کے مجسمے کے سامنے زمین پر سجدہ ریز ہو گیا۔ اور بلند آواز سے اشلوک پڑھنے لگا۔

پجاری کی دیکھا دیکھی اس جگہ جتنے بھی لوگ موجود تھے وہ سارے کے سارے پجاری کی طرح زمین پر سجدہ ریز ہو گئے۔ سب نے اپنے ہاتھ آگے کر کے جوڑ رکھے تھے۔

اتنے میں آسمان کی طرف سے دائرہ کی شکل میں دھواں نیچے کو آیا اور اس دھوئیں نے دونوں سانپوں کو اپنے دائرہ میں لے لیا۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارا دھواں دونوں سانپوں کو لئے ہوئے اوپر کو اٹھنا شروع کر دیا اور پھر کافی اوپر جا کر غائب ہو گیا۔

دھوئیں کا اس جگہ سے غائب ہونا تھا کہ تیز دودھیا روشنی سارے میدان میں پھیل گئی۔ روشنی کو دیکھ کر پجاری نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا اور ایک بھر پور نظر دہاں پر

شوگاف نعرہ لگانے لگے..... ناگ دیوتا کی جینے ہو۔“
 کافی دیر تک یہ نعرہ بلند ہوتا رہا، اس کے بعد پجاری کی
 آواز آئی..... ”سجنو! اب آپ لوگ اپنے اپنے گھر
 جائیں..... اور شام سے پہلے پہلے دودھ ضرور اس جگہ
 رکھ دیں۔“ یہ بول کر پجاری خاموش ہو گیا اور پھر تمام
 لوگوں کے ساتھ واپس گاؤں میں آ گیا۔

ناگ دیوتا کا مجسمہ گاؤں سے باہر تھا۔ اس جگہ بہت
 سارے ٹیلے تھے اور ہر طرف ہریالی تھی، ہرے بھرے
 کھیت اور ہرا بھرا جنگل بھی تھا۔ اس جگہ کی خوبصورتی دیکھ
 کر لوگ جھوم اٹھتے تھے اور لوگوں کی خواہش تھی کہ وہ اپنا
 زیادہ تر وقت اس جگہ گزاریں۔ مگر اس جگہ رات کا اندھیرا
 پھیلنے ہی عجیب سی دیرانی کیلپنتی تھی۔

لوگوں کے دلوں پر خوف بیٹھ جاتا تھا، کچھ لوگوں پر
 تو کچھ بھی طاری ہو جاتی تھی اور پھر اس وجہ سے لوگ
 اس علاقے میں جانے سے کتر آتے تھے۔

پجاریوں اور پنڈتوں کا کہنا تھا کہ یہ سارا علاقہ
 ناگ دیوتا کے دس میں ہے اور رات کا اندھیرا پھیلنے ہی
 اس جگہ ناگ دیوتا حقیقت میں آ کر اپنا وقت گزارتے
 ہیں اور ناگ دیوتا کے ساتھ ان کے بے شمار سیوک بھی
 ساتھ میں آتے ہیں اور اسی وجہ سے پورے علاقے میں
 ناگ دیوتا کے حکم سے خوف کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

اور لوگ اس طرف کارخ نہیں کرتے کیونکہ ہو سکتا
 ہے کہ لوگوں کی آمد سے ناگ دیوتا اور ان کے سیوکوں کو
 کسی قسم کی کوئی دشواری پیش آئے اور ان کے آرام
 سکون میں خلل پڑے۔

گاؤں کے سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں
 واپس آ گئے تھے اور بہت زیادہ حیرت میں تھے کہ ناگ
 دیوتانے اپنا درشن کیوں کرایا اور اگر درشن کرنا ہی مقصود
 تھا تو ناگ دیوتا اتنے غصے میں کیوں تھے۔ ناگ دیوتا کی
 آنکھوں سے چنگاریاں اور منہ سے خوفناک پھونکار کے
 ساتھ شعلے کیوں نکل رہے تھے؟ اور یہ بات بھی حقیقت
 ہے کہ جب دیوی دیوتا خوش ہو کر اپنے چاہنے والوں کو
 اپنا درشن کراتے ہیں تو بہت ہی پیار و محبت لوگوں پر

موجود سارے مجسمہ پر زلوٹوں پر ڈالا۔ اور پھر حیرت
 سے ناگ دیوتا کے جسمے کی طرف دیکھنے لگا۔ پجاری
 بہت ہی حیرت میں تھا کیونکہ اس وقت وہاں پر دو
 سانپوں کا نظر آنا بہت ہی حیرت ناک تھا۔
 خیر کافی دیر تک پجاری حیرت و استعجاب میں پڑا
 رہا۔ پھر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ ابھی تک تمام لوگ
 مجسمہ پر نہ تھے۔

”گاؤں والو! اب اپنے سر اوپر اٹھاؤ۔“ یہ سننا تھا
 کہ سارے لوگ اپنی اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”سجنو! ناگ دیوتا کی یہ کرپا ہے کہ ناگ دیوتانے
 اپنا درشن کرایا۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہمارے بھاگ کھل گئے،
 ورنہ کبھی ایسا نہ ہوا، اور نہ ہی ہم تمام لوگوں نے سنا ہے کہ
 کبھی ناگ دیوتا نے اس طرح پوجا کے درمیان اپنا
 درشن کرایا ہو، ارے اس طرح صدیاں گزر جاتی ہیں اور
 لوگ ناگ دیوتا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ترس
 جاتے ہیں۔

سجنو! اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہمارے
 گاؤں میں اور ہر گھر میں خوشیاں آئیں گی، پورے
 گاؤں میں خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ میرا مشورہ ہے کہ
 آپ تمام لوگ ناگ دیوتا کی بڑھ کر پوجا کرو اور
 ناگ دیوتا سے برا تھنا کر دتا کہ ناگ دیوتا ہم سے خوش
 ہو کر بار بار اپنا درشن کرائیں۔

آپ لوگوں سے ایک بقی ہے کہ شام کا اندھیرا
 پھیلنے سے پہلے پہلے جتنا زیادہ ہو سکے اپنے اپنے گھروں
 سے کسی نہ کسی برتن یا پیالے میں دودھ لا کر اس جگہ رکھ کر
 چلے جائیں تاکہ ناگ دیوتا خوش ہو کر دودھ پیئیں۔

اور جہاں تک مجھے معلوم پڑتا ہے کہ ناگ دیوتا
 دودھ پینے کے لئے اکیلے نہیں بلکہ اپنے بہت سارے
 سیوکوں کو بھی اپنے ساتھ لائیں گے۔“ اور یہ بول کر
 پجاری خاموش ہو گیا۔

اتنے میں ایک نوجوان آگے بڑھا اور بولا۔ ”ناگ
 دیوتا کی جے ہو..... ناگ دیوتا کی جے ہو۔“
 یہ سننا تھا کہ اس جگہ موجود سارے لوگ ٹلک

نچھاور کرتے ہیں۔

اور ایک بات یہ بھی ان لوگوں کے ذہنوں میں کھٹک رہی تھی کہ چلو ناگ دیوتا نظر آئے مگر پھر بعد میں ایک دیوتا کا اور نظر آنا کیا معنی رکھتا ہے اور پھر یہ کہ دوسرے دیوتا کا اس جگہ آن موجود ہونا اور پھر ایک دوسرے کو قہر آلود انداز سے دیکھنا اور پھر غم و غصے اور قہر برساتے ہوئے ایک دوسرے کے وجود پر شعلے برسانا کیا معنی رکھتا ہے۔

دونوں سانپ ایک دوسرے کے مد مقابل ڈٹے پڑے تھے اور یہی نہیں اس کے بعد دل دہلاتا وہ منظر جس میں کہ دھوئیں کا ایک دائرہ آسمان سے نیچے اترتا اور پھر دونوں سانپوں کو دائرے میں لئے ہوئے اوپر آسمان میں غائب ہو جانا، کیا چکر تھا۔

خیر لوگ جتنا سوچتے ان کا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ لہذا لوگوں نے یہ بات اپنے دماغ میں بیچانی کہ بھگوان جانے کیا رام لایا ہے۔

ادھر پجاری کا دماغ بھی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ کیوں کہ ابھی تک اس کی زندگی میں کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ نہیں رونما ہوا تھا۔

پجاری کی عمر اس وقت ستر کے قریب تھی اور اس ستر سالہ زندگی میں یہ پہلا واقعہ رونما ہوا تھا جس نے پجاری کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ اپنے بھی پجاری بہت ہشتی شالی تھا۔ جنسوں اور منسروں پر مبور رکھتا تھا، پجاری نے بڑے بڑے جاپ کر رکھے تھے۔

یہی نہیں بلکہ پجاری کے قبضے میں کئی بیڑ بھی تھے۔ اس نے اندیکھی تو تو اپنے دوش میں کر رکھا تھا۔

ناگ دیوتا کے جسم سے پاس سے آنے کے بعد مندر میں پجاری آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا اور پھر اشلوک پر اشلوک پڑھتے جا رہا تھا۔

پجاری کی خواہش تھی کہ اسے کسی بھی غیبی طاقت سے یہ معلوم ہو جائے کہ ناگ دیوتا کی پوجا کرتے ہوئے جو منظر رونما ہوا تھا وہ اصل میں کیا تھا۔

اشلوک پڑھنے کے بعد پجاری اپنے خاص خاص جاپ کے الفاظ دہرانے لگا اور اپنے ایک خاص بیڑ کو طلب کرنا چاہا۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر تک وہ جاپ کرتا رہا کہ اچانک مندر کے ایک کونے میں گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھنے لگا اور پھر ایک بھاری کرخت آواز پجاری کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”مہان شمتی مہاراج۔۔۔۔۔ آپ کا خدمتگار شونا حاضر ہے، حکم کریں۔“

یہ آواز سن کر پجاری نے فوراً اپنی آنکھیں کھول دیں اور حاضر ہونے والے بیڑ سے مخاطب ہوا۔ ”شونا۔۔۔۔۔ میں نے تجھے یوں کشت دیا ہے کہ تو یہ بتا کہ پوجا کے وقت مجھے کے اندر سے باہر نکل کر ناگ دیوتا نے اپنا درشن کرایا، اور پھر اچانک ناگ دیوتا کے منہ سے شعلے نکلنے لگے اور ساتھ ہی آنکھوں سے چنگاریاں بھی متواتر نکلنے لگی تھیں، اور یہ بات میری بدھی میں نہیں بیٹھ رہی۔

اور پھر دوسری بات یہ کہ ناگ دیوتا کے سامنے ایک اور۔۔۔۔۔ اور پجاری کی بات ادھوری رہ گئی، کیونکہ اسی وقت شونا کی آواز سنائی دی۔

”مہاراج دراصل۔۔۔۔۔“ اور پھر جلدی سے شونا بولا۔ ”مہاراج۔۔۔۔۔ شام کر دیں۔۔۔۔۔ اب میں چلتا ہوں۔“ اور یہ بولتے ہی شونا ما اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔

اتنے میں بہت بھاری اور کرخت آواز پورے مندر میں گونجنے لگی۔ ”پجاری جو کچھ ہوا ہے اسے تو بھول جا۔۔۔۔۔ یہ بات تو نہیں سمجھ سکتا۔۔۔۔۔ بس جتنا سمجھنے کی تجھ میں طاقت ہے وہیں تک رہ۔۔۔۔۔ اور اپنی سزبان بند رکھ۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ اگر تو نے اچھل کود کی تو نقصان میں رہے گا۔“

پجاری نے جوا تانتا سنا تھا کہ وہ اندر تک دہل کر رہ گیا۔ اس پر جیسے کچھ پیٹاری ہو گئی۔ اس کے منہ سے فوراً نکلا۔۔۔۔۔ ”جی ناگ دیوتا۔۔۔۔۔ میری ہمت کیا جو میں اب معاملے میں کچھ بھی سوچوں۔۔۔۔۔ آپ کی کراپا ہوگی آپ مجھے شام کر دیں۔۔۔۔۔“ اور یہ بول کر پجاری سجدہ ریز

ہو گیا۔ اس کے بعد وہ غیبی آواز آتا ہند ہو گئی۔

طاقتور کارندہ فوراً اس جگہ پہنچا اور پجاری کے ہیر کو چلتا کر دیا اور پجاری کو اس معاملے میں کچھ سوچنے اور بولنے سے روک دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جنگل میں موجود گوبلی چند کی آتما بہت بیاکل تھی، اسے کبھی مل بھی چھین نہیں مل رہا تھا۔

وہ اپنی بے کلی پر قابو پانے سے قاصر تھی، ابھی تک وہ جہاں بھی جا رہی تھی ہر جگہ اسے منہ کی کھانی پڑتی تھی۔ رولوکا کے کارندے اسے ایک پل کے لئے بھی سکون نہیں لینے دے رہے تھے۔

وہ فلک شکاف آواز کے ساتھ چیخنے لگی۔ ”ناگ دیوتا۔ میری سہائتا کرو۔ میں بہت پانی ہوں۔ مجھ پر کر پا کرو۔“ اس کی آواز جیسے پورے جنگل کو دھلا رہی تھی۔

اتنے میں اسے ایک آواز سنائی دی۔ ”ارے تو کون ہے؟ جلدی سے میرے سامنے آ۔“ میری تپسیا کو نصیحت کر دیا۔ میں گیان دھیان میں لگا ہوا تھا۔ تو کون ہے جلدی سے میرے سامنے آ۔“

اس آواز کا سننا تھا کہ گوبلی چند کی آتما اور بھی بیاکل ہو گئی۔

اس نے چاہا کہ فوراً سے پیشتر اس جنگل سے نکل جائے مگر بے سود۔ اسے اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ کیونکہ اب پورے جنگل کے گرد ایک ان دیکھا زبردست حصار قائم ہو چکا تھا اور یہ حصار اس کے گرد قائم کر دیا تھا جس کی آواز گوبلی چند کی آتما کو سنائی دی تھی۔

دراصل اس جنگل میں ایک بہت ہی مہان ہشتی سادھو اپنے گیان دھیان میں لگا پڑا تھا۔ اس نے دنیا سے اپنا ناٹھ توڑ کر اس جنگل میں تھا۔

اور جب گوبلی چند کی آتما نے فلک شکاف واویلا مچایا تو سادھو کے گیان دھیان میں خلل واقع ہوا، اور پھر وہ تلش میں آتے ہوئے پورے جنگل کے گرد حصار قائم کر دیا تاکہ وہ ہستی جس نے کہ اس کا من گیان دھیان

کافی دیر تک پجاری سجدہ ریز رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا خوف کم ہوا۔ پھر اس نے اپنا سر اوپر کھڑکایا اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا مگر اب وہاں پر کچھ بھی نہ تھا۔ دراصل ابھی تک جو کچھ بھی ہوا تھا وہ رولوکا کے کہنے اور اشارے پر ہوا تھا۔

جب گوبلی چند کی آتما ایک سانپ کا روپ دھار کر ناگ دیوتا کے جسم کے پیچھے آ کر چھپ گئی تھی تو اسی وقت رولوکا کا ایک کارندہ۔

ناگ دیوتا کے منہ سے ایک ناگ کی شکل میں باہر کو نکلا غضبناک حالت میں۔ تاکہ وہاں موجود گوبلی چند کی آتما کو ناگ کی شکل میں دیکھ کر لوگ اس کی پوجا نہ کرنے لگیں اور اس طرح اس آتما کو ٹھہراؤ کا موقع مل جاتا۔

ویسے گوبلی چند کی آتما بھی کوئی عام آتما نہ تھی وہ بھی کافی ہشتی شالی تھی اور پھر فوراً اس نے سوچا کہ ناگ دیوتا کے جسم کے منہ سے نکلنے والے سانپ پر قابو پالے اور یہی سوچ کر وہ بھی غضبناک حالت میں اپنے مد مقابل کی طرف بڑھا۔

اور پھر اگر اس وقت ان دونوں سانپوں میں سے ایک بھی زیر ہو جاتا تو معاملہ بگڑ سکتا تھا اور چونکہ رولوکا اپنے کمرے میں بیٹھا سب کچھ واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ تو یقیناً رولوکا ایسا کچھ کر دیتا کہ گوبلی چند کی آتما جو کہ سانپ کے روپ میں تھی اس کا خون خرابہ ہو جاتا۔ اور پھر اس طرح اس کا خاتمہ یعنی ہو جاتا، لیکن رولوکا ابھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ فی الحال گوبلی چند کی آتما کا اتنی جلدی خاتمہ ہو جائے۔

لہذا رولوکا نے فوراً اپنی غیبی طاقت کو دھوکے کی شکل میں بھیجا کہ وہ پلک بھینکتے ہی ان دونوں سانپوں کو اٹھا کر ور لے جائے اور گوبلی چند کی آتما کو جنگل میں چھوڑ دے، اور ہوا بھی یہی کہ دونوں سانپ اس دھوکے کے اثر میں چھپ کر غائب ہو گئے۔

اور جب پجاری نے اپنے خاص ہیر شونا سے مل حقیقت کو جاننا چاہا تو وہاں پر بھی رولوکا کا ایک بہت

سے بھگایا تھا وہ اس سے بچ کر جنگل سے باہر نہ نکل جائے۔

لہذا مجبوراً گوہی چند کی آتما مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق بہت کرب و اذیت کی حالت میں اس طرف بڑھنے لگی جس طرف اس سادھو کی کشتیا تھی۔

جب وہ قریب گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت ہی ضعیف لاغر سادھو کشتیا کے باہر بیٹھا ہے۔ اس کی آنکھیں اس طرف لگی پڑی تھیں۔ جس طرف سے گوہی کی آتما آ رہی تھی۔

سادھو پر نظر پڑتے ہی گوہی دہشت زدہ ہو گیا۔ اس پر کچھ طاری ہو گئی۔ اس کی آواز لرزنے لگی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سادھو سے کوئی بات کر سکے۔

اتنے میں سادھو کی گردن آواز گونجی۔ ”او تابکار۔۔۔۔۔ دشت۔۔۔۔۔ پانی۔۔۔۔۔ تو نے میرے گیان دھیان میں خلل ڈال دیا۔ میں ڈیڑھ برس سے یہ جاپ کر رہا تھا۔ میں دنیا اور منش کو تیاگ کر یہاں آ بیٹھا ہوں۔ ارے یہ دنیا تو کونسی ہے۔۔۔۔۔ یہاں پر منش اپنے مطلب اور نفسانی خواہشات کا غلام بنا بیٹھا ہے۔ تو بھی تو کوئی کم نہیں۔۔۔۔۔ تجھے پرناگ دیوتا نے کرپا کیا۔۔۔۔۔ تجھے ناگ دیوتا نے اپنا سیوک مان لیا، مگر تو نے ناگ دیوتا کا مان خاک میں ملا دیا۔

ارے پانی تو اپنے نفس کا غلام بن گیا۔۔۔۔۔ تو نے معصوم اور پوتر نارایان کورات کے اندھیرے میں بے عزت کیا۔ اور یہی کہیں بلکہ ان کا خون اپنے پیروں کو پلا لیا۔

تیرا ظلم اور بڑھا اور تو نے کئی نوجوانوں کو اپنی خونی خواہش کے جھینٹ چڑھا دیا۔۔۔۔۔ تو سوچ!! تو نے کتنا ظلم کیا جو کہ دیوی دیوتاؤں کے برداشت سے باہر ہو گیا۔

اور پھر تو ٹھاکر کے پیچھے پڑ گیا۔۔۔۔۔ ٹھاکر کی پوتر پتری لکھی تو نے نہیں چھوڑا۔

تو نے ٹھاکر سے جھوٹ بولا کہ ناگ دیوتا تمہاری

پتری مدھو کو اپنا سیوک یا داسی بنانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ بتا کیا یہ سچ تھا۔۔۔۔۔ تیرا جواب ہاں میں نہیں ہوگا۔ کیونکہ تو یہ جھوٹ بول کر مدھو کو اپنے دیش میں کرنا چاہتا تھا۔

اور جب تو اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہو سکا تو تو نے وہی کچھ کیا جو اب تک دیگر نارایوں کے ساتھ کرتا چلا آ رہا تھا۔ اپنے پیروں سے مدھو کو بھی اٹھوایا اور۔۔۔۔۔ پوتر مندر میں تو نے اس کی عزت کو خراب کر دیا اور پھر تیرے پیروں نے اس کا خون کر کے ایک ایک بوند بوند بوند کر دیا گیا۔۔۔۔۔ اس کے لئے ٹھاکر بنارس میں ایک مہمان شکتی شالی ناگ دیوتا کے مندر میں موجود پنڈت کے پاس پہنچا اور اپنی ساری پتہ سنا ڈالی۔

پنڈت بہت ہی زیادہ گیانی تھا۔۔۔۔۔ پنڈت نے ٹھاکر کی بات پر مکمل اعتبار نہ کیا اور اپنے گیان دھیان سے بھی اصل حقیقت کو معلوم کر لیا تو پنڈت بھی اندر تک دہل کر رہ گیا۔

پنڈت کا دل ڈوبنے لگا کہ ناگ دیوتا کا سیوک اس قدر کالے کرتوتوں کا مالک جو کہ رات کے اندھیرے میں لوگوں کا خون ہی نہیں بلکہ عزتیں بھی خراب کر رہا تھا۔

اور پھر پنڈت کو طیش آ گیا۔۔۔۔۔ پنڈت نے یہ معاملہ ناگ دیوتا کے سامنے رکھ لیا۔ تو ناگ دیوتا بولے۔ ”وہ بچاری کے روپ میں رکھ مٹش ہے۔۔۔۔۔ اب اس کا جلد از جلد انت ہونا چاہئے۔

پنڈت میں تجھے یہ کام سونپتا ہوں کہ تو اس کا انت کرادے تاکہ لوگ سکھ کا سانس لے سکیں اور دیے بھی ہنسنا سراسر سبز علاقہ دیران ہوتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ اور اب بھی لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شانتی پور سے بھاگ رہے ہیں۔

اور پنڈت سن لے۔۔۔۔۔ اس پانی کا انت بھی اسی طریقے سے ہونا چاہئے جس طریقے سے وہ لوگوں کا انت کر رہا ہے۔

اس کے بعد ایک مہا پرش آئے گا جو کہ گوہی کی آتما

کو نہیں بھی چین نہیں لینے دے گا، وہ گوپی کی آتما کو بھگا بھگا کراتا ہلکان کر دے گا کہ گوپی کی آتما کہیں کی بھی نہ رہے گی۔ اور پھر جب اس مہاراج کا سن چاہے گا تو وہ گوپی کی آتما کا بھی انت کر دے گا۔

پنڈت اب میں چلتا ہوں..... اس کام میں اب نہیں کرنا۔“ اور پھر ناگ دیوتا کی آواز آتا بند ہو گئی۔ ناگ دیوتا جاتے تھے۔

ٹھا کر کو مطمئن کر کے پنڈت نے واپس بھیج دیا اور پھر اس رات پنڈت نے اپنے ہمتی شالی بیروں کو بھیج کر تیرا انت کرا دیا۔

پاپی آتما اب تو بتا تیرا کیسا برا حال ہے۔ اگر تو ذرا بھی ناگ دیوتا کا خیال کرتا..... ارے تو مندر کا رکھوالا لوگوں کا بھروسے والا..... ناگ دیوتا کا سیوک..... چھی بھی تو نے کیسا پاپ کیا۔

پاپی میرے پاس تیرے لئے کچھ بھی نہیں..... میں تیرے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا..... تو فوراً یہاں سے کلکتہ چلا جا..... ماں کالی کلکتہ والی کے مندر میں..... شاید کالی ماں تیرے لئے کچھ کر دے..... یا ہو سکتا ہے ماں تیرے لئے ناگ دیوتا سے کہہ کر تجھ پر کرپا کرادے۔ ویسے کرپا کے لائق ہے تو نہیں، اب یہ دیوی ماں پر منحصر ہے کہ شاید اس کا دل تیرے لئے توجہ جائے۔ اب ترنت تو یہاں سے چلا جا۔“ سادھو نے غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر گوپی بولا۔ ”مہاراج! دشمن میرے پیچھے لگا پڑا ہے..... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے کلکتہ نہ پہنچنے دے اور راستے میں ہی دبوچ لے۔“

پھر سادھو بولا۔ ”اب یہ تیرا مسئلہ ہے..... میں نے ایک راستہ بتا دیا ہے، اب آگے تیرے ساتھ کیا ہوگا مجھے نہیں معلوم..... مگر اب تو یہاں سے چلا جا..... میں نے جنگل کے باہر جو حصار قائم کیا تھا اسے میں نے ہٹا دیا ہے۔ جا جلدی سے نکل جا۔“

سادھو کی حقیقی اور کھری کھری باتیں سن کر گوپی پلٹا فوراً جنگل سے باہر کو نکل کر ایک طرف آندھی اور

طوفان سے بھی تیز پرواز کرنے لگا۔
ادھر رولو کا کے کارندے پل پل کی خبر رولو کا تک پہنچا رہے تھے۔ اور ویسے رولو کا بھی اپنی مخفی طاقتوں سے سب کچھ معلوم کر رہا تھا۔

رولو کا کے کارندے غیبی طور پر گوپی کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

گوپی کی آتما آنا فانا کلکتہ پہنچ گئی۔ اور پلک جھپکتے ہی کالی کے مندر میں گھس کر غائبانہ طریقے سے کالی کے چرنوں میں جبدہ ریز ہو گئی۔

زار و قطار اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کالی کے چرنوں میں وہ ہچکیاں لے کر کالی کو پکار رہی تھی۔ ”ماں میری سہائتا کرو..... ماں میں بہت پاپی ہوں..... میں ابھی من کے کارن لوگوں کے ساتھ انیائے کرتا رہا..... میرے پاپوں کا گھڑا جب بھر گیا تو ناگ دیوتا نے مجھے ٹھکرادیا۔“

ماں..... میں معافی کے قابل تو نہیں مگر ماں تم بہت دیا لو ہو..... ہندو ذات پر تمہارا بہت ادھیکار ہے ماں..... تم بہت رحم دل..... سہائتا کرنے والی ہو..... ماں تم اپنے ماننے والوں پر بہت زیادہ کرپا کرتی ہو، ماں مجھ پر بھی کرپا کرو..... میری آتما کو ایک پل بھی چین نہیں مل رہا ہے۔ ماں میں تمہارے چرنوں میں اپنا انت کر لوں گا، اگر تم نے مجھے پاپی پر دیانہ کی۔“

وہ کالی کے چرنوں میں بڑا بلکتا رہا..... سسکتا رہا..... مگر کالی کی طرف سے بالکل بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

مندر میں لوگ آتے رہے جاتے رہے مگر لوگوں کو اس کی جھلک بھی نہیں دکھ رہی تھی۔ گوپی چونکہ غائب حالت میں تھا..... مگر وہ سب کو دیکھ رہا تھا۔

کالی کے مندر میں جو پنڈت تھا۔ اس پنڈت کو بھی گوپی کی آتما کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ وہ ایک جگہ بیٹھا لوگوں کے لائے ہوئے پرشاد اور دیگر چیزیں وصول کرتا رہا اور ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو آشیر واد دیتا رہا۔ اتنے میں دیوی کے ہاتھ پر گیندے کے پھول کا جوہار

ناراض ہوئی۔ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں، اور کسی قسم کی چٹان نہ کریں۔“
اور یہ سنتے ہی سارے لوگ پنڈت کو پرنام کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔
دن ختم ہو گیا..... رات سے مندر میں ایک کرخت

نسوانی آواز سنائی دی۔ ”کوئی چنداٹھ یہاں سے..... تیری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی.....“

ارے مورکھ تو نے جو پاپ کئے ہیں..... کیا تجھے شرم نہیں آتی تھی ایسا کرنے پر..... ناریوں اور لوگوں کے ساتھ تو نے ناقابل معافی جرم کیا ہے..... تیری اسی میں بھلائی ہے کہ تو یہاں سے ترنت چلا جا۔ نہیں تو میں خود تیرا انت کر دوں گی۔

تو نے تمام دیوی دیوتاؤں کا ابھمان کیا ہے..... ناگ دیوتا کا سیوک ہو کر..... ایسا ظلم و زیادتی..... اب تجھے کہیں بھی چین نصیب نہ ہوگا، چل بھاگ یہاں سے..... اس سے پہلے کہ میں تیرا بیڑا غرق کر دوں تو ترنت یہاں سے نکل جا.....

اچھا چل میں تجھے ایک اپائے بتاتی ہوں..... تو سیدھا شانی پور کے ناگ مندر میں چلا جا..... اور وہاں جا کر ناگ دیوتا کے جرنوں میں ماتھا ٹیک کر بیٹھ جا..... ہو سکتا ہے کہ ناگ دیوتا کو تیرے گڑگڑانے پر دم آ جائے..... اور ناگ دیوتا تجھے معاف کر دیں..... مگر یہ یاد رکھ کہ ناگ دیوتا کے علاوہ کوئی اور تجھ پر دیا نہیں کر سکتا۔ ورنہ تو اسی طرح پورے سنسار میں بیاگل سرگرداں رہے گا۔

میں تیرے لئے اور کچھ بھی نہیں کر سکتی..... اور مگر تجھے اس لئے مشورہ دے رہی ہوں کہ تو میرے پاس ایک آس و امید لے کر آیا ہے۔

یہ تو تجھے معلوم ہی ہے کہ ہر دیوی دیوتا کی اپنی ایک حدود ہے۔ کوئی کسی کے معاملے میں مداخلت نہیں کرنا ہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی کے آگے جتنی کرتا۔ وہ بھی کسی اچھے کام کے لئے۔ اب تو یہاں سے ترنت جا..... دیر نہ کر.....“ اور دیوی کی آواز آنا بند ہو گئی۔

پڑا تھا اس کا دھاگہ ٹوٹ کر نیچے گرا جسے دیکھ کر پنڈت چونک گیا اور پھر پنڈت کی بے چینی دیکھنے کے قابل تھی۔ مندر میں موجود دیگر لوگ بھی ایک ٹک کالی دیوی کے جیسے کود دیکھ رہے تھے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

کیونکہ پھول کے ہار کا ٹوٹ کر نیچے گرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایسا ہونا نحوست خیال کیا جاتا تھا۔ یعنی مندر میں ضرور کوئی بہت پاپی ظالم..... خونی..... یا راکھشش نمائش آیا ہے..... یا پھر دیوی ماں بہت غضبناک حالت میں ہے۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ مندر میں موجود چھت سے لٹکی ہوئی تمام گھنٹیاں خود بخود بجنے لگیں۔ اور پھر ان بجتی ہوئی گھنٹیوں کو لوگ ہونفوں کی طرح دیکھنے لگے۔ تمام لوگوں کی نگاہیں گھنٹیوں پر پڑی تھیں۔

پنڈت کی آواز سنائی دی۔ ”ماں..... رکھشا کرو..... ماں ہم لوگوں پر دیا کرو..... اگر ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو ہمیں بتایا جائے۔“

اس کے بعد تو سارے کے سارے لوگ بولنے لگے۔ ”ماں رکھشا کرو..... ماں دیا کرو..... ماں کرپا کرو.....“ پنڈت کی گھبراہٹ قابل دید تھی..... وہ بار بار اپنے ماتھے پر اپنا ہاتھ مار رہا تھا، پنڈت کی آنکھوں سے چمک دور ہو کر ویرانی سی چھا گئی تھی۔

اس کے بعد پنڈت اپنی جگہ بیٹھ گیا اور اپنی گردن جھکا لی۔ پھر چند لمبے بعد اس نے گردن اوپر کونٹائی اور بولا۔ ”سجنا! آپ سب باہر چلو۔ میں مندر بند کرتا ہوں..... لگتا ہے دیوی ماں کو اس وقت ہماری موجودگی ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“

پنڈت کی بات کو سننا تھا کہ مندر میں موجود سارے لوگ جلدی جلدی باہر نکلے گئے۔ جب سارے لوگ باہر نکل گئے تو پنڈت جھٹ سے کھڑا ہوا، اور مندر سے باہر آ کر دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اس کے بعد بولا۔ ”آپ لوگ گھبراہٹیں نہیں..... میں رات سے معلوم کر دوں گا کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ دیوی ماں ہم سے کیوں

بعد وہ دائرہ آہستہ آہستہ چھت سے نیچے کو یعنی مندر کے فرش کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر نیچے کو بڑھتے بڑھتے وہ آگ کا دائرہ نیچے آ کر ایک جگہ رک گیا۔

گوہنی چند کی آتما اس سے بالکل بھی بے خبر تھی کیونکہ وہ تو ناگ دیوتا کے چروں میں ماتھا ٹیکے پڑی تھی۔ پھر وہ آگ کا دائرہ بالکل نیچے ہو گیا اور گوہنی کے ارد گرد سے ہوتا ہوا فرش پر ٹپک گیا۔

دائرہ کا فرش پر ٹپکنا تھا کہ اچانک گوہنی چند کو ہوش آ گیا۔

اب گوہنی چند کی چھین مندر کے درود یوار کو دہلانے لگیں۔ ”ناگ دیوتا..... دیا کرو..... ناگ دیوتا میرا انت نہ کرو..... ناگ دیوتا مجھ پر کربا کرو.....“ وہ چیختا رہا مگر اس کی کرناک آواز سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔

پھر اس دائرے کا پھیلاؤ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ دائرہ جتنا کم ہوتا اس سے کہیں زیادہ گوہنی چند کی آتما کی دلدرد چھین مندر کو لڑاتی رہیں۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ دائرہ چاروں طرف سے سٹ کر ایک گولا سا بن گیا۔

اوہ..... کتنا دلدرد، دلخراش، اذیت و کرناک منظر تھا۔ گوہنی چند کی آتما کی فلک شکاف چیخ پورے مندر کو دہلا گئی۔ پھر آگ کا وہ گولا آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنے لگا۔ اور اس روشن دان سے باہر کو نکل گیا۔ جس روشن دان سے ایک چنگاری کی شکل میں آیا تھا۔ اس طرح گوہنی چند کی آتما کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

دراصل یہ ساری کارروائی ردولوکا کی تھی۔ گوہنی چند کی آتما جہاں کہیں بھی گئی ردولوکا کے کارندے اسے تنگ کرتے رہے۔ آخری مرتبہ وہ کالی کلکتہ والی کے مندر میں گیا تو وہاں پر بھی ردولوکا کی یاد دہرا تھا اور اس طرح گوہنی چند کی آتما کو گھیر گھار کر دوبارہ مندر میں لانا تھا۔

پہلی مرتبہ بھی جب ناگ دیوتا کا مجسمہ نیچے کر کر ٹوٹا تھا وہ بھی ردولوکا کا ایسا کیا ہوا تھا، دراصل ایسا نہ تھا مگر گوہنی چند کی آتما کو ایسا نظر آتا تھا۔ اس کے بعد پھر مندر کا دروازہ کھلنا اور مندر سے اسے باہر کی طرف لانا

ایک مرتبہ پھر گوہنی چند کی آتما شامی پور میں موجود ناگ مندر میں جانے کے لئے پرواز کرنے لگی۔ اب بھی ردولوکا کے کارندے اس کے پیچھے لگے پڑے تھے۔

خیر چشم زدن میں گوہنی چند ناگ مندر میں پہنچ گیا۔ رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا پورے مندر میں موجود تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا کہ اتنے میں دو دھیا روشنی پورے مندر میں پھیل گئی۔ تو اس روشنی کو دیکھ کر وہ ہلکا گیا۔ وہ حیرت میں پڑ گیا کہ یہ روشنی ہوئی تو کیسے ہوئی۔ ناگ دیوتا کا مجسمہ اپنی جگہ ایسا وہ تھا۔ یہ بات اسے اور بھی اچنبھے میں ڈال رہی تھی، کیونکہ اس سے پہلے جب وہ بھاگتا ہوا مندر میں آیا تھا تو ناگ دیوتا کا مجسمہ فرش پوس ہو کر کلوے کلوے ہو گیا تھا۔ وہ بہت زیادہ حیرت میں تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، اچھے بھلے مجسمہ کا گر کر پاش پاش ہونا، پھر اپنی جگہ بالکل صحیح سالم موجود ہونا، اور یہی بات حیرت میں ڈال رہی تھی۔

خیر وہ اس معاملے میں کافی الجھا پڑا تھا۔ وہ ناگ دیوتا کے چروں میں گر کر زار و قطار آنسو بہانے لگا۔ اس کی فلک شکاف لرزتی ہوئی آوازیں رے مندر میں گونجنے لگی تھیں۔

وہ اپنے ماتھے کو ناگ دیوتا کے پکے چروں میں ملنے لگا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا ماتھا لہو لہان گیا۔ اس وقت وہ ٹھوس وجود میں بیٹھا تھا۔ روتے روتے اسے ایک طویل وقت ہو گیا تھا مگر پھر بھی ناگ ہاتھ کی طرف سے کوئی بھی آواز سنائی نہ دی تھی۔

اتنے میں ایک عجیب منظر نظر آیا۔

ایک بڑی سی آگ کی چنگاری مندر کے روشن دان سے اندر آتی نظر آئی۔ مندر میں آتے ہی وہ چنگاری چھوٹی گیند کے برابر ہو گئی۔ وہ چنگاری مندر کی ت سے لگی پڑی تھی۔ پھر اس چنگاری کا حجم بڑھنے لگا دیکھتے ہی دیکھتے اس چنگاری نے ایک گول دائرے شکل اختیار کر لی۔

پھر شعلہ بھڑکتا وہ دائرہ آہستہ آہستہ چوڑاں میں بڑھنے لگا۔ اب اس کا دائرہ کافی بڑھ چکا تھا۔ اس کے

تاکہ وہ بھاگ کر ہلکان و بے جان ہو جائے اور جب وہ واقعی حال سے بے حال ہو گیا تو..... اسے پھر سے مندر میں لا کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ ردلوکانے۔

اور اس طرح گوہی چند اور اس کی آتما کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا (خس کم جہاں پاک) پھر رات ہی رات میں ردلوکا کے کارندوں نے پورے مندر کو صاف و شفاف کر کے مندر کی بگڑی ہوئی حالت کو درست کیا۔

اب مندر کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی مندر ہے جو سینکڑوں سال سے ویران بن کر پڑا تھا۔ بڑی بڑی گھنٹیاں بھی لٹکی نظر آنے لگی تھیں۔ راستے کے سارے جھاڑ جھکار ہٹا دیئے گئے تھے۔ اب اس پورے علاقے کو کوئی دیکھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مندر کے قریب وجوار کا یہ علاقہ ویران تھا۔

صبح کا پوپھٹا اور پھر ہر سو روشنی پھیلنے لگی۔ اس کے بعد ایک مقررہ وقت یعنی جو ہندوؤں کے پوجا کا وقت ہوتا ہے اس وقت پر مندر میں موجود تمام گھنٹیاں خود بخود بجنے لگیں اور اتنی زور دار طریقے سے گھنٹیاں بج رہی تھیں کہ قرب وجوار کے لوگ اچنبھے میں پڑ گئے۔

سینکڑوں سال بعد مندر سے یہ گھنٹیوں کی آوازیں کیسے سنائی دے رہی تھیں۔

ایک تو سارا علاقہ منجانب آبادی سے عاری تھا۔ علاقے میں لوگ تھے مگر بہت کم تعداد میں۔ مندر سے گھنٹیوں کی آتی آواز کو سن کر لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر ایک دوسرے کو اچنبھے سے دیکھنے لگے، ہر کسی کے چہرے پر سوال تھا کہ ”آج سینکڑوں سال بعد ناگ مندر سے گھنٹیوں کی آواز، وہ بھی دن کے وقت؟“

سارے لوگوں کے دماغ میں صرف اور صرف ایک ہی بات تھی کہ ”یہ سب بھگوان کا کیا دھرا ہے، یہ بھگوان کا شانتی پور والوں پر کربا ہے کہ سینکڑوں سال سے بند مندر میں موجود گھنٹیاں خود بخود بجنے لگی ہیں۔“ کچھ دیر تک گھنٹیاں بجتی رہیں اور پھر اس کے بعد خاموشی

چھا گئی۔ حویلی کی دیکھ بھال کرنے والے رامو اور شامو بھی اپنی اپنی جگہ حیرت میں تھے کہ آج یہ کیسا اچنبھا ہے اور ایسی کون سی طاقت ہے جو کہ گھنٹی، بجا رہی ہے۔

دن ختم ہوا پھر رات کا اندھیرا پورے شانتی پور میں پھیل گیا۔ لوگوں نے ایک اور منظر دیکھا کہ پورے مندر میں تیز روشنی ہونے لگی تھی۔ یہ بات بھی لوگوں کو حیرت میں ڈالنے والی تھی۔

ایک دن، دو دن، تین دن اور پھر چوتھے دن بھی علی الصبح تو اتر سے مندر کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں، اب تو لوگوں سے رہا نہ گیا اور پھر چند لوگ مل کر ناگ مندر کی طرف بڑھے، اب بھی ان لوگوں کے دلوں میں خوف بیٹھا ہوا تھا کہ نہ جانے مندر میں گھنٹیاں کون بجا رہا ہے؟ اور یہ گھنٹیاں آئیں تو کہاں سے آئیں؟

وہ کون مہمان شمتی ہے جو کہ ویران مندر میں صفائی سترائی کر کے اور گھنٹیاں لگا کر لوگوں کو مندر کی طرف بلا رہا ہے۔

چند لوگ جو کہ مندر کی طرف جا رہے تھے ان میں کئی ضعیف اور کئی نوجوان تھے۔ دل و دماغ میں ڈر خوف تو تھا مگر پھر بھی ان کے قدم مندر کی طرف بڑھتے رہے۔

جب وہ لوگ مندر کے دروازے پر پہنچے تو اور بھی حیران ہوئے۔ مندر کا دروازہ بہت ہی صاف ستر تھا۔ پورے دروازے پر ذرہ برابر بھی گرد و غبار نہیں تھا۔ اور سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ مندر کا بڑا دروازہ چوہنٹ کھلا پڑا تھا۔

دروازے پر کھڑے ہو کر ان لوگوں نے ایک دوسرے کے چہروں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر کسی میں بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ سب کے سب دروازے پر کھڑے رہے کہ ان میں سے ایک نوجوان آگے بڑھا اور بولا۔ ”میں ہی اندر جاتا ہوں۔ اور دیکھتا ہوں کہ اندر کا کیا حال ہے۔“ اور یہ بول کر وہ نوجوان مندر میں چلا گیا۔

بانی لوگ مندر کے دروازے پر ہی کھڑے رہے۔
اور جانے والا نوجوان بہت حیرت سے پورے مندر کو
دیکھ رہا تھا۔ وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر پورے مندر کا
ہائزہ لیتا رہا۔

اب بھی خود بخود مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ ایسا
لگتا تھا کہ کوئی ان دیکھی طاقت گھنٹیاں بجا رہی ہے۔

پھر وہ نوجوان دروازے پر کھڑے لوگوں سے
مخاطب ہوا۔ ”ارے بھائی آپ لوگ بھی اندر آ جاؤ.....
یہاں کچھ بھی نہیں..... مندر تو اندر سے بہت صاف ستھرا
ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ابھی ابھی مندر میں رنگ
ورن کیا گیا ہے۔

نوجوان کی بات سن کر دروازے پر کھڑے
سارے لوگ مندر میں چلے گئے۔ اور جب انہوں نے
مندر کو اندر سے دیکھا تو حیرت میں پڑ گئے۔

جب سارے لوگ مندر میں داخل ہو گئے تو مندر
کی بجتی ہوئی ساری گھنٹیاں خود بخود خاموش ہو گئیں۔
یہ دیکھ کر لوگ اور بھی حیرت میں تھے۔ خیر سارے
لوگ ناگ دیوتا کے مجسمہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرنام
کرنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے طریقے
سے جو بھی کرنا تھا وہ کیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد وہ سب کے سب مندر سے
واپس آ گئے۔

اور اب یہ خبر پورے علاقے میں جنگل کی آگ کی
طرح پھیل گئی۔ یہ خبر دوسرے علاقوں تک بھی گئی کہ
سینکڑوں سال سے بندویران مندر میں خود بخود رنگ و
روغن ہو گیا۔ ہر طرح کی صفائی ستھرائی ہو گئی اور سب
سے اچھے والی بات کہ علی الصبح مندر کی گھنٹیاں خود بخود
پو جانا تم پر بجنے لگتی ہیں۔

پانچویں روز دن کے ساڑھے گیارہ بجے رولوکا
شاننی پور میں پہنچ گیا۔ وہ سیدھا حویلی میں گیا اور جب
رامو کا کا کی نظر رولوکا پر پڑی تو رامو کا کا بہت خوش
ہوئے۔ اس دن حویلی میں بھی کافی لوگ سیر و تفریح کی
غرض سے آئے ہوئے تھے۔

رامو کا کا سے رولوکا بولا۔ ”رامو کا کا اس علاقے
کے چند لوگوں کو آپ اکٹھا کریں، میں ناگ دیوتا کے
مندر کے بابت کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، اور ہاں چند
دن میں جو کچھ بھی مندر میں ہوتا رہا ہے اس کا تو آپ
لوگوں کو معلوم بھی ہے، مندر میں صفائی ستھرائی، رنگ و
روغن اور خود بخود علی الصبح گھنٹیوں کا بجاتا۔“

اور پھر رولوکا کے منہ سے شامو اور رامو نے جب
گھنٹیوں کے بجنے کے بارے میں سنا تو وہ دونوں چونک
گئے، کیونکہ بات تو حقیقی تھی۔

ان دونوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ رولوکا
کی بات بالکل ٹھیک ہے اور اس میں ضرور کوئی اہم راز
پوشیدہ ہے۔ یہ سوچتے ہوئے رامو کا کا بولے۔ ”جی
صاحب جی! ہم ابھی لوگوں کے پاس جاتے ہیں اور
لوگوں کو لے کر آپ کے پاس آتے ہیں۔“

خیر رامو اور شامو، رولوکا کے پاس سے اٹھ گئے اور
حویلی سے پرے گاؤں میں چلے گئے، اور کوئی ایک گھنٹہ
بعد واپس آئے تو ان کے ساتھ کوئی بیس بیس آدمی
تھے۔ سارے آدمی قریب آئے اور پھر ہاتھ جوڑ کر
رولوکا کو پرنام کیا۔

رولوکا نے سب سے مصافحہ کیا اور ہاتھ کے
اشارے سے بولا کہ ”آپ لوگ تشریف رکھیں اور میری
چند باتیں غور سے سنیں کیونکہ یہ باتیں آپ سب کے
لئے فائدہ مند ہیں اور آپ کے علاقے کی خوشیاں اور
خوشحالی اس میں نہیاں ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے
کہ آپ لوگوں کا بڑا ہوا وقت سنور جائے گا، رامو کا کا
سب کو ٹھنڈا پانی پلائیں۔“

”جی صاحب جی!“ میں ابھی ٹھنڈا پانی لاتا ہوں۔
”اور یہ بول کر رامو کا کا جلدی سے چلے گئے اور تھوڑی
دیر بعد واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کی
بالٹی تھی، پھر رامو کا کا نے تمام لوگوں کو ٹھنڈا پانی پلایا، اور
پھر اس کے بعد رامو کا کا بھی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔
اس کے بعد رولوکا سب سے مخاطب ہوا۔ ”جناب
اگر آپ لوگوں کو میری باتیں جھوٹ لگیں تو میرے

سائنس ہی اظہار کر دیتا۔ اور میرا یہ پختہ یقین ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اب شافی طور سے ہر قسم کا خونی خطرہ ختم ہو گیا ہے اور جو اصل خطرہ تھا اس کا خاتمہ ہو گیا ہے۔“

ساری خرابی اور خونی کھیل کا مہرہ آپ کے مندر کا پجاری گوبی چند تھا۔

گوبی چند جب اس مندر کا پجاری بنا تو کچھ عرصے بعد وہ اپنی نفسانی خواہشات کا غلام بن گیا۔ اس نے رات کے اندھیرے میں معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنے بیروں کے ذریعہ اٹھوایا تھا۔ اور اس کے بعد اس لڑکی کو بے عزت کر کے چھوڑ دیتا۔ اس کے بعد اس کے پیر اس لڑکی کا گلا کاٹ کر اس کا خون پی جاتے تھے۔

پھر اس عمل کے تحت اس نے نوجوان کو بھی مارنا شروع کر دیا تھا۔ نوجوان کو اٹھوا کر انہیں اپنے بیروں کے حوالے کر دیتا تھا۔

یہی نہیں بلکہ اس نے ٹھا کر صاحب کی بیٹی مدھو کو بھی رات کے اندھیرے میں اٹھوایا اور پھر اس کی عزت لوٹ لی، شروع میں اس نے ٹھا کر صاحب سے مطالبہ کیا کہ آپ کی بیٹی مدھو ناگ دیوتا کو پسند آگئی ہے اور ناگ دیوتا کی خواہش ہے کہ مدھو کو ناگ دیوتا کی داسی بنا دیا جائے۔

گوبی چند نے اس معاملے میں جھوٹ بولا تھا کہ ٹھا کر صاحب ناگ دیوتا کے نام پر مدھو کو داسی بنا دیں گے اور اس طرح گوبی چند، مدھو کی عزت سے اکثر کھیلا کرتا لیکن ٹھا کر صاحب کے انکار نے گوبی چند کو اشتعال میں مبتلا کر دیا اور پھر اس نے مدھو کو رات کے اندھیرے میں اٹھوایا۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ خود گوبی چند کا خاتمہ ہو گیا۔ مرنے کے بعد بھی گوبی چند نے مدھو اور ٹھا کر صاحب کی روح کو اپنے قبضے میں رکھا تھا۔

گوبی چند نے اپنے ٹھکانے عمل سے شافی طور کو ویران اور برباد کیا۔ لوگ اپنی جگہ اور جائیدادیں چھوڑ کر چلے گئے اپنی جان بچانے کے ڈر سے۔

رامو کا کا کو یاد ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے یہاں

پر میں سفر کے لئے آیا تھا اور اسی رات مجھے ناگ مندر میں اچانک روشنی نظر آئی تھی، آدمی رات کے وقت تو اسے دیکھ کر میں چونک گیا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی راز ہے، اور پھر اس حقیقت کا انکشاف رامو کا کا نے بھی کر دیا تھا۔

لہذا اس راز کو جاننے کے لئے میں پیچھے پڑ گیا۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ سارے خونی مسئلے کے پیچھے گوبی چند کا ہاتھ ہے۔ گوبی چند جب زندہ تھا اس وقت بھی وہ گاؤں والوں پر ظلم کرتا رہا اور جو بھی خوب صورت جوان کنواری اسے اچھی لگتی اسے اٹھوایا۔

اور جب اس کا خاتمہ ہو گیا تب بھی اس کی روح نے ظلم کا بازار گرم رکھا، وہ پونم کی رات میں ٹھا کر اور مدھو کی قید کردہ روح کو بلاتا، مدھو کو اذیت دیتا اور حکم دیتا کہ میرے سامنے ناچ، اور جب مدھو انکار کرتی تو اس کے سامنے ٹھا کر بلرام سنگھ کی روح کو طرح طرح سے اذیت دیتا، اور اپنے والد کی اذیت کو مدھو برداشت نہ کرتی اور پھر وہ ناپے لگتی تھی۔

خیر آپ لوگوں کے دیوی دیوتا بھی گوبی چند کی کارستانی پر بہت زیادہ ناراض تھے۔ انہوں نے اس کے ظلم کے عوض اس کی کسی نہ بھی مدد کی اور خاص طور پر آپ لوگوں کے ناگ دیوتا تو بہت ہی اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔

اس کی روح نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر بے سود: وہ بھاگتا رہا اور ہلکا نہ ہوتا، وہ بھاگتے بھاگتے تھک کر چور ہو چکا تھا، اس کے لئے پورے سنسار میں کوئی ایسا جگہ نہ بنی تھی جہاں کہ اسے پناہ ملتی۔ اور پھر اسے ہر جگہ سے گھیر گھا کر آپ لوگوں کے مندر میں لایا گیا اور اگر کے فرار کے سارے راستے بند کر دیئے گئے لہذا وہ مندر میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ گوبی چند کی روح کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا۔ اب گوبی چند کی روح سے یہ علاقہ پاک ہو چکا ہے اب رہتی دنیا تک گوبی چند کی روح کا کوئی نام و نشان نہیں ہوگا۔

اب آپ لوگ ہر طرح سے بے خوف ہو کر مندر میں پوجا پاٹ ادا کر سکتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ چار دن سے مندر میں یہی طاقت کے ذریعہ گھنٹیاں بج رہی ہیں۔

آپ لوگ نہ ڈریں اور نہ ہی گھبرائیں اب آپ لوگوں کے لئے خوشی کا مقام ہے، میرے بس میں جو کچھ بھی تھا وہ میں نے کر دیا، انسانیت کے ناطے تاکہ شانتی پر میں کچھ شانتی کا دور دورہ ہو، لوگ سکھ کا سانس لیں اور جو لوگ اپنے گھربار چھوڑ کر چائے ہیں، انہیں آپ لوگ اس گاؤں میں دوبارہ لے آئیں، تاکہ وہ اپنے اباؤ امداد کی جگہ پر آرام و سکون کی زندگی گزاریں۔

اب آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔ میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔“ رو لو کا کی بات سن کر سارے لوگ غرضی اپنے ہاتھ جوڑ کر رو لو کا کے سامنے کھڑے ہو گئے، ان لوگوں نے رو لو کا کو ڈھیر ساری دعائیں دیں، اس کے بعد رو لو کا نے ہر ایک سے مصافحہ کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اور پھر دلی میں حکیم وقار کے مطب میں پہنچ گیا۔

☆.....☆.....☆

اس کا نام عمران عرف مانی تھا۔

نامی گرامی پہلوان مانی کی طرح اپنے فن میں ماہر..... گزشتہ چند سالوں سے وہی اس چھوٹے سے قصبے میں پہلوانی کے مقابلے میں اول نمبر پر آ رہا تھا، اور اب مہینہ بھر بعد..... پھر سالانہ مقابلہ تھا اور اگر مانی یہ مقابلہ بھی جیت جاتا تو اسے ناقابلِ تخییر کا خطاب مل جاتا۔

آج سے 30 سال پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا، لیکن اس کے بعد اتنے سالوں تک یہ اعزاز کوئی اور حاصل نہ کر سکا، جس نے اس اعزاز کو حاصل کیا تھا وہ پہلوان اب اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔

لیکن اب قصبے کے 80 فیصد لوگوں کو امید تھی کہ ملی ضروریہ ایوارڈ حاصل کر لے گا، باقی 20 فیصد وہ لوگ تھے جو مانی سے پر خاش رکھتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جہاں حامیوں کی تعداد بڑھ جائے

وہاں دشمن بھی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اپنے ”شعبے“ سے ہٹ کر مانی صرف مانی تھا۔ اس کی رگ رگ میں شرافت، سادہ لوحی اور نرم دلی رچی بسی ہوئی تھی۔

اور یہ حقیقت تھی، ورنہ آج سے چند سال پہلے تک مانی کیا تھا.....؟

گزرے دنوں کے وہ سارے منظر آج بھی اس کی یادوں کی بیج پر تروتازہ تھے، وہ اپنے محترم استاد کے احسانات کیسے بھول سکتا تھا۔ جن کی بدولت آج وہ اس مقام پر تھا۔

ہاں..... وہ استاد..... جو آج بھی اس کے ساتھ تھے۔

اس کے ماں باپ اسے نوعمری کی عمر میں ہی داغ مفارقت دے گئے تھے۔

باپ کا روپ سروپ تو اسے بہت اچھی طرح یاد تھا، البتہ ماں کا صرف سایہ ہی دھیان میں رہتا تھا۔

اس کا باپ ایک سختی مزدور تھا، لیکن اس نے اپنے بیٹے کو قصبے کے سب سے اچھے اسکول میں داخل کر دیا تھا۔

اور ابھی وہ سیکنڈری کلاسز میں ہی تھا کہ..... باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا، وہ ایک حادثاتی موت کا شکار ہوا تھا۔

اس اندوہناک واقعہ کے بعد مانی کی دنیا ہی بدل گئی، زمین بھی اجنبی ہو گئی اور آسمان نے بھی منہ موڑ لیا۔

اب اس گھر میں وہ تھا اور اس کے باپ کی زندگی میں رکھا جانے والا بوڑھا ملازم دینو بابا تھے۔

دینو بابا بہت زیادہ خاموش طبیعت انسان تھے، مانی انہیں اکثر یہ کہہ کر چھیڑتا تھا۔

”دینو بابا.....! کبھی میں نہیں آتا کہ آپ کا شمار زندوں میں رکھا جائے یا.....“

”زندگی اور موت برابر ہی ہے بیٹا.....“ دینو بابا نے مسکرا کر ایک دن کہا.....!

”میں نے ان دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔“

اتنا کہہ کر دینو بابا اپنی لمبی اور گھنی سفید داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

☆ ☆ ☆

مانی کو پہلوانی کا بہت شوق تھا اور اسی شوق کے سبب وہ ایک پہلوان جابر کے اکھاڑے میں پہنچ گیا۔ پہلوان جابر اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورنے لگا۔

”تو ہم لوگوں سے مذاق کرنے آیا ہے؟“ جابر نے اسے غور سے دیکھا۔

وہ اپنے مخصوص پنک پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ اور اس کے دائیں بائیں 2 مسنڈے جوان پہلو سے لگے بیٹھے، اس کے کانڈھے داب رہے تھے۔ جہاں پنک رکھا ہوا تھا، یہ ایک کافی کھلی جگہ تھی، جسے تین اطراف میں پودوں کی باڑ کے ذریعے محن کا رنگ دے دیا گیا تھا۔

”میں آپ سے مذاق کیوں کروں گا؟“ بڑے اطمینان سے جواب دیا گیا۔ ”کیا آپ کا اور میرا کوئی تعلق ہے؟“

یہ جملہ ذرا بھاری تھا، جابر نے اس دبلے پتلے اور خوب صورت مانی کو گہری نظر سے دیکھا اور اپنی بھاری آواز میں کہا۔

”کیا نام ہے تیرا؟“

”مانی۔“

”ہوں۔“ جابر نے ہنکارا بھرتے ہوئے سر ہلایا۔ ”کیا کہہ رہا تھا تو پھرے بول۔!“

”مجھے یہ فن سیکھنا ہے۔“ پہلوانی کا فن۔

کیا آپ مجھے سکھا دو گے؟“ مانی پر شوق لہجے میں پوچھا تھا۔

”ہا ہا ہا۔“ جابر نے ایک زوردار ہنسی لگایا اس کے چیلوں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی

اور وہ بھی معنی خیز نظروں سے مانی کی طرف متوجہ تھے۔

”اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے جتا۔؟“ مانی کے لہجے میں حیرت کا عنصر تھا، میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا۔ آپ مجھے سکھائیں یہ فن۔“

”تو اس قابل ہے۔“ جابر ہنستے ہوئے بولا۔ ”اپنی حالت تو دیکھ۔۔۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تو اپنی جمع پونجی خوب لاتا ہے۔“

اس جملے کو مانی سمجھ نہ سکا تھا، البتہ اس نے یہ ضرور دیکھا تھا کہ جابر کے دونوں چیلے حلق پھاڑ کر بیٹھے تھے۔

”میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا۔۔۔۔۔“ مانی کے لہجے میں الجھن تھی۔

”سمجھے گا بھی نہیں۔۔۔۔۔“ جابر نے جواب دیا، پھر اس نے کبھی اڑانے کے انداز میں ہلاتھ ہلا کر کہا۔

اب جاؤ بھائی۔۔۔۔۔ تم نے ہمارا بہت دماغ کھالیا۔۔۔۔۔ جاؤ کھلیو کو دو اور عیش کرو۔۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔۔

”نہیں جاؤں گا۔۔۔۔۔“ مانی کو بھی ضد آ گئی۔

میں کہہ رہا ہوں نا کہ آپ مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔“

”او۔۔۔۔۔ جاؤ بھائی۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ دو سیکنڈ میں تمہاری ہڈی پلٹی برابر ہو جائے گی۔۔۔۔۔ جاؤ شاباش۔۔۔۔۔“

مانی اب بھی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

”ٹھہرو استاد۔۔۔۔۔“ ایک چیلہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں ابھی اس کا بخارا تار دیتا ہوں۔۔۔۔۔ یہ ہمارے جابر استاد کو خواہ مخواہ پریشان کرنے پر تلا ہے۔“

”ارے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ دلارے۔۔۔۔۔!“ جابر نے اپنے چیلے کو ٹوکا۔ ”غصہ مت کر۔۔۔۔۔ یہ تو بھولورام ہے۔۔۔۔۔ بے چارہ پہلے ہی ڈیڑھ پلٹی ہے۔ اگر تو نے اس کی ایک آدھ پلٹی اور کم ردی تو کیا کرے گا۔؟“

دونوں چیلے پھر بس پڑے۔ پھر جابر کے چہرے پر نہ جانے کیوں ایک شیطانی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ مانی سے مخاطب ہوا۔

”کل دن میں 3 بجے آنا..... میں کھاؤں گا
جے کشتی..... اب جاؤ.....“

مانی کے چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے اس
نے جلدی سے گردن ہلائی اور وہاں کے لئے گھوم گیا۔
☆.....☆.....☆

دوسرے دن مانی دوپہر کا کھانا وغیرہ کھا کر جابر
کی طرف جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ لباس تبدیل
کر کے وہ دینو بابا کے کمرے میں آیا۔

”دینو بابا.....! میں ذرا کام سے
جابر ہاں۔ شام تک آ جاؤں گا۔“

”کہاں جا رہے ہو بابو جی.....؟“ دینو بابا
اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔

”آ کر بتاؤں گا.....“ مانی بات اڑانے لگا۔
”بس..... جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“

”پھر بتانے سے کیا فائدہ ہوگا
بابو جی.....؟“ دینو بابا کا سوال تھا۔ ”ابھی بتانے میں کیا
حرج ہے.....؟“

”ابھی مزہ نہیں آئے گا.....“ مانی مسکرایا۔
”میں واپسی میں ہی بتاؤں گا۔ اور اگر کام ہو گیا تو ساتھ
میں مٹھائی بھی لاؤں گا۔“

”آپ کی مرضی ہے.....“ دینو بابا کی مسکراہٹ
بہت شاندار ہوتی تھی۔ ”میرے لئے تو بس آپ کی
خیر و عافیت ہی مٹھائی کا بدل ہے۔ آپ جہاں جاؤ وہاں
کا میاں آپ کے قدم چومے۔ مولا کرے۔“

”شکر یہ دینو بابا.....“ مانی نے مسکرا کر سر ہلایا۔
پھر وہ گھر سے نکل گیا تھا اور یہ نہ دیکھ سکا کہ اس
کے جانے کے بعد دینو بابا بھی گھر میں نہیں رکے تھے۔
وہ بھی دروازے پر تالا ڈال کر نکل کھڑے
ہوئے تھے۔

آج بھی جابر پہلوان کے ڈیرے پر وہی تینوں
موجود تھے، لیکن آج پلنگ خالی پڑا تھا اور تینوں مصروف
دکھائی دے رہے تھے۔

مانی ایک کونے میں کھڑا ہو کر نہایت دل چسپی

سے ان کے داؤ بیچ اور دھیمے کا مستی کو دیکھ رہا تھا۔
کانی دیر بعد جابر کی اس پر نظر پڑی تھی ساتھ ہی
وہ چلایا۔ ”ارے..... ٹڈی پہلوان آ گیا.....“
اس کے دونوں شاگرد بھی رک گئے اور مانی
کو گھورنے لگے، ان دونوں کی آنکھوں میں بھی تسخیر
اڑانے کا انداز جھلک رہا تھا۔

”آؤ بھئی..... آؤ.....“ جابر نے نعرہ لگایا
”ہم لوگ تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے.....“

مانی ذرا جھجکا، پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھا اور ان
کے درمیان آ کھڑا ہوا۔

”چلو بھئی.....“ جابر نے کہا۔ ”پہلا سبق شروع
کرو..... اور مرغا بن جاؤ.....“

”مرغا.....؟“ مانی نے حیرت سے دہرایا۔
”ہاں..... اسکول میں پڑھے ہو.....؟“

”جی..... ہاں.....“
”اسکول کے ماسٹر نے تم کو کبھی مرغا نہیں
بتایا.....؟“

”جی..... بتایا ہے.....“ اس نے سر ہلایا۔
”بس تو پھر..... ویسا ہی مرغا بننا ہے
تمہیں.....!“

”لیکن وہ تو سزا ہوتی تھی..... ہم کوئی غلطی
کرتے تھے تو اس بات پر ماسٹر صاحب ہمیں مرغا بناتے
تھے۔“ مانی نے معصومیت سے بتایا۔

دونوں چیلہ ہنس پڑے، استاد کے ہونٹوں پر بھی
مسکراہٹ اٹھ کھیلی ان کر رہی تھی پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔

”پہلوان ایسے ہی نہیں بن جاتے۔ خون کا
پسینہ ہو جاتا ہے اپنی جان جو کھوں میں ڈالنی پڑتی ہے۔
کولہو کے نیل کی طرح محنت اور مشقت کے پہاڑ

توڑنے پڑتے ہیں۔ ہاتھ پر برسوں جمائی جاتی ہے.....
نادان بچے..... نہ جانے کتنے جان کنی اور نقص مرخلوں

سے گزرنے کے بعد پہلوان کا اعزاز ملتا ہے.....
اور تیری تو ابھی ابتداء بھی نہیں ہوئی ہے۔“

”ٹھیک ہے.....“ مانی نے سر ہلا کر حامی

جابر اس وقت پوری طرح مانی کی طرف متوجہ تھا، اس لئے چونک اٹھا۔

اور جب وہ مڑا تو اس کے سامنے ایک بوڑھا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ گھنی اور سفید داڑھی مونچھیں، دراز قد، چوڑے شانے اور بے داغ سفید کپڑوں میں ملبوس اس بوڑھے کی آنکھوں سے بے پناہ غصہ چمک رہا تھا۔

”تم لوگوں کو شرم نہیں آتی.....“ بوڑھے کے لہجے میں غصیل و غضب تھا۔ ”ایک معصوم بچے کو اپنے ظلم کا نشانہ بنارہے ہو۔“

”تم کون ہو.....؟“ جابر نے اسے گھورا۔
 ”تمہارا باپ تو نہیں ہوں.....“ بوڑھا مسکرایا،
 ”لیکن عمر تو اتنی ہی ہوگی.....“

”اے بڑے میاں.....“ دلارا آگے بڑھا۔
 ذرا تیز سے بات کر دیا جابر استاد سے.....“

لیکن بوڑھا اسے خاطر میں کب لایا تھا؟ وہ تو مانی کی طرف بڑھا اور کسی کھلونے کی طرح اسے ہاتھوں میں سمیٹا اور آرام سے پٹنگ پر ڈال کر بڑبڑایا۔
 ”بے ہوش ہے..... ہاں.....“

مانی کی آنکھیں مسلسل بند رہیں، اب بوڑھا دوبارہ ان تینوں کی طرف مڑا۔

”کیا کر رہے تھے تم لوگ.....؟“ بوڑھے نے جابر سے پوچھا۔ اس کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔

”تم سے مطلب.....؟“ جابر نے نتھن پھلا کر کہا۔

”مجھے بتاؤ.....“ بوڑھے نے ضد کی۔
 ”ہم اسے پہلوانی سکھا رہے تھے.....“ جابر نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”اچھا.....“ بوڑھا گویا حیرت زدہ رہ گیا! ”ایسے سکھاتے ہیں.....؟ کبھی خود بھی سیکھی ہے یا بس کھیاں ہی اڑاتے ہو.....؟“

”دیکھو بڑے میاں.....“ جابر کا لہجہ نرم گرم سا تھا۔ ”میں تمہاری عمر کا لحاظ کر رہا ہوں..... اب تم اپنا راستہ بناؤ..... کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا ہاتھ اٹھ جائے۔“

بھری۔ ”مجھے منظور ہے۔“
 یہ کہہ کر وہ جھکا اور دونوں گھٹنوں کے درمیان سے بازو نکال کر کان پکڑ لئے۔

”شاباش.....!“ اس کے کانوں میں جابر استاد کی آواز آئی۔

پھر وہ اپنے چیلے سے مخاطب ہوا۔
 ”دلارے.....! بیٹھ جا اس کی پیٹھ پر.....“
 دلارا تو شاید اسی حکم کا منتظر تھا، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے آگے بڑھا اور مانی کی کمر پر اپنی تشریف رکھ دی۔

وہ بے چارہ تو پورا اہل کر رہ گیا پہاڑ جیسا وزن اس کے ناتواں جسم سے کیسے برداشت ہوتا۔

”نہ..... نہ.....“ جابر نے آواز لگائی۔ ”ہلنا مت..... برداشت کرو..... یہ تمہارا امتحان ہے..... اگر اس میں پاس ہو گئے تو پہلوان بن سکو گے..... ورنہ نہیں.....“

یہ الفاظ مانی کے کانوں میں گونج کر رہ گئے۔ اس نے اپنا لرزتا ہوا دھڑ اور کپکپاتی ہوئی ٹانگوں کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔

”شاباش..... ہمت کر جوان.....!“ ایک بار پھر جابر کی آواز گونجی۔

لیکن ”جوان“ کہاں سے ہمت کرتا.....؟ اس بے چارے کی تو حالت ہی بری ہو رہی تھی۔

بلکہ اب تو سینے میں سانس بھی کھینچ لگی تھی، اسے یوں لگا جیسے کسی لمحے میں بھی اس کا دم اکھڑ جائے گا۔

اور پھر وہی ہوا جو کسی لمحہ میں بھی ہو جاتا تھا۔
 ”ارے..... ارے.....“ دلارے نے یہ کہتے ہوئے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا کیونکہ عدنان دھڑ سے ایک جانب لڑھک چکا تھا۔

اب اس کا بے حس و حرکت جسم زمین پر پڑا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

عین اسی وقت کسی نے جابر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اپنے ساتھیوں کی طرف آنکھ مار کر بولا۔
 ”اچھا بھئی..... اب تم اصرار کرتے ہو تو
 آؤ.....“

یہ کہہ کر جابر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔
 بوڑھے نے جابر کے پنجے میں اپنا پنجہ پھنسا دیا۔
 جابر کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ
 دوڑنے لگی چند لمحے وہ اپنی ہی مسکراہٹ کے مزے لیتا
 رہا۔

پھر اچانک ہی اس نے اپنے ہاتھ کو ایک زوردار
 جھٹکا مارا اسے پوری امید تھی کہ بوڑھا اپنا ہاتھ چھڑا کر قلا
 بازی کھا کر گرے گا۔

لیکن دوسرا لمحہ حیرت انگیز تھا جابر کی آنکھوں
 میں حیرت کے دیئے جل اٹھے۔ کیونکہ اس کا ہاتھ اب
 بھی بوڑھے کے ہاتھ میں تھا۔

جابر نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ چھڑانے کی بھرپور
 کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔
 اس کے ماتھے پر پسینے کی نمی تھی ہونٹیں چپکنے
 لگیں، چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں۔

اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ ایسا ہو جائے
 گا، ایک بوڑھے انسان سے اسے مذاق ہی مذاق میں
 چیلنج کرنا بھاری پڑ جائے گا۔

اس کے چیلے بھی اب صورت حال سمجھ چکے تھے
 اور کافی حیرت زدہ نظر آ رہے تھے۔

بوڑھا بڑے اطمینان سے جابر کی زور آزمائی کا
 تماشا دیکھ رہا تھا، اچانک اس نے ہلکی سی مسکراہٹ
 چہرے پر لاتے ہوئے اپنے ہاتھ کی گرفت سے جابر
 کے ہاتھ کو آزاد کر دیا۔

اور جابر..... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نیند سے
 جاگا ہو، کبھی وہ اپنے ہاتھ کو دیکھتا ٹوٹتا، اور کبھی بوڑھے
 کے ہاتھ کو گھورنے لگتا۔

”جو میں نے کہا تھا، وہ سچ نکلا۔“ بوڑھے کی
 پرسکون آواز نے ماحول کا سکوت توڑ ڈالا۔ ”تم نے بس
 کھیاں اڑائی ہیں۔“

”ہاتھ اٹھاؤ نہیں میرے بچے.....!“ بوڑھے
 نے اسے پکارتا، بلکہ ہاتھ ملاؤ..... اور اگر تم نے مجھ سے
 اپنا ہاتھ چھڑا لیا تو میں مان جاؤں گا کہ تم واقعی پہلوان ہو
 اور اس بچے کو پہلوانی سکھا سکتے ہو..... اور اگر نہ چھڑا
 سکتے تو..... پھر میری بات سچ ہوگی۔“

”تم..... بڑے میاں..... تم مجھ سے ہاتھ
 ملاؤ گے.....“ استاد جابر کے لہجے میں ہلاک کی حیرت تھی
 ، ساتھ ہی اس نے بوڑھے کو سر سے لے کر پاؤں تک
 گھور کر دیکھا تھا۔

”ہاں..... آؤ.....“ بوڑھے نے ہاتھ آگے
 بڑھا دیا۔

استاد جابر نے اس کی استخوانی ہاتھ کو دیکھا،
 جو جھریوں سے بھرا ہوا تھا اور پھر اچانک ہی ایک زوردار
 اور بے ساختہ قسم کا قبضہ اس کے منہ سے برآمد ہوا۔

اس کے دونوں چیلے بھی مذاق اڑانے والے
 انداز میں بوڑھے کو دیکھ کر ہنس پڑے تھے۔ پھر بڑی
 مشکل سے جابر نے خود کو سنبھالا اور اپنے چیلوں کی
 طرف دیکھ کر اعلانیہ انداز میں بولا۔

”ہاں بھی کیا خیال ہے..... قبول کر لوں یہ چیلنج
؟“

چیلے پھر ہنس پڑے، ادھر بوڑھے نے منہ
 بتا کر کہا۔

”جلدی کرو..... میرے پاس وقت
 نہیں ہے..... مجھے بچے کو بھی لے کر جانا ہے۔“

”بچے کو لے کر جانا ہے.....؟“ جابر نے اسے
 گھورا..... ”کہاں.....؟“

”اس کے گھر.....“ جواب ملا۔ ”میں اسے
 جانتا ہوں۔“

”تو پھر اسے اٹھاؤ اور چلتے پھرتے
 نظر آؤ.....“ جابر نے فوراً کہا۔

”پہلے ہاتھ ملاؤ.....“ بوڑھے نے بچوں کی
 طرح ضد کی۔

اب تو جابر کو یقین ہو گیا کہ بڑھانسی ہے۔ وہ

لہر اگیا..... ان کا چہرہ دفعتاً زرد پڑا تھا۔
اپنی خاموش دیکھ کر مانی نے پھر ٹوکا۔

”بتاؤ بابا بابا؟ چپ کیوں ہو.....؟“

”آں.....“ دینو بابا خیالات کی دنیا سے نکل کر چوکے۔ ”میں بتاؤں گا..... ضرور بتاؤں گا..... لیکن وقت آنے پر..... ہو سکتا ہے کہ وہ وقت نہ آئے۔ کیونکہ وقت کبھی پلٹا نہیں کھاتا..... جو گزر جاتا ہے وہ مڑ کر نہیں دیکھتا.....“

مانی انہیں الجھے ہوئے انداز سے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”مجھے کچھ تو بتاؤ دینو بابا.....! تم جو کہہ رہے ہو وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا.....“

”اسی لئے تو میں چپ ہوں.....“ دینو بابا مسکرائے۔ ”میری زندگی کی کہانی بہت لمبی ہے..... اور یہ کہانی میں تمہیں اس وقت سناؤں گا۔ جب تم امتحان میں پورے اتر جاؤ گے اور کامیابی حاصل کر لو گے.....“ یہ کہتے ہوئے دینو بابا کی آنکھوں میں غیر معمولی سی چمک اجاگر ہو گئی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کبھی اندرونی جذبے سے سرشار ہو رہے ہوں۔

”کیا تم بھی مجھے مرنا بتاؤ گے.....؟“ مانی نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

”نہ کام کے نہ کالج کے“ دینو بابا نے ہونٹ سیکنے لئے۔ ”پہلوان بنا پھر رہا ہے۔“

”کیا آپ اسے جانتے ہو.....؟“ مانی چونکا۔

”ہاں.....“ دینو بابا نے سر ہلایا پھر جلدی سے بولے۔

”اگر تم مجھ سے پہلے ہی اپنی خواہش کا اظہار کر دیتے، تو تم کو اس کے پاس جا کر مرنا نہ بتا پڑتا۔“

”اب مجھے کیا معلوم کہ آپ بھی تیس مارخان ہو.....“ مانی نے جواب دیا۔ ”آپ کو کد کھ کر کون سوچ سکے گا کہ آپ کو کبھی پہلوانی کے گراآتے ہوں گے۔“

دینو بابا مسکرائے، پھر ایک طویل سانس لے

پھر بوڑھا ان لوگوں کی طرف سے بے نیاز ہو کر بچے کی طرف بڑھا..... اسے پٹنگ سے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور وہاں سے نکل آیا۔

جابر اور اس کے چیلوں کی تو گویا شی ہی گم ہو گئی تھی۔ بوڑھے نے جابر پہلوان کے احاطے سے باہر آ کر بڑے پیار سے بے ہوش مانی کی کمر تھپتھپائی اور سرگوشی کے انداز میں بڑبڑایا۔

”اب تو فکر مت کر بیٹا..... تیرا دینو بابا تجھے پہلوان بنائے گا..... ناقابلِ تسخیر پہلوان.....“

☆.....☆.....☆

وقت گزر رہا تھا..... اور مانی کے اندر آہستہ آہستہ ایک پہلوان نمود پارہا تھا۔

اسے خود بڑی مشکل سے اس بات کا یقین ہوا تھا کہ اسے پہلوانی کی شاندار مشقیں کرانے والا دینو بابا ہیں۔

اس دن جو تمنا اور خواب لے کر وہ گھر سے نکلا تھا، سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ تمنا..... وہ خواب..... گھر ہی کے صحن میں پورا ہو جائے گا۔

تموڑے ہی عرصے میں اس نے اپنے اندر بے پناہ تہذیبیالی محسوس کیں۔

بس دینو بابا نے اس کے سامنے چند شرائط رکھی تھیں، جن میں سے دو بہت اہم تھیں۔

۱۔ ”اسی کوئیں بتاؤ گے کہ تمہارا استاد کون

۲۔

۳۔

۴۔

۵۔

۶۔

۷۔

۸۔

۹۔

۱۰۔

کی نگاہیں ڈاؤس پر تھیں اور ہونٹ مسلسل حرکت میں تھے۔

وہ کچھ پڑھ رہے تھے..... تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ اور جب اس کی آنکھیں کھلتیں تو ان کی سرخی بڑھ جاتی۔

ہو سکتا ہے کہ وہ مانی کے لئے دعا گو ہو.....

ہر سال کی طرح یہ مقابلہ بھی قصبے کے سب سے بڑے میدان ”گولڈن گراؤنڈ“ میں منعقد ہوا تھا اور اس وقت کچھ بچے بھاڑا ہوا تھا۔ کہیں کسی کو نے تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔

اور مقابلہ لوگوں کی سوچ سے زیادہ حیرت انگیز تھا۔ مانی کی لڑائی اور بچاؤ کا انداز تماشا نیوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

کسی کے ذہن و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ مانی نے اپنے استاد کے لئے کبھی کسی کے ساتھ کوئی مشق نہیں کی۔ کوئی مقابلہ نہیں کیا۔

وہ اس وقت ایک ماہر فائزر کی طرح ڈاؤس پر جما کھڑا تھا، جبکہ اس کا حریف بھی کوئی معمولی پہلوان نہیں تھا، اس کا نام جگا پہلوان تھا۔ اور پورے قصبے میں اس کے پوسٹر جگہ جگہ آویزاں تھے۔

اب آخری راؤنڈ تھا۔ اس مقابلے کی فیصلہ کن گھڑی آن پہنچی تھی۔

مانی کے حریف جگا پہلوان نے اپنا آخری واؤ آزمایا..... یہ واؤ سینکڑوں موقعوں پر اسے کامیابی سے ہسکتا کر چکا تھا..... اور اس میں جکڑنے والا اٹھ کر پانی بھی نہیں مانگتا تھا۔

اور اس وقت دیکھنے والوں کی سانسیں ہی رک گئیں جب جگانے اپنا داہنا گھٹنا زمین پر ٹیکنے کے بعد بائیں گھٹنے پر مانی کو جھکا کر اس کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈال کر جکڑ لیا۔

اس وقت نہ جانے کتنے ہی لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے ان میں خود دینو بابا بھی شامل تھے۔

ان کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کے

کریولے۔ ”بچی بات تو یہ ہے کہ میری بھی دلی خواہش یہی تھی کہ تم کو.....“

وہ بولتے رک گئے، کسی سوچ میں پڑ گئے تھے جب کافی دیر گزر گئی تو مانی نے ٹوکا۔

”کہاں کھو گئے دینو بابا؟“

”کہیں نہیں.....“ وہ مسکرائے۔ ”چلو اب

کھانے کا وقت ہو رہا ہے..... کھانا کھا لو.....“

”وہ کس چیز کا کلوہ ہے..... وہ آپ مجھے کھلاتے ہو؟“ مانی کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔

”وہ طاقت کا خزانہ ہے.....“ دینو بابا کے لہجے

میں جوش تھا۔ ”ایسی چیزوں کا مرکب ہے جو تمہارے

اعضائوں کو اندرونی طور پر مضبوط کریں..... اور تم

کو ٹھوس فولاد بنادیں..... اب ساری باتیں ختم اور.....

کھانا شروع..... چلو..... اٹھو.....!“

☆.....☆.....☆

یہ مانی کا بطور مانی پہلا سال تھا، دوسرے پیشہ ور پہلوانوں کی طرح جگہ جگہ اس کے پوسٹر نہیں لگے تھے، اور نہ ہی اس کے بوڑھے استاد نے کسی اور طریقے سے اس کی تشہیر کی تھی۔

بس اچانک ہی فن پہلوانی کے آسمان پر یہ ستارہ ابھرا تھا اور لوگوں کی آنکھیں خیز ہوئی تھیں۔

اس کا جسم بھاری بھر کم ہرگز نہیں تھا، لیکن دینو بابا کے زیر سر پرستی میں اس کا انگ انگ ٹھوس ہو چکا تھا۔

راؤنڈ کے کھیلوں میں انتہائی مہارت سے مسلسل جیت حاصل کرنے کے بعد وہ فاضل راؤنڈ میں پہنچا اور اپنے مقابل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

یہ مقابلہ بھی کوئی آسان نہیں تھا۔ اس کا مقابل

نامی گرامی پہلوان تھا، جو پچھلے سال بھی فاتح رہ چکا تھا۔

لیکن جو حیرت انگیز اور انوکھے گروہ مانی کے پاس تھے، وہ ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔

مقابلہ بہت سنسنی خیز تھا تماشا نیوں کی سانسیں ہی رک کر رہ گئی تھیں۔

تمام تماشا نیوں میں دینو بابا بھی موجود تھے، ان

آثار صاف دکھائی دے رہے تھے ان کی آنکھیں مسلسل ڈاکس کی طرف تھیں۔

نہیں دیکھا تھا، لیکن اب..... آخری لمحات میں.....
دینو بابا کمزور سا دکھائی دے رہے تھے۔ مانی نے پوچھ ہی لیا۔

”کیا بات ہے دینو بابا.....! میں آپ کو کچھ دنوں سے پریشان دیکھ رہا ہوں۔“
”ہاں.....“ دینو بابا نے کہا۔ ”میں واقعی پریشان ہوں۔“

”کیوں.....؟ کیا بات ہے.....؟“
”تم ناقابلِ تسخیر کے ایوارڈ کے لئے کھڑے ہونے والے ہو..... اور میں اسی لئے گھبرا رہا ہوں.....“
”آپ گھبرا رہے ہو.....“ مانی نے حیرت سے ان کی شکل دیکھی۔ ”آپ نے ہی تو مجھے ہمت اور حوصلہ دے کر اس مقام پر پہنچایا ہے اور اب آپ ایسی باتیں کر رہے ہو.....؟“

”ہاں..... میرے بچے.....! میں خود بھی اس بات کو سمجھتا ہوں..... لیکن آج سے 30 سال پہلے جو کچھ ہوا تھا..... اس کی وجہ سے میرا دل ڈر رہا ہے.....“
”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا.....“ مانی کے لہجے میں الجھن تھی۔

دینو بابا کوئی جواب دینے کے بجائے کسی سوچ میں پڑ گئے تھے۔
پھر انہوں نے گہری نظروں سے مانی کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

”آج سے 30 سے پہلے جو پہلوان یہ ایوارڈ جیتا تھا..... اس کا استاد بھی میں ہی تھا۔“
مانی یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ چند ثانیے کے لئے اس کی نظریں اپنے استاد پر جم کر رہ گئیں۔
”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہو.....؟“ اس کے منہ سے نکلا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں.....“ دینو بابا ہنسنے سے انداز میں مسکرائے۔ ”اور میں دینو بابا نہیں ہوں..... میرا نام آتمش ہے اور میرا تعلق ایک دور دراز قبیلے سے ہے۔“

اچانک ہی انہوں نے اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر اس پر منہ سے کچھ پھونکا اور پھر ہاتھ کو سیدھا کر کے ڈاکس کی طرف کیا اور مٹی کھول دی۔

ادھر حریف نے اپنا آخری داؤ لگا دیا تھا، مانی چند لمحوں کے لئے تو ساکت و جامد رہ گیا۔

پھر اچانک ہی اس کے جسم میں قہقہری سی دوڑ گئی، اس نے بجلی کی سی تیزی سے خود کو ایک زوردار جھٹکا مارا۔
جگا پہلوان اس جھٹکے کے لئے قطعی تیار نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اچھل کر گرا اور چاروں خانے چت ہو گیا۔

اوه..... پھر جو تماشائیوں نے شور مچایا ہے تو خدا کی پناہ.....! مانی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر جگا پہلوان کے پیٹ پر اپنا گھٹنا لگا دیا۔

ایک بار پھر تالیوں کی آواز سے فضاء گونج اٹھی..... مانی یہ مقابلہ جیت چکا تھا۔

☆☆☆☆

لگاتار چار سال تک مسلسل ناقابلِ شکست رہنے کے بعد..... اب مانی کی منزل تھی پانچواں سال.....! اگر وہ یہ مقابلہ بھی جیت جاتا، تو آج سے 30 سال پہلے کا واقعہ زندہ ہو جاتا..... جب جلال شاہ نامی پہلوان نے ناقابلِ تسخیر کا ایوارڈ جیتا تھا۔

لیکن کیا یہ ایوارڈ جیتنا اتنا ہی آسان تھا.....؟
جیسے جیسے وقت قریب آ رہا تھا، مانی کے دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ خود اس نے اپنے استاد کو لہجہ میں جلتا دیکھا۔

مانی اس بات پر کافی حیرت بھی تھی کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ دینو بابا اندرونی طور پر بہت سراسیمگی کا شکار ہے۔

اب تک تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، اتنے سالوں میں اس نے بھی دینو بابا کے پرسکون اور مطمئن ہوئے سمندر کی طرح بے لہر چہرے پر پریشانی کا سایہ بھی

دینو بابا نے انکشاف کیا، اور مانی گویا ابھمن آئیز حیرت کا مجسمہ بن کر رہ گیا۔

”میں یہاں گزشتہ کئی سالوں سے روپوشی کی زندگی بسر کر رہا ہوں.....“ دینو بابا نے مزید کہا۔ جس طرح تمہارے اس قہجے میں قوت اور طاقت کی زور آزمائی ہوتی ہے اور پہلوانی کی جنگ ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح میرے قبیلے میں جادو اور سحر کا میدان لگتا ہے..... اب تم سمجھ کر نہیں.....؟“

”نہیں دینو بابا.....“ مانی نے حیرت سے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں آپ کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔“ ”کیا تم جادو، سحر اور منتر کے بارے میں واقفیت رکھتے ہو.....؟“ دینو بابا نے سوال کیا۔

”تھوڑا بہت.....“ مانی نے کہا۔ ”میں تو آپ کا شاگرد ہوں.....“

”میں نے تم پر جتنی محنت کی ہے، اور تم نے جو مقام حاصل کیا ہے..... اس میں کئی فیصد حصہ جادو اور سحر پر مبنی ہے۔ کیوں کہ یہ بھی طاقت کے ہی دوسرے نام ہیں..... پہلوانی کی طاقت جسائی ہوتی ہے اور جادو روحانی طاقت کا نام ہے..... 30 سال پہلے میں نے ان دونوں کو یکجا کیا تھا..... لیکن زالوشا سے یہ برداشت نہ ہو سکا، اور جلال شاہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا..... زالو شانے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا.....“

”یہ زالوشا کون ہے.....؟“ عدمان نے پلکیں جھپکائیں۔ ”یہ تو نام بھی عجیب سا ہے۔“

”وہ میرے ہی قبیلے کا فرد ہے.....“ دینو بابا نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اور جادو، سحر کے میدان میں میرا حریف ہے۔ میں عرصہ دراز پہلے قبیلہ چھوڑ چکا ہوں..... لیکن وہ اب تک میری ہر کامیابی کا دشمن ہے..... میں نے اسی لئے تمہیں بدل کر تمہارے گھر میں پناہ لی تھی..... اور اپنی بقیہ ماندہ زندگی کو سدا سے انداز میں گزرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن تمہاری دل چسپی اور توجہ نے میرے اندر کے انش کو پھر سے جگا دیا۔ لیکن

اس وقت میں نے انجام کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور نہ ہی میرے ذہن و گمان میں تھا کہ زالوشا میری محنت پر پانی پھیر دے گا۔“

اتنا کہہ کر دینو بابا خاموش ہو گئے، مانی ٹکر ٹکران کی شکل دیکھ جا رہا تھا۔

”اگر زالوشا نامی کوئی آدمی آپ کا دشمن ہے..... تو اس نے جلال شاہ کو کیوں ختم کیا.....؟“

”اس لئے کہ جلال شاہ میری ہی طاقت کا نمونہ تھا۔“ دینو بابا نے جواب دیا۔ ”اور..... اب تم ہو.....

لیکن..... لیکن میں تم کو اس کی زد میں نہیں آنے دوں گا۔ نہیں آنے دوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے دینو بابا کا چہرہ سرخ ہو گیا، پھر وہ خاموش ہو کر ہونٹ چبانے لگے..... جیسے تصور میں کسی جاندا کا کچا اور تازہ گوشت کھا رہے ہوں۔

”وہ ہے کون دینو بابا.....؟“ مانی نے بے چینی سے پوچھا! کیسا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ مجھے کچھ تو بتاؤ.....!

”وہ سحر کا بادشاہ ہے.....“ نام اس کا زالوشا ہے۔

”اس کی شکل و صورت مخصوص نہیں ہے وہ روپ بدل کر بھی دھوکا دیتا ہے..... وہ..... وہ اس جگہ رہتا ہے

جہاں زمین کا رنگ لال ہے اور وہاں موجود رشتوں کے پتے نیلے رنگ کے ہیں..... ہاں..... میرا اور اس کا کوئی

مقابلہ نہیں ہے..... لیکن میں نے اپنے علم سے کبھی کوئی

ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا..... اسی لئے میں اس کی طاقت

کے سامنے کافی حد تک ڈٹ جاتا ہوں..... اب دیکھتے

ہیں..... وہ تمہارے تاج پہننے کے بعد اگر کوئی رنگ

دکھانے کی کوشش کرے گا تو میں اپنا پورا زور صرف

کردوں گا..... 30 سال کا عرصہ گزر گیا ہے..... لیکن

جس طرح وہ مجھے یاد ہے..... میں بھی اسے یاد ہوں

گا..... اگر اب بھی میں اس کے علم کے احاطے میں ہوا وہ

ضرور کوئی چھیڑ چھاڑ کرے گا..... چلو دیکھتے ہیں.....

کیا ہوتا ہے..... ہو سکتا ہے کہ وہ اب..... میرا پیچھا

چھوڑ چکا ہو۔“

گلنار ہوٹل میں وہ تینوں اس طرح بیٹھے تھے جیسے کسی کے منتظر ہوں۔

ان کی آپس میں گفتگو بھی جاری تھی، ان کا موضوع وہی تھا جو آج کل زدعام تھا..... یعنی پہلوانی کا سالانہ مقابلہ..... اور پھر باتیں کرتے کرتے وہ ہوٹل کے صدر دروازے کی طرف دیکھنے لگتے۔

”یار میرا خیال ہے کہ وہ مشکل ہی آئے گا.....“ ایک نے کہا، یہ دہلا پتلا اور سختی سی جسامت کا مائل تھا، چہرے پر باریک سی مونچھیں تھیں۔

”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے.....“ دوسرا بولا۔ نیلے ہیٹ والے نے اندر داخل ہوتے ہی ان تینوں کو اپنی نظروں کا مرکز بنالیا۔

وہ بھی شاید اسی کے منتظر تھے تینوں نے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا، نیلے ہیٹ والے کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی، پھر وہ ان تینوں کی طرف بڑھا۔

ان کی میز کے گرد چوٹی کرسی خالی تھی، جو اسے پیش کر دی گئی، وہ شکر یہ کہ ساتھ کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اب تینوں نے اسے غور سے دیکھا، اپنے حلیے اور رنگ ڈھنگ سے وہ کسی غیر علاقے کا فرد دکھائی دے رہا تھا۔ کم از کم اس قصبے کا تو ہرگز نہیں تھا۔

”میں نے ہی آپ لوگوں سے فون پر بات چیت کی تھی.....“ ہیٹ والا مسکرایا۔ ”آپ لوگوں کے نام زبیر، سلیم اور برکت ہیں نا.....؟“

”ہاں..... بالکل..... میرا نام زبیر ہے، یہ سلیم اور یہ ہے برکت..... فون پر تو آپ اس طرح گفتگو کر رہے تھے، جیسے برسوں سے ہم لوگ آپ سے واقف ہوں..... لیکن آپ تو ہمارے لئے بالکل اجنبی ہیں.....“

”ہاں.....“ وہ زبیر کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا اور نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں پر اپنی نظریں نہ

اس وقت زبیر نے کچھ عجیب سی بات محسوس کی

لمحی

”میں بھی آپ لوگوں کی لائن کا آدمی ہوں.....“ اس نے پھر بات شروع کی۔ ”اس لئے غائبانہ طور پر اکثر لوگوں سے واقف ہو جاتا ہوں..... ہاں ابھی.....“

”اب مطلب کی بات ہو جائے.....؟“

”چائے منگوائیں یا ٹھنڈا.....؟“ زبیر نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں.....“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔

آپ لوگ اپنے لئے جو منگوانا چاہو منگوالو..... میں صرف سادہ پانی مانگا۔“

”تکلف کر رہے ہیں.....؟“ برکت نے ہنس کر پوچھا۔

”نہیں.....“ وہ بھی مسکرایا۔ ”ضرورت محسوس نہیں ہو رہی.....“

”ذرا رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور آواز دھیمی کر کے بولا۔

”ہاں ابھی..... اگر مانی جیت گیا تو میری طرف سے 30 لاکھ کی بولی ہے..... اور اگر ہار گیا تو.....“

وہ بولتے بولتے رک گیا، کیونکہ ہیرا چائے لے آیا تھا۔ ان لوگوں کے اسرار پر بھی ہیٹ والے نے چائے نہیں لی۔ پھر ہیرا چائے سرو کر کے چلا گیا۔

”تو آپ مجھے 30 لاکھ ادا کرو گے.....“ اس نے بات پھر شروع کی۔ ”کیا آپ لوگ اس معاہدے کو ذن کرتے ہو.....؟“

”ہمیں منظور ہے.....“ تینوں یک زبان ہو کر بولے۔

”ٹھیک ہے..... معاہدے پر سائن ہوں گے اور آپ لوگ گواہوں کا بھی انتظام کر لیجیے.....“ وہ بولا۔ ”میری طرف سے 30 لاکھ فائل۔“

”ٹھیک ہے.....“ زبیر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، پھر چونک کر بولا۔ ”ارے ہاں..... یاد آیا..... آپ نے اب تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔“

”میرا نام.....“ وہ تھوڑا سا آگے جھک آیا۔ ”میرا نام زالوشا ہے.....“ (جاری ہے)



عذاب تنہائی

صابحہ محمد اسلم - گوجرانوالہ

اچانک کمرے کے کونے میں گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے نسوانی ہیولہ کا روپ دھار لیا، دیکھنے میں وہ بہت دلکش، حسین اور خوب صورت تھی پھر اس کی آواز سنائی دی ”میں ایک روح ہوں۔“

ڈیڑھ گھنٹے کی مسجد بنانے والے اکثر خسارے میں رہتے ہیں۔ کہانی پڑھ کر دیکھ لیں

تو نہیں رہنا۔ اگر تمہیں یہ منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ مجھ سے بات مت کرو۔“
سلمان خاموشی سے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔
پھر ساری رات دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ دونوں کی شادی کو تھیں ابھی تین ماہ بمشکل ہوئے ہوں گے۔
بہت اچھی زندگی گزر رہی تھی کہ اچانک ہی ماہم نے نئے گھر میں رہنے کا شوشہ چھوڑ دیا۔

”سلمان“ مجھے نہیں رہنا اس گھر میں، اگر تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو الگ گھر میں رہنا ہوگا ورنہ تمہارا اور میرا ساتھ بس یہیں تک کا ہے سنا تم نے۔“

”م..... ما..... ہم میری بات تو سنو یا۔“
”نہیں..... مجھے اور کچھ نہیں سنا۔ بس میں نے کہاناں کہ مجھے اس گھر میں ایک ساتھ نہیں رہنا ہے

ماہم اور ثناء دو بہنیں تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔
 ماہم کے والدین ماہم کی پیدائش کے 5 سال بعد ہی
 ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ ماہم کی
 دور کی خالہ نے ان کی پرورش کی تھی وہ بیوہ تھیں ان کی
 کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے ہر طرح سے دونوں
 بہنوں کی پرورش کی تھی۔ ماہم اور ثناء انہیں ہی ماں جی
 کہہ کر بلاتی تھیں جب ثناء 22 سال کی ہوئی تو انہیں
 ثناء کی شادی کی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے بہت دیکھ
 بھال کر ثناء کی شادی اپنے بھانجے شاہ زیب سے
 کر دی۔ شاہ زیب بہت ہی سمجھ دار سلکھا ہوا انسان تھا۔
 اور اس کے گھر والے بھی بہت مطمئن تھے۔ سوان
 دونوں کی شادی بہت دھوم دھام سے نہ سہی مگر بہت
 سادہ بھی نہیں تھی۔ ماہم کی دوست کرن کی شادی میں
 ماں جی اور ماہم دونوں ہی گئی تھیں وہاں پر کرن کی ماہی
 عائشہ کو اپنے بیٹے کے لئے ماہم ہر لحاظ سے پسند
 آئی۔ انہوں نے اپنی دونوں بہنوں کو اپنے بسمہ کو بھی
 ماہم سے ملوایا۔

عائشہ بیگم نے ماں جی سے بات کی تو یوں بنا
 چوں چراں کہ یہ رشہ منظور کر لیا گیا۔ ماں جی کو ماہم کی
 طرف سے بہت فکر تھی کیونکہ وہ اب بہت زیادہ بیمار
 رہنے لگی تھیں۔ اس لئے وہ ماہم کی جلد از جلد شادی
 کر کے اس کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔
 یوں ماہم عائشہ بیگم کے لاڈ لے چہیتے اور سب سے
 چھوٹے بیٹے سلمان کے ساتھ رخصت ہو کر اپنے
 سسرال آ گئی۔

ماہم کی شادی کے بعد ماں جی بھی زیادہ عرصہ
 تک نہ جی سکیں اور شادی کے 15 دن بعد ہی اپنے
 خالق حقیقی سے جا ملیں۔

☆.....☆.....☆

سلمان اور ماہم میں دو دن سے بول چال بند
 تھی۔ سلمان مع ماہم کے اٹھنے سے پہلے ہی آس کے
 لئے نکل جاتا۔ اور ماہم بھی زیادہ دیر تک اپنے کمرے
 میں ہی بند رہتی۔

”کیا ہوا بیٹا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے
 ناں۔؟“ ماہم اور سلمان کے کمرے میں دستک دے کر
 عائشہ بیگم اندر آئیں اور ماہم سے مخاطب ہوئیں۔ ان
 کے مخاطب کرنے پر ماہم نے ایک نظر اپنی فکر مند ہوتی
 ساس کو دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر فنی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں
 می میں بالکل ٹھیک ہوں آئی ایم فائن ڈونٹ وری۔“
 ”مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں
 ہے۔“ عائشہ بیگم فکر مند لہجے میں گویا ہوئیں۔

”نہیں می میں بالکل ٹھیک ہوں چلے میں بھی
 آپ کے ساتھ باہر چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ماہم بھی عائشہ
 بیگم کے ساتھ ساتھ چلے گئی۔

”لائیں بھابھی میں آپ کی کچھ ہیلپ
 کروں۔“ کچن کے پاس سے گزرتے ہوئے ماہم کچن
 میں چلی گئی۔ وہاں لائے بھابھی اور بسمہ دونوں کھانا
 بنانے میں مصروف تھیں۔ ”کیا ہوا ماہم تمہاری طبیعت
 کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ لائے بھابھی نے ماہم کی
 طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی بھابھی سر میں تھوڑا درد تھا اس لئے کمرے
 میں لیٹی تھی سو جا تھوڑی دیر سو جاؤں تو طبیعت کچھ ٹھیک
 ہو جائے گی۔“ کہتے ہوئے ماہم چھری اور پیاز ہاتھ میں
 تمام چکی تھی سلاڈا کٹنے کے لئے۔

”نہیں ماہم میں کراؤں گی، ہم ہیں ناں
 یار پھر کیوں ٹینشن لیتی ہو تم۔“ یہ کہتے ہوئے بسمہ نے
 چھری ماہم کے ہاتھ سے لے لی۔

”ویسے بھی تمہارے سر میں درد ہے جاؤ تم لان
 میں می کے ساتھ بیٹھو، میں تم دونوں کے لئے چائے لے
 کر آتی ہوں۔“

لائے اور بسمہ بھابھی جب سے ماہم کی شادی
 ہوئی تھی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں اور زیادہ تر کام خود
 ہی کرتی تھیں۔ اور تو اور ماہم کے اپنے کام بھی زیادہ
 تر بھابھیاں ہی کرتی تھیں۔ مثلاً کپڑے دھونے پر ایس
 کرنے وغیرہ وغیرہ.....

”یہاں سب لوگ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں می

کا مشورہ دے کر چلی گئی تھی۔
 ”کیا ہوا میڈم کہاں گم ہو۔؟“ اپنی آنکھوں کے سامنے لہراتا ہوا ہاتھ دیکھ کر ماہم چونک کر ایک دم خوابوں کی دنیا سے باہر آئی۔ اور سلمان کا ہاتھ اپنے سامنے لہراتا دیکھ کر غم و غصے کی کیفیت میں یک دم اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

سب کے سب ماہم کی اس حرکت پر حیرت سے بت بنے اس کی پشت کو دیکھ گئے اور ایک دم سب نے سوالیہ نظروں سے سلمان کو دیکھا۔ ”وہ..... وہ..... ماہم الگ گھر میں رہنے کی فرمائش کر رہی ہے وہ کہہ رہی ہے کہ مجھے سب کے ساتھ نہیں رہنا الگ رہنا ہے اکیلے۔“ سلمان کے منہ سے اس انکشاف پر سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

سلمان نے ہنچکپاتے ہوئے بات مکمل کی، کیوں کہ ایک نہ ایک دن تو یہ بات سب کے سامنے آنی ہی تھی۔
 ”ماہم کو اس گھر میں کیا کمی ہے ہر چیز تو اسے ملتی ہے ضرورت کی۔“ عائشہ بیگم صدمے سے چور لہجے میں بولیں۔

اگلے دن سلمان کے اٹھنے سے پہلے ہی ماہم اپنا بیک تیار کر چکی تھی۔ اور سلمان کے اٹھنے ہی ماہم اسے بتا چکی تھی کہ ”آج اسے ثناء کے گھر ڈراپ کر دیں۔“ آفس جاتے ہوئے ماہم کو سلمان نے چپ چاپ ثناء کے گھر ڈراپ کر دیا عائشہ بیگم کو وہ نکلتے نکلتے ہی بتا چکی تھی کہ ”میں ثناء آپ کی گھر جارہی ہوں اور جب تک سلمان الگ گھر نہیں لے لیتے میں واپس نہیں آؤں گی۔“ عائشہ بیگم کو اس بات کی قطعاً توقع نہیں تھی کہ ماہم ان کے سامنے بھی الگ گھر کی بات کر سکتی ہے۔

ماہم کو ثناء کے گھر آئے ہوئے 8 دن ہو چکے تھے اور سلمان نے ایک بار بھی فون نہیں کیا تھا اور ماہم کو ثناء نے روک رکھا تھا کہ وہ سلمان کو فون نہ کرے..... بہت بار لائیب بھا بھی اور بسمہ بھا بھی کا فون آیا۔ ”ماہم تم اپنا گھر بر باد کر رہی ہو یہاں سلمان کی یہ حالت ہے کہ نہ ہی کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ اور کام میں خود کو بہت

لائیب بھا بھی، بسمہ بھا بھی یہاں تک کہ سلمان خود بھی میرا خود سے زیادہ خیال رکھتے ہیں پھر کیوں میں ان سے دور جانے کی ضد پراڑی ہوں۔ الگ گھر لینے کی ضد میں سلمان کو بھی ناراض کیا جو مجھ سے بہت پیارا کرتے ہیں۔ میری ذرا ذرا سی چیز کا کتنا دھیان رکھتے ہیں۔“ ماہم سوچ میں پڑ گئی۔

”ماہم ایک نہ ایک دن تو تمہیں الگ ہونا ہی ہے کیوں نہ آج سے ہی۔ آج تمہاری یہ جھنجھائیاں تمہارا پیار سے کام کر رہی ہیں کل کو تمہیں اپنی انگلیوں پر نچائیں گی، ہر کام بلکہ اپنا بھی تم سے کروائیں گی۔ اور سلمان، سلمان تو بڑا کبھی پھرتی ہوتا کہ سلمان ایسے ہیں ویسے ہیں۔ میرا خیال رکھتے ہیں مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں ایک بار سلمان سے تو الگ گھر کی فرمائش کر کے دیکھو پھر پتہ چلے گا کہ سلمان تم سے سچ میں پیار کرتا ہے یا نہیں؟“

اب تم مجھے ہی دیکھ لو ماہم کیسے شاہ زیب کو اپنی انگلیوں پر نچائی ہوں، ہم صرف دو لوگ ہیں ایک بیٹا ہے ہمارا جنید جب مرضی آؤنگ پر جاؤ، جب مرضی باہر کھانا کھاؤ گھر میں دل کیا تو کھانا بنالیا اور نہ باہر سے منگوایا۔ دو لوگوں کا کام ہی کتنا ہے۔ خوب مزے ہیں بھی میرے تو..... اگر تم چاہو تو تم بھی ایسے عیش کر سکتی ہو اگر سلمان الگ گھر میں رہنے پر رضامند نہ ہوا تو اسے دھمکی دینا کہ الگ گھر لوور نہ میں اپنی بہن کے گھر چلی جاؤں گی۔

جب تک واپس نہیں آؤں گی جب تک الگ گھر لینے پر رضامند نہیں ہوتے اور اگر وہ سلمان تمہاری اس دھمکی سے بھی نہ ڈرا اور الگ گھر میں رہنے پر رضامند نہ ہوا تو کچھ دنوں کے لئے آ جانا میرے گھر..... اتنا تو میں جانتی ہوں کہ سلمان تم سے محبت کرتا ہے اور تمہیں لینے کے لئے ایک دن ہمارے گھر ضرور آئے گا۔ بس اتنا سا کام کرنا پڑے گا تمہیں، پھر اس کے بعد عیش ہی عیش۔“ ماہم کے کانوں میں ثناء کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے ہی ثناء یہاں آئی تھی اور ماہم کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے کنوئیں میں چھلانگ لگانے

ضرور اسے بہکایا جا رہا ہے وہ تو بالکل معصوم ہے۔“ بسہ
اور لائیبہ دونوں بچن میں باتیں کر رہی تھیں۔

”ہاں مجھے یاد آیا جس دن شام آئی تھی۔ اس دن
میں ماہم کے کمرے کے پاس سے گزر رہی تھی تو میں
نے شام کے منہ سے سنا تھا کہ ”الگ گھر کی فرمائش
کرو خوب عیش کرو گی۔“ لائیبہ بھابھی نے کہا۔

”ہاں تو یہ سب شام کا ہی کیا دھرا ہے خود
تو لڑائیاں کر کے گھر میں الگ ہو گئی دوسروں کو بھی اپنے
طرح بننے کے مشورے دیتی ہے۔“ بسہ نے بھی شام
کے خلاف بول کر اپنی بھڑاس نکالی۔

سلمان جو کہ بچن میں چائے پینے کے لئے
آیا تھا۔ ان دونوں کی باتیں سن کر دروازے سے ہی
واپسی کے لئے مڑ گیا اور اپنے کمرے میں جا کر کئی وی
اون کر کے ریوٹ سے چپٹل چھینچ کرنے لگا۔

سلمان عجیب کشش میں تھا کہ اتنے میں عائشہ
بیگم لائیبہ اور اندرائیں اور سلمان کو سمجھانے لگیں۔ ”بیٹا
یہ ناراضگی چھوڑ دو اور ماہم کو لے آؤ۔“

”مگر مکی وہ الگ گھر میں رہنے کا کہہ رہی ہے۔“
”تو کیا ہوا بیٹا۔ ساری دنیا الگ ہوتی چلی آئی
ہے اور اگر ماہم اس میں خوش ہے تو اسے الگ گھر میں
لے جاؤ تمہارے دادا والا مکان ہے شالیمار میں، برسوں
سے خالی پڑا ہے اس کی صفائی ستھرائی کروا کے ماہم
کو لے کر وہاں چلے جاؤ۔ وہاں پر پہلے تو کوئی آبادی
نہیں تھی لیکن اب سنا ہے کہ آس پاس کافی گھر آباد
ہو چکے ہیں۔“

”ٹھیک ہے مکی جیسے آپ کی مرضی میں ایسا ہی
کرنا ہوں۔“ سلمان نے سعادت مندی سے سر جھکا دیا
اور عائشہ بیگم نے اس کے ماتھے کا بوسہ لے لیا۔

اگلے دو دن تک سلمان صفائی ستھرائی کا کام
کروانے لگا اور پھر ماہم کو لے کر شالیمار والے گھر میں
شفٹ ہو گیا۔ ماہم بھی بہت خوش تھی کہ سلمان نے اس
کی بات مان لی۔ عائشہ بیگم، لائیبہ اور بسہ بھابھی سے

مصرف رکھنے لگا ہے اپنی صحت کا ذرا خیال نہیں تم ہی
اس کا کچھ خیال کرو ماہم.....“ لائیبہ بھابھی نے سنجی لہجے
میں ماہم سے کہا۔

”بس میں خیال کروں ان کا اور انہیں کوئی حق
نہیں میرے خیال کا انہیں مجھ سے پیار ہی نہیں ہے اگر
مجھ سے ذرا سا بھی پیار ہوتا تو میری بات ضرور مانتے۔
اور جب تک الگ گھر کا بندوبست نہیں ہو جاتا، میں
نہیں آؤں گی سمجھیں آپ۔؟“ ماہم نے غصے سے کہہ
کر فون بند کر دیا۔

پھر سارا دن ماہم کا ملال میں گزرا کہ اسے
بھابھی سے اس طرح سے بات نہیں کرنی چاہئے تھی وہ
کیا سوچ رہی ہوں گی، میرے بارے میں کہ کتنی
خود غرض ہے۔ ماہم کا دماغ چکرانے لگا اور وہ کچھ دیر
ریٹ کرنے کے لئے لیٹ گئی۔
”ماہم..... ماہم..... کچھ دیر بعد شاہ زیب بھائی دستک
دے کر اندر چلے آئے۔“ ماہم ہم امی کی طرف جا رہے
ہیں تم ساتھ چلو گی ہمارے۔؟“

”نہیں بھائی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ
جائیں میں کچھ دیر ریٹ کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے میں بھی یہی کہہ رہی تھی کہ
ماہم گھر پر ہی رک جائے کیونکہ کہ آج کام زیادہ ہے
مجھے جنید بہت تنگ کر رہا تھا تو کام بھی نہیں ہوا ماہم برتن
سنگ میں رکھے ہیں دھولینا اور صفائی کر کے یہ چند
سوٹ ہیں تمہارے بھائی کے یہ پر لیں کر دیتا۔“ شام تو
ماہم کو حکم دے کر چلتی بنی۔ جبکہ شاہ زیب، شام کی اس
حرکت پر ہونٹ کپکتے رہ گئے اور شام کے پیچھے باہر نکل
گئے اور پھر ماہم کے دماغ میں سوچوں کا غبار اٹھا۔ ”یہ
کیا! ایسا حکم تو مجھے سسرال والے بھی نہیں دیتے تھے۔“

خیر ماہم سارے کام نمٹا کر اندر آ کر لیٹ
گئی۔ آج اسے وہ کہ سلمان کی یاد ستر رہی تھی پھر نے
اپنے موبائل میں گانا لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆.....☆

”نہیں بھابھی ہماری ماہم ایسی بالکل نہیں ہے

مل کر ماہم سلمان کے ساتھ چلی گئی۔

سلمان بھی ناراضگی ختم کر کے ماہم کی خوشی میں ہی خوش تھا وہ ماہم کو پیار سے ماہا پکارتا تھا اور یہ ماہم کو بہت اچھا لگتا تھا وہ دونوں بہت خوش تھے ماہم روزانہ گھر فون کر کے لائبہ بھابھی، ہسمہ بھابھی اور عائشہ بیگم سے باتیں کرتی۔ وہ بھی اس کی خوشی چاہتے تھے اور اسی میں خوش تھے کہ ماہم خوش ہے۔

اس گھر میں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہونے والا تھا، ان دنوں میں ماہم نے خوب اچھی طرح سے گھر کی سینک کی تھی۔ اپنے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کو خوب ڈیکوریٹ کیا تھا۔ ماہم کی ڈیکوریٹ کو سلمان بھی داد دینے بتا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ماہم آج میرا ویٹ نہ کرنا، میں ڈرائیٹ گھراؤں گا، گیٹ کو اور بیڈ روم کے دروازے کو ٹھیک سے بند کر لیتا۔“ موبائل پر سلمان کا سچ دیکھ کر ماہم پر کچھ طاری ہو گئی اور سلمان کا موبائل نمبر ڈائل کر کے کان سے لگا لیا جو کہ مسلسل آف چار ہاتھا۔

ماہم کچن میں کھانا بنا رہی تھی اور موبائل بیڈ روم میں ہی تھا، جب کام سے فارغ ہو کر ماہم روم میں گئی تو موبائل پر سلمان کی اتنی زیادہ مسیڈ کال دیکھ کر پریشان ہو گئی اور جب صبح آن کیا تو پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اب وہ سلمان کا نمبر ملاری تھی جو کہ بند چار ہاتھا اور پھر اچانک بیل گئی تو ماہم کی جان میں جان آئی۔ دو تین بیل پر سلمان نے فون ریوکیا۔ ”ہیلو..... ہیلو سلمان تم ٹھیک تو ہونا کب سے تمہیں فون کر رہی ہوں موبائل بند چار ہاتھا۔“

”ہاں میری جان میں بالکل ٹھیک ہوں بس آج تھوڑا کام زیادہ ہے، کام میں پھنسا ہوں، اس لئے لیٹ آؤں گا، تم اپنا خیال رکھنا اور دروازے کو ٹھیک طرح سے لاک کر کے سونا۔“

”اوکے لیکن تم پلیز جلدی آنے کی کوشش کرنا۔“ ماہم گھبراہٹ میں بولی۔

حسن سلوک

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پڑوس میں ایک یہودی رہا کرتا تھا۔ جب کبھی گھر میں کوئی چیز آتی تو پڑوسی کو بھی اس میں سے دیتے، ایک مرتبہ آپ نے ایک بکری ذبح کرائی اور گھر والے یہودی کو گوشت بھیجنا بھول گئے حضرت عبداللہؓ کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بہت سخت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے۔

”رسول اکرمؐ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ہمسایوں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق جبرائیلؑ نے اس قدر تاکید کی کہ مجھے شک پڑ گیا کہ غالباً ہمسایوں کو شریک وراثت بتادیا جائے گا۔“

(انتخاب: ذواللہ - کراچی)

”ماہم کبھی اکیلی رہی جو نہیں تھی اس لئے اسے ڈر لگ رہا تھا اور خود پر رہ کر غصہ بھی آ رہا تھا کہ اسے الگ گھر میں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی ایسا موقع بھی آ سکتا ہے کہ اس کو اکیلا رہنا پڑے گا۔ اب اسے سب گھر والوں کی یاد تازہ رہی تھی۔

”اوکے ماہم میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“ جیسے ہی کام ختم ہو گا میں فوراً آ جاؤں گا اب دروازے کو لاک کرو اور آرام کرو۔“ ”بائے ٹیک کیئر.....“ سلمان پیار سے بولا۔

فون بند ہونے کے بعد ماہم پہلے گیٹ لاک کر کے آئی اور پھر بیڈ روم کا دروازہ لاک کر کے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی آج وہ تھک گئی تھی، تو اسے لیتے ہی نیند آ گئی۔ ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ بہت زوروں سے چیخنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھ کر توجہ نہ دی اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اتنی دیر میں آوازیں چیخنے چلانے کی اس قدر تیز ہو گئیں کہ ایسا لگتا تھا کہ ابھی سر پھٹ جائے گا غور کرنے پر پتہ چلا کہ وہ آوازیں نسوانی تھیں جو کہ باہر محن سے آ رہی تھیں، وہ ڈر کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور فون اٹھا کر

اور پھر باتیں کرتے کرتے دونوں کو نیند آ گئی۔

صبح معمول کے مطابق ماہم نے سلمان کے اٹھنے سے پہلے ہی ناشتہ تیار کیا اور خود فریش ہو کر ناشتہ ٹیبل پر لگا دیا یا سلمان کو اٹھانے کے لئے روم میں گئی شاید سلمان شاور لے رہا تھا، وہ روم میں نہیں تھا۔ جلدی سے ماہم بیڈ کی چادر درست کرنے لگی اتنے میں ماہم کو پھر چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اب چیخنے کی آواز کے ساتھ رونے کی بھی آوازیں آرہی تھیں۔

”اوہو! آج تو ہماری میڈم بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“ کاشن کے پنک اور فیروزی کنٹراس کے سوٹ میں ماہم سچ میں نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ سلمان واش روم سے آیا تو ماہم بیڈ کی چادر ٹھیک کر کے اٹھی تھی۔ سلمان ایک تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سلمان کی نظروں کی تپش محسوس کر کے ماہم یک دم ہر بڑا گئی۔ ”ایسے کیا دکھ رہے ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں اپنی جان کو دیکھ رہا ہوں..... آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔“

پھر ماہم بولی۔ ”جلدی سے آجائیں ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ دونوں نے ناشتہ کیا کھانے کے دوران بھی سلمان گاہے بگاہے ماہم کو دیکھتا رہا۔ ”آج میں جلدی آ جاؤں گا تم کھانا نہ بنانا آج ہم ڈنر باہر کریں گے۔“ ماہم کو سلمان یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا اور سلمان کے جانے کے بعد ماہم ناشتے کے برتن سمیٹ کر بچکن میں برتن دھو رہی تھی کہ رونے کی آواز پھر سے آنے لگی اور بہت تیز آواز تھی۔

ماہم کو ڈرتو لگ رہا تھا مگر اب تو دن تھا اس لئے زیادہ ڈرنے لگا۔ ماہم برتن دھو کر مچن میں آئی تو آواز کچھ تیز ہو گئی ماہم آواز کی سمت بڑھنے لگی باہر مچن میں آ کر جہاں کچھ کھلے رکھے تھے، پودوں پر رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے، یہاں بچی زمین تھی اور آواز وہیں سے آرہی تھی۔ ”ک.....ک.....کو.....کون ہے؟“

ماہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہیلپ! ہیلپ! ہیلپ می۔ پلیز! میری مدد کرو

سلمان کا نمبر ڈائل کرنے لگی جو کہ بند تھا۔

پھر دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ وہ سمجھی کہ شاید سلمان آئے ہیں۔ باہر جاتے ہوئے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی اتنے میں دروازہ بہت زوروں سے بجنے لگا وہ گھبراتی ہوئی دروازے کے پاس آئی اور بتا پوچھے ہی دروازہ کھول دیا اور جب باہر دیکھا تو کوئی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ خوف و ڈرنے اسے اپنے جتنے میں جکڑ لیا تھا اس کی حالت ماہمی آب تھی، حلق میں کانٹے جیسے محسوس ہو رہے تھے۔ جسم میں خون کی گردش جیسے رکئی محسوس ہو رہی تھی اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ چکے تھے، خیر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر اس نے دروازہ جھٹ بند کیا، ابھی وہ بیڈ روم کے پاس تک پہنچی ہی تھی کہ دروازہ پھر سے بجنے لگا تو وہ ڈرتی ڈرتی پھر دروازے تک آئی۔ ”کون.....؟ کون ہے.....؟ کون ہے باہر.....؟“

”میں ہوں یار اب کھول کھول بھی دو دروازہ.....“ سلمان کی آواز سن کر ماہم نے دروازہ کھول دیا سلمان کے اندر قدم رکھتے ہی اس سے لپٹ گئی۔

”ارے کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو۔“

”سلمان..... وہ..... وہ..... وہاں مچن سے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں، بہت زور سے کوئی چیخ رہا تھا۔“

”کہاں سے..... دکھاؤ مجھے کون چیخ رہا ہے وہاں۔“ سلمان اس جگہ آ گیا جہاں سے نسوانی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

سلمان ماہم کو بانہوں میں لئے لئے ہی مچن کے پاس آیا۔

مگر یہاں تو چار سو خاموشی کا راج تھا۔ ”یہیں سے آرہی تھیں آوازیں۔“ ماہم لڑتی آواز میں بولی۔

”ارے بھی تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا، یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اوکے ریلیکس ہو جاؤ، اب چلو۔“ سلمان ماہم کو لے کر روم میں آ گیا اور ماہم کا دھیان بنانے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا

سلمان بولا۔ ”کون ہو تم اور کیا چاہتی ہو۔؟“
 ”میں ایک روح ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”روح کا لفظ سننے ہی ماہم ایک دم کانپ کے رہ گئی۔“
 ”بولو کیا مدد کر سکتے ہیں ہم تمہاری۔؟“ سلمان نے پوچھا۔

”میرے والدین نے دولت کے لالچ میں آ کر میری شادی کمال سے کردی تھی میں بچپن سے ہی بہت خوبصورت تھی اور اپنے کزن انور کو بہت پسند کرتی تھی میرا نام نورالعین ہے پیار سے سب مجھے نور کہہ کر بلاتے تھے اور ابھی مجھے بہت پسند کرتا تھا گھر میں میرے ابو اور امی کو کبھی پتہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں میرے ابو بھی میری پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے غریب ہماری شادی کر دانے والے تھے کہ اتنے میں کمال پتہ نہیں کہاں سے فک پڑا۔ میری امی سو تیلی تھی کمال ان کی بہن کا بیٹا تھا وہ میرے ابو کی جائیداد پر قبضہ جمانا چاہتا تھا کمال نے پہلے ہی اپنی خالہ یعنی میری سوتیلی ماں کو ششے میں اتارا کہ میں نور سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور پھر میرے ابو کو بھی اور امی کو دولت کا لالچ دیا اور لالچ میں آ کر انہوں نے میری شادی اس سے کردی۔

میں بہت ردی بہت تڑپی مگر میری آہوں کا کسی پر کچھ اثر نہیں ہوا کمال نے شادی کے بعد میرے ابو کو دھمکی دی کہ اگر وہ اپنی ساری جائیداد اس کے نام نہیں کریں گے تو وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا ابو کو میری جان کی پرواہ تھی اور انہوں نے اپنی ساری جائیداد اس کے نام کر دی۔

کمال شرابی تھا، جواری تھا نشے کا بہت عادی تھا، کافی عرصے سے یہ گھر خالی پڑا تھا، کمال نے اس کا تالہ توڑ کر اس میں اپنا فاشی کا اڈا بنالیا تھا طرح طرح کے شرابی دوستوں کو لے کر آتا تھا۔

کمال کا ایک دوست امیر ایک دن گھر آیا، اچانک میں وہاں سے گزر رہی تھی تو اس کی نظر مجھ

پلیز، میری مدد کرو۔“
 ”کون ہو تم اور کیا چاہتی ہو مجھ سے۔؟“ ماہم نے لرزے اور ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”میں بہت مصیبت میں ہوں پلیز، میری مدد کرو۔“ زمین کے نیچے سے آواز آئی۔

”کون ہو تم اور کہاں ہو؟“ ابھی ماہم نے پوچھا ہی تھا کہ اتنے میں ماہم کا میل فون بج اٹھا۔

”السلام علیکم! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنا میں جی، آپ کسی ہیں۔ لائبہ اور بسمہ بھابھی کسی ہیں؟ یہاں سب ٹھیک ہے۔“

”بیٹا تم کسی ہو اور سلمان کیسا ہے۔؟“ عائشہ بیگم نے سوال کیا۔

”سب ٹھیک ہے شکر ہے اللہ کا..... اچھا اللہ حافظ۔“ فون بند کر کے ماہم کا موم میں مصروف ہو گئی تھوڑی دیر بعد سلمان آ گیا اور پھر دونوں آؤٹنگ کے لئے نکل گئے کھانا بھی ہوٹل میں کھایا اور تقریبی مقامات پر سیر کرنے لگے بہت انجوائے کیا دونوں نے اور پھر رات گئے تک واپس آئے۔

آتے ہی سلمان پہنچ کرنے کے لئے واش روم میں ٹھس گیا، اور ماہم کو اچانک محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پاس سے گزرا ہو..... کچھ دور جا کے ماہم کو کوئی سایہ نظر آیا اور جب ماہم نے بغور دیکھا تو غائب ہو گیا۔

اتنے میں سلمان اس جگہ آ گیا جہاں ماہم بیٹھی تھی۔
 ”سلمان وہ وہاں کوئی ہے۔؟“ ماہم بولی۔

”کہاں.....؟ وہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ ماہم کے انگلی کے اشارہ کی سمت دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے کوئی تھا۔ ”تم مانو نہ مانو یہاں کوئی ہے۔“

”کون ہے کون ہے وہاں۔؟“ سلمان آوازیں دینے لگا۔

اتنے میں ایک سایہ نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے انسانی روپ میں ایک دوشیزہ کھڑی تھی وہ بہت دلکش اور خوبصورت تھی کہ ایک لمحے کے لئے سلمان اور ماہم دونوں یک نکل اسے دیکھ گئے اور پھر ایک دم

”اب سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے صبح دیکھیں گے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔“ سلمان نے ماہم سے کہا جو کہ بت بنی ابھی تک اس سمت دیکھ رہی تھی جہاں نور کھڑی تھی۔

”سلمان مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ ماہم بولی۔

”ڈر مت ماہا مجھے لگتا ہے ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ ماہم بھی سلمان کے ساتھ اندر روم میں آ گئی۔

اگلی صبح سلمان نے محلے کے چند لوگوں کو اکٹھا کیا اور انہیں صورتحال سے آگاہ کیا تو سارے لوگ ہاں میں ہاں ملانے لگے اور پھر گملوں کے پاس کچی زمین کو کھودا گیا تو وہاں سے مخدوش ایک لاش نکلی جسے اصل طریقے سے نماز جنازہ پڑھا کر قبرستان میں دفنایا گیا۔

اس کے بعد اس گھر میں نور کی روح نظر نہیں آئی۔ چند دن بعد ماہم بولی۔ ”سلمان میرا یہاں دل نہیں لگتا، ہمیں مئی کے پاس واپس جانا چاہئے۔“ اور ماہم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

”میں بھی تم سے یہ ہی کہنے والا تھا۔ مگر تم کہیں ناراض نہ ہو جاؤ غصہ نہ کرو اس لئے میں نے نہیں کہا۔“

”سوری سلمان میں نے آپ کا اور سب گھر والوں کا بہت دل دکھایا۔“ یہ کہتے ہوئے ماہم نے سلمان کے کندھے پر سر رکھا۔

اور پھر اگلی صبح وہ دونوں واپس گھر چلے گئے، ماہم نے سب سے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور ان دونوں کو دیکھ کر گھر والے بہت خوش ہو گئے کیوں کہ ان کے گھر کی رونقیں واپس آ گئی تھیں۔

اس کے بعد آئندہ کبھی ماہم نے الگ گھر میں رہنے کا مطالبہ نہیں کیا۔

پر پڑی تو ابرار نے کمال کو بہت زیادہ دولت کا لالچ دے کر میرے ساتھ رات گزارنے کو کہا۔

کمال تو پہلے ہی لالچی انسان تھا۔ سو اس نے ابرار کی بات مان لی۔

”نہیں نہیں..... کمال تم ایسا نہیں کر سکتے میں تمہاری بیوی ہوں میں کسی غیر کے ساتھ رات نہیں گزار سکتی۔ کچھ تو شرم کرو، میں تمہاری بیوی ہوں اس کی نہیں اور تم دفعہ ہو جاؤ یہاں سے خبردار جو مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش بھی کی تو میں.....“ چیتنے لگی چلائی گئی۔

اور ابرار کوروم میں چھوڑ کر کمال باہر نکلنے لگا تو میں نے نیل پر پڑا شیشے کا گلدان اٹھا کر توڑا اور اپنے آپ کو مارنے لگی کہ اتنے میں کمال نے آ کر میرے ہاتھ سے گلدان لے لیا اور مجھ سے کہا۔ ”میں تمہیں پیار سے کہہ رہا ہوں کہ ایک رات گزار لو اس کے ساتھ بس۔“

میں نے منع کر دیا اور شور مچانے لگی اور اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ ”بے شرم بے غیرت کچھ تو شرم کرو اپنی بیوی کو کسی اور کے حوالے کرتے ہو۔“ کمال نے شراب پی ہوئی تھی طیش میں آ کر گلدان سے میرے پیٹ میں پے در پے کئی وار کر ڈالے اور میں تڑپتے ہوئے ساکت ہو گئی۔

ابرار تو یہ سب دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا کمال نے میری لاش کو باہر گملوں کے بیچ جو کچی زمین ہے گڑھا کھود کر وہاں پدفن کر دیا اور خود پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگا تھا۔

ایک دن شراب کے نشے میں دھت سڑک کر اس کرتے ہوئے ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔“ یہ بول کر وہ روح سسکنے لگی۔

”ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں۔“ سلمان بولا۔

”تم میری لاش کو غسل دے کر کفنانے کے بعد

نماز جنازہ کے ساتھ دفن کر دو تو میری روح کو سکون مل سکے گا، اللہ تم کو اس کا بہت اجر دے گا۔“ یہ کہہ کر نور کی روح غائب ہو گئی۔





خونی بارش

ملک فہیم ارشاد۔ ڈچکوٹ فیصل آباد

اور اچانک نوجوان کے چہرے کے خدو خال بدلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ دہشت ناک اور خوفناک ہو گیا تو اسے دیکھ کر لڑکی اپنی جگہ سے اچھلی اور ساتھ ہی کرسی سمیت نیچے گر پڑی اور پھر خوفناک چہرہ نوجوان اچانک.....

احکام خداوندی کو انکار کرنے والے اکثر نشانِ عبرت بن کر موت سے ہمتناز ہو جاتے ہیں

کالے رنگ کی ایک بڑی کار اس برستی بارش کی رات میں کافی دیر سے ٹارل اسپڈ سے سڑک پر جاری تھی، کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر مشہور بزنس مین کامران مرزا بیٹھے تھے، وہ کپڑے کی بہت بڑی مل کے مالک تھے، ساتھ والی سیٹ پر ان کا بچپس سالہ بیٹا فراز بیٹھا ہوا تھا جبکہ پچھلی سیٹ پر ان کی بیوی زہنت بیگم اور ساتھ ہی ان کی بیس سالہ بیٹی ماریہ براجمان تھی۔

آج غصہ کی بارش ہو رہی تھی اور کافی دیر سے ہو رہی تھی..... بارش کے ارادے جلد تھنے والے نہیں تھے، برستی بارش کی وجہ سے راستوں کا بھی برا حال تھا کیونکہ ٹکڑے موسمیات کے مطابق بارش برسنے کا ارادہ ساری رات کا تھا۔ بارش مزید تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی، اوپر سے بجلی بھی خوب چمک رہی تھی اور بادلوں کا گر جتا تو ویسے بھی بارش کے ساتھ رہا ہے۔

صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر وضاحت کرتے ہوئے بولے ”گاڑی کے ٹھنڈے تو پہلے سے بند ہیں، AC آن ہے، سگریٹ بجھانے سے مجھے نیند آ سکتی ہے اور اگر مجھے نیند آگئی تو اسٹیرنگ میرے قابو میں نہیں رہے گا اور فری ہینڈ گاڑی کسی بھی چیز سے ٹکرا سکتی ہے۔“

”اس معلومات کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ زینت بیگم نہ بتاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولیں جبکہ فراز بے اختیار ہنسنے لگا۔

”اور اس سگریٹ کی وجہ سے اگر تین آدمی ڈسٹرب ہوں تو۔“ زینت بیگم نے بدستور منہ بتاتے ہوئے کہا۔

”صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے کا سفر باقی رہ گیا ہے۔ پھر ہم گھر میں ہوں گے۔“ کامران صاحب نے کہا۔

”کیا مصیبت ہے۔“ زینت بیگم نے منہ لگاڑتے ہوئے کہا اور پھر ہنستے ہوئے فراز پر برس پڑیں۔ ”تمہارے یہ دانت نکلنے بند ہوں گے یا تمہیں ایک پھنڈ لگاؤں۔“ فراز اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر یکدم خاموش ہو گیا۔

بارش کا زور اب مزید بڑھ گیا تھا۔ گاڑی کی وینڈ اسکرین پر چلتے واپس نہ آتی تھی۔ کامران صاحب نے گاڑی کی رفتار مزید کم کر دی تھی کیونکہ اگر وہ رفتار کم نہ کرتے تو گاڑی کسی حادثے کا شکار ہو جاتی۔

”بیگم صاحبہ اگر بارش کا یہی حال رہا تو ہم دو تین گھنٹوں میں گھر پہنچیں گے۔“ اور کامران صاحب اس مرتبہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

”اس بارش کو بھی آج ہی برساتھا۔“ زینت بیگم غصے سے بولیں۔

”مما بارش پر غصہ نہ کریں، ورنہ بارش غصہ ہو کر مزید تیز ہو سکتی ہے اور پاپا نے جو آپ کو تین گھنٹے کا وقت دیا ہے وہ کہیں پانچ گھنٹے کا نہ ہو جائے۔“ ماریہ نے ہینڈ فری کاٹون سے نکالتے ہوئے کہا۔

”آپ کو فرصت مل گئی گاٹون سے۔“ اور تمہیں کیسے پتہ کہ تمہارے پاپا نے یہ بات کہی تھی تم تو فلن والیم میں گائے سکتی ہو۔“ زینت بیگم نے غصے اور حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

ماریہ کاٹون میں ہینڈ فری لگائے گاٹون سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کامران صاحب سگریٹ سلگائے گھرے گھرے کش لے رہے تھے۔ زینت بیگم گاڑی کی سیٹ سے سر نکالنے کے لئے رہی تھیں۔

اچانک وہ ہڑبوا کر اٹھ بیٹھیں ان کے اٹھنے کی وجہ کامران صاحب کی سگریٹ سے نکلنے والا دھواں تھا جس نے زینت بیگم کی ناک میں ٹھس کر کھلبلی مچادی تھی اور وہ اٹھنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ انہوں نے غصے سے کامران صاحب کو گھورا اور پھر اپنی سائیڈ کا شیشہ کھول دیا، برستی بارش کے ساتھ سر بخشتی دھواں نے بارش کے قطر کو لگاڑی کی کھڑکی کی جانب دھکیلا اور ان قطر کو ل کی زد میں زینت بیگم اور موبائل فون پر لگنے سنی ماریہ آ گئیں۔ ماریہ نے تیزی سے آنکھیں کھولیں تو زینت بیگم اب شیشہ اوپر کر رہی تھیں۔ ”مما اگر آپ کا بارش میں نہانے کو دل کر رہا ہے تو پاپا گاڑی ایک طرف روک دیتے ہیں اور پھر آپ اچھی طرح نہالیں۔“ کم از کم ہمیں تو تنگ نہ کریں۔“ ماریہ نے منہ بتاتے ہوئے کہا۔

”خاموش۔“ میرا بارش میں نہانے کو دل نہیں کر رہا۔“ زینت بیگم نے غصے سے ماریہ کو ڈانٹا تو ماریہ نے منہ بتاتے ہوئے دوبارہ گاٹون میں ہینڈ فری لگا لی۔

”بیگم صاحبہ خیریت تو ہے، کافی غصے میں لگ رہی ہیں آپ۔“ کامران صاحب نے بیک مرر سے زینت بیگم کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”آپ یہ سگریٹ بجھا نہیں سکتے کیا؟“ زینت بیگم نے کہا۔

”بھاتا تو ایں، لیکن اسے بجھانے کے کچھ نقصانات ہو سکتے ہیں۔“

”ارے، پاپا۔“ زینت بیگم کے بولنے سے پہلے فراز بول اٹھا۔

”اوہ یہ! اگر میں نے سگریٹ بجھادی تو کار ایکسیڈنٹ ہی ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ وہ میں بتائے دیتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر کامران

”کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ لڑکی کوئی چڑیل یا بھوت بھی ہو سکتی ہے۔“ زینت بیگم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”زینت بیگم کو اپنی اس بات پر ایک مرتبہ پھر قہقہے سننے پڑے۔“

”میں صحیح تو کہہ رہی ہوں۔“ زینت بیگم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”بیگم صاحبہ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آپ جدید دور میں ہیں..... اور بھوت پریت جن چڑیلیں اب صرف کہانیاں یا فلموں تک محدود ہیں، کامران صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جو جی میں آئیں کریں..... مجھے کیا..... زینت بیگم نے غصے سے اپنا فیصلہ سنایا، اب بارش میں بھٹکتی ہوئی وہ لڑکی گاڑی کے قریب آ چکی تھی۔

فراز نے اپنی سائیڈ کاشیشہ نیچے کیا تو خوشگوار ہواؤں اور بارش کے قطروں نے اس کا استقبال کیا۔ ”سس..... سنئے.....“ فراز نے فٹ پاتھ پر چلتی اس لڑکی کو آواز دی، لڑکی رکی اور اس نے اپنا چہرہ فراز کی طرف کیا تو فراز کے دل کی دھڑکیں تیز ہو گئیں، اس نے اتنی خوبصورت لڑکی آج تک نہیں دیکھی تھی۔

”اگر..... آپ کہیں تو آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیں، فراز نے لڑکی کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

”نن..... نہیں..... صاحب..... ہمارا گھر یہیں پاس میں ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا تو فراز کو لڑکی کے چہرے پر ہنسی بہت بھلی لگی۔ ”اسی لئے تو ہم کہہ رہے ہیں۔“ فراز نے کہا تو لڑکی حیرت سے اس کا منہ تنگ لگی، جیسے کہہ رہی ہو۔ ”کیا مطلب؟“

”دیکھئے اس طوفانی بارش میں ہم مزید سفر نہیں کر سکتے، آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیں گے اور جب تک بارش نہیں رکتی، آپ اس وقت تک ہمیں اپنے گھر میں پناہ دے دیں۔“ فراز نے بظاہر اس سیدھی سادھی لڑکی کو فریشت کی۔

”صاب ہمارا گھر بہت چھوٹا سا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔

”تو کیا ہوا، ہم نے وہاں کون سا ہمیشہ کے لئے رہنا ہے، چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔“ فراز کی اس بات پر وہ

”میں گانے کہاں سن رہی تھی ماما“ ماریہ نے زینت بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر.....“ زینت بیگم مزید حیران ہوئیں۔

”ہینڈ فری تو میں نے آپ کی وجہ سے کانوں میں لگا لی تھی۔“ ماریہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو کامران صاحب اور فراز بھی مسکرانے لگے تھے۔

”میری وجہ سے کیوں؟“ زینت بیگم کا لہجہ الجھن آمیز تھا۔

”روٹی تو گاڑی میں تھی نہیں ماما..... سوچا اگر ہینڈ فری کانوں میں لگاؤں تو آپ کے خراٹوں کی آواز کچھ کم ہوگی۔“ ماریہ کے جواب کی وجہ سے زینت بیگم کو کامران صاحب اور فراز کے قہقہے سننے پڑے۔

”بدلتیز“ زینت بیگم نے مصنوعی غصے سے مسکراتے ہوئے ایک چپت ماریہ کے سر پر لگا دیا۔

”پاپا واقعی بارش کم ہونے کے بجائے تیز سے تیز ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں تھوڑی دیر کے لئے کہیں رک جانا چاہئے۔“ فراز نے کامران صاحب کو مشورہ دیا۔

”بیٹا تمہاری رائے سے تو میں متفق ہوں، مگر کوئی ہوٹل یا پیٹرول پمپ نظر آئے تو“ کامران صاحب نے فراز کے مشورے سے متاثر ہوتے ہوئے کہا اسی وقت ہائل گرجے اور زور سے بجی چکنی فراز اور کامران صاحب کی نظر فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی ایک لڑکی پر پڑی تو کامران صاحب نے اسی وقت بریک پر پاؤں رکھ دیئے۔

”کیا ہوا؟ زینت بیگم نے پوچھا۔

”بیگم صاحبہ ابھی ابھی میں نے پیچھے فٹ پاتھ پر ایک لڑکی دیکھی ہے۔“ کامران صاحب نے گاڑی روکنے کی وجہ بتائی۔

”اور میں نے بھی۔“ فراز بھلا کہاں پیچھے ہٹا تھا۔

”طوفانی رات ہے اگر ہم اسی طرح سفر کرتے رہے تو کہیں کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔ وہ لڑکی کہیں رہتی ہوگی اگر ہم اسے لفٹ دیں تو وہ تب تک ہمیں اپنے گھر میں پناہ دے سکتی ہے جب تک یہ طوفانی بارش تھم نہیں جاتی۔“ کامران صاحب نے کار روکنے کی اہل وجہ بیان کی۔

تینوں مسکرائے۔

”جیسے باتوں کا تو یہ نہیں، پر میں تمہارے ساتھ اس گھر میں ہمیشہ کے لئے رہ سکتا ہوں۔“ فراز نے دل میں کہا۔

”ٹھیک ہے صاحب۔“ ایک مرتبہ پھر فراز کو اس کی خوب صورت مکان دیکھنے کا موقع مل گیا۔

ماریہ نے تھوڑا سا پرے ہو کر گاڑی کا کچھلا دروازہ کھول دیا تو وہ لڑکی جھپکتے ہوئے کار میں بیٹھ گئی۔

”بیٹی تمہارا نام کیا ہے؟“ کامران صاحب نے پوچھا۔

”میرا نام شراجیہ ہے۔“ لڑکی نے اپنا نام بتایا۔

”ہوں..... تو شراجیہ بیٹی تمہارا گھر کہاں ہے؟“

کامران صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”تھوڑا سا آگے بائیں طرف ایک کچا راستہ آئے گا

اس کے بعد ہمارا گاؤں آ جائے گا، گاؤں کا پہلا گھر ہمارا ہے۔ شراجیہ نے بتایا۔

”کون، کون ہیں تمہارے گھر میں؟“ کامران صاحب نے پوچھا۔

”ابو اور ایک بھائی ہے۔“ شراجیہ نے بتایا۔ کامران صاحب نے شراجیہ کے کہنے پر گاڑی بائیں طرف ایک کچے راستے پر ڈال دی، بارش کی وجہ سے کچے راستے پر گاڑی چلانے میں دشواری پیش آرہی تھی، لیکن کامران صاحب ایک ماہر ڈرائیور تھے، گاؤں کے ابتدا میں ہی شراجیہ کا ایک چھوٹا سا کامکان تھا، کامران صاحب نے شراجیہ کے کہنے پر گاڑی اس مکان کے سامنے روک دی۔ وہ سب گھر میں داخل ہوئے تو گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ شراجیہ نے لائٹیں جلا کر روشنی کر دی، وہ چاروں چارپائی پر بیٹھ گئے، اس گھر میں ایک چھوٹا سا مٹن ایک چھوٹا سا چکن ایک کمرہ اور چھت پر جانی لکڑی کی میٹھی تھی۔

”صاحب آپ کے لئے گرم گرم دودھ لاؤں؟“

شراجیہ نے ان سے پوچھا۔

”سنا ہے گاؤں کا دودھ بہت خالص ہوتا ہے..... لے آؤ.....“ کیوں بچوں کیا خیال ہے؟“

کامران صاحب نے کہتے ہوئے فراز اور ماریہ کی رائے جانچی چاہی۔

”نیکئی اور پوچھ پوچھ.....“ دونوں نے بیک زبان ہو کر کہا۔

”مجھے ڈاکٹر نے دودھ بند نہیں کیا۔“ زینت بیگم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... سوری بیگم صاحبہ..... آپ گرما گرم دودھ نوش فرمائیں گی، کامران صاحب نے کہا تو ماریہ اور فراز ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے جبکہ شراجیہ ابجھن کے عالم میں ان چاروں کی طرف دیکھنے لگی۔

”شراجیہ بیٹی ہم چاروں کے لئے گرما گرم دودھ لے آؤ۔“ کامران صاحب نے کہا تو شراجیہ جی اچھا ہمتی ہوئی چکن کی طرف بڑھ گئی۔

بارش کا زور ابھی بھی بہت زیادہ تھا، بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج بھی بارش کا ساتھ خوب نبھار رہی تھی۔ ”اچھا ہوا ہم نے یہاں پناہ لے لی نہیں تو ہم کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتے تھے۔“ زینت بیگم نے کہا تو کامران صاحب کے ساتھ فراز اور ماریہ حیرت سے زینت بیگم کا منہ سننے لگے۔

”کیا ہوا؟“ آپ لوگ اس طرح میری طرف کیوں دیکھ رہے ہیں۔“ زینت بیگم نے پریشان نگاہوں سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔

”بیگم صاحبہ ہم تینوں اس لئے آپ کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں کہ تھوڑی دیر پہلے تو آپ کہہ رہی تھیں کہ یہ لڑکی چڑیل بھی ہو سکتی ہے اور اب آپ کہہ رہی ہیں کہ ہم نے اس گھر میں پناہ لے کر اچھا کیا۔“ کامران صاحب نے وجہ بیان کی۔

”ایک تو آپ لوگ میری ہر بات پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔“ زینت بیگم غصے سے منہ بناتے ہوئے بولیں اور وہ تینوں مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

اتنے میں شراجیہ دودھ اور پیالے لے آئی اور انہوں نے خوب مزے سے دودھ پیا۔ ”شراجیہ تمہارے ابو اور بھائی کہاں ہیں؟“ کامران صاحب نے خالی پیالے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”وہ جی ابو فیکٹری گئے ہوئے ہیں وہاں چوکیدار ہیں۔“ شراجیہ نے بتایا۔

پر شیطان حادی ہو گیا۔ وہ شرابیہ کے چہرے پر جھکا، اس سے پہلے کہ وہ وہ اپنے ہونٹ شرابیہ کے خوب صورت ہونٹوں پر رکھتا، اچانک شرابیہ نے اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں اور فراز چیخا ہوا پیچھے ہٹا۔

چیخنے کی وجہ شرابیہ کی آنکھیں کھولنا نہیں تھا بلکہ آنکھوں کی جگہ دو دھکتے ہوئے انگارے تھے۔ شرابیہ چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی، فراز کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

اچانک شرابیہ کے چہرے کے خدو خال بدلنا شروع ہو گئے، اب جولڑکی فراز کے سامنے کھڑی تھی اسے دیکھ کر بے اختیار فراز کے منہ سے نکلا۔ ”ت.....ت..... تم؟“

”ہاں میں۔“ لڑکی کی غرائی ہوئی آواز فراز کے کانوں میں پڑی، ساتھ ہی وہ لڑکی اچھلی اور فراز کو لیتی ہوئی فرش پر جا گری۔

”دیکھو..... م..... مم..... مجھے معاف کر دو۔“ فراز نے گھبراہٹ کے باعث کہا۔

”تم نے مجھے معاف کیا تھا۔“ لڑکی نفرت زدہ لہجے میں بولی۔ ساتھ ہی اس نے ہنسنے کے لئے منہ کھولا تو فراز نے دیکھا اس لڑکی کے سامنے کے لیے اور نوکیلے دانت تھے، اس لڑکی نے اپنے نوکیلے دانت فراز کی گردن میں گاڑ دیئے۔

☆.....☆.....☆

دروازے پر زور دار دستک ہوئی جسے سن کر ماریہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اس کی نگاہ فراز کی چارپائی پر پڑی تو وہ خالی تھی۔ ”ہیں فراز بھیا کہاں گئے؟“ ماریہ حیرانی سے بڑبڑائی ساتھ ہی دروازے پر دستک کی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی تو ماریہ نے کامران صاحب اور زینت بیگم کو دیکھا، وہ صاف سمجھ گئی کہ وہ ایسی گہری نیند میں ہیں کہ انہیں جگانے میں اگر وہ لگ گئی تو دروازے پر دستک دینے والا دروازہ توڑ دے گا، وہ اٹھ کر بیٹھی اور اس نے اپنی جوتی پہنی اور لکڑی کی سیڑھی کے ذریعے چھت سے نیچے اترتی، اس دوران دروازے پر کئی مرتبہ دستک ہو چکی تھی۔

ماریہ نے آگے بڑھ کر پوچھے مے تیر ونی دروازہ کھول

”اچھا ایک بات کی حیرت ہے مجھے شرابیہ اتنی طوفانی بارش میں تم سڑک پر کیا کر رہی تھی۔“ فراز نے شرابیہ کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

”صاحب جی، جنگل میں میرا بھائی لکڑیاں لینے گیا تھا۔ اس کے پیچھے گئی تھی۔“ شرابیہ نے بتایا۔

”لکڑیاں صبح بھی لائی جاسکتی تھیں۔“ کامران صاحب نے کہا۔

وہ جی صبح کو بھائی جلدی کام پر چلا جاتا ہے گھر میں لکڑیاں تھوڑی بہت پڑی تھیں، جن سے میں نے آپ کے لئے دودھ گرم کیا ہے۔“ شرابیہ نے بتایا۔

”ہوں۔“ کامران صاحب نے ایک گہرا سانس کھینچا۔

”صاحب جی..... آپ لوگ ایسا کریں اور کے کمرے میں آرام کریں، جب بارش ختمے گی تو آپ لوگوں کو میں جگا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے بیٹی۔“ کامران صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

بارش کا ارادہ ابھی رکنے والا نہیں تھا۔ فراز چارپائی پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ کامران صاحب، زینت بیگم اور ماریہ تو گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے جبکہ فراز، شرابیہ کے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا، اس نے اپنی زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اوپر سے اس کا سادہ انداز۔ ”شاید اس بارش نے مجھے شرابیہ سے ملانا تھا۔“ فراز خود سے ہمکلام ہوا، اس کا دل شرابیہ سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے فیملی ممبرز پر نگاہ ڈالی وہ گہری نیند میں تھے، وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھا، پھر شوز پہنے اور ایک طرف بنی لکڑی کی سیڑھی کی طرف بڑھا، سیڑھی کے اوپر دیوار پر ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ فراز نے دیکھا بارش کی رفتار مسلسل بڑھ رہی تھی۔ وہ سیڑھی کے ذریعے نیچے اترا وہ نیچے بنے اٹھوتے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا شرابیہ چارپائی پر آنکھیں بند کئے سو رہی تھی۔ فراز اس کی چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

شرابیہ ہلاکی خوب صورت تھی اچانک فراز کے دماغ

”مسٹر جبار لکڑیاں صبح بھی تو لائی جاسکتی تھیں، آخر اس طوفانی رات میں اتنی زیادہ لکڑیوں کی کیا ضرورت پڑ گئی۔“
 ”ماریہ جی مگر میں لکڑیاں کم نہیں اس لئے اور ہمارے لئے کام کام ہوتا ہے، چاہے وہ طوفانی رات میں کیوں نہ کیا جائے۔“ جبار نے بتایا۔ اور ویسے بھی صبح کام پر جلدی چلا جاتا ہوں۔“

”شرابیہ نے بھی کچھ ایسا ہی بتایا تھا۔“ ماریہ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میں باہر سے لکڑیاں لاتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر جبار نے وہ کلبھاڑی دیوار کے ساتھ رکھی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا اس کی واپسی ہوئی تو اس نے لکڑیوں کا بڑا سا گٹھرا اٹھا رکھا تھا اس نے وہ گٹھر کچن میں رکھا۔ ”آپ دودھ پیتیں گی؟“ جبار نے پوچھا۔

”ویسے تو میں پی چکی ہوں۔ لیکن موسم کی مناسبت سے چلے پھر پی لوں گی۔“ ماریہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو جبار جواباً مسکراتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں دودھ کے دو پیالے تھے، ایک پیالا اس نے ماریہ کی طرف بڑھا دیا اور خود ماریہ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور دودھ کا پیالا منہ سے لگا لیا۔

”یہ بارش تو آج کتنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔“ ماریہ نے کھڑکی سے باہر برستی بارش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”گلتا ہے آسان آج کچھ زیادہ ہی آنسو بہا رہا ہے۔“ جبار نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا تو ماریہ ہنس پڑی۔

ماریہ دودھ پیتے پیتے رکی اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میری ماما کا کہنا ہے کہ ایسے دیرانے اور ایسے موسم میں بھوت پریت اور چڑیلوں سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔“ لیکن جبار صاحب ان باتوں پر مجھے قطعی یقین نہیں۔“
 ”کیوں؟“ جبار نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”اندھری رات ہے برستی بارش چمکتی بجلی اور مگر جتے بادل ماحول فل ہارڈ (Horror) ہے اور آپ مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں، تو میں آپ کو بتاتی چلوں مسٹر جبار میں آج کل کی پڑمی لکھی اور سمجھ دار لڑکی ہوں، میں ان

دیا اور چمکتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ باہر ایک خوب صورت نوجوان ہاتھ میں کلبھاڑی لئے کھڑا تھا۔ ”ارے..... ارے..... آپ چیخ کیوں رہی ہیں؟“ اس نوجوان نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

”یہ..... یہ..... آپ نے کلبھاڑی کیوں پکڑ رکھی ہے۔“ گھبراہٹ کے باعث ماریہ نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اوہ..... یہ کلبھاڑی دیکھ کر نوجوان مسکرایا یہ تو میں جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کے لئے لے گیا تھا۔“

”اوہ.....“ اطمینان کے باعث گھبراسنا سنبھل گیا۔ ”تو آپ شرابیہ کے بھائی ہیں۔“
 ”وہ تو میں ہوں..... لیکن آپ کون ہیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”میں..... ہم مسافر ہیں..... ماریہ نے بتایا۔
 ”میں..... ہم کیا آپ کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں؟“ شرابیہ کے بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں میرے ماما، پاپا اور ایک بھائی ساتھ ہیں..... ماریہ نے بتایا۔
 ”یقیناً شرابیہ آپ لوگوں کو یہاں لائی ہوگی۔“ شرابیہ کے بھائی نے کہا۔

”جی ہاں۔“ ماریہ نے مختصر سا جواب دیا۔
 ”بڑی مہمان نواز ہے شرابیہ۔“ اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔ آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔“ ماریہ جواباً مسکرائی۔
 ”لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔“ شرابیہ کے بھائی نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔

”نظر تو میرا بھائی بھی کہیں نہیں آ رہا۔“ ماریہ نے بھی کہا۔

”ہو سکتا ہے وہ اور آپ کے بھائی میرے پیچھے آئے ہوں، میں جنگل میں لکڑیاں لینے کے لئے گیا ہوا تھا۔“

”ویسے مسٹر..... آپ کا نام؟“ ماریہ نے پوچھا۔
 ”مجھے جبار کہتے ہیں۔“ شرابیہ کے بھائی نے اپنا نام بتایا۔
 ”میں ماریہ ہوں۔“ ماریہ نے اپنا تعارف کروایا۔

باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔“ ماریہ نے بظاہر جبار کو آگاہ کیا۔
 ”اس میں پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہونے کا کیا سوال ہے
 ماریہ صاحبہ، بھوت پریت، جادو حقیقت ہیں۔“ ان کا ذکر بہر
 دور میں رہا ہے۔“ جبار نے کہا۔

”جبار صاحب آج کل جس چیز کا نام جادو ہے وہ
 ہے سائنس..... سائنس نے جادو کو بہت پیچھے چھوڑ دیا
 ہے۔“ ماریہ نے بتایا۔

”ماریہ صاحبہ جادو اپنی جگہ اور سائنس اپنی جگہ.....
 اخبارات ان واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔“ جبار نے کہا۔
 ”اخبارات کی بات چھوڑیے..... اخبارات میں تو
 کافی حد تک جھوٹ لکھا ہوتا ہے۔ آپ کوئی موجود، مثال
 دیں۔“ ماریہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو آپ بھوت پریت کو نہیں مانتیں۔“ جبار نے
 سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”بالکل نہیں۔“ ماریہ نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”جہاں تک اس برستی بارش کا سوال ہے تو تمہیں 19
 اکتوبر کی رات یاد ہوگی۔“ جبار کی اس بات پر ماریہ اپنی کرسی
 سے یوں اچھل جیسے اسے 440 دولت کا جھکا لگا ہو۔

”اور جہاں تک بھوت پریت کا سوال ہے تو یہ
 دیکھو۔“ اتنا کہہ کر جبار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو ماریہ نے
 دیکھا اچانک جبار کے چہرے کے خدو خال بدلنا شروع
 ہو گئے، خوف کے باعث ماریہ نے کرسی سے اٹھنے کی
 کوشش کی وہ کرسی سمیت پیچھے جا گری، پھر اچانک چہرہ
 بدلتا ہوا جبار کمرے سے غائب ہو گیا، ماریہ دھڑکتے دل
 کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”بچانا مجھے۔“ اچانک ماریہ کو اپنے پیچھے سے کرخت،
 ڈراؤنی، غراؤنی ہوئی مردانی آواز سنائی دی، ماریہ تیزی سے
 گھومی، ماریہ کے پیچھے ایک خوب صورت نوجوان وہی
 کلہاڑی ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا جو تھوڑی دیر پہلے جبار کے
 ہاتھ میں تھی۔

”ت..... ت..... تم.....“ بے اختیار ماریہ کے منہ
 سے نکلا۔

”ہاں میں.....“ اتنا کہہ کر اس خوب صورت نوجوان

نے کلہاڑی کا زور دار وار ماریہ کی گردن پر کیا تو ماریہ کو نہ تو
 چیخنے اور نہ ہی سنبھلنے کا وقت ملا، اس کی گردن کٹ کر کسی فٹ
 بال کی طرح زمین پر جا گری۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک سانپ کی پھانک تھی، جس نے زینت بیگم کی
 نیند میں خلل ڈالا تھا اور انہیں آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا
 تھا۔ زینت بیگم نے دیکھا ایک کالے رنگ کا سانپ
 زینت بیگم کے سینے پر کندڑی مارے بیٹھا تھا جس کی وقت بھی
 زینت بیگم کو ڈس سکتا تھا، اپنے سینے پر اتنا خوفناک سانپ
 دیکھ کر زینت بیگم کے منہ قلع خشک ہو گیا، انہوں نے اپنی
 آنکھیں گھمائیں تو کامران صاحب گہری نیند میں ڈوبے
 خراٹے لے رہے تھے۔ زینت بیگم نے اپنی آنکھوں کا
 دائرہ دوبارہ سانپ کی طرف کیا تو انہیں حیرت کا ایک شدید
 جھٹکا لگا، اب ان کے سینے پر سے سانپ غائب تھا۔ زینت
 بیگم نے اطمینان کے باعث ایک لمبا سانس کھینچا اور اٹھ کر
 بیٹھی۔ انہوں نے اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کیا، فراز
 اور ماریہ کی چار پائیاں خالی پڑی تھیں۔ ”یہ دونوں کہاں چلے
 گئے؟“ زینت بیگم خود سے بے حکام ہو گئیں۔

”سینے“ زینت بیگم نے خراٹے لیتے کامران
 صاحب کو آواز دی لیکن کامران صاحب شس سے سس نہ
 ہوئے۔ ”ایک تو یہ ہیں، جب سوتے ہیں تو دنیا کی خبر سے
 بالکل فارغ ہو جاتے ہیں۔“ زینت بیگم نے منہ بناتے
 ہوئے کہا۔ پھر انہوں نے چپل پہنیں۔ فراز، ماریہ، انہوں
 نے زور سے آواز دی لیکن کوئی جواب موصول نہ ہوا تو وہ
 لکڑی کی میز مٹی کی طرف بڑھیں تو پیچھے سے ایک مرتبہ پھر
 سانپ کی پھانک سنائی دی، زینت بیگم جلدی سے گھومیں
 لیکن پیچھے کچھ نہیں تھا۔

لکڑی کی میز مٹی کے اوپر روشن دان میں سے زینت
 بیگم نے باہر جھانکا، بارش کا زور ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔ ”یہ
 بارش آج رات ہی نہیں رہی۔“ زینت بیگم تشویش کے عالم
 میں بولیں۔ ”مردہ میز مٹی کے ذریعے نیچا آئیں۔“

”فراز، ماریہ۔“ زینت بیگم نے ایک بار پھر دونوں کو
 پکارا لیکن زینت بیگم کو کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ ”یہ دونوں

کم بخت کہاں چلے گئے؟“ زینت بیگم غصے سے بولیں۔
انہوں نے پورے گھر میں دیکھا لیکن انہیں فراز اور
مار یہ کہیں نظر نہیں آئے اور نہ ہی شراجہ۔
اسی وقت سامنے کی دیوار کسی فلم اسکرین کی طرح
روشن ہو گئی، زینت بیگم حیرت سے اس طرف دیکھنے لگیں،
فلم اسکرین کی طرح روشن دیوار میں ایک سین میں ایک
خوب صورت کمرے میں ایک بیڈ پر ایک لڑکا اور ایک لڑکی
اپنی مستی میں مست تھے، اسی کمرے کی کھڑکی کے پیچھے
سے ایک 30،32 سال کا آدمی حیرت سے دیدے
پھاڑے وہ منظر دیکھ رہا تھا۔

اچانک لڑکی کی نظر کھڑکی کے پیچھے کھڑے اس آدمی
پر پڑی تو وہ آدمی تیزی سے کھڑکی کے پاس ہٹ گیا۔
”oh, no“ لڑکی پریشان کن سمجھ میں بولی۔
”کیا ہوا ڈار لنگ؟“ لڑکی کے ساتھ چپکے ہوئے اس
لڑکے نے پوچھا۔

”اصغر نے ہمیں دیکھ لیا۔“ لڑکی پریشانی سے بولی۔
”تو پھر اس میں پریشانی والی کیا بات ہے، اسے
مرواد پتے ہیں۔“ اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”نہیں..... اس طرح تو کامران کا سارا شک مجھ پر
جائے گا۔“ اس لڑکی زینت نے کہا۔

”شک، کیا مطلب؟“ وہ لڑکا حیران ہوا۔
”پچھلے کئی مہینوں سے کامران کو مجھ پر شک ہے کہ
میرے کسی کے ساتھ غلط تعلقات ہیں۔ انہوں نے اس
چوکیدار اصغر کے بچے کو میری جاسوسی پر لگا دیا ہے۔“ زینت
نے بتایا۔

”لیکن زینت ڈار لنگ تمہیں کیسے پتہ کہ کامران نے
اس اصغر کو تمہاری جاسوسی پر لگا رکھا ہے۔“ اس لڑکے نے
مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میری خاص خادمہ نے مجھے بتایا ہے۔“ زینت نے
کہا۔ ”اور اس کی بات صحیح بھی ہے کیونکہ میں نے ابھی اسے
کھڑکی کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔“

”تم کھڑکیوں کرتی ہوں، میرے پاس ایک کام کا بندہ
ہے جو ایسے مرڈر کرتا ہے کہ وہ مرڈر مزدور نہ لگے بلکہ قدرتی

موت لگے۔ تم فکر مت کرو۔“ اتنا کہہ کر اس لڑکے نے بیڈ
کے ساتھ اٹیچ بیبل پر پڑے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

دیوار پر دوسرا سین ابھرا جس میں ایک کوارٹر کے باہر
زوروں کی بارش ہو رہی تھی، اس کوارٹر میں اصغر پریشانی کے
عالم میں ٹہل رہا تھا۔ کامران صاحب تو دوسرے شہر گئے
ہوئے ہیں۔ آتے ہی انہیں بتا دوں گا۔“ اصغر خود سے
ہمکرام ہوا۔ ”دل..... دل..... لیکن..... کہیں زینت بیگم
مجھے مرواندوے۔“ یہ سوچ کر اصغر پریشان ہو گیا۔

اسی وقت اصغر کو کمرے میں ایک سانپ کی پھنکار
سنائی دی، اصغر نے زمین پر دیکھا تو ایک کالے رنگ کا بڑا
سا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا اس سے پہلے کہ اصغر اپنا
بچاؤ کرتا سانپ نے اسے ڈس لیا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار
اپنی پہلے جیسی حالت میں آ گئی۔

”یہ..... یہ تو.....“ زینت بیگم پریشانی سے ہٹلائی۔
”ہاں زینت بیگم یہ تمہارے کالے کروت تھے جو میں نے
تمہیں دکھائے ہیں۔“ اچانک زینت بیگم کو اپنے عقب سے
غراتی ہوئی مرواندہ آواز سنائی دی تو زینت بیگم تیزی سے
گھومیں اس کے پیچھے اصغر غصے کی حالت میں کھڑا تھا۔
”تت..... تت..... تم.....“ زینت بیگم گہرا ہٹ کے
باعث ہٹلاتے ہوئے پیچھے ہٹتے ہوئے بولیں۔

”ہاں میں تو مر چکا تھا..... لیکن زینت بیگم آن
تمہاری موت بن کر لوٹا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اصغر نے اپنے
ہاتھ زینت بیگم کی طرف بڑھادیئے، تو اس کے ہاتھ لمبے
ہوتے ہوئے زینت بیگم کی گردن تک جا پہنچے، اور دونوں
ہاتھوں نے زینت بیگم کی گردن دبوچ لی، پھر پچم زون میں
زینت بیگم فرش پر گر گئی چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

”اٹھیے.....“ اچانک کسی نے کامران صاحب کو
جنھنجھوڑا، کامران صاحب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ”کک.....
کون ہے.....“ کامران صاحب نے ارد گرد نگاہیں دوڑاتے
ہوئے کہا۔ لیکن انہیں جنھنجھوڑنے والا کوئی بھی موجود نہیں تھا،
لیکن ایک حیران کن انور دل دہلا دینے والا سین ان کا منظر
تھا۔ سامنے تین لاشیں جم..... کے ساتھ اٹلی لٹکی ہوئی تھیں۔

تمہاری ضد کے آگے میں ہارا تو تم نے مجھے اپنے دوستوں کے بچ لا کر بے عزت کر دیا کہ تم نے اپنے دوستوں سے شرط لگائی تھی کہ تم مجھے پیار کرنے پر مجبور کر دو گی..... پیار کا دیا جلا کر بھجایا نہیں جاتا ماریہ..... بلکہ پیار کے دینے کو تو آنڈھیوں اور طوفانوں سے بچایا جاتا ہے تاکہ وہ مجھے نہ بلکہ ہمیشہ کے لئے جلتا رہے۔ اس لڑکے نے کہا تو ماریہ پریشان نگاہوں سے ارد گرد کھڑے اسٹوڈنٹس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”ہنو میرے راستے سے۔“ اتنا کہہ کر ماریہ بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔

اسی دیوار پر سین بدلا اس سین میں ماریہ دولڑکوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ”مجھے ہر حال میں اس کی موت چاہئے، ماریہ دانت پیستے ہوئے بولی۔“ وہ تو مرجائے گا لیکن بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟“ دونوں میں سے ایک لڑکا بولا۔

”تم جو کہو گے عامر تمہیں وہ ملے گا، ماریہ نے کہا۔“ کچھ بھی۔“ عامر نے ہونٹوں پر زبان پھیر لی۔

”ہاں کچھ بھی۔“ جواباً ماریہ مسکرائی۔ ”بس تو پھر تم کاشف کو فون کرو اور اس سے کہو کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔“ میں بھی تم سے پیار کرتی ہوں اور ابھی تم سے شہر سے باہر فلاں جگہ پر ملنا چاہتی ہوں۔“ عامر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر وہ نہ آیا تو؟“ ماریہ نے بظاہر اس لڑکے عامر سے جواب مانگا۔ ”وہ تمہارے عشق میں اس وقت اندھا ہے تمہارے ایک اشارے پر وہ جہنم میں بھی جاسکتا ہے۔“ عامر نے کہا تو ماریہ نے مسکراتے ہوئے موبائل پر کاشف کے نمبر ڈائل کرنے شروع کر دیئے۔

اسی دیوار پر پھر سین بدلا جس میں زبردست بارش ہو رہی تھی ایک خالی جگہ پر ماریہ اور کاشف کھڑے تھے۔ ”کاشف میں پہلے واقعی تم سے مذاق کر رہی تھی۔ لیکن آج تمہاری تڑپ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو۔“ آؤ میری باتوں میں آ جاؤ۔“ ماریہ نے اپنی باتوں کا بار کھولتے ہوئے کہا تو کاشف مسکراتا ہوا آگے بڑھنے لگا تو نفا ایک زوردار چیخ سے کاپ اٹھی۔

اچانک عامر نے کاشف کی پیٹھ میں دل کی جگہ خنجر گھونپ دیا تھا۔ کاشف زمین پر پڑا ترپنے لگا۔

ایک لاش کا تو سر گھڑ سے غائب تھا اور اس گھڑ سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا، باقی دونوں لاشوں سے بھی خون بہہ رہا تھا وہ دھڑکنے لڑکی کا تھا خوف کے باعث کامران صاحب کا پھانسم پیسے میں نہا گیا، کامران صاحب نے غور کیا تو ان کا پیر کا ساس اور اوپر نیچے کا ساس نیچرہ گیا اور پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ تینوں لاشیں بالترتیب رحمت بیگم فراز اور ماریہ کی تھیں!!!

”ماریہ.....“ خوف اور صدمے کی وجہ سے کامران صاحب کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ آگے بڑھے اور لاشوں کے قریب جا کر دوھاڑیں مار مار کر رونے لگے، اسی وقت مخالف سمت کی دیوار کی فلم اسکرین کی طرح روشن ہو گئی اور اس دیوار پر زینت بیگم کی کالی راتوں اور کالے کرتوتوں والا سین چل رہا تھا وہ سین دکھ کر کامران صاحب نے حیرت سے زینت بیگم کی الٹی لنگی لاش کی طرف دیکھا اب اسی دیوار پر ایک نیا سین ابھرا اس سین میں ایک خوب صورت لڑکا ماریہ کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ ”ماریہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ اس خوب صورت لڑکے نے ماریہ سے کہا۔

”What“ ماریہ چلائی۔ ”تمہاری یہ جرات؟“

ماریہ آپے سے باہر ہو گئی۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھ سے یہ یہودہ بات کہنے کی۔

وہاں کئی اسٹوڈنٹس جمع ہو چکے تھے۔ ”لیکن تم نے بھی تو کچھ دن پہلے یہی یہودہ بات مجھ سے کہی تھی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ اس لڑکی نے بظاہر اسے یاد دلایا۔

”وہ..... وہ تو میں تم سے مذاق کر رہی تھی۔“ ماریہ چور نظروں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے بولی۔

”مذاق.....“ وہ لڑکا جیسے چیخا..... ”کسی کے احساسات سے کھیلنا مذاق ہوتا ہے۔ میں تو تمہاری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ تم بار بار مجھ سے یہی کہتی تھی کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور میں تم سے کہا کرتا تھا کہ میں ایک غریب لڑکا ہوں اور تم ایک امیر زادی جو اب تم کہا کرتی تھی۔“ تو کیا ہوا عشق امیری غریبی نہیں دیکھتا۔“ عشق صرف کیا جاتا ہے، نہ ہو جاتا ہے، یہ ذات پات کو نہیں دیکھتا اور جب

کامران صاحب حیرت سے اسی لنگی مادیہ بغیر سر کے
ماریکی لاش کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ پواری کی طرف دیکھا۔
دیوار پر پریسن بدلا ایک کمرے میں چارپائی پر پڑی
لاش کے گرد کچھ عورتیں بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں، ایک خوب
صورت لڑکی اس لاش پر کچھ زیادہ ہی آنسو بہا رہی تھی، پھر
اس نے لاش پر سے کپڑا ہٹایا تو کامران صاحب نے دیکھا
وہ لاش کاشف کی تھی!!!

”بھیا.....“ وہ لڑکی یہ کہتے ہوئے زار و قطار رونے لگی
باقی عورتیں اسے سنبھالنے لگیں اسی دیوار پر پریسن بدلا وہ ہی
لڑکی جو کاشف کی لاش پر آنسو بہا رہی تھی فراز کے ساتھ
ایک کمرے میں آنسو بہا رہی تھی۔
”فراز میں اندر سے ٹوٹ چکی ہوں.....“ وہ لڑکی
آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

”دیکھو نازیہ رو نہ تھیں..... اگر کوئی چلا جائے تو اس
کے ساتھ کوئی تھوڑا چلا جاتا ہے۔“ فراز نے نازیہ کو دلاسہ
دیتے ہوئے کہا۔

”ماں بچپن میں ساتھ چھوڑ گئی کچھ بڑی ہوئی تو باپ
کو سانپ نے ڈس لیا اور بھائی آج مردہ حالت میں ملا۔“
مجھے یوں لگتا تھا کہ تم مجھ پر ہوس بھری نگاہیں ڈالتے ہو اسی
لئے مجھے تم سے نفرت تھی۔ لیکن آج مجھے لگا کہ تم ہی واحد
میرا آسرا ہو۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مجھ سے شادی
کرو گے۔ اسی لئے میں تمہارے پاس آئی ہوں۔“ نازیہ
نے دھکی لہجے میں کہا۔

”میں تم سے شادی ضرور کروں گا میری جان۔“ فراز
نے اسے ہاتھوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

”یہ..... یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ نازیہ اپنے آپ
کو چھڑاتے ہوئے اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”تمہارا آسرا بن رہا ہوں۔“ اتنا کہہ کر فراز نے
پھر نازیہ کو اپنی طرف کھینچا۔

”چھوڑو مجھے ذلیل انسان..... میں تمہارے معاملے
میں دھوکہ کھا گئی۔“

”نازیہ نے ایک زوردار تھپڑ فراز کے گالوں پر دے مارا
اور اپنا دوپٹہ سنبھالتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف

بڑھی تو اسی وقت دوپٹے کے نو جوان دروازہ کھول کر
اندر داخل ہوئے، نازیہ ٹھنک کر گر گئی۔“ نازیہ میری جان.....
آج تو میں اپنی بھوک مٹا کر بھی رہوں گا..... بڑا انتظار
کروایا تم نے..... اور جہاں تک شادی کا سوال ہے تو ایسے
وعدے تو میں تم جیسی بے شمار دو کوڑی کی لڑکیوں سے
کر چکا ہوں اور ان کے ساتھ بھی وہی کرتا ہوں جو آج
تمہارے ساتھ ہوگا۔“ فراز نے کہا۔

پھر کامران صاحب نے ایک انتہائی شرمناک منظر
دیکھا فراز اور اس کے دوستوں نے نازیہ کی عزت کے
پڑنے پر اڑا دیئے..... کئی کئی نازیہ اس گھر سے باہر نکلی
تو آسان بھی اس کی حالت پر آنسو بہا رہا تھا پھر اچانک وہ
ایک گاڑی سے نکل آئی اور عزت کے ساتھ ساتھ زندگی بھی
ہار گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دیوار اپنی پہلے جیسی حالت میں
آگئی کامران صاحب نے حیرت سے فراز کی لاش کی
طرف دیکھا۔

”دیکھا کامران صاحب اپنی اولاد اور بیگم کے
کارنامے۔“ اچانک کامران صاحب کے کانوں میں ایک
مردانہ آواز پڑی تو وہ تیزی سے گھومے، پیچھے بالترتیب
اصغر، کاشف اور نازیہ کھڑے تھے۔ ”یہ..... یہ.....
کک..... کیا ہو گیا؟“ کامران صاحب ہکلاتے ہوئے
بھرائی آواز میں بولے۔

”کامران صاحب آپ کی بیگم ذیبت بیگم بدخصلت
عورت تھی آپ کے کہنے پر میں نے اس کی جاسوسی کی
اور اس نے مجھے مردادیا لیکن آپ کی اولاد بھی ماں جیسی نکلی
انہوں نے میرے بعد میرے خاندان کا پیچھا نہیں چھوڑا
آپ نے دیکھ ہی لیا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا..... لیکن آج
ہمارا انتقام پورا ہو گیا..... ہم نے اپنا انتقام پورا کر لیا۔“ اصغر
نے خوشی سے کہا۔

کامران صاحب غم زدہ نظروں سے ان لاشوں کی طرف
دیکھ رہے تھے اس کے علاوہ وہ لوکر بھی کیا سکتے تھے..... بارش
تھم چکی تھی اور صبح کی جو ہر طرف پھوٹ رہی تھی۔





وہ کون تھی

مدرسہ بخاری - شہر سلطان

اچانک پراسرار نسوانی آواز موبائل پر سنائی دی۔ تمہاری یاد بہت آتی ہے ملنا بھی چاہتی ہوں مگر وقت ملنا بہت مشکل ہے اور یہ میرا دل جانتا ہے کہ میں ملاقات کے لئے کس قدر بے چین ہوں کہ پھر اچانک.....

دل و دماغ پر خوف کا سکہ بیٹھاتی اور رگوں میں لہو جمہد کرتی دگدگ اور دل سوز حقیقت

”جی حقیقت بتاؤں تو یقین نہیں کریں گی اور جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”آپ حقیقت ہی بتادیں۔“ وہ بولی۔
 ”آپ کا نمبر خواب میں دیکھا تھا، دو تین دن تک آپ کا یہ نمبر میرے خواب میں مسلسل آتا رہا، پہلے پہل تو میں نے توجہ نہ دی، لیکن پھر جب یہ سلسلہ مسلسل چل نکلا تو مجبوراً مجھے آپ کا نمبر ڈائل کرنا پڑا۔“ میں نے

اس کی آواز کوئل سی اور بہتی آبشاروں کے سریلے گیت کے مدغم رنگوں جیسی تھی، میں اس کے دلکش اور روح میں حلاوت کرتے انداز بیان میں کھوسا گیا تھا، دہانے کے بہت سے سریلے سنے اور پرکھے بھی تھے، مگر اس کی آواز میں الگ قسم کا رنگ اور جاذبیت تھی۔
 ”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا۔؟“ وہ سہرا نہ ا
 نماز سے بولی۔

جواب دیا۔

”What?..... کیا آج کے دور میں ایسا ممکن

ہے۔؟“ یہ سراسر غلط بیانی ہے۔ دوسری طرف سے حیرت بجائی۔

”یہی بات آپ سے میں نے پہلے عرض کی تھی، مگر آپ نے فرمایا کہ حقیقت ہی بتائی جائے۔“ میں نے کہا۔

”OK..... فرض کیا آپ کو میرا نمبر خواب میں ملا تو پھر آپ کوئی دلی ہو..... ایسے بہت سے خواب آپ کے پاس آئے ہوں گے.....!“ وہ بولی۔

”ہر خواب سچا ہو..... ضروری نہیں۔ مجھے آپ کا نمبر خواب میں دکھایا گیا اور ہدایات دی گئی کہ آپ کی Help کی جائے۔“ میں نے کہا۔

”کیا آپ سید ہیں؟“ پوچھا گیا۔
”الحمد للہ..... جیسی جیسی سید، بخاری ہوں۔ مجھے کامران بخاری کہتے ہیں۔“ اپنا عہدہ جان بوجھ کر چھپا گیا تھا۔

”Good.....! میں شام کو فارغ ہوتی ہوں اس ٹائم آپ سے کپ شپ ہو سکتی ہے۔“ وہ انداز دلربائی سے بولی۔

”OK..... اپنا خیال رکھئے گا۔“ میں نے رابطہ ڈسکنٹ کر دیا۔

میری ڈیوٹی ان دنوں کشمیر کی وادیوں میں تھی۔ جنت بے نظیر کا یہ علاقہ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ گوکہ علاقہ میری صحت اور دماغی لحاظ سے بہترین تھا۔ لیکن ایک چیز کا ارمان ہمیشہ سے رہا کہ یہ علاقہ پاکستان میں شامل کیوں نہ ہوا؟ غاصبانہ قبضہ آخر کب تک کشمیری عوام کی جائز دلی امنگوں سے خون کی ہولی کھیلے گا۔

نیلیم وادی دیکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں نیلیم وادی بھی آتا پڑے گا۔ میرا یہاں دل اداس رہنے لگا تھا گوکہ قدرتی نظارے، ہر طرف کھمرے ہوئے تھے۔ حوالدار انصاف خان اور اے ایس آئی سلامت خان

انتہائی نیک اور ایماندار لوگ تھے انصاف خان دل کا بہت رحم دل تھا۔

خان صاحب نے آج تک ایک چوٹی بھی نہ ماری تھی، جبکہ سلامت خان، نوجوان تھا اور کڑیل تھا چوڑا سینہ اور خاموشی خاموشی..... میں نے ایک ہفتے میں اسے بھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، سپاٹ اور چوکس افسر..... وقت کی پابندی اور پانچ وقت کا نمازی.....! اردو اور انگلش میں عبور اس کے ساتھ فارسی اور پشتو کا بھی ماہر اس کی چال میں ایک مرداز وقار تھی بولتا تو جیسے فیصلہ مگر دلوں کی دھڑکنوں پر راج کرنے والی گفتگو کرتا۔

میں نے ایک دن انصاف خان سے پوچھا۔
”خان صاحب سلامت خان..... خاموش طبیعت ہے، شروع سے ایسے ہی یا کوئی مسئلہ ملے ہے؟“

بہت اچھا کیا کمی..... جو آپ نے پوچھ لیا جب سے آپ آئے ہیں سلامت خان چپ چپ سا ہے۔ پہلے تو ایسا نہ تھا۔ بہت بولتا تھا جی۔
”اس کی کوئی خاص وجہ تو ہوگی؟“

سنا ہے سلامت کی محبوبہ اسے چھوڑ گئی ہے۔ یہ واقعہ آپ کے چارج سنبھالنے سے دو دن پہلے کا ہے۔ اس نے انتہائی اہم خبر دی۔

”اوہ تو یہ مسئلہ ہے..... اس کی اداس حالت اس بات کی غماز ہے کہ عشق کا روگ لگا ہے۔“

”میں نے بات کی تھی جی مگر سلامت خان نے سارا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑا ہوا ہے۔“ بڑا شریف آدمی ہے جی۔ انصاف خان بولا

☆.....☆.....☆

ٹھنڈی سرد ہوا کے جھونکوں میں، میں نے اتر ساحرہ کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ دھلتے سورج کا وقت تھا۔ یہاں کا موسم خاصا سرد اور بادلوں میں پھلتا پھولتا ہوا تھا۔ میں نے اپنے پرسٹل سیل فون سے نمبر ڈائل کیا تھا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے کال اٹینڈ کی۔
”ہیلو..... آداب۔“ دوسری طرف

کہا گیا۔

”پولیس کے.....“ میں نے کہا۔
 ”آپ کو انسپکٹر کا مران بخاری کہہ سکتی ہوں۔“
 ”مگڑ..... خاصی ٹیلنٹڈ ہیں ویسے آپ نے
 Guess کیا، یا انداز میں تیر چھوڑا ہے۔“
 ”کچھ بھی سمجھ لیں۔“

”ایک بات کہوں؟“ میں نے کہا۔
 ”آپ کی آواز سچ میں بہت سریلی ہے دل
 میں اترنے والی دیری سویت۔“ میں نے کہا۔

”Thanks“ وہ بولی۔

”آپ کہاں رہتی ہیں۔؟“

”کشمیر میں۔“

”کشمیر میں کس جگہ۔؟“

”مظفر آباد کے محلے چاندنی میں۔“

”پڑھتی ہیں یا؟“

”اسٹوڈنٹ تو انسان ساری عمر رہتا ہے البتہ

میں نفسیات پر ریسرچ ہوں۔“

”مگڑ۔ انتہائی دلچسپ فیلڈ ہے۔“

”آپ کو شوق ہے۔؟“

”ہاں لیکن وقت ہی نہیں ملتا۔ پچاس فیصد لوگ

اسے کچھ اس مانتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں..... مگر وہ اس کی باریکیوں اور دلچسپیوں

سے ناواقف ہیں۔ یہ رویوں کو ناپنے کے بعد کا ایک مکمل

نچوڑ ہے۔ اس میں کسی جاندار کے ذہنی رویے اور سوچ

کو شامل کر کے کسی ایک عمل کے رد عمل، یا سوچنے

اور پرکھنے کے عمل کو نفسیات کے لئے ہیں۔“

ایک دہی شخص ہر بات میں ننگ پیدا کر کے

زندگی کی دُور میں الجھن پیدا کر کے مسائل کا شکار

ہو جاتا ہے۔ جبکہ عام شخص جسے ذہنی احتیاط نہیں وہ دنیا کا

ہر کام بہت جلدیکہ جاتا ہے ڈپریشن کے شکار لوگ عام

ذہنی سطح سے نیچے کا لیول رکھتے ہیں۔ مزدور شخص کبھی چین

سے نہیں بیٹھنا چاہے گا اس کی عادت میں محنت بسی ہوگی

بہت سے لوگ مہنگی اشیاء یا خدمات پر یقین صرف اس

لئے رکھتے ہیں کہ وہ مہنگی ہوں گی تو ظاہر ہے کہ کسی اچھی

”آداب جی.....! میں کا مران بخاری بات
 گمدا ہوں۔ صبح آپ نے کہا تھا شام کو بات ہو سکے
 گی۔“ میں نے حوالہ دیا۔

”جی ضرور..... فرمائیے آپ میری کس قسم کی
 مہلپ کر سکتے ہیں۔“ وہ بولی۔

مجھی ایک منظر دور بادل میں بیٹا۔ بادل میں

اچانک چاند نظر آنے لگا۔ اس چاند میں ایک حسین چہرہ

اپنے خوبصورت کانوں سے موبائل لگائے کسی سے

بات کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی حیرت کا شدید جھکا لگا

ہب دوسری طرف کھانسنے کی آواز آئی تو چاند میں بھی

وہ مبین چہرہ کھانسنے لگا۔ میری نظر جیسے دور بین کی طرح

بھاگ ہوئی۔ وہ کوئل اور سندھ چہرہ مجھ سے چند انچ کے

فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”آپ واقعی حسین دلکش ڈنشین ہیں آپ کے

من کی انتہا نہیں۔“

”آپ نے مجھے کہاں دیکھ لیا ہے۔؟“ وہ بولی۔

”میرے سامنے ہیں آپ..... وائٹ

سوٹ، ریڈ بندے اور پیچھے کو کھلے بال..... بلیک پنسل

ٹیل جوتا.....“ میں نے سارا نقشہ بیان کر دیا۔

”کیا مطلب؟ آپ مجھے بھلا کہاں سے دیکھ سکتے

ہیں۔ آپ سچ سچ بتائیں کس آپ کون ہیں۔؟“ وہ بولی

”آپ کو سچ بتا رہا ہوں تو آپ حیران بھی ہوتی

ہیں اور پریشان بھی۔“

”لیکن اسی لمحے جیسے چاند غائب۔ سمجھیں منظر

بھی غائب۔“

”سوری میں کچھ زیادہ ادور ہو گیا تھا۔ میں نے

ابھی تک آپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔“

”جی میں سحر ہوں۔“

”واہ..... نام تو بہت پیارا ہے۔ آپ کی

طرح.....“ میں نے لائن ماری۔

”آپ کیا کرتے ہیں۔“

”جی نوکری کرتا ہوں۔“

”کس ڈپارٹمنٹ میں۔“

اور مشہور کہنی کی ہوگی۔ اور مشہور کہنی کا نام ہی کسٹر میں کافی ہے۔“

دوسری طرف سے نفسیات پر لیکچر بھاڑ دیا گیا۔
Good..... آپ کی معلومات قابل تحسین ہیں..... میرے ڈپارٹمنٹ میں ایک عدد Female سائیکلائرسٹ کی ضرورت ہے۔ آپ آفر قبول کریں تو انتظامات کروں۔“
 وہ مسکرا دی۔ ”جی میں جاب نہیں کر سکتی.....!“
 ”وجہ؟“

”ہمارے خاندان میں اس کی اجازت نہیں۔“
 ”اوکے۔ آپ کو مجبور نہیں کروں گا البتہ آپ سائیکلائرسٹ ہونے کے ناطے پولیس کی مدد تو فرمائیں گی۔“

”جی ضرور ملک و قوم کے لئے میری خدمات حاضر ہیں۔ لیکن جاب نہ کرنا میری مجبوری ہے۔“
 ”اتنا کافی ہے۔ ہمیں آپ کی مدد سے بہت فائدہ ہوگا۔“

☆.....☆.....☆

”سلامت خان کی چال ڈھال میں دن بدن ڈھیلا پن آرہا تھا۔ اس کی ساری خوبیاں ایک ساتھ ہی رُو چکر ہونے لگی تھی۔

پھر ایک دن سلامت خان تھانے نہ پہنچا۔
 میں نے اس کا نمبر ڈائل کیا نمبر پاؤرڈ آف جا رہا تھا۔ اس لمحے انصاف خان اندر داخل ہوا۔

”سرکار..... غضب ہو گیا سلامت خان رات سے کہیں گم اور اس کے گھر والے پریشان ہیں۔“

”اوہ..... ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ ہمیں ابھی چلنا ہوگا۔“ اور ہم اسکے گھر جا پہنچے۔

سلامت خان کی ماں کے مطابق وہ رات کو اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا لیکن پھر واپس نہ آیا تھا انہوں نے اس کے نمبر پر رابطہ بھی کیا مگر نمبر پہلے Busy اور بعد میں سوئچ آف ملا۔

”کیا آپ کو وہ اپنے دوست کا نام بتا

کر گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم دوست کے پاس ضرور جاتے۔“ تبھی میرا سیل فون بج اٹھا۔

”صاحب..... میں حیدر علی بول رہا ہوں۔ سلامت بے ہوش حالت میں اسپتال میں موجود ہے مگر اپنے ایک عزیز کی عیادت کے لئے گیا ہوا تھا تو سلامت خان کو دیکھ کر آپ کو اطلاع دینا ضروری سمجھا۔“

”اوہ..... بہت شکریہ۔ تم اس کا خیال رکھو میں پہنچتا ہوں۔“ یہ شکیرا اگلو تا سرکاری اسپتال تھا۔ ار

لئے مجھے دہاں پہنچنے میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہوئی۔ سلامت خان کی حالت ٹھیک نہیں تھی اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ جبکہ اس کے ماتھے اور سر پر چوٹ کے واضح زخم تھے۔

”سر.....! آپ آگئے، میں خود ہی آپ کو انعام کرنے والا تھا۔“ اے ایس آئی صاحب بے ہوش حالت میں اپنی گاڑی میں پائے گئے تھے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہو۔ ڈاکٹر نے بتایا۔
 ”لیکن آپ نے نہ تو پولیس کو اطلاع دی نہ ان کے گھروالوں کو میں بھڑکا۔“

”میں ابھی چارج پر پہنچا ہوں۔“
 ”دیکھئے یہ سب آپ کا اخلاقی فرض ہے خیر آپ ان کی حالت کے بارے میں بتائیں۔“
 ”یہ شام تک ڈسچارج کر دیئے جائیں گے کچھ زخم ہیں وقت تو لگے گا۔“

”لیکن مریض کو ذہنی دباؤ سے بچائیں۔“ بول کر ڈاکٹر چلا گیا۔

سلامت کو شام تک ڈسچارج کر دیا میں نے اسے ابھی تک کوئی سوال نہ پوچھا تھا۔ البتہ اس کی غلط فہمی شروع کرادی تھی۔ کچھ نہ کچھ پراسرار ضرورہ جس نے سلامت خان کو اس قسم کی خطرناک حالت دوچار کر دیا تھا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوا یا کوئی کارروائی۔

میں نے اس کی گاڑی کا معائنہ کیا۔ یہ پہلا راستہ تھا اس کی جیب سائیز پر رکھی تھی اس کا سوئچ آف

Cell مجھے مل گیا تھا۔

ایک اور حیرت انگیز چیز ایک سرخ چوڑی کا ککڑا
مکے سائڈیٹ سے ملا۔

☆.....☆.....☆

”آج کل آپ بہت پریشان نظر آ رہے
ہیں۔“ وہ بولی۔

”ہاں..... ٹھیک کہتی ہو۔ ایک پراسرار کیس
ہے۔“ جس نے الجھن بڑھا رکھی ہے۔
”کچھ مجھے بھی بتاؤ۔“

”میں نے ساری کہانی سنا دی۔“

”میرے خیال سے سلامت خان کسی لڑکی کے
مطلق میں مبتلا ہو کر جان دینا چاہتا تھا، لیکن عین ٹائم
ہی نے اسکی یہ کوشش ناکام بنا دی۔“

”لیکن تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”بات واضح ہے۔ اس کی محبوبہ اسے چھوڑ
کر ہمارے گئی..... عشق کی آگ میں تڑپنے والا نوجوان
ہماروں سے کد جانا چاہتا تھا مگر کسی نے اس کی مدد کی
اور اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔“

”کیسے؟ اور وہ طاقت کون تھی۔“

”یہ خود تلاش کرو۔“

پھر کچھ حیرت انگیز معاملات پیدا ہو گئے۔

طاعت خان کا دماغ قریب 20 سال پیچھے جا پڑا تھا۔

30 سال کا نوجوان اچانک بچوں والی باتیں کرنے

لگا۔ میں نے پہلے پہل اس بات پر یقین نہ کیا

مگر جب جدید میڈیکل سائنس نے بھی اس بات کی

تصدیق کر دی تو اس بچ کو تسلیم کرنا پڑا۔

اس معاملہ میں سحر نے بھی مدد کی۔

”اگر یہ واقعی بچکانہ حرکتیں کر رہا ہے تو واقعی یہ

فلت ہے کہ اس کا دماغ 20 سال پیچھے جا چکا ہے۔

مگر ممکن ہے انسانی دماغ ذہانت کی بلندیوں کو چھو سکتا

ہو۔ مثلاً دائرہ مخصوص سے خاص Duratiah تک

پہنچ سکتا ہے۔ لیکن چونکہ اصل دماغی

دور 20 سال سے آگے ہے تو ابھی نہ کبھی میموری

لوٹ آئے گی۔

”مریض کو آم کا جوس اور کوئی ایسی مودری
دکھائیں جو اس نے Latest دیکھی ہو۔ اس معاملے
میں ان کی رفیق حیات یا کوئی قریبی ساتھی مددگار
ہو سکتا ہے۔“ سحر نے بتایا۔

”مطلب اگر اس کی زندگی کے خوبصورت

لمحات اس کے سامنے بیان کئے جائیں یا مودری کی

صورت میں دکھائیں جائیں تو حالات بہتر ہو سکتے

ہیں۔ اور آم کا جوس کیسے کار کر ثابت ہوگا اس کیس

میں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ایسا کرنے سے میموری اچانک واپس

آ سکتی ہے تھوڑا وقت درکار ہوگا۔ یہ مرحلہ کتنی

اور صبر آزما ہوگا لیکن بہتری کی امید رکھنی چاہئے۔

اور جہاں تک تعلق آم کے جوس کا تو ملک ٹیک ایک مکمل

علاج ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ میٹل ہاسپٹل، یا

میٹل ہاؤس میں زیادہ تر ملک ٹیک استعمال ہوتا ہے

اصل میں آم میں موجود مخصوص پوٹاشیم اور میٹھے ذرات

دماغ اور دل دونوں کو تقویت دیتے ہیں۔ آم کو رومانوی

پھل کہا جاتا ہے۔ رومانس، دماغ میں موجود نفرت

اور Negative اثرات کو زائل کر دیتا ہے۔“ سحر

نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

”ویری ملڈ..... میں کوشش کرتا ہوں کہ اس

معاملے میں کوتاہی نہ ہو۔“

”سحر..... ایک کام کرو گی؟“

”جی بتائیں۔“

”اپنی تصویر MMS کر سکتی ہو؟“

”جی ضرور کر دیتی مگر میرا سیل اس قسم کی

Service سے بہرہ ور نہیں ہے۔ مطلب میرا سیل

MMS ریو کر سکتا ہے اور نہ بھیج سکتا ہے۔“

”اوہ..... پھر واقعی مسئلہ ہے..... ویسے مارکیٹ

میں نئے نئے ڈیزائن اور اس قسم کی سہولت والے بے شمار

Cell موجود ہیں۔ ایک دو خرید لیں ہمارا بھلا ہو جائے گا۔“

لیکن اتنی دیر میں رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

سحر جا چکی تھی۔ اس کے علاج کے خصوصی انتظامات کرائے تھے۔ آپٹیل کیریونٹ میں سلامت خان بمعہ اپنی والدہ اور بھائی کے موجود رہا تھا۔ سحر کی ہدایات کے مطابق ملک ٹیک اور کچھ ایسی سوویز جو..... ہم نے مل کر دیکھی تھی میں نے آپٹیل طور پر اس کے روم میں انتظام کر دیا تھا۔

پھر ایک دن سحر کا فون آدھکا..... وہ کچھ پریشان تھی۔ ”کامران بخاری..... ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”خیریت..... کیا ہو گیا؟“ میں نے پوچھا۔
”چھوڑو تم..... یہ تمہارا مسئلہ نہیں..... تمہارے اے ایس آئی کی حالت کیسی ہے؟“ اس نے ٹال منول سے کام لیا۔

”اس کی حالت نہیں بدلی۔ تم مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ..... ہو سکتا ہے میں تمہارا ساتھ دے سکوں۔“
”نہیں یہ میں خود ہینڈل کر سکتی ہوں..... تمہیں کشمیر کیسا لگا؟“

”بہت اچھا لگا..... لوگ اچھے ہیں۔ قدرت کے خوبصورت نظارے ہیں۔“
”نیلیم وادی گئے.....؟“
”ہاں.....!“

”کل مل سکتے ہو؟“
”کہاں؟“
”نیلیم وادی کی مشرقی جانب ایک سدا بہار درخت ہے جسے نیلیم پرنس کہا جاتا ہے۔ کل شام 6 بجے۔“

”لیکن.....؟“
”رابطہ ڈسکنٹ ہو چکا تھا۔“
اگلی صبح شام کے انتظار میں گزری۔ شام کے 6 بجے مجھے نیلیم پرنس پہنچا تھا۔ حوالدار رحم دل غلا مقامی آدمی تھا۔ وہ مجھے وقت سے پہلے مطلوبہ مقام پہنچا دیا تھا۔

یہ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ میں نے اہ درخت کو دیکھا آٹھ تنوں والا یہ خوبصورت درخت

اب میں اپنے دل کی بات بتاتا ہوں۔ مجھے سحر سے واقعی پیار ہو گیا تھا، گپ شپ کرتے۔ ہم دونوں نجانے کہاں جا پہنچے۔ میں رفتہ رفتہ اس کے سحر میں گرفتار ہوتا گیا۔

اس کی میٹھی آواز میرے کانوں میں شیرینی بکھیر دیتی تھی۔ دلچسپی میری سوچوں میں حاصل ہونے لگی۔ ان دنوں فراغت سی کمی میرا ٹرانسفر کشمیر میں ہو گیا تھا۔ یہ مظفر آباد کا لوائی علاقہ تھا ہر طرف امن وامان کی صورتحال تھی۔ ایک ہفتے میں مجھے کسی کی شکایت نہ ملی تھی۔ حوالدار انصاف خان اپنی جوانی کے قصے سناتا تھا۔ چرب زبان ضرور مکر دل کا سادہ اور ایماندار تھا۔ مجھ سے ایک ہفتے میں اس کی ایسی بے گنجی جیسے ہم برسوں کے ساتھی ہوں۔ دن یونہی اچھے گزر رہے تھے مگر پھر ایک رات میں نے انوکھا خواب دیکھا میرا فوکس سیل فون کے ڈائلڈ نمبر پر تھا۔ میں ایک نیٹ ورک کمپنی جو ہمارے ملک میں ٹیلی کمیونیکیشن کی خدمات دینے والی کمپنی کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ نمبر بار بار میرے سامنے فوکس ہوتا رہا۔ پھر اس نمبر سے ٹیکسٹ پیج موصول ہوا کہ I am worry..... پلیز میری ہیلپ کریں۔

ہیلپ پہل تو میں نے توجہ نہ دی مگر پھر جب مسلسل یہ فون ہوتا رہا تو میں نے اس نمبر کو آ زمانے کا فیصلہ کیا۔

حیرت انگیز طور پر تیسرے دن اسی نمبر سے ٹیکسٹ پیج موصول ہوا۔ زبان میری سمجھ سے باہر تھی۔ پھر میں نے وہ نمبر ڈائل کیا..... دوسری طرف، خوبصورت آواز والی خاتون نے فون اٹھینا دیا۔ باقی کے معاملات آپ کے سامنے ہے۔

☆.....☆.....☆
سحر..... دودن گم رہی تھی۔ اس کا نمبر پاور ڈ آف رہا تھا۔ میں اس کا نمبر کئی مرتبہ ڈائل کر چکا تھا۔ ادھر اے ایس آئی کی طبیعت دماغی طور پر بچکانہ، البتہ اس کی حرکتیں دس سالہ بچے والی تھی۔ میں نے سرکاری طور پر

ہماش گھونسلوں کا مسکن تھا۔

☆.....☆.....☆

اس دن شدید بارش ہوئی تھی۔ گرج چمک کے ساتھ مینہ خوب برسنا بھیجئے کا بہت شوق ہے۔ میں خوب بیگیا میرے کپارٹمنٹ میں ایک چھوٹا سا تالاب بھی ہے۔

میں نہا دھو کر کمرہ میں آ گیا۔ تولیہ سے جسم صاف کیا تھی کال بیل بجی..... بارش ختم چلی تھی البتہ بادل ابھی تک موجود تھے میں دروازے پر پہنچا۔

ایک گفٹ پیک میرے سامنے تھا۔ میں نے سائن کر کے گفٹ لے لیا اندر آ کر میں نے گفٹ کھولا۔ ایک خوبصورت سی براؤن ڈگھڑی اور ایک براؤن ڈگھڑی کا قلم اندر موجود تھا۔ ساتھ میں ایک خط تھا۔

آداب!

خیریت مسنون! تمہاری یاد بہت آتی ہے ملنا بھی چاہتی ہوں مگر مناسب وقت پر ضرور ملاقات ہوگی۔ میں فون پر آج کل بہت کم وقت دے رہی ہوں اس لئے آپ سے بات نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ میرا دل جانتا ہے کہ میں کس قدر بے چین ہوں۔ میری طرف سے یہ تحفہ قبول فرمائیں۔

اللہ آپ کو خوش رکھے۔

والسلام۔ آپ کی سحر

وہ مجھے اتنی اہمیت دے رہی تھی لیکن ملنے کے لئے کیوں نہ آتی تھی؟

”وہ نوجوان جو مجھے گفٹ دے گیا تھا وہ کون تھا؟ اور مجھے کیسے جانتا تھا؟ سحر بذات خود کیوں سامنے نہ آ رہی تھی؟“ یہ سوالات چونکا دینے والے تھے۔

میں نے ابھی تک یہ مسئلہ اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں اسے خالصتاً ذاتی میسر کہتا تھا۔ لیکن مجھے امید تھی کہ سحر بھی نہ کبھی سامنے ضرور آئے گی۔! دوستی کو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے۔

گھڑی اپنورٹ تھی۔ اس پر مقامی وقت بھی سیٹ تھا۔ اور تاریخ تھی۔ قلم انوکھی طرز کا تھا۔ آپ

بادل میرے قریب رینک رہے تھے۔ شام اچانک بھی سحر کا کہیں کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ اچانک میرا ہل فون بج اٹھا۔ یہ سحر کی کال تھی..... میں نے اٹینڈ کی۔

”ڈیر! میرا ایک مسئلہ ہو گیا ہے میرا ایک فرینڈ آپ کو میری طرف سے گفٹ دے جائے گا۔ اسے قبول کر لیتا۔ اینڈ ویری سوری۔“ دوسری طرف سے معذرت خواہانہ انداز تھا۔

”اوکے..... کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن گفٹ کی تکلیف کیوں کی؟“ آج نہیں تو کچھ نہیں۔“

”میرا دل مت توڑیں..... میری مجبوری نہ ہوتی تو ضرور آتی۔“

”اوکے“

وہ نیلم پتھر سے جڑی ایک انوکھی تھی جس کے آٹھ کونے تھے ہر کونے سے مختلف قسم کی شعاعیں نکل رہی تھی ہر شعاع کا رنگ الگ تھا۔ یہ گفٹ مجھے اس شام ایک نوجوان سحر کے نام سے دے گیا تھا۔ دیدہ زیب ہنگام کے اوپر انگریزی حرف میں میرا نام لکھا ہوا تھا۔

اندر ایک جٹ تھی جس پر لکھا تھا۔

”آپ کو دیکھا نہیں مگر چاہا ضرور ہے۔ کاش

میں آپ سے مل پاتی یہ حقیر ساتھ اپنی درمیانی انگلی میں

ال بیچے گا اس کے آٹھ کونے آپ کی ہر قسم کی مدد کریں

گے۔“ والسلام آپ کی سحر۔

اس کی چاہت کا انداز نہ لایا تھا۔ خود بلا کر نہیں

ال۔ اسے ضرور کوئی مسئلہ رہا ہوگا۔ البتہ اس کا گفٹ

اللہ کی تاخیر یا پریشانی کے میرے پاس آیا تھا۔ اس

نوجوان نے مجھ سے نام پوچھا نہ کچھ اور کہا..... بس

”سحر“ کا نام لیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

اور گفٹ لے لیا تھا۔

ایک چیز جو میں بیان کرنا بھول گیا وہ یہ کہ ایک

گلاب کا پھول بھی اس گفٹ کے ساتھ اٹیچ تھا۔ (بعد

میں اس کی خوشبو کا عالم یہ تھا کہ آج تک خوشبو قائم ہے)

”سحر، ایک بات کہوں۔“

”ہاں.....کہو.....“

”تم بہت اچھی ہو.....! میرا بہت خیال رکھتی ہو۔“

”بس.....مجھے سر پر نہ چڑھائیں۔“

”مجھے ہدایات کی کتنی بھی کہ سحر کی ہیلپ کرو لیکن

یہاں تو معاملہ الٹ ہے۔ یہاں تو صرف میری

مدد فرمائی جا رہی ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں۔ بہت جلد آپ کو میرے

بارے میں معلومات مل جائے گی۔“ وہ بولی۔

☆.....☆.....☆

اور پھر حیرت انگیز طور پر اے ایس آئی سلامت

خان کی دماغی حالت سنبھلنے لگی وہ پہلے سے زیادہ

سمجھداری کی باتیں کرنے لگا تھا۔ میں نے سحر کی ہدایت

کے مطابق گھڑی اس کے سر ہانے رکھ آیا تھا اور اسپتال

سے ڈسچارج کرا کر گھر لے گیا تھا۔

انہی دنوں قتل کا ایک کیس آیا مگر حیرت انگیز

طور پر قاتل میرے قاتل کے قاتل آ گیا تھا۔

”سرکار..... میرا نام صبح خان ہے، مقتول میرا

دوست تھا ہم نے اس کو قتل کیا مگر انجانے میں قانون جتنا

چاہے سزا دے۔“

”صبح خان، یہ سب عدالت میں کہنا۔“ میں

نے کہا۔

چند دن کیس چلا صبح خان کو سزا دی گئی وہ سزا

آدمی تھا خیر میری زندگی کا آسان اور سیدھا سادہ کیس

رہا۔ البتہ سحر کا سحر مجھ پر چھایا رہا۔ مجھے اس سے ملنے کا

شوق تھا۔

میں نے نیلیم پتھر والی انگوٹھی پہن لی اسے پہننے

کے بعد مجھے اپنے اندر ایک عجیب طاقت محسوس ہوئی

جیسے میرے اندر کچھ داخل ہو گیا ہو۔ بڑی

پیاری Feelings تھی۔ جنہیں میں بیان نہیں

کر سکتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں ہوا میں

اڑ سکتا ہوں۔ گا سکتا ہوں چیونٹی کی آواز بھی سن سکتا ہوں

روشنی کی آواز..... پھول کے کھلنے کی آواز پودے کی

لکھنے، مگر نظر نہ آنے والی روشنائی استعمال کی گئی تھی اس

”سحر..... تم یہ سب کیوں کر رہی ہو۔؟“

”چاہتی ہوں تمہیں..... اتنا بھی حق نہیں۔“ وہ

بولی۔

”تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو لیکن مل نہیں پاتی۔؟“

”وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گی۔! میرے

بارے میں پریشان نہ ہوا کرو۔“

”OK..... ریسرچ کا سناؤ۔“

”جاری ہے۔ اوہ..... ایک بات بتانا بھول گئی

اپنے اے ایس آئی کو سینٹل اسپتال سے ڈسچارج کراؤ

گھر لے جاؤ اس کے سر ہانے جو میں نے گھڑی بھیجی

ہے اس گھڑی کو سر ہانے رکھ دو۔“

”اس سے کیا ہوگا۔؟“

”گھڑی میں اذان ہوتی ہے۔ پانچ وقت

اذان کے الفاظ اس کے دماغ کو چلنے میں مدد دیں گی۔“

”کیا ایسا ممکن ہے۔؟“

”ہاں..... حالیہ ریسرچ کے مطابق اگر کوئی

مفصّل اذان کو مسلسل لگا رہتا رہے تو ہر قسم کا

Negative اثر زائل ہو جائے گا۔ اذان کی تاثیر سبز

رنگ میں، اور سفید روشنی کی طرح ہے۔ سننے والا

Positive محسوس کرتا ہے۔“

”اوکے.....“

”اور قلم کا خیال سے استعمال کرنا تم اسے ہوا

، زمین، پانی دیوار ہر جگہ استعمال کر سکتے ہو۔ یہ ایک

بہترین ہتھیار بھی ہے اس کی کچلی جانب ایک چھوٹا بن

ہے اسے کلک کرنے سے یہ قلم چاقو بن جائے گا۔“

”یہ تو کمال کی چیز ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اس کا استعمال مثبت رہے۔“

گرد و گدھ کی آواز..... حیرت انگیز طور پر دیوار کے آر پار
دیکھنے کی طاقت یہ سب حیران کن تھا۔

☆.....☆.....☆

سورج کی روشنی کھمر کر زمین پر پڑ رہی تھی، میں
دھوپ سینک رہا تھا آج کافی عرصہ بعد سورج نے چہرہ
دکھایا تھا میں بارہ بیٹھا ایک کیس کی اسٹڈی میں مصروف
تھا کہ اچانک میرے دائیں جانب دیوار پر سایہ پڑا اگلے
لمحے میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ نیلم کے ایک کونے
سے سرخ روشنی سے لائٹنگ اس کا عکس دیوار پر پڑا۔

i miss you.....from S

یہ سب حیرت انگیز تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا
دیوار پر واقعی یہ الفاظ نمایاں تھے۔

یہ سب کیسے ممکن تھا؟ لیکن ممکن تھا بھی کہی۔
کیونکہ جب سے سحر سے دوستی ہوئی تھی ہر چیز حیرت انگیز
طریقے سے وقوع پذیر ہو رہی تھی۔

بہر حال جو بھی تھا سحر میرے لئے فائدہ
مند ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے بہتے پانیوں ساچا ہا تھا۔
اسے محسوس کیا تھا۔ اس کی آواز سے پیار کیا تھا۔ میری
زندگی کی پہلی لڑکی جس نے مجھے پیار پر مائل کر دیا تھا،
جنے میں نے دیکھا تھا کہ نہ تھا..... چاند والا منظر مجھے
آنکھوں کا دھوکہ لگا تھا۔

مجھے پیٹنگ کا شوق تھا، مگر فائن آرٹس کی کلاس
صرف ایک بار لی تھی۔ لیکن پھر حیرت انگیز طریقے سے
میں نے ایک لڑکی کی تصویر بنائی میرا ہاتھ اس فیلڈ کے
لئے مناسب نہ تھا۔ ایک بار میرا ہاتھ کلائی سمیت فریپچرڈ
ہو گیا تھا سب کچھ کر سکتا تھا مگر پیٹنگ مشکل تھی لیکن
جب میں نے کام شروع کیا تو دھوم مچ گئی۔

دنیا کے مشہور اور عظیم ترین لوگوں کی عملی زندگی
کو مصوری کے انداز سے فلما نا شروع کر دیا..... وہ دن
بھی آپہنچا جب میری تصویروں کو عالمی سطح پر قدر کی نگاہ
سے دیکھا جانے لگا۔ میرا اکاؤنٹ بھی بڑھنے لگا۔

ایک دن سحر کا فون آیا۔

”بڑی دھوم مچا رکھی ہے اپنی مصوری کی۔“

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔“

”نہیں..... یہ سب آپ کے اندر تھا۔ مناسب

وقت پر آپ نے ان صلاحیتوں کا استعمال کیا۔“

”بجائے فرمایا، مگر آپ کے قیمتی تحائف نے میری
قسمت ہی جگادی۔ مجھے آپ سے صرف ایک شکوہ ہے
کہ آپ ہمیں ملاقات کا شرف نہیں بخش رہیں۔“ میں
نے شکوہ کیا۔

”کاش! یہ سب ممکن ہوتا آپ کو ایک قیمتی بات
بتاؤں۔ اگر آپ اس قلم کو اپنی پیٹنگ میں استعمال
کریں تو مزید فائدہ مند رہے گا۔“

”وہ کیسے؟“

”اگر آپ اس کے پیچھے موجود بٹن کو ڈبل کلک
کریں تو یہ قلم ایک جادوئی برش کا کام بھی دے گا۔ آپ
اس برش سے مجرموں کی اصل تصاویر صرف نام لے
کر بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی مشہور انسان کی تصویر
بھی بنائی جاسکتی ہے۔“

”زبردست..... میں اسے مجرموں کے خلاف
استعمال کروں گا۔“

”مجھے بھی یہی امید ہے۔ اے ایس آئی کا
سناؤ۔“

”پہلے سے بہتر ہے۔ دعا کریں جلد صحت یاب
ہو جائے۔“

”آمین۔“

”ایک بات بتاؤ۔“ میں نے پوچھا۔

”پوچھو۔“

”سحر تم ہو، یعنی روشنی..... یا جادو.....! کل میں
دفتری کام میں مشغول تھا کہ نیلم پتھر سے اچانک ایک
شعاع نکل کر دیوار پر جا پڑی دیوار پر i miss
you لکھا آ گیا۔“

”ہیلو.....! ہیلو۔“ میں پکارتا رہ گیا مگر رابطہ
ڈسکنٹ ہو گیا تھا۔“

میں جب بھی کوئی اہم بات کرنے لگتا تو رابطہ
منقطع ہو چکا ہوتا۔

☆.....☆.....☆

جانچنی میں نے اپنی ویب سائٹ بنا ڈالی اور اپنی ساری تصاویر نیٹ پر اپ لوڈ کر دی تھی۔ میری ساری پینٹنگ انٹرنیٹ پر دیکھی اور بنگ آڈر بھی کیا جاسکتا ہے آن لائن شاپنگ کا یہ انداز ساری دنیا میں رائج ہے میں نے بھی اس جدید طریقے سے خریداری کو اپنانے کا فیصلہ کیا جس کا مجھے ریکارڈ فائدہ ہوا۔

اور یہ سب سحر کی وجہ سے تھا۔

ایک امریکی اخبار نے میرا تفصیلی انٹرویو لیا تھا لیکن کام کی زیادتی اور گورنمنٹ کی طرف سے اجازت نہ ملنے کی وجہ سے یہ کام Delay کر دیا البتہ ایک مشہور اخبار کو تفصیلی انٹرویو دینے کی حامی بھری۔

اس رات رحم دل خان نے جو دیکھا تھا وہ حقیقت کے کتنا قریب تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا البتہ یہ جاننا ضروری تھا کہ وہ الفاظ کس نے لکھے؟ وہ جو کوئی بھی تھا میرا چاہنے والا تھا۔

اسی رات ایک اور واقعہ ہوا۔

میں نے رات اپنے کمپارٹمنٹ میں گزارنی ہوتی ہے جو کہ میرے دفتر کے بیک پر موجود ہے جھونکا مگر خوبصورت گھر، جس کی صفائی ستھرائی کا خیال بابا خیر دین رکھتا تھا گھر کی پچھلی جانب باغیچہ تھا۔ جس میں انگور کی تیل، گلاب کا پھول، موتیا، چنبیلی اور مالٹا کے درخت تھے..... یہ سب میری ہدایت پر بابا خیر دین نے لگائے تھے۔ بہت سے پودے میرے سے پہلے بھی موجود تھے۔ شام کو میں ٹیرس پر بیٹھ کر جاسوسی ناول پڑھتا تھا یہ میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ باغ کی طرف سے جھینجھینی خوشبو آرہی تھی یہ بہت سندر تھی اور بہت پیارے احساس کے ساتھ۔

میں نے بچن سے ایک مگ چائے کا بنایا اور الماری سے ایک جاسوسی ناول اٹھا کر ٹیرس پر جا بیٹھا۔ میرے نیچے بائیں جانب باغیچہ خوشبو بھیرے جا رہا تھا۔ میں نے کتاب جو نبی کھولی خوشبو کا منبع خارج ہوا پھر جیسے اسپرے کا ڈھکن اوپن کر دیا ہو کتاب سے خوشبو نکل کر فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔

انصاف خان کی حالت نازک تھی اس کی آنکھوں میں خوف بھرا تھا حالانکہ جوان تھا لیکن اس کی ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

”صاحب جی! باہر بھوت، خوف ناک بھوت موجود ہے۔“ اس کی حالت بگڑی جا رہی تھی۔

میں نے انصاف خان کو حوصلہ رکھنے کا کہا۔ اسے کرسی پر بٹھایا وہ واقعی ڈرا ہوا تھا میں نے اسے پانی پلایا۔

پھر تیزی سے باہر کی جانب آیا۔ میری گاڑی جس کا رنگ سفید تھا پورچ میں ٹھہری تھی لیکن اس پر سرخ رنگ کا i love you لکھا تھا۔ نیچے ”S“ واضح تھا۔

دائیں اور بائیں جانب بھی یہی الفاظ واضح تھے۔ میں جان نہ سکا کہ یہ حرکت کس نے کی تھی اور رحم دل خان نے کیا دیکھا تھا؟

میں نے اچھی طرح تسلی کی اور دوبارہ اپنے آفس آ گیا۔

انصاف خان کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا تم پولیس میں ہو رحم دل خان..... تمہیں ہمت اور بہادری سے زندگی گزارنی چاہئے..... اب بتاؤ باہر کیا ہوا تھا؟“

”میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک خوبصورت پری اتری ہے اس کا رخ ہمارے تھانے کی طرف ہی تھا۔ وہ بہت حسین تھی۔ میں نے آج تک ایسا حسین زندگی میں نہیں دیکھا اس کی نظر جو نبی مجھ پر پڑی۔ پری غائب ہو گئی پھر تھوڑی دیر بعد آپ کی کار پر خون پڑنے لگا۔ گاڑی پر سارا خون پھینکے گا میں بھاگ کر آپ کی جانب آ گیا۔“ اس کا انداز اتنا سچا اور سادہ تھا کہ مجھے اس کی بات پر یقین کرنا پڑا۔

کیونکہ وہ خون بعد میں کسی کے جذبات کی عکاسی کرنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں نے بار بار سحر سے رابطہ کیا مگر نمبر پاورڈ آف ملا..... ادھر میری مصوری کی دھوم یورپ اور افریقہ تک

واقعہ..... سحر کی پراسراریت مزید بڑھتی جا رہی تھی۔
مجھے کشمیر کے نواحی گاؤں سے نامعلوم کال آئی
تھی کارل نے مکمل پتہ بتایا یہ ایک عشق کا معاملہ تھا۔ لڑکی
غائب تھی جبکہ لڑکا لڑکی کے عشق میں پاگل ہو گیا۔ یہ
پولیس کا کیس نہ تھا مگر لڑکی کی گمشدگی حیرت انگیز
تھی۔ میں مطلوبہ ایڈریس پر جا پہنچا۔

یہ متوسط طبقہ کے عزت دار لوگ تھے۔ درمیانہ
سفید پوش طبقہ..... خاموشی سی زندگی کے کٹھن دن
گزارنے والا..... خواہشوں کا گلا کاٹ کر زندگی کی دوڑ
میں رینگ کر چلنے والے شریف لوگ..... خالی پیٹ
مگر سفید کاشن کا لباس اور کھر کھاؤ میں ماہر۔
ہمیں دیکھتے ہی محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے
میں نے فون کرنے والا نمبر ڈائل کیا اور اپنے آنے کا
بتا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

چند ہی لمحوں میں مطلوبہ آدمی آن پہنچا۔
تعارف اور رکی علیک سلیک کے بعد اس نے
ہمیں اس لڑکے کا گھر دکھایا جو پاگل ہو گیا تھا۔
میں نے دستک دی دوسری دستک پر ایک
دریش صفت آدمی باہر آیا..... ہمیں دیکھ کر اس کی
آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔
”آپ..... میرے دروازے پر..... خیریت
تو ہے جناب۔“
”جی بالکل خیریت ہے..... آپ اطمینان
رکھیں۔“

”یہ بابا عظمت ہیں..... لڑکے کے
نانا.....“ اس نے بتایا۔
”بابا جی مجھے انسپکٹر کا مران بخاری کہتے ہیں۔
آپ کے پوتے کی دماغی حالت خراب کرنے والی ایک
لڑکی ہے۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں۔“
”جی واقعی..... میں بیٹھک کھولتا ہوں اطمینان
سے بات کرتے ہیں۔“

☆.....☆.....☆

عظمت بابا کے مطابق لڑکی کا جو دہی دنیا میں نہ

سموکر کن خوشبو کا دلفریب احساس جس کے اندر میری
روح پھیل سی گئی تھی۔

پھر اچانک خوشبو ختم ہو گئی پھر میں نے کتاب کا
اگلا صفحہ پلٹا..... حیرت انگیز طور پر سرخ روشنائی سے
محبت بھرے الفاظ لکھے نظر آئے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ کتاب کل ہی مارکیٹ سے
لے کر آیا تھا میں نے کچھ لکھا تھا نہ میں نے یہ کتاب کسی
کو پڑھنے کے لئے دی تھی پھر یہ سب کچھ کس نے لکھا؟
کون ہے جو میرے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گیا تھا
تبھی میں نے باغیچے میں ایک منظر دیکھا۔

انگور کی تیل کے بنز پتے سرخ ہو گئے۔ میں نے
آنکھیں صاف کی تبھی میں کتاب اٹھا کر نیچے باغ میں
آ گیا۔ انگور کی تیل واقعی سرخ ہوئی تھی انگوروں کا موسم
بھی سر پر تھا۔ مجھے انگور پرستی بہت پسند ہیں۔ انگوروں
سے لدی تیل سے میں نے ایک کچھا اتار لیا حیرت انگیز
انگور کے باہر ”K“ یعنی کا مران لکھا تھا یہ جلی
حروف ”K“ میں نے پوری انگوروں کی تیل پر لکھے دیکھا
تھا میں نے انگور ہاتھ میں لئے میرے نیچے چھوٹا سا بلخ کا
بچہ تھا۔ جس کی چوچ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ میں تھوڑا
نروس ہو گیا تھا۔ ہمارے گھر میں بلخ کا بچہ کہاں سے
آ گیا تھا؟ میں نے اس کی چوچ سے کاغذ کا ٹکڑا نکال لیا
اندر لکھا تھا Be Happy..... میں نے بیٹھ کر پڑھا
لیکن جب اس بلخ کے بچے کو دیکھا تو بچہ غائب تھا۔

”سحر“ کہاں تھی؟ کن حالات میں تھی؟ کچھ
پتہ نہ تھا اس کا نمبر فی الحال آف تھا، ایک بات جس نے
مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا وہ تھی سحر کی پراسرار
شخصیت..... وہ خود غائب تھی مگر اس کی نشانیاں میرے
ساتھ تھیں، یہ اس کا پیار تھا کہ میں شہرت کی بلندیوں کو
جا پہنچا تھا۔ میرے بہت سے مسائل منٹوں میں حل
ہو جاتے تھے جبکہ پہلے ایسا نہ تھا۔

پھر نیلم پتھری خوبیاں مجھ سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔
شعاعوں اور خون سے لکھا جانا خون سے گاڑی
پر Love you لکھا جانا بلخ اور خوشبو والا

تھا کیونکہ انہوں نے اپنی روحانی طاقت سے اس کا پتہ لگایا تھا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔
عظمت بابا روحانی باوا بھی تھے بظاہر عام شخص مگر لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے والے۔
”بیٹا..... جس لڑکی سے میرا پوتا آصف بات کرتا تھا اس کا انسانی وجود دنیا میں موجود نہیں۔“

پھر مجھے اپنے واقعات یاد آ گئے۔
میرے موجودہ واقعات بھی کچھ اس طرح تھے۔

لڑکی کی آواز بھی مگر جسمانی وجود کبھی میرے سامنے نہ آیا تھا اور پھر اے ایس آئی کا باگل پن اور عشق میں پاگل ہو جاتا۔ کڑیاں ملتی جا رہی تھی لیکن کوئی واضح ثبوت نہ تھا۔
عظمت بابا نے روحانی علم کی بنیاد پر یہ بات واضح ثبوت کے ساتھ کہی تھی کہ آصف جس سے بات کرتا تھا۔ اس کا وجود دنیا میں موجود نہ تھا میں نے عظمت بابا کے ساتھ اس انوکھے کس کو سلجھانے کا فیصلہ کیا۔

ہر کس میں مختلف طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ یہاں عقلی گھوڑے اور گولیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ روحانیت ہی ایک ایسا مکمل ہتھیار تھی۔ جس کے ذریعے ہم اس کس کو سلجھا سکتے تھے۔
ہم نے آصف کے تمام کا لڑکار ریکارڈ چیک کیا فریجائز اور کیوینٹیشن کمپنیز کی اعلیٰ اپروچ کے بعد ایک حیرت انگیز بات سامنے آئی کہ آصف کے پسندیدہ نمبرز میں ایک نمبر ایسا تھا جس کی سم کا نمبر ابھی تک کسی کمپنی نے الاٹ نہ کیا تھا یہ سم ابھی تک استعمال نہیں کی گئی تھی یعنی اس نمبر کا وجود ہی نہ تھا۔
مجھ کو نوے شام تک فریجیکز پر کال کرنے والا Receive نمبر سرے سے دنیا میں موجود ہی نہ تھا۔
یہ حیرت انگیز بات تھی۔

فریجائز منیجر کے ریکارڈ میں Receiver کا Display نہ ہوتا تھا۔
عظمت بابا کی بات دل کو چھوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک بات تو واضح ہو گئی کہ آصف جس نمبر پر کال کرتا تھا اس کا وجود دنیا میں موجود نہ تھا۔

”اس نے سب رشتہ داروں کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا ہے بھابھی اور بھائی کا رورور برا حال ہو گیا ہے۔“

”ہو سکتا ہے ڈرامہ کر رہا ہو۔“ میں نے کہا۔
”مگر کس لئے ڈرامہ کرے گا کوئی وجہ تو ہوگی۔“
دہ بولا۔
”کسی لڑکی کا چکر تو نہیں۔“ میں نے کچھ سوچ

کر کہا۔

”نہیں جی..... اس کی پسند کوئی نہیں۔“

☆.....☆.....☆

جمال خان کا کیس آصف سے ملتا جلتا تھا جمال کے خواب میں ایک عورت حسین زلفوں والی یازیب کی کشش کے ساتھ آئی اور پرانے کھنڈر پر بلائی تھی یہ بات جمال کے ایک قریبی دوست نے بتائی تھی۔ کئی بار اس کے خواب میں آنے کے بعد جمال خان نے اس سے ملنے کی ہامی بھری وہ اس سے ملنے گیا اس کا دوست احمد اس کے ساتھ تھا مگر وہ پرانے کھنڈر سے تھوڑی دور رک گیا کافی دیر بعد جب وہ واپس نہ آیا تو وہ پرانے کھنڈر میں داخل ہو گیا لیکن جمال خان نہ ملا ہر جگہ ڈھونڈنے کے بعد وہ واپس آ گیا اس نے ساری بات جمال کے ابو کو بتائی۔

☆.....☆.....☆

سحر کا نمبر آف.....!

دو کیمز توصل ہو چکے تھے بلکہ میرا اور اے ایس آئی کا مسئلے جوں کا توں تھا۔ سحر منظر عام سے غائب تھی۔ جبکہ اے ایس آئی کے تمام قصبے صرف ایک چوڑی جس کا رنگ سرخ تھا تھی کوئی ثبوت کے کسی لڑکی سے ملا ہو یا کسی طرح کا پتھر..... کچھ بھی سامنے نہ آیا۔ ایک دن انصاف خان بھاگتا ہوا آفس آیا۔ اس کے حواس بے ترتیب تھے۔ ایک عجیب مگر اچھی خبر لے کر آیا تھا۔

”صاحب! وہ اپنا اے ایس آئی سلامت خان ٹھیک ہو گیا اس کا داغ ٹھکانے پر آ گیا ہے جی..... وہ کسی سحر نامی عورت کا نام لے رہا ہے۔ اور بہت غصے میں ہے۔“

میں فوراً اس کے گھر گیا۔ سحر کا نام اس کے منہ سے سن کر حیرت ہوئی تھی۔

اے ایس آئی سلامت خان واقعی نارمل حالت میں تھا اس کی یادداشت واپس آ گئی تھی زندگی کی رونق چہرے پر واضح تھی مگر وہ غصے میں تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ سیلوٹ کرنے لگا۔ ”سرا! مجھے بلایا ہوتا۔“ وہ ادب سے بولا۔

”نہیں..... تم زندگی میں واپس آ گئے ہو اللہ کا شکر ہے..... لیکن تم اتنا غصہ میں کیوں ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ خدا نے تمہیں نئی زندگی عطا کی۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے صاحب مگر میں اس سحر کو نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ انگلی کے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”اطمینان رکھو آرام سے بیٹھو۔ اور مجھے بتاؤ کہ سحر کون ہے۔؟“ میں نے اسے بٹھایا۔

”یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے بلکہ آپ کے آنے سے کچھ عرصہ قبل مجھے ایک اجنبی کال موصول ہوئی۔ بولنے والی ایک لڑکی تھی اس کی آواز میں شیرینی تھی پھر مجھے اس کی کال ہر روز موصول ہونے لگی۔ کبھی وہ مجھے خواب میں نظر آتی کبھی جان میں کبھی میرے اندر داخل ہو جاتی روح کی مانند۔ کبھی مجھے پیار کا اظہار کرتی۔ ہر بار اس کا انداز مختلف ہوتا تھا۔

اس کا نام سحر..... اپنے نام کی طرح جادو گر مگر تھی۔ وہ مجھے ہر بار ملنے کا وعدہ کرتی مگر ملتی نہیں۔

میں اس دن اسے ملنے ہی جا رہا تھا کہ میری گاڑی بے قابو ہو گئی سامنے کھائی تھی اس لمحے مجھے لگا کوئی اندر گاڑی میں داخل ہوا اس نے بریک لگائی اور گاڑی رک گئی اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں۔

بات واضح ہو گئی تھی۔ آصف اور جمال خان کے پاگل پن کا راز بعد میں سحر کے نام سے سامنے آ گیا۔

عظمت بابا نے وظائف پڑھنے کا کہا تھا مخصوص وظائف اور عملیات کے بعد سارے متاثرہ افراد زندگی میں لوٹ آئے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ مجھے کچھ نقصان نہ ہوا وہ میرے لئے سراپا محبت تھی اور میں نے پہلا پیار کیا وہ بھی ایک ایسی پراسرار شخصیت سے جس کی شخصیت پر سوال اٹھتا ہے کہ وہ کون تھی؟



ایم اے راحت

آخری قسط

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلم کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تھیر انگیز کہانی

واقعات سے واسطہ پڑ جائے تو پھر اس کی حالت مجھ سے مختلف نہ ہوتی۔ اپنے آپ میں ہی مضحکہ بن گئی تھی اور سوچتی تھی کہ اگر کبھی زندگی میں موقع ملا اور میں نے کسی کو یہ داستان سنا تو وہ یا تو مجھے ہمدردی کی نگاہ سے دیکھے گا اور سوچے گا کہ میرا دماغ الٹ گیا ہے یا پھر ہنستا ہوا چلا جائے لیکن جو کچھ میرے سامنے تھا، اس کا آخری سرا میرے علم میں نہیں تھا۔

ایک گزرنے والی کو دیکھا جو میری ہم جسامت تھی، اس کا تعاقب شروع کر دیا، جس گھر میں وہ داخل ہوئی میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اس گھر میں پہنچ گئی، ایک لباس کی چوری کا معاملہ تھا۔

اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ کوئی اس کے ساتھ اندر داخل ہوا ہے میں نے زمانہ قدیم کے اس مکان کو دیکھا۔ گھر میں بہت سے افراد تھے لیکن مجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے مطلب کی جگہ تلاش کی، ایک جگہ مجھے بہت سے لباس نظر آئے اور میں نے اس خاتون سے غائبانہ معذرت کر کے ان میں سے ایک لباس منتخب کر لیا۔ اس کے بعد وہاں رکتا بے معنی تھا، میں لباس لے کر باہر آ گئی۔ ہر چند کہ میں دوسروں کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ففری جبکہ مانع تھی، لباس

پاکستان میرا اتنا حسین علاقہ تھا کہ دیکھنے سے آنکھوں کو فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ یہاں پھولوں کی بھرمار تھی اور اہل شہر شاید پھولوں سے عشق رکھتے تھے۔ ہر کٹڑے پر پھولوں کے تختے نظر آ رہے تھے۔ مکاؤں سے پھول بھاگ رہے تھے۔ میں کافی دور تک نکل آئی، اور پھر ایک جگہ رک کر میں نے سوچا کہ اب اریدہ کو تلاش کرنا چاہیے لیکن اس کے سامنے پہنچنے ہوئے کوئی ایسی اجنبی صورت نہ ہو جس سے وہ حیران ہوں..... سب سے پہلے مجھے مقامی خواتین کا لباس درکار تھا۔ میں نے یہاں خواتین کو بھی دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے مخصوص لباس میں ملبوس، چہروں پر نقاب لگائے ہوئے خاصی دلکش نظر آتی تھیں۔ کچھ دیر سوچتی رہی۔ سپاہی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس سے حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ حالانکہ اس قسم کے مجرمانہ اقدامات کے بارے میں سوچ تو سکتی تھی لیکن ان پر عمل کرنا نہایت مشکل کام تھا میرے لئے۔ تاہم میں نے یہ مشکل کام کر ڈالا اور اب حوصلہ بڑھ گیا تھا کیا کروں ایک مضحکہ خیز مشکل میں پڑ گئی ہوں، ورنہ زمانہ جدید میں جب انسان جدید سائنسی دور میں سانس لے رہا ہو اس قسم کے احقانہ تصورات تفریح طبع کے لئے تو ہو سکتے ہیں اگر کسی بد نصیب کا ایسے



سلاطین کی پھوپھی تھی لیکن دشمنوں میں شامل، پتہ نہیں اس کا طرز زندگی کیا ہو، اتنا اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ اس کے لئے فضا ساز گار نہیں ہے اور اہل مصر اسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ زیادہ تاریخ تو میرے علم میں نہیں تھی، بس اتنا معلوم تھا کہ بوس طولی عرصے تک مصر پر قبضہ جمانے کے بعد اور اہل مصر پر حکومت کرنے کے بعد پسپا ہوئے تھے اور مصریوں نے انہیں نکال باہر کیا تھا اور حکومت ان کے قبضے میں آگئی تھی۔ بات بے حد پرانی تھی، لیکن بہر طور بوس سے نفرت کی جاتی تھی اور چونکہ اُردیہ ایک بوس کی بیوی تھی اس لئے شاہی معتب بھی تھی، اگر وہ راعن عوس کی عزیزہ نہ ہوتی تو شاید اسے بھی مصر سے باہر نکال دیا جاتا۔ دروازے پر کھڑے محافظوں سے میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو کون ہے اور اُردیہ سے ملاقات کیوں کرنا چاہتی ہے؟“

”میں ذخیرہ سے آئی ہوں اور اس کے لئے ایک پیغام لائی ہوں۔“ محافظوں نے مجھے اندر جانے کی اجازت دی اور کہا۔

”تیری آمد کے بارے میں اُردیہ کو خبر کی جائے گی اور اگر وہ تجھ سے ملنا پسند کرے گی تب تجھے اس کے پاس بھیجا جاسکتا ہے۔“

میں نے ہیزاری سے کہا۔ ”یہ عمل تم جس قدر جلد کر سکتے ہو کرد کیونکہ میرے پاس اُردیہ کے لئے ایک اہم پیغام ہے اور میں جلد از جلد یہ پیغام اسے دے دینا چاہتی ہوں؟“

محافظوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا، البتہ انہوں نے اس سلسلے میں کارروائی کی تھی اور کچھ دیر کے بعد دو کنیزیں مخصوص لباس میں میرے پاس پہنچ گئیں۔ انہوں نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور میں ان کے ساتھ چل پڑی، وہ مجھے دیوان خانے میں لے گئیں اور پھر ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کیا مجھے اور انتظار کرنا پڑے گا؟“ میں نے کہا۔

تبدیل کرنے کے لئے کوئی تنہا جگہ درکار تھی، اس کے لئے مجھے بہت دیر تک سرگرداں رہنا پڑا۔ تب کہیں جا کر بہت فاصلے پر ایک تنہا جگہ نظر آئی، یہاں میں نے لباس تبدیل کیا، اپنے پرانے لباس کی ایک کٹھری سی بنا کر ایک طرف اچھال دی، چہرے پر مقامی عورتوں کی مانند نقاب لگائی، اور پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد خود پر سے زادیوں کا خول اتار دیا۔ بڑا عجیب لگتا تھا یہ عمل مجھے اور اب مجھے زادیوں کی ترتیب آگئی تھی، اس کے بعد میں وہاں سے چل پڑی، بہت دیر تک میں چلتی رہی، پھر میں نے ایک راگبیر کو آواز دی، اور وہ رک گیا۔

”محترم عزیز! کیا تم مجھے اُردیہ کا مکان بتا سکتے ہو.....؟“ اس نے مجھے سرے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔

”کیا تم صبر امیں اجنبی ہو؟“

”یہ سوال تم نے کیوں کیا؟“

”دو وجوہات کی بنا پر۔“

”وہ کیا.....؟“

”اول تو یہ کہ یہاں کون ہے جو کہ اُردیہ کے مکان کے بارے میں نہیں جانتا، دوم یہ کہ یہ مکان جس کے باغیچے میں تم کھڑی ہو یہ اُردیہ کا ہی ہے۔“

میں حیران رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جہاں میں کھڑی ہوئی تھی وہاں چاروں طرف سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ اطراف میں درخت جھوم رہے تھے۔ پھولوں کی تو یہاں بے پناہ بہتات تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ سامنے نظر آنے والا مکان اُردیہ کا ہی ہے۔ راگبیر اب بھی میرے سامنے ہی کھڑا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”ہاں، میں صبر امیں اجنبی ہوں اور ذخیرہ سے آئی ہوں۔ میں نے جواب دیا اور وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

اس دلچسپ اتفاق پر دل ہی دل میں مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی، مکان کے دروازے پر پہنچ کر میں نے اس عورت سے ملنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا جو اتنا تم

”ہاں، کچھ دیر۔“

”مگر میں فوراً ان سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”انہیں پیغام دیا گیا ہے اور عزتہ نفرت نے حکم دیا کہ تمہیں اندر بلا لیا جائے اور انتظار کرنے کے لئے کہا جائے۔“ میں بیزاری سے انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد ایک تیسری کثیر آئی اور اس نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا میں اس کے ساتھ چل پڑی، کئی راہدار یوں سے گزر کر مجھے ایک کمرے کے سامنے لایا گیا، پھر کثیر نے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں دروازے سے اندر داخل ہو گئی، اندر کا ماحول بے حد عجیب تھا اس شاندار مکان میں یہ کمرہ کسی راہب کی خانقاہ کا درجہ رکھتا تھا پورے کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ ہاں زمین پر غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ ایک گردان میں لوہان سلگ رہا تھا اور اس کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، غالیچے کے ایک گوشے پر شاید نیل کائے کی کھال بچھی ہوئی تھی، اس پر ایک بوڑھی عورت دو زانو بیٹھی ہوئی تھی اس کے سامنے چمڑے پر رکھے ہوئے کچھ اوراق رکھے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک پیالے میں پانی رکھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

”اپنے چہرے سے نقاب ہٹا اور میرے سامنے بیٹھ جا۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں دو زانو بیٹھ گئی، پھر میں نے چہرے سے نقاب ہٹایا اور بوڑھی عورت کے چہرے پر رد عمل دیکھنے لگی اس کا چہرہ پاٹ تھا وہ مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

”تیرا نام شادائش ہے۔“

اُریدہ کے منہ سے اچانک اس طرح اپنا نام سن کر مجھے بہت حیرت ہوئی لیکن میں نے فوراً ہی گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

”آہ، تیرا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پھرا گئی تھیں، نہ جانے کب سے میں تیرا انتظار کر رہی ہوں۔“ اس نے پاس رکھے ہوئے چمڑے کے اوراق

سمیٹے اور انہیں پانی کے پیالے میں ڈبو دیا۔

”اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔“

”میں یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں، بزرگ خاتون کہ تم میرے بارے میں کیسے جانتی ہو؟“ اُریدہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

”ذاتی طور پر میں ابھی ان لوگوں میں شامل ہوں جو تجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن جو کچھ وقت کی کتاب میں تحریر ہو جائے اسے کون مٹا سکتا ہے۔ ابولس براہان نہ جانے کب سے یہ سب کچھ جانتا تھا اس نے اوراق میں بہت سی انوکھی کہانیاں تحریر کر دی تھیں میں تجھے کیا کیا بتاؤں؟“

”تم مجھے نفرت کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہو، اُریدہ؟“

”تو تاریخ کو منتشر کرنے والوں میں شامل ہے، تم میں سے کچھ نے ہمارا صدیوں کا سکون غارت کر دیا ہے۔ ہم جو ہواؤں کی آغوش میں میٹھی نیند سو رہے تھے۔ اپنا سکون غارت کرنے والوں سے کیسے خوش ہو سکتے ہیں۔“ بڑھیا کے چہرے پر نفرت اور بیزاری کے آثار پیدا ہو گئے۔

میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”کیا تمہیں علم تھا کہ میں تمہارے پاس آؤں گی؟“ میرے سوال کے جواب میں اس نے پانی میں بھیک کر خراب ہونے والے صفحات کو دکھ کر کہا۔

”ہاں، ان میں یہی درج تھا۔“

”یہ کس کی تحریر تھی؟“

”یہ ابولس براہان کی پیش گوئی تھی اس نے سب کچھ تحریر کر دیا تھا؟“

”کاش تم اسے ضائع نہ کرتیں، کاش میں بھی دیکھ سکتی کہ ان میں اور کیا لکھا ہوا تھا، میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں، لیکن تمہارے رویے سے مجھے مایوسی ہوئی ہے، جبکہ اتنا تم سلاطین کا کہنا تھا کہ اس کی پھوپھی اسے بہت چاہتی ہے اور جب اسے علم ہوگا کہ میں اس کے پاس آئی ہوں تو وہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لے

”میں نے کہا تا کہ یہ داستان بھی طویل ہے۔“
 ”مجھے یہ بتاؤ کہ کسی ہے۔ کیا اسے قید میں مصوبتیں
 دی گئی ہیں۔ وہ بیمار تو نہیں ہے؟“
 ”اسے صرف ایک بیماری ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”کیا.....؟ بوڑھی عورت نے بے قراری سے
 پوچھا۔

”وہ کہتی ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد صرف اتنا ہی
 ہے کہ جو الزام اس پر لگایا ہے، وہ جھوٹ ثابت ہو جائے
 کیونکہ وہ جھوٹ ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی طلب
 نہیں اور اس احساس نے اسے بیمار کر دیا ہے وہ اس
 سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔“

بوڑھی اُردہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں
 بہتی رہیں اس نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد
 گلوگیر لہجے میں کہا۔

”دیوتا آموں کی قسم، وہ پاکیزہ ہے، وہ کلی کی طرح
 معصوم ہے۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا
 ہے۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں میں پروان چڑھایا ہے۔
 میں نے اسے اپنی زندگی کے صبح شام دیئے ہیں، سالوت
 لا پرواہ انسان تھا۔ اس نے اپنا وقت عیش و عشرت میں
 گزارا اور ناواقفیت کی ان منزلوں تک پہنچ گیا جہاں
 انسان کی بصیرت بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ آنکھوں سے
 نہیں کانوں سے دیکھتا ہے۔ اور سالوت پر بھروسہ کرنا
 دیوانگی ہی تو تھی..... آہ، یہ دیوانگی اس کلی کے دامن کو
 داغدار کر گئی، اور اس کے بعد راعمن عوس اس کا صحیح
 جانشین نکلا، حقیقتوں سے اتنا ہی بے خبر، یہ نہ جانا اس نے
 کہ وہ پاکیزہ کلی جو ہزار حفاظتوں میں پل رہی تھی، داغدار
 کیسے ہو سکتی ہے۔ اور تم مستقبل سے آنے والو، تم نے اس
 کھیل میں ہمارے دشمنوں کا ساتھ دیا۔

لڑکی! ابولس براہانے یہ چند لوہیں رقم کر کے مجھے
 دی تھیں، اس نے کہا تھا کہ جو اس الزام کا باعث بنے
 ہیں وہی اس کی تردید بھی کر دیں گے اور آنے والی لڑکی
 جس کا نام نشا دانش ہوگا، جب تیرے پاس پہنچے گی تو
 حقیقتوں کا انکشاف شروع ہو جائے گا۔ یہی ان لوگوں

گی۔“
 ”اوہ، کیا.....؟“ بوڑھی اچھل پڑی۔ اس نے
 آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔
 ”کیا کہا تو نے؟“ تو..... تو سلاطیہ کے پاس سے
 آئی ہے۔“
 ”کیا ابولس براہا کی پیش گوئی میں یہ تفصیل نہیں
 تھی۔“

”تو سچ کہہ رہی ہے۔ آہ کیا تو سچ کہہ رہی ہے۔ تو
 اناتم سلاطیہ سے ملی تھی۔ کب، کہاں؟“ بوڑھی عورت
 شدید بے چین ہو گئی۔

”میں اس کے پاس سے آرہی ہوں، اور یہ
 میرے سچ کی نشانی ہے۔“ میں نے وہ انگلی اُردہ کو
 پیش کر دی جو اناتم سلاطیہ نے مجھے دی تھی۔ بوڑھی
 انگلی دیکھ کر بے اختیار ہو گئی۔ وہ زار و قطار رونے لگی
 اور اس نے انگلی کو بار بار چوما۔ اس سے اندازہ ہو گیا
 کہ وہ اپنی سچی کو کتنا چاہتی ہے۔

”یہ کیسے ممکن ہوا۔ تو اس تک کیسے پہنچ گئی؟“ اس
 نے روتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی ایک طویل کہانی ہے۔ بزرگ خاتون نے
 مجھ پر اپنی ہمہ دانی کا اس طرح اظہار کیا یہ سب کچھ غلط
 ملط ہو گیا۔ میں نہیں جانتی کہ میرے بارے میں تمہیں
 کیا کیا معلوم ہے۔“

”شاید مجھ سے غلطی ہو گئی، واقعی میں نے تیرے
 ساتھ بہتر سلوک نہیں کیا۔ اٹھ..... اب تو یہاں رہنے
 والوں میں سے نہیں ہے۔..... میری آرام گاہ میں
 چل۔ میں نے صرف ابولس براہا کی تحریر پر انحصار کیا جو
 نامکمل اور مختصر تھی۔ آ.....! وہ لڑکھڑاتے قدموں سے
 باہر نکل آئی اور مجھے اس کے ساتھ چلنا پڑا۔ زمانہ قدیم
 کی ریش عورت کی آرام گاہ جس قدر شاندار ہو سکتی تھی یہ
 جگہ ویسی ہی تھی اس نے مجھے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔

”تو واقعی سلاطیہ سے ملی تھی؟“

”ہاں، یہ انگلی اس کی گواہ ہے۔“

”راعمن عوس کی اجازت سے۔“

”تیری ماں.....؟“ اُریدہ نے پریشان لہجے میں کہا۔

”ہاں، یہی مجھ سے کہا گیا ہے اور تو خود دیکھ کیا میری صورت اس عورت سے ملتی جلتی نہیں ہے، جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ میری ماں ہے۔“

”ہرگز نہیں..... بالکل نہیں..... قطعی نہیں، یہ سب جھوٹ ہے، صورتوں میں مماثلت ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ معصوم پاکیزہ لڑکی کسی گناہ کی مرتکب قرار دی جائے، لیکن آخر یہ کیا مصیبت ہے، یہ کیا کہا جا رہا ہے اور ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ میں تو اس طرح مفلوج ہو چکی ہوں کہ میرے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت میری طبیعت ایسی نہ ہوئی۔ اگر میں دیوتا سالوت کی مرضی کے مطابق کسی ایسے شخص سے منسوب ہوتی جو مصری ہوتا لیکن اب مجھے ایک گناہ گار کی زندگی گزارنے کے لئے مجبور کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ خبر یہ بالکل ہی الگ بات ہے۔

”تجھے ابولس براہم کے پاس جانا ہوگا۔ یہاں تک کی کہانی اس نے مجھے تم کر دی تھی، لیکن مجھے یوں لگ رہا ہے، جیسے اس کہانی میں اس کی شمولیت کے بغیر آگے کچھ نہ ہو پائے گا۔“ بوڑھی عورت جیسے اپنے آپ میں الجھتی تھی۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں مزید کچھ نہیں پوچھا۔ بس پریشان ہوئی، کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور کبھی ان آنکھوں سے الجھنیں جھانکنے لگتیں، پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تھکے تھکے انداز میں اپنی نشست سے نکلتے ہوئے کہا۔

”میرا بوڑھا داماد کوئی بھی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے لیکن تیری آنکھوں میں انا تم سلاطیہ کی تصویر ہے۔ تو نے اسے حال میں دیکھا ہے اور اس طرح تیرا حق بنتا ہے کہ میں نہ صرف تجھ سے محبت سے پیش آؤں، بلکہ تیرا احترام بھی کروں اور خاطر مدارت بھی۔ سن نشاداش میرے منہ سے اگر تیرے لئے کوئی تلخ لفظ نکل جائے تو آج زبول کی قسم، اسے محسوس کرنے سے

میں درج تھا اور ان کی ترتیب یہاں آخر ختم ہو جاتی تھی کہ تو میرے پاس پہنچ جائے اور اگر تو انا تم سلاطیہ سے مل کر آئی ہے تو تجھے خود احساس ہو گیا ہوگا کہ وہ انداز نہیں ہو سکتی، میں نہیں جانتی کہ مکمل کہانی کیا ہے، بس اتنا معلوم ہے مجھے کہ مستقبل سے آنے والوں نے تاریخ کو منتشر کر دیا ہے اور ان کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔“

ہاں ابولس براہم نے ستاروں کے تعاون سے مستقبل والوں کے بارے میں بہت سی تفصیلات بتائی تھیں، کہا تھا کہ وہ زمین و آسمان میں بے ترتیبی پیدا کرنے کا باعث بنیں گے..... اور نہ جانے کیا کیا شے منتشر ہو جائے گی۔ ہم صدیوں سے سکون کی آغوش میں سو رہے تھے، مستقبل والوں کے ہاتھوں بے ترتیب ہو گئے ہیں۔ زمین پر بسنے والے کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔

نشاداش تیرے علم میں تو ہوگا۔ ستاروں کا راز دار خود بھی اتنا ہی منتشر تھا، جبکہ اسے زمین و آسمان کی کہانیوں میں سے بہت سی کہانیاں معلوم ہیں لیکن مستقبل والوں سے وہ خود بھی خوفزدہ تھا اور ہاں مجھے یاد آیا اس نے کہا تھا مجھ سے کہ جب نشاداش میرے پاس پہنچے تو میں اس کے پاس ضرور بھیجوں۔

لڑکی تاریخ منتشر ہو گئی ہے اور تو نہ جانے کس کس طرح انا تم سلاطیہ کی بے گناہی ثابت کرے گی کیا تو مجھے بتائے گی کہ ایسا ممکن ہے۔ بہت وقت گزر چکا ہے اسے قیدی بنے ہوئے، وہ پاکیزہ ہے، معصوم ہے اسے اب اُس قید سے رہائی ملنی چاہیے۔ لڑکی بتا تو اسے کس طرح بے گناہ ثابت کرے گی.....؟“

میں نے پریشان نگاہوں سے بوڑھی عورت کو دیکھا اور کہا۔

”حالانکہ تیری باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آئیں اُریدہ لیکن میں تجھ سے ہر طرح کا تعاون کرنا چاہتی ہوں۔ ہاں اس بات کا اعتراف مجھے بھی ہے کہ انا تم سلاطیہ نہ تو میری ماں ہے اور نہ ہی کوئی ایسی عورت جس پر الزام لگایا جاسکے۔

گر یز کرتا۔ بڑا مشکل وقت ہے ہم پر تاریخ منتشر ہو چکی ہے اور ہمارے پاس وہ ذرائع نہیں ہیں کہ ہم سچائیوں کو رقم کر دیں۔ پتہ نہیں کیا ہوگا۔ پتہ نہیں کیا ہوگا؟“ بوڑھی اُریدہ نے کہا۔

میں خود بھی اسی طرح الجھ گئی تھی۔ یہاں آتا ہے مقصد ہی رہا۔ یہ بوڑھی عورت تو خود مجھے مرینہ معلوم ہوتی تھی اس سے زیادہ گفتگو کرتا بے کاری تھا، میں نے اس سے کہا۔

”ابولس براہا کا نام لیا ہے تم نے بزرگ خاتون وہ کون ہے، اور کیا وہ انوکھے علم سے آراستہ ہے.....؟“

”ہاں، وہ ستارہ شناس ہے، ستاروں کا زاردار اور میرا مربی اس کی بہت عزت کی جاتی ہے اور ستاروں کی اشتراک سے وہ جو کچھ کہتا رہا ہے اب تک وہی درست نکلا ہے۔“

”وہ کہاں ہے.....؟“

”تا کستان صبر اسے بہت دور..... وادی ترکناں میں اس کا معبد ہے۔ ترکناں کے پرانے معبد میں اس نے ہمیشہ ہی بودو باش اختیار کی ہے، اور تجھے اس کے پاس ضرور جانا چاہیے۔ میں اس کا مکمل بندوبست کر دوں گی۔“

”اتنا میں ضرور بتانا چاہتی ہوں بزرگ خاتون کہ میں راعن عوس کی معزز بجرمہ ہوں اور اس کے سپاہی میری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مجھے بھی انا تم سلاطین کی بیٹی کی حیثیت سے قید خانے میں پہنچا دیا گیا تھا اور اسی قید خانے سے میں نے فرار حاصل کیا ہے جبکہ یہ کام انا تم سلاطین کے لئے بھی ہو سکتا تھا لیکن اس نے کہا کہ وہ اپنی داغدار صورت لے کر قید خانے سے باہر کا راستہ نہیں اختیار کرے گی ہاں اس وقت اس کے لئے باہر نکلتا ممکن ہوگا جب اہل مصر اسے ایک پاکیزہ اور مقدس ہستی کا درجہ دیں گے، میں خود بھی اس کے لئے وہی مقام حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو میری روح تجھے اس سے بھلا کون روکے گا، تو بالکل فکر مت کر ابولس براہا تک پہنچنا میرا کام ہے اور

کوئی نہ جان سکے گا کہ ایک رتھ میں بوڑھی اُریدہ سفر کر رہی ہے یا نوجوان لڑکی نشادانش۔“

”تو بس ٹھیک ہے، تو میرے لئے یہ انتظام کر دے ہو سکتا ہے ہم پردہاں سے حقیقتیں منکشف ہوں۔“

”ایسا ہی ہوگا، مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا۔“ بوڑھی عورت نے کہا۔

”اس میں کتنا وقت لگ جائے گا.....؟“

”نہیں جلدی نہ کر، میں محفوظ انتظام کر دوں گی اور اس سے پہلے تو کچھ وقت میری مہمان بھی رہے گی۔ یہ ضروری ہے کہ راعن عوس خود اتنا فرض شناس نہیں ہے لیکن وہ جو اس کا احاطہ ہوئے ہیں۔“

اُریدہ نے میرے قیام کا بندوبست کر دیا۔ میرے اطراف ہنوز تاریکی تھی۔ کسی مشکل کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ میری زندگی داستان الف لیلہ ہو گئی تھی۔ ایک کے بعد دوسری کہانی فنک آتی تھی۔ کہیں سے مقصد نہیں حل ہو رہا تھا۔ اُریدہ نے دوسری ملاقات کافی بہتر حالت میں کی۔ اپنی بیٹی کے نام پر وہ بے اختیار ہو کر مجھ سے میرے بارے میں بہت سے سوالات نہیں کر سکتی تھی۔ اس دوسری ملاقات میں اس نے مجھ سے بہت کچھ پوچھا۔ مجھے بہت کچھ بتایا۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔

”بڑا انوکھا کھیل ہے۔ مستقبل نے ماضی میں دخل اندازی کی ہے، قدیم علوم بے معنی ہو گئے ہیں۔ کچھ کچھ میں نہیں آتا۔ آ میں تجھے کوہ ارغماں لے چلوں۔ جس کے سوراخوں سے دور تک دیکھا جاسکتا ہے ماضی میں بہت دور تک۔“

”کوہ ارغماں کیا ہے.....؟“

”قدیم بادشاہوں کے لئے رہنما پہاڑ، جس کے سوراخوں سے مرکزیت اور مرکزیت کی تفصیل ملتی ہے۔ لیکن انہیں جو چشم دینا رکھتے ہیں اور جو ناکارہ تھے انہوں نے بھی اس سے رہنمائی حاصل نہ کی جیسے سالوت یا راعن عوس اور اس جیسے بہت سے لیکن جب اس سے رہنمائی حاصل کی گئی تو مایوسی نہ ہوئی کیا تو وہاں چلنا پسند

رہا تھا جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ میرا سر چکرا رہا تھا۔ ہواؤں کے شور میں مصری آبادیوں کی آوازیں شامل تھیں۔ پھر بوڑھی کے آخری الفاظ کے ساتھ ایک دم خاموشی چھا گئی۔ یہ سنائے بھی جانتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں چکرائی ہوئی آنکھوں سے باہر دیکھتی رہی، زمین الٹ پلٹ ہو رہی تھی۔ عمارتیں بوس ہو رہی تھیں، جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر سب کچھ ہواؤں میں تحلیل ہو گیا۔ بالکل خاموشی چھا گئی جگہ جگہ اہرام سراٹھائے کھڑے تھے، ان کے درمیان کوئی ذی روح نہیں تھا۔ کوئی تحریک نہیں تھی۔ خاموشی، ویرانہ.....!

”وہ تیسرا جھروکہ ہے۔ میں اس تک پہنچنے کی سکت نہیں رکھتی تو چاہے تو وہاں جا سکتی ہے۔“
 ”وہاں کیا ہے.....؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں نہیں جانتی۔“

”میں اوپر جاؤں.....؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہاں، اگر تو چاہے۔“ بوڑھی تھکے تھکے لہجے میں بولی اور میں نے کچھ اور بلندیاں طے کیں اور اس جھروکے کے باہر سے جہانکا تیز روشنیوں میں جدید مصر نکمرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں حیران رہی، میں اسے شناخت کر رہی تھی۔ بہت دیر تک میں وہاں رکی۔ پھر واپس بوڑھی کے پاس آ گئی۔ بوڑھی اداس بیٹھی ہوئی تھی۔

”اس کے دوسری طرف مصر جدید ہے۔ میرے دور کا نمائندہ!“ میں نے کہا۔ بوڑھی نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ جب وہ کچھ نہ بولی تو میں نے کہا۔
 ”مگر تجھے یہاں کیوں لائی ہوا یاد ہے.....“
 ”ایک تجربہ کرنے، کچھ معلوم کرنے کے لئے۔“
 ”کیا.....؟“

”پہلے جھروکے سے تو میں نے ماضی کا مصر دیکھا۔ نیل کی آبادیوں کے عروج و زوال دیکھے، دوسرے جھروکے سے مصر کی خاموشی دیکھی۔ وہ دور جب مصری تہذیب تاریکیوں میں سو گئی تھی اور تیسرے جھروکے سے تو نے اپنا دور دیکھا۔ تو نے یہ سب کچھ دیکھا

کرے گی۔“
 ”ہاں، کیوں نہیں“ میں نے بے دلی سے کہا۔ کرتی بھی کیا، میں خود اندھیروں کی مسافر تھی۔ اُردیدہ نے سفر کا بندوبست کیا اور خود بھی کچھ گھوڑوں والے تھہ میں بیٹھ کر میرے ساتھ چل پڑی۔

وادیوں، دروں اور پہاڑوں کے درمیان سے گزرا کر بلاخر ایک نخلستان پر یہ سفر ختم ہوا، یہ نخلستان ایک پہاڑی کے دامن میں تھا۔ اُردیدہ نے اسی پہاڑی کو کوہ ارضاص کا نام دیا۔ یہاں کچھ وقت آرام کر کے شام کے بھنبیوں میں ہم نے پر پیچ راستے عبور کرنے شروع کر دیے۔ پہلی منزل آگئی تو بوڑھی نے ہانپتے ہوئے ایک بڑے سے جھروکے کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کے دوسری جانب مصر کی تاریخ کندہ ہے۔ آ میں تجھے مصر کی حقیقی تاریخ سے روشناس کراؤں۔ ممکن ہے تیرے دور کے محقق دھوکہ کھا گئے ہوں لیکن ارضاص میں مصر کی تمام حقیقتیں پنہاں ہیں۔“ ہم جھروکے کے نزدیک پہنچ گئے۔ بلند یوں سے پستیاں نظر آ رہی تھیں لیکن ان پستیوں میں ایک دنیا آباد تھی۔ بوڑھی کی آواز ابھری۔

”یہ مہض ہے، قدیم بادشاہی کا مرکز، وہ دیکھ جیہرا کے اہرام تعمیر ہو رہے ہیں۔ یہ جو تھے خاندان کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں اور وقت گزر کر تیسویں خاندان تک آ گیا ہے، اور اب ذرا بائیں سمت نگاہ دوڑا۔ ادھر دیکھ، وہ دیکھ سکندر مصر پر قابض ہے اور بطلیموسیوں کا یونانی خاندان مصر پر حکمران ہے اور وہ انتونی قلو پطرمہ کا دور ہے جو زوال پذیر ہو رہا ہے۔ آ ذرا رخ بدل، دیکھ رومی، مصر کی تقدیر کے مالک بن چکے ہیں۔ مصر کی بارفاقتین کے زیر حکومت رہ چکا ہے، انہی میں حبشہ اور لیبیا کے مکس بھی تھے یوں یہ سلسلہ تو ت انہ انہ تک آتا ہے۔ اسی دوران ہتموس ثالث اور اس کے بعد سالوس انہ مصر کے والی رہے اور پھر دیکھ قدیم مصر کیا ہو گیا۔

بوڑھی اُردیدہ کہتی جا رہی تھی اور تمام مناظر پستیوں میں نمودار ہو کر محدود ہوتے جا رہے تھے۔ بس یوں لگ

تا.....؟“

”کیا ابولس براہا معبد سے باہر نہیں آسکتا؟“

”نہیں۔ ستاروں کے راز دار مجھ سے کہیں زیادہ ضعیف ہے۔ پھر اس کا احترام بھی واجب ہے۔ ہمیں خود وہاں جانا ہوگا۔ میں وہاں جاؤں گی کیونکہ براہادہ واحد شخص ہے جو ستاروں کی مدد سے مجھے یہ بتا سکتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں انائم سلاطیہ کے لئے جتنی پریشان ہوں کاش تو اس کا اندازہ لگا سکتی۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بوڑھی اُریدہ نے بشکل تمام سفر طے کیا۔ بے شک مشکل چڑھائیاں تھیں، لیکن معبد کا سفر طے ہو گیا۔ معبد کے احاطے میں شہوت، اور زیتون کے درخت جا بجا بکھرے ہوئے تھے اور درختوں سے گرے ہوئے پھلوں کے جا بجا انبار لگے تھے جن سے منتشر ہونے والی میٹھی خوشبو چاروں طرف پکرائی پھر رہی تھی۔

معبد کے سامنے بنے ہوئے چبوترے پر بوڑھی اُریدہ نے ابولس براہا سے ملاقات کی۔ بے حد ضعیف انسان تھا۔ ہڈیوں اور سفید بالوں کا مجموعہ اور دنیا سے بے خبر۔

”میں تیری معتقد اُریدہ ہوں۔ تجھ سے ملنے آئی ہوں۔“

”میں نے اب سب سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ میں کسی کو نہیں جانتا۔“ بوڑھے نے کانپتی آواز میں کہا۔

”تو نے ہمیشہ مجھ سے شفقت کا برتاؤ کیا ہے اور تیرے کہنے کے مطابق یہ میری مشکلات کے آخری لمحات ہیں۔ ان لمحات میں میری مدد سے منہ نہ موڑ۔“

”لیکن میری مشکل کے لمحات شروع ہو گئے ہیں۔ اب میں زندگی کے بوجھ سے جھکا ہوا ہوں۔“

”اس کے باوجود تیری مدد درکار ہے۔“

”میں اپنی مدد نہیں کر سکتا، تیری مدد کیسے کروں؟“

”آہ، تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ تو نے مجھے ستاروں کی مدد سے وہ لوہے بنا کر دی تھیں۔ جو چمڑے کے کاغذ پر لکھی ہوئی تھیں۔ تو نے کہا تھا کہ میری مشکل ٹلنے کا وقت آئے گا تو تو میری مدد کرے گا۔“

”ہاں۔“ میں کچھ نہ سمجھ کر بولی۔

”ابولس براہا مجھے یہ بتائے کہ پھر ماضی سے تیرا کیا رشتہ ہے۔ تو تاریخ کو زمانہ جدید کے انسان کی آنکھ سے دیکھ سکتی ہے کیونکہ تو اس دور کی تحقیق ہے۔ ماضی سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر سلاطیہ کے دشمن کس بنیاد پر اس پر الزام لگاتے ہیں۔ مگر..... کون کیسے کس سے کہے۔“ بوڑھی کی آواز بندھ گئی۔

میں اس کی منطق پر غور کرنے لگی۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کے بعد اُریدہ وہاں سے واپس چل پڑی۔ اپنی رہائش گاہ آ کر اس نے مجھے میری آرام گاہ پہنچا دیا، یہاں تو گاڑی بالکل رک گئی تھی۔ میں اب کیا کروں۔ قید خانے میں رہ کر رامن عوس سے تو رابطہ رہتا۔ کوئی فیصلہ تو ہو جاتا۔ یہاں آنا بالکل بے مقصد رہا تھا۔ وہ صرف اپنی مشکل بیان کر رہی تھی۔ بہت غور کر کے میں نے فیصلہ کیا کہ اس آخری شخصیت سے اور مل لوں جسے ابولس براہا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مگر وہ بھی بے مقصد ثابت ہوا تو پھر رامن عوس کے دربار میں خود حاضر ہو جاؤں گی اور اپنی تقدیر کا فیصلہ مانگوں گی۔

”دو تین دن نہایت سکون سے انتظار کیا، یہاں تک کہ اُریدہ نے خود ہی کہا۔

”ابولس کے پاس جانے کا انتظام کر لیا ہے میں نے ہمیں کل صبح نکلتا ہوگا۔“

سفر کے لئے رتھ کا بندوبست کیا گیا۔ وہی رتھ تھا اور وہی رتھ بان جو ہمیں ارغماص لے گئے تھے لیکن اس بار سفر پہلے سے زیادہ طویل تھا اور راستے ایسے خوب صورت کہ آنکھیں روشن ہو جائیں۔ بے مثال خطہ تھا۔ میں نے بڑی خوشی سے یہ سفر طے کیا۔ جس جگہ رتھ رکاوہ بھی ایک طویل پہاڑی سلسلہ تھا۔ پہاڑیوں میں سیاہ پتھروں کی وہ عبادت گاہ نظر آرہی تھی جو بہت قدیم معلوم ہوتی تھی۔ بوڑھی نے یہاں رتھ سے اتر کر کہا۔

”آہ۔ اس معبد تک جانا میرے لئے جس قدر مشکل ہے۔ میں ہی جانتی ہوں۔“

”کون ہے تو.....؟“

کی یہ الجھن مابعد تاریخ کے لوگ ہی سلجھا جائیں گے اور انہی میں نشا دانش ہوگی۔ جو میرے پاس آئے گی اور وہیں سے حقیقتوں کا انکشاف ہوگا؟“

”اُریدہ..... آہ میری محبوب ہستی تاریخ کی الجھن کا شکار ہے اور دیکھ لے وہ آگئی ہے، جس کے لئے تو نے پیش گوئی کی تھی۔“

”وہ کون ہے؟“

”ہاں شاید..... ایسا کچھ ہوا تھا۔“ بوڑھے نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

”مجھے کچھ اور یاد دلانا کہ میں اپنی یادداشت تازہ کر سکوں۔“

”تو نے تعین کیا تھا اور مجھے لوصل لکھ کر دی تھیں کہ ان سے اندازہ لگاتی رہوں کہ کتنا وقت باقی ہے اور سب کچھ تعین کر کے درج کر دیا تھا۔ سو وہی تمام واقعات پیش آئے جو تیری تحریروں میں تھا۔ یہاں تک کہ نشا دانش نالی لڑکی میرے پاس آئی لیکن نہ یہ جانتی ہے کہ اب کیا ہوگا۔ انا تم سلاطیہ کیسے اس بہتان سے نجات پائے گی۔ آہ، ہم ایک بار پھر تیری رہنمائی حاصل کرنے آئے ہیں۔“

ابولس براہا سوچ میں ڈوب گیا۔ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”میرے دماغ میں اس کہانی کے مٹے مٹے نقوش موجود ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم مجھے کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ بعد کی کہانیاں ستارے جاتے ہوں گے۔ میری نگاہ بھی کمزور ہے اور دماغ بھی کمزور ہو چکا ہے۔ بہت مشکل کام ہو گیا ہے۔ اب یہ میرے لئے کیا کہ وہ آگئی ہے، وہی لڑکی جس کا نام تو نے شاید نشا دانش لیا اور کیا میری درج کی ہوئی لوصل تیرے پاس محفوظ ہیں.....؟“

”نہیں، تو نے کہا تھا کہ تیری پیش گوئیاں درست ثابت ہو جائیں اور لوح کا آخری لفظ بھی ختم ہو جائے تو میں انہیں پانی میں ڈبو کر ان پر تحریر نقش منادوں، سو میں نے ایسا ہی کیا ہے۔“

”ہاں..... ستارے جس کے لئے جو کہیں وہ انہی تک محدود رہتا چاہئے، ورنہ ان سے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہر بات عام ہونے کے لئے نہیں ہوتی.....، لیکن عزیزہ اس سے آگے جو کچھ بھی ہے وہ ستاروں میں

”نشا دانش مابعد تاریخ کی وہ ہستی جو تاریخ کے جال میں الجھ گئی ہے اور اس سے تاریخ کے بہت سے تار منسلک ہیں۔“ اُریدہ اس کی خوشامد میں مصروف تھی۔ مجھے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی اور میری گردن گھوم گئی۔ شہوت کے زمین پر لگے ڈھیر کے پیچھے ایک سایہ نظر آ جا جو یک جھپکتے دوسری طرف گم ہو گیا تھا۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ معبد میں رہنے والا ابولس براہا کا خادم وغیرہ۔ چنانچہ میں نے ادھر سے توجہ ہٹائی۔ ابولس براہا نے کہا۔

”گزرنے والے وقت نے میری یادداشت اور بصیرت پر برا اثر ڈالا ہے، نہ جانے کیا کیا بھول گیا ہوں، تیرا نام دماغ میں آتا تو ہے لیکن میری پیش گوئی کیا تھی، مجھے یاد نہیں، تاہم مجھے بتا تاریخ کی کیا الجھن ہے اور کون کس مشکل کا شکار ہے؟“

”بہت پہلے میں تیرے پاس آئی تھی ابولس اور تیری ستارہ شناسی سے مدد مانگی تھی میں نے۔ میں نے تجھے بتایا تھا کہ نساووس نادانوں کا شکار ہے اور اپنے ہی جسم پر زخم لگا رہا ہے۔ اس نے اپنی بیٹی انا تم سلاطیہ کو پابند سلاسل کیا ہے اور کیا ہے کہ اس نے تاریخ میں مداخلت کرنے والے ایک شخص سے روابط پیدا کر کے تاریخ مصر کو داغدار کیا ہے اور اس الزام میں اسے قیدی سزا دی گئی اور کہا گیا کہ مستقبل سے آنے والے کے مقدمے کا فیصلہ کئے بغیر انا تم سلاطیہ کی رہائی ناممکن ہے اور اس کے لئے اس نے کانہوں کے اشارے پر ایک تاویل گھڑی، پھر یوں ہوا کہ وہ نہ رہا اور راعن عوس نے اپنے باپ کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ تو میں نے ابولس براہا تجھے بتایا تھا کہ ایسا ہوا ہے اور تو نے ستاروں کی مدد سے مجھ پر یہ منکشف کیا کہ انتظار کرنا ہوگا۔ تاریخ

ہیں کہ شاید بہت سوں کو یقین بھی نہ آئے۔ لیکن میں اس کی معتقد ہوں اور جانتی ہوں براہ ستاروں کا شاسا ہے اور ستارے اس سے کبھی غلط نہیں کہتے۔ سو اگر ہمیں یہاں سے رہنمائی مل گئی تو یوں سمجھ تیری اور میری دونوں کی مشکل آسان ہو جائے گی۔“

میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر براہا کے ساتھ وقت گزاری پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ میں خود بھی اُردیہ سے متفق تھی اور جس مصیبت میں پھنس گئی تھی اس کا حل کسی نہ کسی مشکل میں تو دریافت ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تاریخ اپنا سفر اس انداز میں طے کر رہی ہو اور یہ سب کچھ بھی تاریخ کا ہی ایک حصہ ہو۔ مجھے یہاں رہنے پر آمادہ پا کر بوڑھی کھل اٹھی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا پھر بولی۔

”مجھے تیرے تعاون پر اطمینان ہے۔ مطمئن رہ، میں تیری خبر گیری کرتی رہوں گی اور اس وقت جب ستارہ شناس ہمارے لئے ستاروں کی منتخب کردہ راہ متعین کر دے گا تو ہم مل کر کام کریں گے۔“

رتھ سے میرے لئے رہائش کی جو چیزیں حاصل ہو سکتی تھیں وہ میرے حوالے کر کے اُردیہ وہاں سے چلی گئی اور میں واپس ابولس براہا کے پاس آ گئی۔ میں نے معبد کی بلندیوں سے اس علاقے کو دیکھا تھا۔ ویسے تو یہ سب کچھ حسین تھا لیکن ان بلندیوں سے مناظر اور بھی حسین نظر آتے تھے۔ اگر پرسکون حالات میں ایسی کسی جگہ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملتا تو بڑی خوشی سے گزارا جاسکتا تھا۔ لیکن میری ذہنی حالت اب بھی خراب تھی ابھی تک کوئی بہتر صورت سامنے نہیں آئی تھی کچھ دیر کے بعد ابولس براہا کے پاس آ گئی۔ براہا نے کہا۔

”یہاں قیام میں تجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ اپنی پسند کی جگہ آرام کے لئے منتخب کر لے۔“

”اس کی چنداں فکر نہ کر معزز بزرگ۔ یہ سب بہت خوب صورت ہے۔ یہاں تیرے سوا اور کون ہے۔“

”بہت سے ہیں، تو سب سے واقف ہو جائے گی۔“ اس نے کہا۔ پھر بولا۔

پہاں ہوگا اور بعد کے حالات ستاروں ہی سے پوچھنا پڑیں گے، اور یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تو نے جانا۔ میری بیٹائی میرا ساتھ نہیں دیتی، لیکن پھر بھی میں کوشش کروں گا ہو سکتا ہے اس کے بعد تجھے تیرے عمل سے آگاہ کر سکوں۔“

اُردیہ کے چہرے پر بے چینی کے آثار پھیل گئے، اس نے گہری گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجھے پاکستان صبرا میں لوگوں سے رابطے رکھنے پڑتے ہیں، میں اتنا وقت یہاں کیسے گزار سکتی ہوں، آہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اس لڑکی کو تیرے پاس چھوڑ جاؤں اور تو اس کی رہنمائی کر۔ پھر یہ لڑکی تیری رہنمائی میں مجھے یہ بتائے کہ ایک گناہ اور معصوم لڑکی کی پاکیزگی کو ثابت کرنے کے لئے میرے قدم کیا ہونا چاہئے، ابولس براہا میرے پاس تیرے سوا اور کوئی رہنما نہیں ہے، ورنہ ہم اپنا مقام کھو بیٹھیں گے۔“

ابولس براہا نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، یہی ممکن ہے اور یہی مناسب ہوگا۔ میں ستاروں سے رابطے قائم کروں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ آئندہ کیا ہونا چاہئے، تاہم تجھے انتظار کرنا ہوگا۔“

بوڑھی اُردیہ نے اپنی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگی۔

”تو بھی تاریخ کی الجھن کا شکار ہے نشا دانش اور جو کچھ تجھ سے معلوم ہوا ہے میں خود بھی اسے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ عمر تو میری بھی کم نہیں ہے۔ لیکن میں دل سے یہ چاہتی ہوں کہ راجمن عوس کے دربار میں، ایک دن یہ بات بتا دے کہ وہ حقیقتوں کا سراغ نہ پاسکا اور جو مستقبل کے لوگ تھے۔ انہوں نے تاریخ میں انتشار برپا کر کے اپنی برتری قائم کی اور غلط الزامات لگا کر تاریخ کے ایک سنہرے دور کو داغدار کر دیا۔ یہ ثابت ہونا چاہئے اور اس میں نشا دانش تیری مدد بہت ضروری ہے اور ابولس براہا کی تمام پیش گوئیاں اس طرح درست نکلی

نزدیک پہنچ گئی بوڑھے براہانے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھ دیکھا اور بولا۔

”آبیٹھ میں تیرے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرا خیال ہے تو ذہنی طور پر بھگتتہ ہے۔ شاید سو گئی تھی۔“
 ”ہاں تمہاری یہ دنیا بہت خوب صورت ہے ابولس براہا لیکن میں اسے اندر کے اضطراب میں اس کا حسن گم کر بیٹھی ہوں“ کاٹس مجھے دلی سکون مل جائے۔“
 ”بیٹھ جا۔“ براہانے نرمی سے کہا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گئی وہ بولا۔

”میں نے تجھ پر غور کیا ہے۔ بہت دیر کے بعد مجھے یاد آیا کہ اُریدہ سے میری کیا باتیں ہوئی تھیں اور میں نے اسے ستاروں کے حوالے سے کیا بتایا تھا۔ تیرا تعلق تو بڑی عجیب دنیا سے ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتائے گی۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“
 ”کچھ سوال جن سے میں ستاروں کی پیدائش کوئی کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”پوچھو۔“ میں نے کہا اور وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔

”تم لوگ لوہے کے گھوڑے پر سفر کرتے ہو؟ تمہارے جہاز سمندر کی گہرائیوں میں دوڑتے ہیں، کیا آہنی پرندے تمہیں فضا کا سفر کراتے ہیں، کیا تم نے آگ کو خول میں بند کر لیا ہے، کیا روشنی تمہاری قیدی بن گئی ہے۔ کیا تمہارے درمیان نفرتوں کے گڑھے نمودار ہو گئے ہیں۔ تمہارے ہتھیار آگ کے آتشیں خول میں بند ہیں۔ کیا تمہارے سورما بزدل ہوتے ہیں، مجھے ان سوالوں کے جواب دو۔“

”لوہے کے گھوڑے۔“ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

”ہاں، ابولس براہا تم ٹھیک کہتے ہو، ہم انہیں کار اور ریل کا نام دیتے ہیں۔ سمندر کی گہرائیوں میں دوڑنے والے جہاز آبدوز کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ آگ یقیناً خول میں بند ہے اور ہم اسے کار تو س

”آرام کر میں تجھے آواز دے لوں گا۔“ اس وقت وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں بھی ضعیف شخص کے پاس سے ہٹ گئی۔ پھر میں نے زیتون کے ایک مہند میں اپنے لئے جگہ منتخب کر لی۔ صاف ستھری گھاس کا بستر تھا۔ میں وہاں آرام کرنے لیٹ گئی اور بوڑھے ستارہ شناس کے بارے میں سوچنے لگی۔ اُریدہ، اور نہ جانے کون کون دماغ میں آئے۔ اب ان تمام چیزوں کے بارے میں سوچ سوچ کر دل پر بیزاری طاری ہو جاتی تھی مجھے اس کہانی کا کوئی اختتام نظر نہیں آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یونہی بھٹکتے بھٹکتے زندگی کا اختتام ہو جائے گا اور کسی بات کا فیصلہ نہیں ہو سکے گی۔ انہی جیسی ہر کوشش کر کے تو ناکام ہو چکی ہوں کیا فائدہ کسی بہتری کے بارے میں سوچنے سے، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ آنکھیں بند کر لیں اور نیم غنودگی کی سی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ یہاں کسی کے آنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا اور یہی ہے اگر کوئی آجاتا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ انہی سوچوں میں اچھی خاصی نیند آ گئی۔ پھر شاید درختوں کے جھنڈ میں کوئی پلچل ہوئی تھی۔ آنکھ کھل گئی۔ ایک لباس سا نظر آیا جو میرے بائیں سمت درختوں کے جھنڈ کے دوسری جانب تھا۔ میں ہاتھ لگا کر گئی اور میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

”کون ہے.....؟“ یونہی بس بے اختیاری کے عالم میں یہ الفاظ زبان سے نکل گئے تھے ورنہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ میری خواب گاہ تو تھی نہیں، جو کسی کو یہاں آنے پر روک ٹوک ہوئی۔ جواب نہیں ملا۔ لباس ایک دم غائب ہو گیا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل آئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن آس پاس کوئی موجود نہیں تھا، بہر حال پانی تلاش کر کے منہ وغیرہ دھویا اور پھر بھوک کا احساس ہوا تو زیتون کے پھلوں کا ایک کچھا تو ذکر ان سے شکم سیری کی، بہت ہی لذیذ زیتون تھے پھر وہاں سے بڑی اور اس سمت آگئی جہاں ابولس براہا پتھر کی ایک بڑی سی سل پر دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ یہ نئی جگہ تھی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ معبد کے سامنے کے حصے میں نظر آیا تھا۔ یہ معبد کا کبھی حصہ تھا، میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے

سے پہلے اپنی تقدیر کا فیصلہ مت مانگو۔ وقت کی کتاب میں یہ فیصلہ تحریر ہے اور بس اس کا وہ وقت کھلنا چاہئے جس میں یہ فیصلہ درج ہو۔“

”اس وقت کا کوئی تعین نہیں ہو سکتا؟ کیا تم اپنے ستاروں سے مجھے یہ پوچھ کر بتا سکتے ہو؟“ میرے اس سوال پر ابولس مسکرا کر خاموش ہو گیا اور اس کے بعد اس نے مجھ سے بے تعلقی اختیار کر لی۔ کئی سوال پوچھے میں نے اس سے لیکن وہ پتھرا گیا تھا۔ میں اس کی کیفیت محسوس کرنے کے بعد وہاں سے اٹھ آئی اور پھر رات کی تاریکیاں پھیلنے تک یونہی بھٹکتی رہی۔ مجھے امید تھی کہ وہ رات کے نکلنے والے ستاروں سے میری تقدیر کا فیصلہ سننے گا لیکن سرشام ہی آسمان پر کالے بادلوں کے غول منڈلانے لگے تھے۔ میں نے پریشانی سے سوچا کہ بھلا جب ستارے آسمان پر وارد ہی نہ ہوں گے تو وہ کس سے باتیں کرے گا۔

یہ بھی میری بد قسمتی کا ایک پہلو تھا ہمارا کراسی جگہ آگئی جہاں دن میں آرام کیا تھا۔ لیکن یہاں آ کر حیران رہ گئی۔ صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک تکیہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اطراف میں حسین پھول مہک رہے تھے۔ یہ پھول اس علاقے میں نہیں نہیں دیکھے تھے۔ یہ سب کہاں سے آ گیا۔ کیا، یہاں کسی اور کا قیام ہے۔ یہ شاید کسی اور کے لئے ہے۔ وہاں سے بننے کے بجائے میں نے وہیں انتظار کرنا ضروری سمجھا کوئی آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ مگر رات گہری ہوتی گئی۔ کوئی نہیں آیا، میں تھک کر لیٹ گئی، زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک آہٹیں ہوئیں یہ آہٹیں جھنڈے سے باہر تھیں۔ میں جلدی سے باہر اٹھ کر نکل آئی لیکن گہرے سناٹے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ عجیب سی بات تھی۔ کسی سائے کو میں نے کئی بار دیکھا تھا۔ لیکن سامنے نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کون ہے اور کیوں مجھ سے چھپتا ہے، کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر واپس اپنی جگہ آ گئی۔ یہاں ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ میرے بستر کے کنارے چند برتن رکھے ہوئے تھے۔ جن میں ایک میں تازہ بھنا ہوا گوشت، دوسرے میں کچھ پھل

کھتے ہیں۔ روشنی بے شک قیدی ہے جو سوچ دبانے سے آزاد ہو جاتی ہے۔ ہتھیار آتشیں ہیں۔ بہادری کا فقدان ہے اور ہمارے سوراچالاکی سے ایک دوسرے پر وار کرتے ہیں اور نفرت، سب سے زیادہ ہم نفرت سے محبت کرتے ہیں۔“

”ستارے سچ کہتے ہیں..... وہ بے شک سچ کہتے ہیں۔“

”تمہارے ستارے میری تقدیر کا کیا فیصلہ سناتے ہیں ابولس براہا کچھ بتا سکتے ہو، اس بارے میں۔“

”ہاں، بہت جلد..... میں نے وعدہ کیا ہے۔“ اس نے کہا۔

”تم نے مجھ سے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔“ میں نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں، جب میں ستاروں سے تمہارے بارے میں سوال کروں گا تو وہ مجھے تمہاری پوری کہانی سنا دیں گے۔“ ابولس براہا نے مطمئن لہجے میں کہا۔

”ابولس براہا میں اپنی تقدیر کا فیصلہ سننا چاہتی ہوں، چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ اگر ماضی کی عدالت مجھے موت کی سزا بھی دے تو یقین کرو وہ سزا مجھے خوش دلی سے قبول ہوگی کم از کم زندگی کا کوئی یک طرفہ رخ تو سامنے آئے۔ لمبے لمبے کی موت مر رہی ہوں، میں اس موت سے نجات چاہتی ہوں۔“ میں نے کہا اور ابولس براہا نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی پھر بولا۔

”بس مختصر سا انتظار کر لو۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

پھر وہ بولا۔

”اور سنو جنہیں شکم سیری کے لئے کچھ درکار ہوگا۔

یہاں ان پھلوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کیا میں

تمہارے لئے کچھ اور چیزوں کا بندوبست کروں؟“

”نہیں، معزز بزرگ مجھے کسی شے کی حاجت نہیں

ہے خواہش ہے تو بس اپنی تقدیر کے فیصلے کی۔“

”وقت ہر چیز کے لئے متعین ہوتا ہے، تم وقت

رکھے ہوئے تھے۔ ایک برتن میں پانی بھی تھا۔

درختوں پر چھدکتے ہوئے پرندوں کو تو نہیں دیکھ سکتی، یہ سب ہمیں کے باسی ہیں، ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں، ہمارے ساتھ ہی جیتے ہیں۔“

”میری مراد کسی انسان سے تھی یہاں تمہارے علاوہ کوئی اور انسان نہیں رہتا؟“

”یہ معبد آبادی سے بہت دور ہے اور پھر ویسے بھی یہ دیران جگہ ہے، عبادت گزار بھی اس طرف نہیں آتے اس لئے میں نے اسے اپنے بیسے کی جگہ بنا رکھا ہے۔ انسانوں میں میرے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں رہتا۔“

”لیکن میں نے کسی کو یہاں دیکھا ہے ابولس براہا۔“

”کسے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی.....! اچھا یہ بتاؤ، درختوں کے جھنڈ میں میرے لئے کوئی بستر پہنچایا تھا تم نے، میرے لئے کھانے کا بندوبست کیا تھا؟“

”عبادت گاہوں میں ایسے تکلفات کہاں ہوتے ہیں، تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟“

”اس لئے کہ درختوں کے جھنڈ میں میرے لئے کسی نے بستر بچھایا تھا اور کھانے کے لئے خوراک بھی پہنچانی تھی۔“

ابولس براہا ایک لمحے کے لئے سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا۔

”ہو سکتا ہے سامیہ آئی ہو، کبھی کبھی وہ یہاں آ جاتی ہے، اور معبد کی صفائی وغیرہ کر دیتی ہے، کوئی مقصد نہیں ہوتا اس کا، مجھ سے کچھ نہیں مانگا اس نے، کبھی کچھ نہیں چاہا۔ بس اپنے دل سے یہاں آ جاتی ہے۔“

”کون ہے سامیہ؟“

”چہ نہیں کون ہے۔ ایک بھگی ہوئی راہبہ ہے۔

دنیا ترک کر کے دیرانوں میں بسیرا کر رکھا ہے۔ جب اکثاتی ہے تو ادھر آ جاتی ہے۔ نہ منہ سے کچھ بولتی ہے، نہ کسی سے کچھ مانگتی ہے، شاید وہی ادھر سے گزری ہوگی۔ انسان تو ہے نا تجھے دیکھا تو حیرے لئے کچھ کر ڈالا۔“

”کون ہے، کون ہو تم سانسے تو آؤ..... کون ہو تم سانسے آؤ، میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ آؤ مجھ سے چھپنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کئی بار پکارا لیکن سناٹے چیتے رہے۔ پھر کوئی آہٹ نہ سنا دی۔

مجھے سخت حیرت ہوئی تھی۔ یہ اسرار کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔ گوشت تو بالکل نہیں چھو لیکن پھل کھالے پھر برتن جھنڈ سے باہر رکھ کر وہاں اپنی جگہ آ گئی۔ ایک عجیب سا خوف دل میں جا گزریں ہو گیا تھا۔ بہت دیر تک سوچوں میں گم رہی، پھر آنکھیں بند کر لیں، وقت گزرتا رہا۔ پھر نیند آ گئی۔ لیکن نیند گہری نہیں ہوئی تھی کہ ایک عجیب سا احساس ہوا، کسی کی گرم گرم سانسیں چہرے سے ٹکرائی تھیں۔ کوئی میرے بہت قریب تھا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر بے اختیار میرے منہ سے دہشت بھری چیخ نکل گئی۔ دو آنکھیں میرے چہرے کے بالکل قریب تھیں۔ لیکن صرف آنکھیں، روشن حسین آنکھیں اور کچھ نہیں تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا، میری چیخ پر بری طرح اچھل پڑا اور دوسرے لمحے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل گیا۔ میرا دل خوف کی وجہ سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اب کسی شے کی بالکل گنجائش نہیں رہی تھی۔ کوئی ضرور تھا۔ میں نے اچھی طرح اسے دیکھا تھا۔ مگر وہ کون تھا، مجھ سے کیا چاہتا تھا یہ معلوم نہ ہو سکا۔ مجھے چند گزرے ہوئے واقعات یاد آنے لگے تھے۔ میں نے پہلے بھی کسی پر اسرار سائے کو آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر میرا بستر، اس کے بعد کھانے پینے کا سامان، ہو سکتا ہے وہ یہیں کہیں رہتا ہو اور چھپ کر میری خدمت کرنا چاہتا ہو۔ لیکن کیوں؟ دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ البتہ میں نے دوسرے دن براہا سے پوچھا۔

”یہاں کون کون رہتا ہے، ابولس براہا؟“

”میں نے تجھے بتایا تھا، بہت سے.....“

”لیکن نظر تو کوئی نہیں آتا.....“

”کیوں، کیا زمین پر ریختے ہوئے کیڑوں،

”تم نے کبھی اس سے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔“

”نہیں لڑکی۔ میں اپنے آپ میں ہی لمبا رہتا ہوں، وہی ہوگی اور کوئی نہیں آتا یہاں وہ بہت اچھی ہے اگر وہی آئی ہے تو تمہیں اس کی ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ دل چاہے تو بات کر لینا اس سے، تجھے اچھا لگے گا۔“

”عجب سے الفاظ تھے ابولس براہا کے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بہر حال میں خاموش ہو گئی۔ براہا کہنے لگا۔“

”پچھلی رات تو ستاروں نے بادلوں کا غلاف اوڑھا ہوا تھا کچھ پتہ نہیں چل سکا لیکن اس رات بادل نہیں ہوں گے۔ کچھ نہ کچھ بات ہو جائے گی ان سے تو آرام کرو اور اس بات کو دل میں رکھنا کہ اس عبادت گاہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہاں بری روئیں نہیں آئیں۔ اچھا میں تجھ سے رخصت ہوتا ہوں۔ آج کی رات ستاروں سے بات ہوگی اور شاید میں تجھے آنے والے وقت کے بارے میں بتا سکوں۔“

ابولس براہا میرے سامنے سے اٹھ کر چلا گیا اور میں سامیہ کے بارے میں سوچنے لگی، اگر کوئی راہبہ یہاں موجود ہے تو کم از کم اس سے بات چیت تو کی جاسکتی ہے، ورنہ تنہائی میرا دماغ بھاڑے دے رہی تھی۔ بوڑھا ابولس براہا ہوش و حواس کے عالم میں تھا۔ یہ کیا کم تھا اس کی عمر اتنی زیادہ تھی کہ اس سے ہوش و حواس کی باتوں تک کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

میں سامیہ کی تلاش میں گھومنے لگی۔ بہت دور تک نکلی تھی، معبد کے آس پاس بھی دیکھا اور ایسے حصوں میں بھی جہاں کسی کے قیام کا امکان ہو سکتا تھا۔ لیکن یہاں کسی کا وجود نظر نہیں آیا۔ انوکھی شخصیت تھی۔ اگر ابولس براہا بچ کہہ رہا ہے تو نہ جانے اس کی کیا کہانی ہوگی۔ میری طرف کس جذبے سے متوجہ ہوئی تھی۔ میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ اس کے دل میں میرے لئے کوئی برائی نہیں ہے۔ بشرطیکہ یہ وہی ہو جس کے بارے میں ابولس براہا نے کہا اور ہو بھی سکتا ہے۔

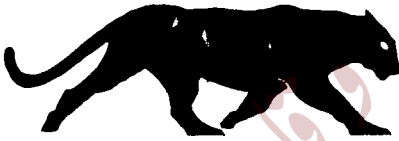
سامیہ مجھے کہیں نہ ملی اور میں اس کی تلاش کر کر کے تھک گئی، ہو سکتا ہے کہیں دور چلی گئی ہو۔ اب کیا کروں، کوئی مشغلہ نہیں تھا ابولس براہا سے اگر کچھ کام کی بات معلوم ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ پھر دیکھوں گی کہ آگے کیا کیا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی تو رونے کو دل چاہنے لگتا تھا۔ دل میں خواہش ابھرتی تھی کہ بھوٹ بھوٹ کر روؤں۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ میرا۔ ایسے جنجال میں پھنسی تھی کہ شاید دنیا کی کوئی بھی ہستی اس طرح مشکلات کا شکار نہ ہوئی ہو۔ پھر اس وقت میں ایک بلند جگہ موجود تھی اور میری نگاہیں دور دور تک بھٹک رہی تھیں کہ دفعتاً مجھے سامنے کے درے سے بہت سے گھر سوار آتے نظر آئے۔ وہ برق رفتاری سے گھوڑے دوڑاتے معبد کی جانب آرہے تھے اور ایک لمحے میں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ فرعون کے سپاہی ہیں۔

میں بدحواسی ہو گئی، کیا کروں، کیا کرنا چاہئے، تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور ابولس براہا کی تلاش میں دوڑنے لگی تاکہ اسے ان سپاہیوں کے آنے کی اطلاع دے دوں۔ چند لمحات کے بعد گھوڑوں کی آوازیں معبد کے اطراف میں محسوس ہونے لگیں۔ ابولس براہا وہاں موجود نہیں تھا جہاں وہ عموماً نظر آ جایا کرتا تھا۔ میں معبد کے عقب میں پہنچی تو دفعتاً ہی میرے سامنے ایک انسانی وجود آ گیا کوئی عورت تھی۔ اس کا چہرہ نقاب میں پوشیدہ تھا۔ سر سے پاؤں تک ایک ایسے سیاہ لبادے میں ملبوس تھی جس سے اس کا جسم بھی نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کچھ نقوش اسے عورت ظاہر کر رہے تھے۔ خاص طور سے آنکھیں، اور یہ وہی آنکھیں تھیں جو پچھلی رات مجھے اپنے قریب نظر آئی تھیں۔ میرے منہ سے ایک بے معنی سی آواز نکل گئی تھی لیکن وہ دوڑ کر میرے نزدیک پہنچی اور اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ پھر اس کی سرسراہٹ ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

”میرے ساتھ آؤ، تمہارے لئے خطرہ ہے، آؤ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ میرے ساتھ، جلدی کرو۔“ میں بادل خواستہ اس کے ساتھ معبد کے عقبی

بلیک ٹائیگر

قیمت - 500 روپے



ایم۔ الیاس

فطری طور پر وہ ایک سراغ رساں اور ہر فن مولا بھی تھا۔ اس لئے اس نے کچھ سوچ کر اور ایک منصوبے کے تحت اس پس ماندہ اور مفلوک الحال علاقے میں اس چھوٹے سے آفس سے پرائیویٹ سراغ رسانی کا آغاز کیا تو بات اس وقت مجبوری کی تھی۔ لیکن حالات بہتر ہونے پر اس نے اسے قائم رکھا تھا۔ اس وقت وہ کسی عالی شان آفس کا دانستہ متحمل ہونا نہیں چاہتا تھا جو شہر کے بہترین کاروباری علاقے میں ہو..... بعد میں یہاں کے رہنے والوں کے ذریعے اسے خلوص اور یکانیت کا وہ احساس ملا جو دولت سے زیادہ دلکش تھا۔ کچھ لوگ جو محض دولت کو جدوجہد کا انعام سمجھتے ہیں..... اس کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے کہ آمدن کا اخلاقیات سے کوئی رشتہ ہے۔ وہ بھی ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ جاسوسی پر مبنی ایک منفرد اور دلگداز کہانی جسے پڑھ کر آپ عیش عیش کرائیں گے۔

شتم بک کارنر ^{منشی علقہ کلی نمبر 5 فیصل آباد}
 امین پور بازار

PH:041,2640015

ڈھلوانوں میں دوڑنے لگی۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی اور اس نے مجھے اتنی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا کہ اگر ٹھوکر لگے تو وہ سنبھال لے۔ ڈھلوانوں کے بعد پھر بیچ در بیچ پہاڑے سلسلے شروع ہو جاتے تھے۔ وہ دو پہاڑوں کی ایک درمیانی دراڑ سے گزر کر دوسری جانب آگئی۔ یہاں ایک پہاڑی میں بڑے سے غار کا دہانہ موجود تھا۔ اس کا رخ اسی دہانے کی جانب ہو گیا اور وہ مجھے وہاں سے اندر لے آئی۔ میرا سانس دوڑنے سے پھولنے لگا تھا۔ اس نے سرگوئی کے عالم میں کہا۔

”بیٹھ جاؤ، وہ یقیناً اس جانب متوجہ نہیں ہوں گے۔ تم یہاں رکو، میں دیکھتی ہوں۔ وہ کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں۔ یہاں سے نکلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ یہ کوشش تمہارے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوگی۔“ یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد وہ باہر نکل گئی اور میں غار کے مٹھڑے فرش پر بیٹھی بری طرح ہانپتی رہی۔ دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ بہت سی سوچیں میرے دل میں آ رہی تھیں۔ غالباً راعن عوس کو میری نشاندہی ہوگئی۔ ممکن ہے اس کا ذریعہ اریدہ بنی ہو، کسی طرح راعن عوس کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں قید خانے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آچکی ہوں۔ خیر مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں تھی اور کچھ ہو یا نہ ہو حاروش عبداللہ نے مجھے تصویروں کا تحفظ بخشا ہوا تھا۔ اور دروشتاں مجھے ایک ایسا فن دے دیا گیا تھا۔ جس نے اب مجھے اپنے آپ میں پراعتماد کروایا تھا۔ اگر کوئی مشکل درپیش آئی تو اسے آپ کو زادیوں کی آغوش میں پناہ دے لوں گی پھر دیکھوں گی یہ لوگ میرا کیا کڑاڑتے ہیں۔ لیکن یہ اونگی راہ پہ کون ہے، میں نے اسے آسانی سے پہچان لیا تھا، وہی تھی جو سائے کی طرح حیرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ تو یہ ہے اس کا ٹھکانہ، میں نے دل میں سوچا۔

تھوڑی دیر تک سانسیں بحال کرتی رہی، پھر تجسس سے سر اٹھار اور میں نے اس غار کو بغور دیکھنا شروع کر دیا۔ خاصی وسعت میں تھا اور یہاں ضروریات زندگی کی چند اشیاء نظر آ رہی تھیں، ایک سمت عجیب سا

کاغذوں کا ڈھیر تھا، غالباً جانوروں کی کھال کو کاغذ کا درجہ دیا گیا تھا، ان کھالوں پر اٹنی سیدی تحریریں تھیں اور بھی بہت سی چیزیں، کھانے پینے کی کچھ اشیاء بھی تھیں، جانور کا سوکھا ہوا گوشت بھی ایک طرف موجود تھا۔ طرز زندگی تو حواس جادہ انسانوں جیسا تھا۔ لیکن ایک تاریک گوشے میں رکھے ہوئے ایک تابوت کو دیکھ کر میرا تجسس مزید جاگا۔ حالانکہ ماحول دھندلا ہو گیا تھا اور غار میں اندھیرے اتار آئے تھے لیکن ابھی اتنی تاریکی نہیں پھیلی تھی کہ تابوت کے اس ہولے کو میں دیکھ نہ پاتی۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی تابوت کے قریب پہنچ گئی۔ تب ہی مجھے وہاں ایک مشعل نظر آئی جو دیوار میں نصب تھی۔ مشعل کے پاس اسے روشن کرنے کے لوازمات بھی موجود تھے۔ میں نے چاروں طرف سے بے نیاز ہو کر مشعل روشن کر دی اور پھر میری نگاہیں تابوت کا جائزہ لینے لگیں۔

تابوتوں سے میرا اچھا خاصا واسطہ رہ چکا تھا۔ اس لئے انہیں دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔ میں نے تابوت کا ڈھکن کھولا اور مشعل کی روشنی میں اس کے اندر سوئے ہوئے زمانہ قدیم کے کسی وجود کو دیکھا لیکن اچانک ہی میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں تو تابوت میں لیٹا ہوا وجود زمانہ قدیم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو ہارون دانش کا وہ جسم تھا جسے میں نے حیران کن طریقے سے آبرار کے پیچھے بنے ہوئے غاروں میں دیکھا تھا۔

تابوت بے شک وہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے قریب وہ دوسرا تابوت موجود تھا جسے ہمیشہ میں نے اپنے باپ کے جسم کے قریب دیکھا تھا۔ یعنی سلاو بیہ کا تابوت، یہاں یہ تابوت اکیلا تھا، اور میں کسی بھی طور اپنی آنکھوں کو نہیں جھٹلا سکتی تھی۔ مزید یقین کرنے کے لئے میں نے مشعل دیوار سے نکالی اور اسے تابوت کے قریب کر کے ہارون دانش کے جسم پر غور کرنے لگی۔ یہ فیصد وہی جسم تھا۔ بالکل وہی تھا۔

میرا دل پھر سے پھٹنے لگا حالانکہ حیرانی کی شدت

قدیم کے ظلم میں آہنسی ہوں بھلا میرا پرسان حال کون ہے۔ بیکار ہے سب بیکار ہے اس سے تو بہتر یہی ہے کہ راعن عوس کی تحویل میں چلا جائے اور اس سے مطالبہ کیا جائے کہ میرا فیصلہ کر دے۔ میں اس کی دنیا کی انسان نہیں ہوں، اگر زندگی میرے لئے ممکن نہیں تو پھر مجھے موت دینے میں بھی جلدی کی جائے، بس ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا دل و دماغ پر۔ دنیا بہت بری لگنے لگی۔ باہر راعن عوس کے سپاہی موجود تھے۔ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا جائے۔ یہی بہتر ہے بے مقصد جدوجہد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، کچھ اس طرح بے اختیار ہوئی کہ سب کچھ فراموش کر کے باہر نکل آئی۔ باہر کوئی نہیں تھا وہ بھی موجود نہیں تھی۔ میں معبد کی طرف چل پڑی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ معبد نظر آرہا تھا لیکن یہاں آ کر حیران ہو گئی۔ راعن عوس کے سپاہی شاید واپس چلے گئے تھے۔ حالانکہ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے پہاڑوں پر پھیل کر مجھے تلاش بھی نہیں کیا تھا میں نے زور سے چیخ کر کہا۔

”کوئی ہے، میں یہاں ہوں۔ میں نشا دانش ہوں۔ راعن عوس کی مفرد قیدی، میں خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر رہی ہوں، کوئی ہے۔“ میری آواز کی بازگشت گونجتی رہی، مگر کوئی دوسری آواز سنائی نہ دی۔ تھک ہار کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی، اپنی بے قسمی کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ میرا بالکل تنہا ہوں اس کائنات میں۔ بدن پر کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی۔ کیا ہوگا آخر، میرا کیا ہوگا، بہت دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی، پھر ابولس کا خیال آیا وہ کہاں ہے، اپنی جگہ سے اٹھی اور اسے تلاش کرنے لگی۔ جہاں وہ موجود ہوتا تھا وہاں نہ تھا۔ بے چین ہو کر اسے لپکانے لگی اور میری لرزی ہوئی آواز پہاڑوں میں گونجنے لگی۔

”ابولس براہا کہاں ہو تم، ابولس براہا، جواب دو، مجھے آواز دو، ابولس براہا۔ میں تمہارے پاس آتا چاہتی ہوں، میں تنہا ہوں ابولس براہا، میرا دل گھبرا رہا ہے، براہا کہاں ہو تم؟“ میں بیچتی ہوئی چٹانوں میں بھٹکتے لگی، پھر

بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ یہ جسم اتنا طویل سفر طے کر کے یہاں تک کیسے آ گیا۔ یہاں اس کی موجودگی کا کیا راز ہے کوئی بات جو سمجھ میں آ رہی ہو۔ کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ وہ راہب کون ہے کہیں سلاویہ تو نہیں، جس نے اب اپنا جسم حاصل کر کے اپنا نادیہ وجود مکمل کر لیا ہے۔ یہی ہو سکتا ہے اس کے علاوہ یہاں ان غاروں میں کیسے آ گئی جبکہ ابولس براہا کا کہنا ہے کہ سامنے نامی کوئی راہب یہاں ان اطراف میں رہتی ہے اور کبھی کبھی اس کے معبد میں بھی آ جاتی ہے۔ الٹی یہ کیا ماجرا ہے، کیا ہے یہ سب کچھ۔ پھر بارون دانش کو دیکھتے ہوئے میرے دل پر رقت طاری ہو گئی۔ میں مشعل تابوت کی جانب نصب کر کے تابوت کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اور میرے حلق سے سکسکیاں نکلنے لگیں۔ ان سکسیوں میں میرے دل کی ترجمان میری آواز میں شامل تھی۔

”ابو کیا دنیا میں کسی باپ نے اپنی اولاد کو اتنے دکھ دیئے ہیں۔ آپ نے اپنے شوق کی تکمیل کے لئے ایک راستہ اپنایا لیکن اپنے شوق ہی کی تکمیل کر لیتے۔ آپ، مجھے اس دنیا میں کیوں لائے، اور اگر لائے تو مجھے اپنے آپ سے اتنا محروم کیوں رکھا، نہ صرف اپنے آپ سے بھی بلکہ آپ مجھے وہ تحفظ بھی نہیں دے سکے جو ماں باپ سے ملتا ہے، در بدر بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا، آپ نے مجھے، ابو بہت خود غرض ہیں آپ۔ آپ نے اپنی حقیقت مکمل کرنے کے لئے اپنی اولاد کو قربان کر دیا، زندگی اس قدر تلخ کر دی آپ نے میرے لئے کراب تو موت سے بھی شرم آتی ہے۔ ایسا کیوں ہے ابو..... ایسا کیوں ہے؟“

میں روتی رہی، لیکن مردہ جسم بھلا کبھی کسی کو تسلی دے سکتے ہیں۔ ابو کا بے جان وجود اسی طرح ساکت و جامد رہا اور میری آنکھوں کے آنسو ختم ہو گئے اور کتنے آنسو بہائی، بے شک یہ پانی نکل جانے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور کیا ملتا مجھے۔ رفتہ رفتہ میں پھسکن ہو گئی۔ بے جان جسم بھلا کہاں سنتے ہیں کسی کی۔ ابو تو اپنی بھائی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ میں زمانہ

ناں، میں خود اس کی خواہش مند ہوں، موت چاہئے مجھے موت چاہئے۔“

”میری بچی آؤ تو سہی، آؤ یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔ آؤ میرے ساتھ انہی غاروں میں چلو، آؤ دیکھو میری بات مان لو میں.....“ اس نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”تم سلا نو بیہ ہونا.....“ میں نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں، میں سلا نو بیہ نہیں ہوں۔“

”تو پھر کون ہو تم؟“ میں نے سوال کیا اور وہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”تم میرے ساتھ چلو گی نہیں آؤ۔ یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔“

”ابولس براہا کہاں ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”اسے راعن عوس کے آدی لے گئے۔“

”ابولس براہا کو لے گئے۔“

”ہاں.....!“

”کیوں.....؟“

”میں نہیں جانتی لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ ابولس براہا کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

”کیا گرفتار کر کے؟“

”نہیں، انہوں نے اسے گرفتار نہیں کیا بلکہ احترام کے ساتھ ایک رتھ میں بیٹھا کر لے گئے ہیں۔ کیونکہ بزرگ ابولس براہا گھوڑے کی پشت پر سفر نہیں کر سکتا تھا

بظاہر یوں لگتا ہے جیسے وہ اس کے ساتھ براسلوک نہیں کر رہے لیکن ہر طور وہ اسے لے گئے ہیں۔“

”کیوں لے گئے ہیں وہ ابولس براہا کو بھلا اس تاریک دنیا بوڑھے سے انہیں کیا لینا ہے نہ جانے کیا

ہورہا ہے یہ سب کچھ نہ جانے کیا ہورہا ہے۔“

”تو میرے ساتھ آؤ، خود کو اس قدر ہلکان نہ کرو، میں تمہاری بہترین معاون ثابت ہوں گی۔“ اس نے

مجھے بازو سے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے کہا اور میں بے اختیار

مجھے ایک آہٹ محسوس ہوئی، بغلی چٹان سے نکل کر کوئی سامنے آ گیا تھا۔ میرے حلق سے ہلکی سی آواز نکلی اور میں اس طرف متوجہ ہو گئی۔

”ب..... بر..... براہا.....“ میری آواز بند ہو گئی۔

ابولس براہا نہیں بلکہ وہی سیاہ پوش عورت تھی، میں نے اسے دہشت ناک نگاہوں سے دیکھا اور میرے منہ سے آواز نکلی۔

”سلا نو بیہ ہونا تم، یہ چہرہ کیوں چھپا رکھا ہے تم نے سلا نو بیہ ہی ہونا۔“

”سلا نو بیہ۔“ عورت کے منہ سے سرسرائی آواز نکلی اس نے ادھر ادھر دیکھا، پھر آہستہ سے بولی۔

”تم غار سے باہر کیوں نکل آئیں۔ یہ جگہ تو تمہارے لئے مخدوش تھی تم نے وہیں میرا انتظار کیوں

نہیں کیا۔ یہاں تمہارا آنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا، تم نے یہ خطرہ مول کیوں لے لیا؟“

”مجھے اس زندگی سے نفرت ہے، میں لعنت بھیجتی ہوں اپنی زندگی پر، میں جینا نہیں چاہتی مرنا چاہتی

ہوں، میں اپنے ناکارہ بوجھ کو کھینچنے کھینچنے تھک گئی ہوں۔ اب اس ناکارہ وجود کو فنا ہو جانا چاہئے۔ اگر ایسا

نہ ہوا تو میں کسی اونچی چٹان پر چڑھ کر چھلانگ لگا دوں گی۔ خودکشی کر لوں گی میں۔ نہیں جینا چاہتی۔ اب میں

ایک لمحہ نہیں جینا چاہتی، دماغ جھنجھنے لگا ہے میرا، ہوش و حواس گم کر بیٹھی ہوں میں اب مجھے صرف موت چاہئے

موت.....“

وہ جیسے تڑپ گئی، آگے بڑھی اور اس نے بڑی محبت سے میرا بازو پکڑ لیا۔

”نہیں، لڑکی نہیں، اس عمر میں موت نہیں مانتے، نہیں بیٹے آؤ میری بچی تم بے سکون ہونا، میں تمہیں سکون دوں گی، آؤ میرے ساتھ، آؤ، تمہارا یہاں ہونا

خطرناک ہے تمہیں، یہاں خطرات درپیش ہیں۔“

”اب میں کسی خطرے کو نہیں مانتی کوئی بھی خطرہ میری زندگی ختم کر سکتا ہے نا۔“

راعن عوس میری موت کا پروانہ جاری کر سکتا ہے

گرفت نہیں تھی جس سے یہ احساس ہو کہ میرے ساتھ زبردستی کرنا چاہتی ہے۔

دماغ کے چولیس مل گئی تھیں۔ اپنی کوئی فکر نہیں تھی۔ روشاق کی عنایت تھی کہ یہ لوگ مجھے پا نہیں سکتے تھے لیکن ابو کو میں انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ میری محبت ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ ان پر جو غصہ تھا ختم ہو گیا تھا۔ جب تک میں زندہ ہوں ایسا نہ ہونے دوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ رتھ کا سفر جاری رہا۔ بہت فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ اچانک میرے عقب میں سرسراہٹ ہوئی اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا، رتھ کی عقبی جگہ میں سامیہ موجود تھی۔ اس کا لباس بے ترتیب تھا۔ چہرے کی نقاب بھی ڈھیلی ہو کر لٹک گئی تھی جس کا شاید اسے احساس نہ رہا تھا لیکن اس کے نعوش نمایاں تھے۔ میں اسے دیکھ سکتی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا اور میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئی تھیں کیونکہ وہ اناطم سلاطیہ تھی جسے میں قید خانے میں چھوڑ آئی تھی۔ اس نے میری کیفیت سے بے نیاز ہو کر کہا۔

”فکرت کرنا شاؤ دانش وہ مجھے وہاں تلاش کر رہے ہیں لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں، بالکل فکر مند نہ ہوتا۔ وہ تمہارا بال تک برکا نہیں کر سکیں گے۔“

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سر بری طرح چکر رہا تھا۔ مشکل میرے منہ سے نکلا۔

”ت..... تم..... انا تم سلاطیہ۔“

اسے اچانک اپنے چہرے سے نقاب کھسک جانے کا احساس ہوا اور اس نے جلدی سے نقاب درست کر لیا وہ بوکھلائی گئی تھی۔ دفعتاً باہر سے کچھ آوازیں ابجریں اور رتھ رک گیا۔ باہر کچھ ہو گیا تھا۔ میں سنہل گئی اور میری نظریں بے اختیار پردے کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے باہر جھانکا رتھ انتہائی تنگ درے سے گزر رہا تھا۔ درہ اتنا تنگ تھا کہ دونوں سمت پہاڑ بہت کم فاصلے پر تھے، اتنے کہ انہیں ہاتھ بڑھا کر چھو لو۔ معلوم ہوا کہ بلندی سے کوئی چٹان لڑھک آئی ہے اور اس نے آگے جانے کا راستہ بند کر دیا ہے۔ گھڑسوار گھوڑوں سے اتر کر رتھ

کی اس کے ساتھ چل پڑی۔

ایکس براہا کو وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ نہ جانے کیوں، کہیں میری وجہ سے بوڑھا ستارہ شناس معصیت کا شکار نہ ہو جائے۔ ہوتا ہے تو جو جنم میں چائے، میرے لئے کسی نے اب تک کیا کچھ کیا ہے، پہلی رات آسمان پر بادل چھا گئے، کتنی بد نصیب ہوں میں، راستہ چلتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے لئے نہ مجھے تمہارا مشورہ درکار ہے اور نہ میں کسی سے کوئی مدد چاہتی ہوں۔ تم سب میرے دشمن ہو، تم سب غیر انسانی شخصیتیں ہو۔ سنو اگر تم ان پہاڑوں میں بھٹکنے والی کوئی روح ہو۔ اگر تمہارا تعلق زمانہ قدیم کی کسی داستان سے ہے تو مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نہ میں ان داستانوں کی رسیا ہوں، کسی سے دلچسپی نہیں ہے مجھے کسی کی محبت یا طلب نہیں ہے مجھے، میں ایک تنہا آوارہ روح کی مانند بھٹک رہی ہوں اس کائنات میں، میں نہ جانے کیوں زندہ ہوں، کاش میں بھی تمہاری طرح زمانہ قدیم کی کوئی روح ہوتی کم از کم سکون کا کوئی لمحہ تو میسر آ جاتا مجھے، اتنی بے سکون ہوں میں کہ میرا ذہن میرے قابو میں نہیں ہے، میرا دل و دماغ ناکارہ ہو چکا ہے۔ میں اسی طرح ختم ہو جاؤں گی۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔ مجھے موت درکار ہے اور کچھ نہیں۔ راجن موس کوئی فیصلہ کرے مجھے کسی فیصلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نہ ماں چاہئے مجھے نہ باپ، کوئی بھی نہیں چاہئے میں صرف موت کی خواہش مند ہوں۔ سمجھیں اور تم اپنا چہرہ کیوں چھپائے ہوئے ہو، مجھ سے بہت زیادہ محبت اور یگانگت کا اظہار کر رہی ہو، لیکن تمہارا چہرہ ایک کپڑے میں چھپا ہوا ہے۔ تم اسے بھی میرے سامنے نہیں لانا چاہتیں۔“ میں زور زور سے چنجی ہوئی اس کے ساتھ چل رہی تھی، اور وہ خاموشی سے میرا بازو پکڑے ہوئے تھی۔ بس اس کے انداز میں محبت تھی کوئی ایسی

اور کیا کر رہا ہے، معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور پکڑاتے ہوئے ذہن سے اس ساری ہنگامہ خیزی پر غور کرنے لگی لیکن کوئی ایک بات جو سمجھ میں آئے۔

چند ہی لمحوں کے بعد غالباً چٹان ہٹادی گئی۔ گھوڑے سوار تھ سے چپکے ہوئے داپس عقبی حصے میں پہنچ گئے اور تھ نے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی، دماغ کا جو حشر تھا وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ بالآخر اس سفر کا اختتام ہوا اور ہم آبادیوں میں پہنچ گئے۔ اس بار مجھے زندان میں تو نہیں لے جایا گیا تھا لیکن جس جگہ مجھے پہنچایا گیا تھا اسے میرا قید خانہ ہی قرار دے دیا گیا۔ ساز و سامان سے آراستہ کمرہ تھا ہر آسائش موجود تھی لیکن بند دروازے کے دوسری طرف پہرے داروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں اب بھی اپنا کھیل کھیل سکتی تھی لیکن اسے آپ پر غور کرتی تو خود شی کر لینے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن انسان ہونے کی حیثیت سے اس کی ہمت بھی نہیں کر پاتی تھی۔ دیکھو میری تقدیر میں کیا لکھا ہے، آہ کاش وہ وقت جلد از جلد آجائے۔

انام سلاطیہ کے لئے دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اس نے ابولس براہا کی خانقاہ پر میرے ساتھ جو احسانات کئے تھے سارے کے سارے ملایا میٹ ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ جھوٹی ثابت ہوئی تھی۔ قید خانے ہی میں وہ اس کا اقرار کر لیتی کہ اسے باہر نکلنے کے مواقع حاصل ہیں اور وہ ایک اور حیثیت سے خانقاہ کے پاس ایک غار میں رہتی ہے تو شاید میری نگاہوں میں اس قدر بے وقعت نہ ہوتی، لیکن سب جھوٹے تھے سب فریبی تھے، اس نے میرے باپ کا جسم ان غاروں سے حاصل کیا تھا اور اپنی تحویل میں لے لیا تھا، کم بخت سلاطوبیہ نے جو الفاظ کہے تھے وہ الگ دل کولرزا رہے تھے، اودہ خدایا، مدد کر میری دل سے ایک ہی آواز نکلتی تھی۔ اب میرے باپ کا بے روح بدن ان لوگوں کے قبضے میں تھا، پتہ نہیں کیا تھا، پتہ نہیں کیا کچھ

سے چپک کر چلتے ہوئے آگے بڑھے انہوں نے اپنے گھوڑے پیچھے ہی چھوڑ دیئے تھے۔ تقریباً تمام ہی سوار جو عقب میں آ رہے تھے آگے کی سمت آگئے تاکہ وزنی چٹان کو ڈھلوانوں میں لڑھکایا جاسکے۔ جگہ کافی محدود تھی۔ پہاڑوں کی بلند یوں پر ایسی بیشتر چٹانیں موجود تھیں جو کسی بھی لمبے اپنی جگہ چھوڑ سکتی تھیں، چٹانچہ سواروں کی کوشش تھی کہ جلد از جلد تھ کے لئے راستہ بنادیا جائے۔ اور اس ہولناک درے سے نکالا جائے، ان لوگوں کی باتوں سے میں نے ساری صورت حال کا اندازہ لگایا۔

انام سلاطیہ بھی شاید انہی کی جانب متوجہ ہو گئی تھی، اب یہ ان کا کام تھا مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی، چٹانچہ میں نے پردہ چھوڑ دیا اور پھر انام سلاطیہ کی جانب متوجہ ہو گئی لیکن حیرت کا ایک اور جھٹکا میرے ذہن کو اس وقت لگا جب میں نے عقب میں اسے موجود نہ پایا۔ میں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھی اور عقبی حصے میں جھانکنے لگی۔ نیچے کا ایک تختہ صندوق کے ڈھکن کی طرح کھلا ہوا تھا اور انام سلاطیہ عقبی حصے میں موجود نہیں تھی۔ کیا معصیت ہے، پتہ نہیں کیا اسرار ہے، ماری نہ جائے بڑا خطرہ مول لیا ہے اس نے حالانکہ عقب کے سوار سامنے کی سمت آگئے تھے اور وہاں صرف گھوڑے تھے، وہ نہ ہٹا رہے تھے، تھ کا پچھلا پردہ ہٹا کر میں نے عقبی سمت میں جھانکا، گھوڑے ساکت و جامد تھے اور ان کے درمیان کسی انسانی وجود کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میرے حواس ہر اساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

غلاب پوش عورت انام سلاطیہ ہے، اسی تصور نے مجھے جکڑ کر رکھ دیا تھا، وہ تو قید خانے میں تھی اور بڑا مان تھا اسے اس بات پر کہ اس وقت تک وہ قید خانے سے باہر نہیں جائے گی جب تک اہل مصر اسے ایک پاکیزہ ہستی قرار نہ دے دیں۔ اور دوسری سمت وہ یہ سب کچھ کر رہی ہے، آہ کیا سچ ہے، کیا جھوٹ ہے، کیا حقیقت ہے کچھ نہیں معلوم تھا مجھے، سارا ماحول کچھ دی بن کر رہ گیا تھا، کسی ایک بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کون کیا ہے

چار پانچ بوڑھوں کے ساتھ چنے میں ملبوس آیا تھا اور اس نے اپنی نشست سنبھال لی تھی، بوڑھے آپس میں کانٹا پھوسی کر رہے تھے۔ ابولس براہمیری جانب متوجہ نہیں ہوا، سب جہنم میں جا سیں مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف تقدیر کے فیصلوں کا انتظار کر رہی ہوں اور ہر فیصلہ مجھے بخوشی منظور ہوگا، ایسی زندگی سے کیا فائدہ جس میں ایک لمحے کا ادراک بھی نہ ہو، لعنت ہے ایسی زندگی پر، نہ جانے کون کون آتا رہا اور اس کے بعد انا تم سلاطیہ کو لایا گیا، اسے ایک قیدی کی حیثیت سے ہی لایا گیا تھا۔ اس وقت اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا اور وہ ویسی نظر آ رہی تھی جیسا میں نے اسے قید خانے میں دیکھا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے، خشک ہونٹ، بڑی شاندار اداکارہ ہے، یہ عورت بہر حال اپنے قید خانے میں پہنچ گئی ہوگی لیکن نہ جانے اس کا کیا کمیل ہے، اسے بھی میری ہی جیسی ایک جگہ پر کھڑا کر دیا گیا۔

اس کے بعد میں نے راعن عوس کو دیکھا، بہت سے لوگ اس کے جلو میں چل رہے تھے۔ وہ تخت زمرد پر بیٹھ گیا۔ ماحول پر گہرا سکوت طاری تھا۔ پھر ایک شخص نے کہا۔

”مقدمہ پیش کیا جائے۔“ دوسرے دو آدمیوں نے یہی الفاظ دہرائے تب ایک اور شخص کھڑا ہو گیا تو اس نے کہا۔

”مقدس راعن عوس، سالوس کے بیٹے، فرمانروائے مصر، عالم ارواح کے پرسکون ماحول میں کچھ مداخلت کاروں نے بھونچال پیدا کیا اور تاریخ کی بابا کی کاسب بن گئے۔ ہم سے ہزاروں سال بعد کے لوگ اپنے دور کی فانی قوت حاصل کر کے ہم میں آ شامل ہوئے اور ہمارے تقدس کو برباد کر دیا۔ ان میں ایک شخص علم میں آیا ہے کہ زمانہ جدید کا نام رکھتا ہے لیکن اسے ”مستقبل والا“ کے نام سے یاد کیا جائے گا.....!“ اس شخص نے ناقابل فہم قوتوں سے کام لے کر معصوم صفت انا تم سلاطیہ کو دروغ لایا اور اسے اپنے فریب

ہوا ہے، ایک ہولناک رات گزارنی پڑی، ایک لمحے کے لئے پکلیں جڑ نہیں پانی تھیں، بس مختلف خیالات دل کو پریشان کر رہے تھے، ہر شخص کا تصور دل میں آ رہا تھا، روشاں بھی حقیقتوں کی تلاش میں کم ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کم جنت، کہاں بھگتا پھر رہا ہوگا، سارے کے سارے جہنم میں جا سیں، ماں کا تصور ہی اب میری آنکھوں سے معدوم تھا، انا تم سلاطیہ یعنی طور پر میری ماں نہیں تھی اور اگر تھی تو درحقیقت ایسی ماں قاتل نفرت تھی، بس ایک ہاپ ہی رہ گیا تھا جس کے بارے میں جو الفاظ کہے گئے تھے وہ لرز رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

صبح ہوئی میرے سامنے بہت اچھا ناشتہ لایا گیا، سخت بھوک تھی جو پھل اس میں موجود تھے وہ کھا کر زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا اور پھر وہ وقت آ گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ پہرے دار سلاطیہ کے ساتھ آئے تھے۔ سلاطیہ اس سلسلے میں سب سے نمایاں کردار ادا کر رہی تھی۔ اس کے اشار پر پہرے دار مجھے لے کر چل پڑے۔ بیچ در بیچ راستے غلام گردشیں، سیرمیاں نہ جانے کیا کیا طے کرتی ہوئی تھیں ایک عظیم الشان دربار میں پہنچ گئی۔ بہت وسیع جگہ تھی، پہرے دار مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ عہدے دار اس تخت کے پاس موجود تھے جو ابھی خالی تھا۔ اس کے عقب میں قدیم مصری طرز تعمیر کے نمونے نظر آ رہے تھے۔ جانوروں اور انسانی جسموں کی تراش جنہیں ہیرے اور جواہرات سے آراستہ کیا گیا تھا، تخت جو دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، زمانہ قدیم اور میری نگاہوں کے سامنے تھا اور ایک عجیب و غریب سی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے ایک جگہ لاکر کھڑا کر دیا گیا، یہ جگہ بھی غالباً قیدیوں کے لئے بنائی گئی تھی۔ میں خاموشی سے پتھر کی مانند وہاں ایستادہ ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ تابوت لایا گیا جس میں ہارون دانش کا جسم موجود تھا۔ اس جسم کو پتھر کی ایک سل پر لٹا دیا گیا جو وہیں بنی ہوئی تھی۔ ایک ایک کر کے افراد آتے رہے۔ پھر میں نے ابولس براہا کو بھی دیکھا اپنی جیسی شکل و صورت کے

”تم سب جانتے ہو کہ وہ ٹھکست خوردہ کوس کے درمیان پروردہ ہے اور اسے علم ہے کہ بالآخر وہ بدترین سزا پائے گی۔ اس لئے اس پر توجہ نہ دو۔“

”تم اپنے جرم کا اعتراف کرتی ہو؟“ بوڑھے نے پھر کہا۔

”میں نے کہا تا کہ جن کی عقل ہی مشتبہ ہو میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتی۔“

سلاطیہ کا جرم سب کے سامنے ہے۔ اس کی بیٹی اس کی ہم شکل ہے اس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔“

”اس نے اپنے جرم کو بدترین کر لیا ہے۔“

”اسے واقعی بدترین سزا ملنی چاہئے۔“ بہت سے لوگوں نے رائے دی۔

”میں نے تمہیں احمق غلط نہ کہا تھا اور میں تم احمقوں کو نہ بتا دوں کہ مجھے سزا دینا تمہارے لئے ناممکن ہے میں محفوظ ہوں اور کچھ دیر کے بعد تم خود اپنی زبان سے احمق کہو گے۔“

”وہ کیسے.....؟“ کسی نے سوال کیا اور سلاطیہ نے کر خاموش ہوئی تب بوڑھے اناطوخ نے مجھ سے کہا۔

”لڑکی تم مستقبل سے تعلق رکھتی ہو۔“

”تمہارے سوالات واقعی احمقانہ ہیں۔ میرے بارے میں تمہاری دانش تمہیں کچھ نہیں بتاتی۔“ میرا جواب سن کر اناطوخ کے چہرے پر بوجھلہٹ کے آثار پھیل گئے۔ راعن عوس بولا۔

”ان دونوں سے کوئی مزید سوال نہ کیا جائے۔“

”معزز دانشور کیا کہتے ہیں؟“ اناطوخ نے بوڑھوں سے کہا۔ تب ایک بوڑھے شخص نے کہا۔

”ابولس براء، انا تم ابولس اور دوسرے دانشور کہتے ہیں کہ تاریخ میں مستقبل کے مداخلت کا راب بھی موجود ہیں اور ان کی تعداد ایک سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ سب اسی واقعے کی کڑیاں ہیں۔“

”وہ پوشیدہ کیوں ہیں؟“ راعن عوس طیش سے بولا۔

”وہ مستقبل کا علم لے کر آئے ہیں۔“

کے جال میں پھانس لیا۔ ان دونوں کا اشتراک پوشیدہ رہا یہاں تک کہ ان کی قربت نے ایک نئے وجود کا اضافہ کر دیا، یہ لڑکی سامنے موجود ہے۔ تاریخ کے اس بدترین جرم کا انکشاف ہونے پر اس مجرم نے انا تم سلاطیہ اور اپنی بیٹی کو لے کر فرار ہونے کی کوشش کی، لیکن محافظ سلاطیہ نے اپنا فرض پورا کیا اور ان کا نشان پالیا۔ بروقت نشان دی پر انا تم سلاطیہ اس کے ساتھ نہ جا سکی لیکن ”مستقبل والا“ اپنی بیٹی کو لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ سلاطیہ نے اسے گرفتار کر لیا تھا لیکن مستقبل کے کسی علم کی بنا پر وہ اپنا جسم قید خانے میں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ البتہ وہ اپنی بیٹی کو مجسم لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ محافظ سلاطیہ نے بھی وہی عمل کیا اور اس کے ساتھ میں چل پڑی۔ تب دیوتا سالوس نے فیصلہ کیا کہ سلاطیہ کو قید کر دیا جائے اور اسے اس کی ہوش مند بیٹی کے سامنے سزا دی جائے۔ سلاطیہ کی بیٹی موجود ہے۔ انا تم سلاطیہ موجود ہے اور بڑا فیصلہ کرنے والا راعن عوس موجود ہے۔“

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ راعن عوس نے اپنے قریب بیٹھے ایک بوڑھے کو مخاطب کیا۔

”اناطوخ، تین پورا مقدمہ سنا۔“

”عزل نفوت.....!“ بوڑھے نے کھڑے ہو کر گردن خم کی۔

”تمہارا علم تمہاری دانش..... مستند ہے کارروائی کا آغاز کرو۔“ بوڑھے نے کچھ توقف کیا پھر بولا۔

”مجھے راعن عوس کا حکم ملا ہے کہ کارروائی کا آغاز کروں۔ مجھے مصر کے ان تجربے کاروں کا تعاون حاصل ہے جو علم و دانش کا سمندر ہیں۔ ان کی مدد کے ساتھ میں اس کارروائی کا آغاز کرتا ہوں، میرا سوال انا تم سلاطیہ سے ہے۔“ انا تم سلاطیہ کیا تم اس اس نادانی کا اعتراف کرتی ہو؟“

”تم سب احمق ہو۔“ سلاطیہ پھرے ہوئے لہجے میں بولی اور سب اچھل پڑے، بے شمار آوازیں ابھریں جن میں ان الفاظ کی مذمت کی جارہی تھی، راعن عوس نے کہا۔

”اور ہم انہیں تلاش نہیں کر سکتے؟“

”ایسا ہی ہے۔۔۔۔۔“

”اب پھر فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہیں تلاش کر کے پیش کیا جائے!“ راعمن عوس نے کہا اور انا تم سلاطیہ تہذیب مار کرنس پڑی۔

”تیری بادشاہت نامکمل ہے راعمن عوس، تیرے دھرم کی قیام نہیں ہو سکتی۔“

”اجنبیوں کو پیش کیا جائے گا۔ گناہ گار کو اس کے جسم میں لایا جائے۔ اگر وہ اپنے جسم میں واپس نہ آئے تو ابھی اسی وقت اس کے جسم کو اس کو اس کی بیٹی کے جسم کے ساتھ آتش کدے میں ڈال دیا جائے۔“ راعمن عوس نے غضبناک لہجے میں کہا۔ تب ابوس براہانے کہا۔

”مستقبل کے اجنبی اپنے علم میں پوشیدہ ہیں۔ ان کی تلاش اس کے لئے نامکن ہے کہ وہ ستاروں کی نگاہوں سے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ہاں گناہ گار اجنبی کو یہ سزا دی جا سکتی ہے لیکن راعمن عوس فیصلہ تو نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ یہ گناہ سلاطیہ نے بھی کیا ہے جبکہ وہ اس سے منکر ہے۔“

”دربار فرعون کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ انا تم سلاطیہ اپنا گناہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ اس کے باوجود اس کا انکار دروغ گوئی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔“ انا طوخ نے کہا۔

”اجنبی اپنے جسم میں واپس آؤ تمہیں تقدیر کرنی ہوگی ورنہ تمہاری بیٹی کو سزا دینے میں دیر نہ کی جائے گی۔“

تب پھر کی سل پر پڑے ہوئے بدن میں جنبش ہوئی اور میں نے ہارون دانش کو اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ میرا دل ہل گیا تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پہلی بار اس تصویر کو مجسم دیکھ رہی تھی۔ جسے صرف تصویر کی صورت میں دیکھا تھا۔ یا پھر ایک ساکن وجود کی صورت میں۔

ہارون دانش اپنی جگہ سے اٹھے، کھڑے ہو گئے اور پھر انہوں نے میری طرف رخ کیا۔ اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔

”تیرے لئے مجھے ہزار بار موت قبول ہے،

نشا میں نے صرف یہ چاہا تھا کہ مجھے کامیابی حاصل ہو جائے۔“

”مجرم کو پایہ زنجیر کیا جائے۔“ انا طوخ نے غضبناک لہجے میں کہا اور سپاہی دوڑ پڑے، چند لمحے میں ہارون دانش کو طوق پہنا دیئے گئے۔ انا طوخ نے کہا۔

”تاریخ کے مجرم۔ کیا تو جواب دے گا، کیا تو تقدیر کرے گا کہ یہ تیری بیٹی ہے۔“

”ہاں۔ یہ میری جگر گوشہ ہے۔۔۔۔۔“ ہارون دانش نے کہا۔

”اس کی ماں کون ہے۔۔۔۔۔؟“ انا طوخ کے سوال پر ہارون دانش کی نگاہیں سلاطیہ کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے سلاطیہ کی آنکھوں میں غیظ و غضب کی بجلیاں ترپتے دیکھیں۔

”کیا یہ تیرا اور انا تم سلاطیہ کا اشتراک ہے۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔ ہم دونوں اس کے ماں باپ ہیں۔“

”جھوٹ بولتا ہے یہ نایکار۔ بہتان تراشتا ہے مجھ پر۔ آہ کاش میری پھوپھی اُردیدہ بھی یہاں ہوتی تو وہ دیکھتی کہ اصل مجرم کون ہے۔ میں اس شیطان کو بالکل نہیں جانتی۔ دیوتا آسمان کی قسم، تیرے ستاروں اور لافانی کہکشاں کی قسم، میں نے پہلی بار اس کی منہوس شکل دیکھی ہے۔ یہ جھوٹا ہے۔“

”سلاطیہ۔۔۔۔۔!“ ہارون دانش نے حیرانی سے کہا۔

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ پائے تھے کہ اچانک دربار میں غلغلہ مچ گیا۔ ہر شخص کھڑا ہو گیا اور راعمن عوس چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر وہ خود بھی چونک پڑا۔ میں نے اس کی آواز سنی۔

”آسمان کی قسم، یہ تو زرخ زبول ہے، اور اس کے ساتھ یہ کون لوگ ہیں۔“

ایک انتہائی بوڑھا شخص جس نے چند پہنا ہوا تھا اور اس کے بال روئی کے گالوں جیسے سفید تھے۔ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ راعمن عوس خود بھی کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔

”تقدیر ہو تمہاری۔ سورج کے بیٹے، تقدس ہو زرخ

ہیں۔ ہمارے جسم تو فنا ہو چکے ہیں۔“
 ”تم نے سنا سر جوڑ کر بیٹھنے والو۔“ اس بار زخ زبول نے شرمندہ نظر آنے والے بوڑھوں سے کہا۔
 ”بے وقوف۔ مستقبل والے اپنی حیات کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ ماضی میں وہ موجود نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے تمہارے عمل میں دخل نہ دیا۔ پھر تمہیں مستقبل میں مداخلت کا کیا حق ہے؟“
 ”اس نے ماضی کی ایک ہستی کو داغدار کر کے بھونچال پیدا کیا ہے۔“ اناطوخ بولا۔

”لعنت ہو تم پر۔ لعنت ہو تمہاری عقلوں پر ابھی تم نے کہا کہ یہ ہمارے جسم نہیں ماضی کی پرچھائیاں ہیں، کیا پرچھائیاں ٹھوس جسم رکھتی ہیں۔ جواب دو؟“
 ”نہیں عزل نفوت۔“

”پھر ایک گزری ہوئی روح نے وہ جسم کہاں سے پایا جو تولید کی قوت بھی رکھتا ہو اور مستقبل میں کسی سے دل بھی لگا سکتا ہو۔۔۔۔۔!“

دربار میں عجب سا شور ابھرنے لگا۔ راعن عوس خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا اور بوڑھا اناطوخ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اناطوخ سلاطیہ کے چہرے پر سکون نظر آنے لگا۔ بمشکل اناطوخ نے کہا۔

”لیکن ایسا ہوا ہے مقدس زخ زبول۔“

”شرم کر اناطوخ، سرزمین مصر پر بے شمار حکومتیں قائم ہوئیں۔ تم نے ہکوں کو مصر سے بھاگ کر دوبارہ حکومت حاصل کی لیکن بعد کے ادوار تم سے دوبارہ چھن گئے۔ جانے ہو کیوں؟ اس لئے کہ تم بے عقل تھے۔ تم حکومت کے قابل نہ تھے۔ مجھے بتانا طوخ ایسا کیسے ہوا۔“

”یہ میں نہیں جانتا زخ زبول۔“

”قابل رحم بے عقل۔ جو گزر گیا اس میں تحریف ممکن نہیں کیونکہ وہ تاریخ ہے۔ تاریخ پر جھوٹ ضرور بولا جاسکتا ہے لیکن جو جاچکا اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔“

”تو پھر یہ سب کیا ہے زخ زبول۔ اناطوخ سلاطیہ کی ہم شکل لڑکی، قیدی، وجود۔“

زبول کی تقدیس ہو سورج کے بیٹے کی۔“ راعن عوس ہی نہیں دوسرے درباری بھی مودب تھے اور سب کے چہرے پر سنسنی چھائی ہوئی تھی۔ ہر نشست چھوڑ دی گئی تھی۔ بوڑھا راعن عوس کے تخت پر جا کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے ساتھ جن دو افراد کو دیکھا تھا ان میں ایک روشاق تھا اور دوسری سامیہ۔ وہی جسم، وہی لباس، وہی نقاب اور نقاب کے عقب سے جھانکتی ہوئی وہی آنکھیں۔ میں ایک بار پھر حیرت سے نگاہ رکھی تھی۔ میں نے سامیہ کی صورت دیکھی تھی۔ اچھی طرح دیکھا تھا میں نے کہ وہ اناطوخ سلاطیہ ہے اور اناطوخ سلاطیہ باپ زنجیر سامنے موجود تھی۔ پھر یہ سامیہ کون ہے؟ میرا دماغ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ دیوانوں کی طرح یہ تماشا دیکھتی رہی۔ بوڑھے نے جسے زخ زبول کہہ کر پکارا گیا تھا، تخت کے پاس کھڑے ہو کر رخ بدلا۔ سب بادب کھڑے ہوئے تھے۔

”بیٹھ جاؤ، میرے پیارو، تمہاری عقلوں پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے اور تمہاری معصومیت پر حیرت ہوتی ہے۔ بہت بڑے مقدمے کی سماعت کر رہے ہو تم لوگ۔ بیوقوفو! کیا تمہیں اس کی اجازت ہے۔ راعن عوس، اور اس کے اہم مشیر، اناطوخ اور تم سب۔ کیا تمہیں اس مقدمے کی اجازت ہے۔ اناطوخ تو بتا۔“

”دیوانہ زخ زبول، میں کچھ سمجھ نہیں۔“

”سورج دیوتا، یا دوسرے معبودوں نے تمہیں اجازت دی ہے کہ موت کی پرسکون آغوش میں پہنچنے کے بعد تم ایسے مقدمات پیدا کرو، کیا تمہیں اس کا حق حاصل ہے؟“

”عزل نفوت، مستقبل کے بدکاروں نے ہماری پرسکون زندگی کو منتشر کیا ہے۔“ اناطوخ نے کہا۔

”کیا موت کے بعد تمہارے اختیارات جاری رہتے ہیں۔ کیا تم اپنی روجوں کو جسوں کے لباس میں لپیٹ میں کر یہ تمام عمل کرنے کے مجاز ہو۔ تم گزر چکے ہو، اور جب تمہیں حیات کی قوت حاصل تھی تو تم نے عمل کیا۔ کیا تمہیں یہ جسم متحرک کرنے کا حکم ہے؟“
 ”عزل نفوت۔ یہ تو ہمارے ماضی کی پرچھائیاں

سزا

رسول اللہ کے زمانے میں ایک صاحب عبداللہ نامی تھے جنہیں لوگ ”حمار“ کہا کرتے تھے اور وہ حضور کو ہنسایا کرتے تھے۔ صاحب معراج انہیں شراب نوشی کے جرم میں کوڑوں کی سزائیں دے چکے تھے۔ اس کے بعد ایک روز پھر وہ رسول اکرم کے زمانے میں اسی جرم میں پیش ہوئے اس روز بھی رسول اللہ کے حکم سے ان کے کوڑے پڑے اس پر ایک شخص بول اٹھے۔

”خدا کی لعنت ہو عبداللہ پر کتنی بار شراب پینے پر پٹ چکا ہے۔“

شہنشاہ کو نین نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ نہیں اس پر لعنت نہ کرو، خدا گواہ ہے کہ میں نے تو اسے اللہ و رسول سے محبت رکھنے والا ہی پایا ہے۔“

(انتخاب: شہر یار خان۔ کچھرو)

رہا، پھر مجھے موجودہ دور کے اس شخص نے جگایا اور جب مجھے علم ہوا کہ دور سیت اور اناتم سلاطیہ کا وقت گزر چکا ہے تو میں سخت غمزہ ہو گیا میرے علم نے مجھے بتایا کہ میں ماضی میں داخل ہو سکتا ہوں اور سلاطیہ کو پانے کا ایک عمل کر سکتا ہوں لیکن میں نے خود کو جگانے والے اس شخص کو خلوص سے اپنی کہانی سنائی مگر اس بد فطرت انسان نے مجھ سے پہلے خود میرے علم سے فائدہ اٹھایا اور یہاں تک آ گیا۔“

”بس تیری داستان یہاں رک جانی چاہئے۔“
زخ زبول نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ پھر سامیہ کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

”اور اے عورت اب تو اپنے بارے میں بتا اور اپنا چہرہ عیاں کر دے۔“ تب سامیہ نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی اور میں نے حیرانی سے دیکھا وہ ہو، ہونا تم سلاطیہ کی ہم شکل تھی۔ درباریوں کے اندر

”یہ تمہارا گناہ ہے۔ تمہارا وہ جرم ہے جو تم نے اپنے اختیارات سے آگے قدم بڑھا کر کیا اور جس کے لئے تمہیں سزا مل سکتا ہوگی۔ تم نے ماضی میں جو کچھ کیا وہ تمہارا اختیار تھا۔ مستقبل والے مستقبل میں جو کچھ کر رہے ہیں انہیں اس کا حق حاصل ہے۔ ہم ان کے راستے کیوں روکیں جن سے ہمارا واسطہ نہیں ہے۔ جو مستقبل میں اپنی تاریخ کی ترتیب کر رہے ہیں۔ یہ آدمی.....“ زخ زبول نے ہارون والش کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

”مستقبل میں اپنے وقت میں اپنے عمل سے گزر رہا ہے۔ اس نے ہماری تاریخ پائی اور اپنے عظیم علم سے ہماری تاریخ میں داخل ہو گیا۔ وہ عورت۔“ اس بار زخ زبول نے سامیہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”وہ بھی مستقبل کی ایک محقق ہے۔ وہ اپنے طلسمی علم سے ماضی میں داخل ہوئی اور اس کے ساتھ ماضی میں داخل ہونے والا وہ تیسرا آدمی ہے۔“ زخ زبول کا اشارہ روشاق کی طرف تھا۔

”تم مستقبل کے ان ذہین انسانوں کو ان کے عمل سے گزرنے دیتے، تم نے ان پر اپنے اختیارات کیوں استعمال کئے۔“

”آہ۔ ہماری ناقص عقلیں ہمارا ساتھ نہیں دے پاریں، زخ بول۔“

”اس ناقصی کی سزا تمہارا مقدر ہے۔ اے شخص تو بتا تو کون ہے۔“ زخ بول نے روشاق سے کہا تو روشاق آگے بڑھ کر بولا۔

”میں ایمنی تراوزی ہوں۔ صدیوں پہلے مصر میں پیدا ہوا تھا۔ وہ دور سیت کے دور سے بہت پہلے کا دور تھا۔ اپنے علم سے میں نے مستقبل میں سیت کے دور کو دیکھا اور میرے علم کی روشنی نے مجھے اناتم سلاطیہ کا جمال دکھایا، میں اس پر فریفتہ ہو گیا اور میں نے ایک خاص علم سے اپنی زندگی کو دور سیت کے لئے وقف کر لیا کہ سلاطیہ کے دور میں جاگوں اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد کروں لیکن بد قسمتی سے

”میں متعین کردہ وقت سے بہت دیر تک سوتا

سے پھر مدہم آوازیں نکلیں لیکن کوئی زور سے کچھ نہ بولا۔ سامیہ نے کہا۔

”میں حال کے دور کی ایک محفّہ ”بصرہ“ ہوں۔ تعلق ملک یمن سے ہے، تاریخ مصر پر ریسرچ کرتے ہوئے ماضی کے پراسرار علوم میں بھی عبور حاصل کر رہی تھی اور ان میں کمال حاصل کرتی جا رہی تھی میں ایک خاص عمل سے ماضی میں داخل ہو کر تاریخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش مند تھی اور مجھے اس میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ دوریت میں، میں نے سالوس کی حکومت پائی اور اس کے لئے کام کرنے لگی۔ یہاں میں نے اناٹم سلاطیہ کو دیکھا، سالوس کی بیٹی حیران کن طور پر میری ہمشکل تھی۔ میرا قیام ایک مرغزار میں تھا اور وہاں میں اپنی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی کہ ایک رات چاند کی روشنی میں مجھے ہارون دانش نظر آیا، یہ میرے دور کا انسان اور مصری تاریخ کے حصول میں ایک مشہور محقق تھا۔ میں اسے نام سے جانتی تھی مجھے یہ نوجوان بہت بھایا، البتہ جب مجھے اس نے اپنی داستان سناتے ہوئے بتایا کہ وہ اناٹم سلاطیہ کے لئے یہاں آیا ہے تو مجھے دکھ ہوا۔

وہ مجھے سلاطیہ سمجھ رہا تھا چنانچہ میں نے خود کو سلاطیہ ظاہر کیا، تب اس سے میری قربت ہوگئی اور ہم مقدس آنتوں کے سائے میں ایک دوسرے کی زندگی کے شریک بن گئے، میں نے اسے بھی نہ بتایا کہ میں سلاطیہ نہیں ہوں ہمارے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام ہم نے اپنے دور کے مطابق فشار کھا، میرے شوہر نے یہاں سے نکلنے کی کوشش شروع کر دی وہ مجھے اور اپنی بیٹی کو یہاں سے لے کر نکل جانا چاہتے تھے۔ یہ مشکل کام نہیں تھا لیکن اچانک کھیل بدل گیا۔ مجھے جج اناٹم سلاطیہ سمجھ لیا گیا اور میرے بارے میں سالوس کو اطلاع دے دی گئی۔ سالوس نے فوری میری گرفتاری کے احکامات دے دیئے۔ سلاطیہ اس وقت اپنی پھوپھی اریدہ کے پاس تھی مجھے علم ہوا تو میں پریشان ہوئی اور میں نے حالات سنبھالنے کے لئے ایک تدبیر نکالی۔

میں روپوش ہوگئی اور سلاطیہ کو گرفتار کر لیا گیا میرا خیال تھا کہ میں خاموشی سے ہارون دانش کے ساتھ نکل جاؤں گی لیکن ہارون دانش کو سلاطیہ کی حیثیت سے میری گرفتاری کی خبر ملی تو وہ پریشان ہو گئے۔ حالانکہ گرفتار میں نہیں ہوئی سلاطیہ ہوئی تھی لیکن بے چارے ہارون دانش کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو کر ان کے جال میں گرفتار ہو گئے اس کے بعد یہ سب کچھ ہوا۔ قصور میرا تھا لیکن چونکہ ہارون دانش مجھے سلاطیہ سمجھ کر مجھ سے محبت کرتے تھے اس لئے مجھے معلوم تھا کہ کہیں حقیقت معلوم کر کے وہ مجھ سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ میں انہیں بے حد چاہتی تھی۔ بعد میں جب میں نے ساری تفصیل سنی تو سامیہ کی حیثیت سے یہاں ایک دیرانے میں رہنے لگی جو ابوس براہا کے معبد کے قریب تھا۔ یہ سب محبت کی خود غرضی کی کہانی ہے۔ جس میں مجبوری کے سوا اور کوئی تصور نہیں تھا۔“

☆.....☆.....☆

فضاء میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ تیز سنناٹ سے ماحول گونج اٹھا، ہر چیز ہلنے لگی اور پھر ایک دھواں سا بلند ہو گیا جس نے سارے ماحول کو گم کر دیا۔ ایک دم ہی سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں اپنی جگہ کھڑی تھی بصرہ اپنی جگہ، اور ہارون دانش اپنی جگہ، اس کے علاوہ ہر طرف پتھروں اور چٹانوں کے ڈھیر تھے۔ ہم سے چند گز کے فاصلے پر بے شمار اراموں کی چوٹیاں چٹانوں کی شکل میں جھانک رہی تھیں۔ بس اور کچھ نہیں تھا۔ ہارون دانش میری طرف بڑھے اور میرے قریب آ کر بولے۔

”نشا۔“

”جی۔“ میں نے سر دلچے میں کہا۔

”میری زندگی پر خوش نہیں ہو؟“

”میں نہیں جانتی ابو۔“

”سب کچھ تمہارے علم میں آ چکا ہے۔ کیا میں قصور وار ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بصرہ یہ تمہاری بیٹی ہے لیکن تمہاری حقیقت قبول کرنے

لیکن میں نے انہیں کلمہ پڑھانے کے بعد ان سے نکاح کیا تھا۔ ہم اس نکاح کی تجدید کر لیں گے۔“

”آپ امی سے تخلص ہیں ابو.....؟“ میں نے سوال کیا۔ ابوامی کو بغور دیکھتے گئے پھر بے اختیار مسکرا پڑے۔

”بمصرہ نے ایک عظیم طلسم توڑ دیا ہے۔ میں انہیں

زمانہ قدیم کی ایک روح سمجھ کر تاریخ کا ایک ناقابل یقین

تجربہ کر رہا تھا۔ جس کا انکشاف دنیا کے لئے اتنا حیرت

ناک ہوتا کہ لوگ سوچ سوچ کر پاگل ہو جائیں۔ لیکن وہ

سب کچھ غیر قدرتی تھا۔ قانون قدرت میں دخل اندازی

بہر حال ممکن نہیں ہے لیکن بمصرہ عظیم ہیں اس میں کچھ

شک نہیں کہ یہ مجھ سے بڑی محقق ہیں۔ یہ مجھ سے پہلے

تاریخ کے اس دور میں داخل ہو گئی تھیں۔ انہوں نے خود کو

ہمارے اتنے عرصہ کسی شے سے محفوظ رہ کر برقرار رکھا،

بہر حال یہ میری بیوی اور تمہاری ماں ہیں۔“

”آپ امی سے تخلص ہیں ابو۔“ میں نے اس

طویل جواب کو نظر انداز کر کے کہا۔

”ہاں..... اب ہوں۔“

”تھینک یو ابو۔“ تھینک یو دیری میچ..... میں نے

پرسرست لہجے میں کہا اور دونوں کے درمیان آ کر ان سے

لپٹ گئی۔ میری مسرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ خوشی سے دیوانی

ہو رہی تھی۔ ماں باپ دونوں مل گئے تھے مجھے جذبات

سے نجات ملی تو یہاں سے لٹکنی لگ رہی تھی اور ہم اس علاقے

کا جائزہ لینے لگے۔ پھر ایک سمت اختیار کر کے چل پڑے۔

کچھ دیر کے بعد میں نے کوہ ارماس دیکھا۔ اسی پہاڑی

آریدہ نے مجھے مصر کے بدلے ہوئے اور ادا کیا۔

میں نے ابوکواس ہارے میں بتایا تو وہ ہلے۔

”یہ صدیوں پرانی بات ہے۔ اب نہ جانے اس

علاقے کا کیا نام ہوگا۔ بہر حال ہمیں پیدل ہی سفر کرنا

ہے۔ دیکھیں یہ سفر کتنا طویل ہوتا ہے۔“

☆.....☆.....☆

بعد کی داستان صرف اس جدوجہد کی داستان ہے جو ہمیں بغیر کسی ارادے کے مصر کے ایک بڑے شہر الحما منہ العمر لے گئی۔ یہاں سے ہم نے اپنے وطن

کے بعد شاید میں تمہیں قبول نہ کر سکوں۔“
بمصرہ نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، میرا دل بے قرار ہو گیا، میں آگے بڑھی اور مصرہ سے لپٹ گئی۔ وہ بلک بلک کر رو پڑی اس نے کہا۔

”میں محبت کا شکار ہو گئی تھی میری بے پناہ چاہت نے مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔“

”میں جانتی ہوں امی، مجھے علم ہے۔ لیکن ابو خود غرض ہیں۔ انہیں اپنی حقیقت اور اپنی زندگی پیاری ہے اور کچھ نہیں۔“

”نہیں، یہ غلط ہے نشا۔“

”یہ سچ ہے ابو۔ ٹھیک ہے آپ اپنی کتابوں کے اوراق کا سفر کیجیے، کئی کتابیں اور لکھ ڈالنے میں اپنی ماں کے ساتھ خوش ہوں۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“

”جو کچھ میں نے کہا بالکل صاف ہے۔ میں آپ کے بجائے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پسند کروں گی۔“

”نشا۔“

”جی ابو، کیا آپ مجھ پر پابندی لگانے کا حق رکھتے ہیں۔“

”لیکن نشا..... میری بیٹی..... میں اب سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔“

”ابو، بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں، آپ کے بارے میں، بہت سے احساسات ہیں میرے دل میں، آپ نے مشکل ترین لمحوں میں مجھے اکیلا چھوڑا ہے۔ آپ نے مجھے کبھی تحفظ نہیں دیا۔ اب میں اپنی ماں کے ساتھ جینا چاہتی ہوں اور یقین کریں ہم جی لیں گے۔“

”بمصرہ بھی ہمارے ساتھ رہیں گی نشا۔“ ہارون دانش نے ہتھیار ڈال دیئے، اور میں ایک دم کھل گئی لیکن

میں نے خود کو سنجال کر کہا۔

”کس حیثیت سے ابو.....؟“

”وہ۔ وہ میری بیوی نہیں، حالانکہ اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ یمن کی بادشاہ ہیں۔ مسلمان ہیں

پھر ایک دن یہ درد اور سوا ہو گیا جب ایک شائیک سینٹر میں مشل سے ملاقات ہوئی وہ خود میرے پاس آ گئی۔
”ہیلو، کہاں ہو بھئی۔“

”یہیں ہوں، تم سناؤ کیا حال ہے؟“
”بہترین۔ شادی کر لی ہے میں نے.....!“ اس نے کہا اور میرے دل پر ایک گھونسا سا پڑا۔
”اوہ مجھے نہیں بلایا تم نے شادی میں۔ عسکری تو

ٹھیک ہیں؟“
”تمہیں ان کے بارے میں نہیں معلوم۔“
”کیا.....؟“

”وہ دماغی اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ مصر سے واپسی کے بعد ان کی حالت ٹھیک نہیں رہی اب تو میں کافی دن سے اسپتال بھی نہیں گئی۔ اس وقت ایک قبول صورت شخص وہاں پہنچ گیا۔ مشل نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”یہ عمران ہیں۔ میرے شوہر۔ عمران یہ میری دوست نشاد دانش ہیں۔“

یہ رات میرے لئے بڑی کٹھن تھی۔ بہت سے خیالات آتے رہتے تھے اور دوسری صبح میں نے فون پر اسپتال کے بارے میں تفصیل پوچھی پھر اسپتال جا پہنچی تھی۔ عسکری بہت کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ بہت دیر تک مجھ پر نگاہیں جمائے رہا۔ پھر بے یقینی کے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

تو میری داستان کے ہمراہیو..... مختصر یہ کہ اب میں شادی شدہ ہوں۔ عسکری میرے بہت اچھے شوہر ہیں۔ امی اور ابو مصر کے بیٹے ادھیڑ نے میں مصروف ہیں۔ راوی عیش لکھتا ہے اور ہاں آپ بھولے نہ ہوں گے کہ انکل رو شاق مجھے ایک فن دے گئے تھے۔ زاویوں میں روپوش ہونے کا فن۔ وہ آج بھی مجھے آتا ہے۔ لیکن اس کے استعمال کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔ شاید آہی جائے تو پھر خدا حافظ۔
(ایم اے راحت کی آئندہ ماہی سلسلے وار کہانی پڑھیں)

واپسی کے انتظامات کئے۔ حالانکہ ہماری پوزیشن بے حد خراب تھی، لیکن بہر حال ابو کی سرپرستی تھی اور وہ بڑی صفات کے مالک تھے۔ انہوں نے مسعود احقری کا سہارا حاصل کیا جو مصر کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ چنانچہ ہم قاہرہ آ گئے۔ مصر کی پراسرار سرزمین کا منبع جہاں میں نے انوکھے لمحات گزاریے تھے۔ تمام انتظامات احقری نے کئے تھے۔ اور جب جہاز نے قاہرہ کی زمین چھوڑی تو مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں ایک عظیم مہم جو ہوں جو کسی خزانے کی تلاش میں نکلی تھی۔ اور وہ عظیم الشان خزانے لے کر واپس جا رہی ہوں۔ ماں اور باپ دونوں تھے اس سے بڑا خزانہ کیا ہو سکتا تھا۔

ہم اپنے وطن پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ سے گھر پہنچے۔ ہمارے ملازم واقعی وفا شعار تھے۔ کوئی جوں کی توں تھی۔ سارے ملازم بھونچکے رہ گئے تھے۔ امی نے شادی کے بائیس سال کے بعد پہلی بار اپنا گھر دیکھا تھا۔ مجھے جس قدر مسرت تھی اس سے کبھی کبھی میں خود نڈھال ہو جاتی تھی۔

میری کوشش تھی کہ ماضی بھول جاؤں، روزانہ صبح اٹھ کر ماں باپ کو دیکھتی کہ کہیں یہ صرف خواب نہ ہو اور جب یہ خواب حقیقت کی شکل میں نظر آتا تو میرا دل رواں سرور ہو جاتا تھا۔ ابو نے سنبھالا لے کر اپنے اثاثوں پر توجہ دی۔ تب مجھے علم ہوا کہ انکل کے ہمدانی واپس آ گئے ہیں۔ وہ معذور بے شک ہو گئے تھے۔ لیکن ذہنی طور پر بالکل درست تھے۔ سسز صوفیہ بدستور انہیں اسسٹ کر رہی تھیں۔ وہ جب میرے سامنے آئیں تو بہت شرمندہ تھیں۔

”دیکھ لیجئے سسٹر میں اپنے امی ابو کو لے آئی۔“
”صرف مبارکباد نہایت ہلکا لفظ ہے۔ اللہ تمہیں تمہاری خوشیاں راس لائے۔“

”ہمارے ڈاکٹر صاحب کا کیا حال ہے.....؟“
”بالکل ٹھیک ہیں۔“ سسز صوفیہ نے کہا۔
اس رات مجھے عسکری بہت یاد آیا تھا اور میں نے اپنے دل میں اس کے لئے عجیب سا درد محسوس کیا تھا۔



ثبوت

عمران قریشی - کوئٹہ

وہ بہت دل گردے کا مالک تھا مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس پر نقاھت طاری ہوتی رہی اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے بھی قابل نہیں تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کام تمام ہو گیا۔

کسی کے دماغ میں اپنی بات ڈالنا مشکل ہی نہیں بلکہ جان جو کھوں کا کام ہے۔ ثبوت کہانی میں ہے

کیس جیمبر کی سزا سنادی گئی تھی۔ مجرم کا نام لینور تھا۔ اس نے اپنے گھرے دوست کو صرف اس لئے قتل کر دیا تھا کیونکہ ہ لینور کا قرض کافی عرصے سے دبائے بیٹھا تھا اور مرنے سے پہلے دینے سے صاف انکاری ہو گیا تھا۔ لینور بلند پریشور کا مریض تھا۔ غصے پر قابو نہیں پاسکا۔ اس لئے ڈنڈے کے ذریعے اس کے سر کو بھاڑ بیٹھا۔ اس کے دوست کی موت موقع پر ہی

میرا نام فیکری ہے۔ ڈاکٹر فیکری..... میں مردوں کی حادثاتی اموات پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ میرے خیال کے مطابق مرنے کے بعد بعض وجوہات کی بنا پر انسانوں میں چند لمحات کے لئے جان موجود رہتی ہے۔ میں ان چند لمحات کی وجوہات پر تحقیق کے لئے ایک ایسے قیدی کے پاس گیا۔ جو سزائے موت کی سزا کا مستحق قرار دے دیا گیا تھا اور جسے دوسرے دن

”اچھا تو تم کوئی دوسرے پادری ہو۔؟“ میں نے سر کو جھٹک کر کہا۔

”میں پادری نہیں ہوں۔ بلکہ تمہارے لئے اس وقت ایسا قابل عمل منصوبہ لایا ہوں جسے تم زیادہ توجہ سے سننا پسند کرو گے۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اور تمہیں صبح ملنے والی سزائے موت کے متعلق تم سے بات چیت کرنے آیا ہوں۔ تمہارے کچھ کام آ سکتا ہوں۔“

لینور پر میری اس تقریر کا جیسے کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے لئے کچھ بہتر کر سکتے ہو؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

پھر بولا۔ ”کوئی میرے لئے کیا کر سکتا ہے۔؟“

”لیکن میں کر سکتا ہوں۔“ میں نے پھر دعویٰ کیا۔

”جہنم میں جاؤ۔ تم اور تمہاری مدد۔۔۔۔۔“ وہ بے زار ہو کر بیڑا یا۔

میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ کہا۔ ”میں تمہارے لئے وہ کچھ کر سکتا ہوں جس کے بارے میں تم نے سوچا بھی نہ ہوگا۔“ میں نے اس کی دھکتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تمہارے تین بچے ہیں۔“

”ہاں ہیں۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔“ اس کی نگاہوں میں تھوڑا سا اشتیاق نظر آیا۔

”جب تم کل اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے تو وہ یتیم ہو جائیں گے میں نے اس سلسلے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ تمہارا کوئی بہن بھائی یا رشتہ دار ان کی کفالت اور نگرانی کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ لینور کے چہرے پر مایوسی نظر آ رہی تھی۔

”اگر میں تمہارے لئے کچھ کر دیا جائے گا۔“

واقع ہو گئی۔ لینور کو گرفتار کر لیا گیا، اس پر مقدمہ چلا اور اسے سزائے موت کا حقدار قرار دے دیا گیا۔

ڈاکٹر فیکری چند لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ جب سامنے بیٹھے ہوئے رپورٹر نے سوال کیا: ”آپ کی ریسرچ کے مطابق مرنے والے انسانوں میں چند لحظات کے لئے زندگی کا وجود باقی رہتا ہے۔ اور آپ نے اسی ریسرچ کی تکمیل کے لئے جیل میں موجود گیس چیمبر کی موت پانے والے قیدی کے ساتھ مختصر معاہدے کا آغاز کیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسا بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔“

ڈاکٹر فیکری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ایسا میری تحقیق کردہ ریسرچ کی فائل میں موجود ہے۔ جسے میں اپنے ہمراہ لے کر آیا ہوں۔ آپ کو پڑھانا مقصود نہیں ہے۔ میں اس کے متعلق آپ کو خود بتاؤں گا۔ آپ اسے تحریری صورت دے کر اپنے اخبار میں چھاپ سکتے ہیں۔“ رپورٹر نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے سامنے رکھا ہوا بین اور کاغذ اٹھایا اور لکھنے کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گیا ڈاکٹر فیکری نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولنا شروع کیا۔

”میں نے جیل گورنر سے ملاقات کے دوران جب قیدی لینور سے ملنے کی اجازت مانگی۔ تب مجھے بتایا گیا کہ مجرم لینور بہت خطرناک آدمی ہے اور کسی بھی بات پر مشتعل ہو کر مجھ پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی ہدایت کی گئی کہ مجرم سے قدرے فاصلے پر رہ کر بات کروں۔ اور اپنی سہارے والی چھڑی پر ہاتھ کی گرفت کو مضبوط رکھوں اگر وہ کسی وقت مجھ سے پانچ دس قدم سے زیادہ نزدیک آنا چاہے یا پھر حملہ آور ہونے کے بارے میں سوچے تو بلا تکلف یہ چھڑی اپنے دفاع کے لئے استعمال کروں۔ حتیٰ کہ محافظ میری مدد کو بھیج جائے۔ یہ سب کچھ سمجھا کر مجھے لینور کی کونھری میں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ جو نبی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ لینور بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کسی ملاقاتی سے نہ ملنے کی خواہش جیسے تاثرات ابھرے۔ وہ تھوڑی بہل ڈال کر لہا۔

خوشخبری شرف مشتری

انشاء اللہ تعالیٰ مال و دولت کا ستارہ مشتری 12 سال کے طویل عرصہ کے بعد اپنے دامن میں لاکھوں خوشیاں لے کر 1 سے 7 ستمبر تک شرف میں آیا تھا۔ یہ ایک وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم انعام ہے۔ مشتری مال و دولت، مالی وسعت اور خوش نصیبی کا ستارہ ہے۔ اسے ہر 12 سال بعد شرف ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص مالی لحاظ سے انتہائی بد قسمت ہو، ہمیشہ فکر و افسان میں رہتا ہو، مدقوں سے قرض میں گرفتار ہو، ہر مسئلے میں رکاوٹ ہو، لائبرری کا انعام تو مدت سے نہ لگتا ہو، اپنے پرانے دشمن بن گئے ہوں، دن رات کا سکون تباہ ہو، ہر کاروبار میں نقصان ہوتا ہو۔

وہ حضرات نیند سے جاگیں اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے یہ لوح ضرور حاصل کریں، یہ وقت 12 سال کے بعد آتا ہے خدا جانے اگلے 12 سال کس کو نصیب ہوں اپنے چھوٹے بڑے بچوں کے لئے ضرور بتا کر رکھ دو تاکہ ان کی قسمت بھی اچھی رہے دنیا کا وہ بڑا خوش قسمت انسان ہوگا جس کے پاس یہ لوح ہوگی اس کا خوش بختی کا دروازہ کھلا رہے گا۔ بذریعہ لائبرری یا مالی باڈر یا تجارت سے رقم برسات کی طرح برقی رہے گی۔ مگر بہت غرضی میں بدل جائے گی۔ اس لوح کی برکت سے اچھے گھر میں شادی بھی ہو سکتی ہے۔ بے اولاد اجڑے ہوئے گھر آباد ہو جائے گا۔ اولاد زینہ ہوگی وہ صالح و خوش بخت ہوگی۔ اس لوح کو رکھنے سے زندگی پرواز کرتی ہے۔ دشمن غالب نہیں آ سکتا۔ سلی کلاطم قسم ہو جائے گا۔ لوح مشتری رکھنے سے انشاء اللہ تعالیٰ دولت دروہہ اس طرح کھج کر چلا آتا ہے۔ جیسے مقام میں کی طرف لوہا۔ دولت مشتری پر عاشق ہوتی ہے۔ اس لوح کو رکھنے سے مدقوں کے قرض سے چھکارا مل جاتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے غنیمت امداد ملتی رہے گی اور زندگی سکون سے بسر ہوگی۔ بچوں کی شادی میں رکاوٹ ہے ان لڑکیوں کا رشتہ ضرور اچھے گھرانے میں ہوگا۔ خدا را ہماری التجا ہے۔ 12 سال کے بعد وقت ملا ہے اس سے ضرور فائدہ حاصل کریں۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان ہے سو برس کا ہل کی خبر نہیں
ہمارے پاس کچھ لوح موجود ہیں آپ حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کا مددگار: **صوفی علی مراد**

0333-3092826-0333-2327650

محرمیوں کی زندگی بسر کریں گے۔ تم جاننے ہو کہ یتیم خانوں کا ماحول کیسا ہوتا ہے۔ وہاں بچے کی طرح کے نفسیاتی اور جسمانی عوارضات کا شکار ہو کر نکلتے ہیں۔ ایسے بچے بڑے ہو کر مشکل ہی سے معزز اور مفید شہری بن سکتے ہیں۔ اور تمہارے بچوں کے ساتھ تو یتیمی ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کی زندگی میں یہ اضافی المیہ بھی ہوگا کہ وہ ایک مجرم اور سزائے موت پانے والے باپ کی اولاد ہیں۔ معاشرے میں کوئی انہیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ اور وہ کبھی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔“ میں نے لینور کو ایک جذباتی حوالے سے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

”تو پھر میں کیا کروں۔ میں کبھی کیا سکتا ہوں۔“ لینور نے بظاہر سپاٹ لہجہ میں کہا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں غمی کی ہلکی سی تہہ میں نے محسوس کر لی تھی۔

”میں اولاد کے خواہش مند ایک خوشحال جوڑے کو جانتا ہوں جو تمہارے بچوں کو گود لینے کے لئے رضا مند ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی بہت روشن خیال اور انسان دوست ہیں۔ اور نظر پئے پر قطعی یقین نہیں رکھتے۔ کہ بدی سے تعلق موثری حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اچھی تربیت اور ماحول کسی بھی شخص کو اچھا بنانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں کسی مجرم کے بچے کو گود لیتے ہوئے کوئی عار نہیں۔ یہ رہا ان کی طرف سے رضا مندی کا بیان۔“ میں ہاتھ میں موجود لفافے میں سے کاغذ کو باہر نکال کر اسے دکھا لیکن لینور نے کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ چند ٹاپے کچھ سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

”بدلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا، کیا چاہتے ہو تم؟“

”تم میری ریسرچ میں میری مدد کر سکتے ہو، میں آج کل انسان کے اعصابی نظام کا مطالعہ اور مشاہدہ کر رہا ہوں۔ یہ میری اس تحقیق کا حصہ ہے۔ جو میں اپنی یونیورسٹی کی طرف سے مکمل کر رہا ہوں۔ یہ

سوافر اوزندہ وٲن کر دیئے جاتے ہیں۔

ادھر میوٲن میں نئے مردوں کو بالکل سیدھی لائوں میں دفنا گیا اور اسی ترتیب سے ایک ری کے ذریعے ان کا رابطہ قبرستان کے محافظوں کے کمروں سے قائم کیا گیا۔ ان رسیوں کے سروں پر گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جو مردے کی معمولی سی جنبش سے بج سکتی تھیں۔ پھر ایسا کئی بار ہوا کہ کوئی نہ کوئی گھنٹی دفنا فوٲا بجتی ہی رہی۔

اس تمام رات محافظوں کی نیند خراب ہوتی رہی۔ ”ڈاکٹر فیکری اپنی تحقیق سے متعلق بات کرتے ہوئے یہ بالکل بھول گیا کہ وہ ایک عام آدمی سے نہیں قیدی سے بات چیت کر رہا ہے۔ اب وہ بالکل نارمل انداز میں برابری کی سطح پر لیٹور سے گفتگو کر رہا تھا یہ ایسا موضوع تھا جو اس کا اپنا تھا۔ اور جس پر وہ گھنٹوں بات چیت کر سکتا تھا۔ بحر حال لیٹور ہمہ تن گوش تھا۔ فیکری نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے کئی اخباروں میں پڑھا اور سنا ہوگا کہ بعض مشہور شخصیتیں تدفین سے کچھ دیر پہلے جی اٹھیں۔ شہرت یافتہ شاعر فرانسس میراج اس وقت لگن میں اٹھ کر بیٹھ گیا جب اسے تابوت میں ڈالا جانے لگا تھا یونانی قد امت پسند ہشپ اس وقت جی اٹھا جب لوگ اس کا آخری دیدار کر رہے تھے اور تو اور ایک مردہ شخص اس وقت درد سے چیختا چلاتا اٹھ کھڑا ہوا جب اس کی نعش کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لئے چیر پھاڑی جانے لگی۔ اس کیس نے تمام ڈاکٹروں کو حیرت میں ڈال دیا لیکن چرچ کے کرتادھرتا مقدس حکام نے اس کو بدروح قرار دے کر دوبارہ موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اتفاق دیکھو خود اس پادری کو بھی کچھ عرصہ بعد ڈاکٹروں نے مردہ قرار دے دیا اور ٹھیک اسی طرح عمل جراحی کے دوران میں وہ ہوش میں آ کر اٹھ کھڑا ہوا پوسٹ مارٹم کے وقت عمل جراحی کی تکلیف سے بہت سے اور مردے بھی اسی طرح جی اٹھے۔ بلکہ باقاعدہ ریکارڈ کے مطابق جارمین اور کورین عہد میں تقریباً

ایک بہت بڑا تخلیقی منصوبہ ہے جسے یونیورسٹی کے ذریعے فریج میڈیکل کونسل نے شروع کیا ہے میں تمہیں ریسرچ کے متعلق کچھ بتاتا ہوں۔“ میں چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا۔ پھر دوبارہ مخاطب ہوا۔

”ہم دراصل زندگی اور موت کے درمیانی عرصے کا ٹھیک تعین کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایک ایسا اصولی ضابطہ یا فارمولا وضع کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے تحت کسی بھی شخص کو مردہ قرار دینے سے پہلے ہر ڈاکٹر پر لازم ہوگا کہ وہ اس پر سب مجوزہ ٹیسٹ آزمائے۔ جب موت کا شوقیلیٹ جاری کرے۔ ہمارا خیال ہے کہ مردہ قرار دی جانے والی بہت سی نعشوں میں بظاہر زندگی کی توانائی ختم دکھائی دیتی ہے۔ مگر دراصل ان میں زندگی کی رتق باقی ہوتی ہے کیونکہ مرنے والے افراد کی شیوا اور ناخن بدستور بڑھتے ہوئے نوٹ کئے گئے ہیں ہم یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حقیقی موت کی طرف بڑھتی ہوئی اس نیم مردہ حالت اور سکتے میں کیا فرق ہے۔“

لیٹور اب توجہ کے ساتھ میری بات سن رہا تھا۔ وہ بخ لہجے میں بولا۔ ”موت سے پہلے وٲن ہونے سے کیا مطلب ہے آپ کا.....؟“

”اکثر ایسا ہوا کہ کسی شخص کو سرکاری طور پر ڈاکٹروں نے مردہ قرار دے دیا لیکن وہ اچانک ہی جی اٹھا کچھ سال پہلے پیرس میں کی جانے والی ایک تحقیق میں یہ حقائق سامنے آئے کہ لوگوں نے جب نئی قبریں بنانے کے لئے قبرستانوں کی پرانی زمینوں کو کھودا تو جو بوسیدہ تابوت برآمد ہوئے ان سے نکلنے والے ہر پانچ سو انسانی ڈھانچوں میں سے ایک اس حالت میں پایا گیا کہ اس کے گھٹنے سینے سے لگے ہوئے تھے جیسے وہ تابوت کا ڈھلکا اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے مر گیا ہو۔ لہذا کم از کم پانچ سو میں سے ایک فرد ایسا بد نصیب ضرور تھا۔ جسے موت سے پہلے قبر کے حوالے کر دیا گیا۔ برطانیہ میں بھی ایسے ہی ایک سروے کے نتائج سے ظاہر ہوا کہ انگلستان اور ویلز میں ہر سال تقریباً دو ہزار سات

بارہ واقعات ایسے ہوئے کہ لوگوں کو مردہ قرار دے کر دفن دیا گیا لیکن جرائم پیشہ افراد نے ان کی نعشیں نکال کر میڈیکل اسٹوڈنٹ کے ہاتھوں فرخت کر دیں اور عین ڈاکیشن ٹیبل پر وہ افراد درد سے بلبلا تے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

قبروں سے شورا اور مختلف آوازیں سننے کی کہانیاں تو تم نے مختلف لوگوں کی زبانی سنی ہوں گی۔ مگر بد قسمتی کا شکار ایسا شخص شاید ہی قبر سے نکلنے میں کامیاب ہو سکتا ہوگا۔ کسی قانونی ضرورت کے تحت مقتول تابوت دوبارہ کھول کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ تابوت کھولنے کی کوشش میں ناکامی پر مرنے والے نے اپنا کفن پھاڑ ڈالا منہ نوج لیا۔ خود کو دانتوں سے کاٹ کاٹ کر بن آئی موت کا مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن افسوس اس کی رہائی نہ ہو سکی۔ وہ کس بے کسی کی موت مرا۔ اس کا اندازہ آ زاد رضا میں سانس لینے والا ہر شخص کر سکتا ہے یہاں تک بھی ہوا کہ ایک امریکن لڑکی نے تابوت میں بچے کو جنم دیا۔

لیکن موت دونوں کا مقدر بن گئی۔ بعد میں کسی قانونی ضرورت کے تحت جب تابوت کھولا گیا تو لڑکی کی دونوں منہیاں بچتی ہوئی تھیں اور تخلیق کا کرب اس نے چہرے پر ابدی نقوش چھوڑ گیا تھا۔

نومولود کفن کے اندر ہی اپنی زندگی کی پہلی
اور آخری سانسیں پوری کر چکا تھا۔

لینور نے اس کریناک منظر کشی پر بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ اور گلا صاف کرنے کے بہانے ڈاکٹر فیکری کو ٹوکا۔ اسے آنے والے دن کے روٹکنے کھڑے کر دینے والے لمحات یاد آنے لگے۔

”اودھ معاف کیجیے گا مسٹر لینور میں اپنے موضوع کے بارے میں بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ اوریہ بھول گیا تھا کہ میں ایک ایسے مجرم کے سامنے موجود ہوں جسے دوسرے دن سزائے موت کی سزا سنائی گئی ہے۔“

لینور نے بازو کی آستین سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا پھر بظاہر لا رو اسی کے ساتھ بولا۔ ”زندگی

کی بہت سی ناگوار حقیقتوں کا سامنا تو کرنا ہی ہوتا ہے
ڈاکٹر.....؟ اور میرے پاس اس کے علاوہ چارہ کار بھی
نہیں ہے۔“

ڈاکٹر فیکری خاموش ہو گیا۔ اور سامنے بیٹھے ہوئے اخبار کے رپورٹر مکمل انہماک کے ساتھ اس کی ریسرچ کی تفصیلات سننے میں مصروف تھے۔ اس کے خاموش ہونے پر بے چینی کے ساتھ اپنی کرسیوں پر پہلو بدلنے لگے۔ ڈاکٹر فیکری نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد گفتگو کا آغاز کیا۔

”ہاں تو میں آپ رپورٹر حضرات کو یہ بات سمجھانا چاہ رہا تھا کہ بے چارہ ڈاکٹر اس معاملے میں بعض اوقات بالکل بے بس ہو جاتا ہے کہ طبعی اصول و ضوابط کے مطابق ایک انسان بالکل مردہ ہو چکا ہوتا ہے، لیکن کون جانے وہ ابھی زندہ ہو اور زندگی اور موت کا فاصلہ ابھی طے نہ کر پایا ہو یہی وہ نقطہ نظر تھا جس پر قائل کر کے میں نے ذیل لکھ کر سے سزائے موت کے قہری لہندہ ملاقات کی اجازت طلب کی تاکہ ہم ہاں میں اس کے لئے جھوڑنے کے بعد لکھا گیا کہ اس کے بعد وہ زندہ ہیں نہ کہ مرے۔ اگرچہ یہ سب محال ہے۔ لیکن یہی ہے کہ ہم اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔“

آئیے۔ ایک رپورٹر نے یہ سچ بھی میں ہوا۔

”ہاں میں واپس لینور سے ملاقات کی طرف آتا ہوں۔ قصہ مختصر یہ کہ میں لینور کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے اور اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔“ آدمی ذہین تھا اس لئے فوراً سمجھ گیا کہ میں اس کے بچوں کے تحفظ کے بدلے میں کیا چاہتا ہوں بہر حال چند لمبے خاموشی کے ساتھ سوتے کے بعد وہ بولا۔

”میں سمجھ گیا ہوں تم اس وقت میری موت کا
نظارہ کرنا چاہتے ہو جب کل یہ لوگ مجھے گیس چیمبر کے

ذریعے ماریں گے۔“

”ہاں.....“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”تو گویا تم مجھے تڑپتے ہوئے دیکھنا چاہتے

ہو۔“ وہ اس دفعہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

مجھے غصہ آ گیا۔ ”معاف کرنا لیور اب کی دفعہ تم

مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میرا یہ کام انسان کی بھلائی کے لئے

ہے، محض تفریح و طبع کے لئے نہیں، اور نہ میرا یہ مقصد ہے

جو تم سمجھ رہے ہو اور اگر میرا کوئی مقصد ہے بھی تو تم بھول

رہے ہو کہ میں بدلے میں تم کو کتنا بڑا معاوضہ فراہم کر رہا

ہوں تمہارے بچوں کا تحفظ.....“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... زیادہ ناراض

ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی بات کو آگے بڑھاؤ۔ میں

سن رہا ہوں۔“ لیور نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”شکریہ۔“ میں نے آہستگی کے ساتھ کہا۔

اور اسے سمجھانے لگا۔ ”تقریباً تمیں برس پہلے بھی ایک

ڈاکٹر شاپائیرو نے ٹھیک یہی کچھ کیا تھا۔ جو میں کر رہا ہوں

اس نے بھی تمہارے جیسے ایک قیدی سے بالکل ایسا ہی

معاہدہ کیا تھا جیسا میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ میں

ایسا کرنا چاہتا ہوں اس میں انسانیت کی بھلائی ہے۔

ڈاکٹر شاپائیرو یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ گلوٹین کے ذریعے

انسان کا سرتن سے جدا ہونے کے بعد بھی کم از کم

سر ضرور ہوش و حواس میں اور زندہ ہوتا ہے میں اپنے اس

پیشرو ڈاکٹر کا تجربہ دوہرا نا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے

ساتھ یہ بھی نوٹ کروں گا۔ کہ گیس چیمبر سے موت

پانے کے بعد انسانی جسم میں کتنی دیر تک زندگی کی

خصوص برقی لہریں موجود رہتی ہیں۔ اس کے لئے کچھ

برقی آلات استعمال کروں گا۔“

ایک لمبی سی ہونہہ کر کے لیور کتنی ہی دیر تک مجھے

بغور دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”ڈاکٹر کیا تمہارا خیال ہے کہ زہریلی گیس کی

موت کے بعد بھی جان باقی رہ سکتی ہے۔“

”یقیناً بات کچھ ایسی ہے۔ میں تمہیں چند

مثالیں دے چکا ہوں اور میں جس ڈاکٹر کا ذکر کچھ

دیر پہلے کر چکا ہوں اس نے ثابت کیا کہ گردن کٹنے کے

بعد بھی کچھ دیر تک کھوپڑی زندہ ہی نہیں رہتی بلکہ وہ

آپ کی بات سنتی اور سمجھتی بھی ہے۔ ڈاکٹر شاپائیرو کی

کھوپڑی نے کٹ جانے کے پانچ منٹ بعد اس کی

بات کا جواب خاص انداز سے آنکھیں جھپکا کر دیا تھا۔

انقلاب فرانس کے دوران لکھی گئی رپورٹوں کے مطابق

جلادوں کو سزائے موت کے پندرہ منٹ بعد بھی کئی

سر زندہ ملے۔ کئی قیدیوں کو سزائے موت دینے کے بعد

جب گلوٹین کا نوکرا کٹے ہوئے سروں سے بھر جاتا اور وہ

اگلے قیدیوں کو لانے کے لئے اسے خالی کرنے آتے۔

تو انہیں بیک وقت کئی سرخون میں تھڑے حرکت کرتے

آپس میں الجھتے بڑبڑاتے اور دانت پیستے ملتے۔“

لیور کی آنکھیں غصے سے لال چلی ہو گئیں اور وہ

اٹھ کھڑا ہوا اس کے تنہے پھڑکنے لگے اور وہ مٹھیاں بھینچتے

ہوئے بڑبڑایا۔ ”اذیت پسند جانور..... ذلیل.....

میں..... میں تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔“

میں نے فوراً اپنی چھڑی پر گرفت مضبوط کر لی۔

اور اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”دیکھو لیور! میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں

تمہاری اذیت کو کم کر دوں گا بس میں جو کچھ کہوں تم وہ

کرو۔ اور اگر اپنی زندگی کا کوئی ثبوت دے دو۔ تو اس

کے بعد میں فوراً ایک باریک سلاخ کھوپڑی میں

اتار کر تمہاری مشکل کو آسان کر دوں گا۔ میں تمہیں

پینتالیس سیکنڈ سے زیادہ تکلیف میں نہیں رہنے دوں

گا اس طرح تمہارے بچے بھی ہر قسم کی تکالیف سے

آزاد ہو جائیں گے۔“

اس اثناء میں بھرا ہوا لیور بجلی کی سی تیزی سے

لپکا۔ اور میز کے نیچے جانے کس جگہ چھپائی ہوئی لوہے

کی ایک باریک سلاخ نکال لایا اور بھوکے بھیڑیے کی

طرح میری طرف بڑھا۔

”اوہ میرے خدا! اگر میں گرنہ جاتا تو وہ میری

کھوپڑی میں سلاخ بھونک چکا ہوتا۔ اس کا دار خالی

گیا۔ لیکن وہ پھر پلٹا اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔

اور وہ شعلہ بارانظر میں مجھ پر گاڑے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 ”ذرا ٹھہرو شیطان ڈاکٹر! میں یہ سلاخ
 تمہاری کھوپڑی میں اتار کر دیکھتا ہوں کہ تم کتنی
 دیر میں مرتے ہو۔“

میری ٹی گم ہو گئی اور میں چاہنے کے باوجود بھی
 چلا نہ سکا لیور نے آگے بڑھ کر میرے سینے پر پاؤں
 رکھا۔ اور میری آنکھوں کے درمیان ماتھے کا نشانہ باندھ
 کر سلاخ میرے قریب لانے لگا۔ اچانک میں نے
 دماغ میں اپنی چھڑی ہوا میں لہرائی جسے اس نے اس زور
 سے لات ماری کہ وہ دروازے سے ٹکراتی ہوئی فرش
 پر گر گئی اسی وقت محافظ کو بلانے کا خیال کوندے کی طرح
 میرے ذہن میں لپکا اور میں زور زور سے مدد کے لئے
 چلانے لگا۔

لیور کی توجہ چند ثانیے کے لئے دروازے کی
 طرف ہوئی یہ وقفہ محافظوں کے پہنچ جانے کے لئے کافی
 تھا۔ آن کی آن میں سلاخ محافظوں نے اسے قابو میں
 کر لیا اور میں نے فرش سے اٹختے ہوئے خدا کا
 شکر ادا کیا۔ لیکن دروازے سے باہر نکلتے ہوئے
 میں نے اپنی پیش کش ایک بار پھر دوہرا دی۔ اور
 بلند آواز سے کہا۔

”لیور اچھی طرح سوچ لو..... سودا مہنگا
 نہیں ہے۔ ایک چھوٹے سے تجربے کے بدلے
 تمہارے بچوں کا مستقبل خوشحال ہو سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر
 میں محافظوں کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا
 ہوں گا کہ لیور کی آواز نے میرے قدم روک لئے بند
 دروازے کے پیچھے سے اس کی پٹھنی ہوئی بلند آواز
 آرہی تھی۔

”ڈاکٹر مجھے تمہارا سودا منظور ہے۔ میں تمہیں
 زندگی کا ثبوت دوں گا اور آہستہ آہستہ اس کی آواز
 ہچکیوں میں ڈوب گئی۔ اور یوں مجھے اگلے دن اس کی
 سزائے موت کے وقت مشاہدے اور تجربے کی
 اجازت مل گئی۔“

”تو کیا اس نے آپ کو وہ ثبوت دے

دیا۔“ ایک رپورٹر نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔
 ”ہاں.....“ ڈاکٹر نے مختصر سا جواب دے
 کر ان کے تجسس کو ہوا دی۔ دوسرا رپورٹر بے چین لہجے
 میں بولا۔

”ڈاکٹر آپ تفصیل سے بتائیے کہ اس کے بعد
 کیا ہوا۔“ ڈاکٹر فیکری نے پھر کہنا شروع کیا۔

”اگلے روز مقررہ وقت پر جب میں لیور کے
 پاس پہنچا تو محافظ اسے سزائے موت کے کمرے میں
 لا رہے تھے۔ ارد گرد کی پیرکوں اور کونھریوں میں سے آہ
 و بکا کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور اس کے سامنے اسے
 الوداع کہہ رہے تھے۔ لیور کو دو محافظوں نے دائیں
 بائیں سے پکڑ رکھا تھا۔ اور وہ بے جان زرد چہرے کے
 ساتھ گرتے پڑتے آگے بڑھ رہا تھا گیس چیمبر والے
 کمرے میں پہنچنے کے بعد ایک لمحہ ضائع کے بغیر اس کی
 زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا کیونکہ تمام انتظامات پہلے سے
 مکمل تھے۔“

”پھر کیا ہوا؟“ ایک رپورٹر نے بے تابی سے
 سانس روک کر پوچھا۔

”اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔“ فیکری نے آہستگی
 سے جواب دیا۔ ”اور مجھے مطلوبہ ثبوت دے دیا۔“

”کیا ثبوت.....“ دوسرے رپورٹر نے جس کا
 اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا۔ تھوک
 نکلنے ہوئے پوچھا۔

”یہ رہا ثبوت.....“ ڈاکٹر فیکری نے اپنا ہالیاں
 ہاتھ آگے کر دیا۔

”یہ تو زخمی ہے شاید کٹ گیا ہے۔“ رپورٹر حیرت
 بھرے لہجے میں بولا۔

”اسے غور سے دیکھئے.....“ فیکری نے اپنا ہاتھ
 دونوں کے آگے بڑھا دیا دونوں رپورٹروں نے پھر پٹھنی
 پٹھنی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ہاتھ
 پر انسانی دانتوں کے نشان نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔



یکے بعد دیگرے کئی مزدور موت سے ہمکنار ہو گئے اور انہیں دفن کر دیا گیا مگر یہ کیا وہ مرے ہوئے سارے مزدور رات کے وقت ایک مقررہ وقت پر کھیتوں میں کام کرتے نظر آنے لگے کہ پھر اچانک.....

حقیقت سے چشم پوشی اور اندھا اعتماد انسان کو زندہ درگور کر دیتا ہے، ثبوت کہانی میں ہے

اپنی زمینوں پر کروں گا تو کیا کچھ نہیں لے گا، اور یوں سب کچھ چھوڑ کر گاؤں چلا آیا۔ میرا ایک ساتھی ڈاکٹر تھا۔ جو کہ افریقہ اور تانزانیہ سے تھا۔ وہ پاکستان میں کسی خاص ریسرچ پر آ رہا تھا۔ وہ میرا جگر کی دوست بن چکا تھا۔ وہ بھی میرا گاؤں دیکھنے کے لئے میرے ساتھ ہی آ گیا۔

کام تو سخت تھا۔ مگر محنت اور لگن کی وجہ سے پہلی فصل نہایت ہی شاندار ہوئی، میرے دوست اسمتھ ورکل کو نہ جانے کون سی بات یہاں پر پسند آئی کہ اس نے مجھ سے درخواست کر کے میری حویلی میں رہنے کی بات کی۔ مجھے تو پہلے بہت عجیب لگا۔ مگر اس میں میرا ہی فائدہ تھا۔ ایک بے بھلے دو! اور پھر وہ تھا بھی بڑے کام کا آدمی۔ پہلے ہی فصل کو تیار کرنے میں دن رات اس نے بھی محنت کی تھی۔ دن بھر جتنی دوپہر میں ہوائی کرائی تھی۔ اور رات کو جب میں ٹھکنے سے ٹھہرا ہوا ہو کر سو جاتا تو وہ ساری رات کھیتوں میں پانی لگواتا۔

مجھے اسمتھ پر کل اعتماد تھا۔ اس لئے سارا حساب کتاب اس کے ہاتھوں میں وے دیا۔ نوکروں کی تنخواہیں، آبیانہ، فصلانہ سب اسی نے سنبھال لیا۔

کاشت کاری کے لئے اس کا شوق جنون بننا چاہا تھا۔ وہ باہر کا تھا۔ باہر کے طور طریقے جانتا تھا۔ وہ نئے

مچھروں نے زندگی عذاب کر دی ہے، جی چاہتا ہے ایک ایک کو مسل ڈالوں، پاگل تھا میں جو اپنی اچھی بھلی زندگی چھوڑ کر اس بیابان میں آ گیا، جب مجھ سے دو بڑے بھائی اس زمین کو سنبھال نہ سکے تو مجھے اپنی میڈیکل کی ڈگری کو آگ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا نام احمد حسین ہے اور میں دیپال پور کا رہائشی ہوں۔ ہمارا خاندان سالوں سے تعلیم یافتہ اور جاگیر دار خاندان چلا آ رہا ہے۔ میرے بڑے دونوں بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور غیر ممالک میں سیٹ ہیں۔ اب یہ دیپال پور کی ساری جاگیر میری ہے، چونکہ دونوں بھائیوں نے زمینداری سے انکار کیا اور باہر رہائش اختیار کر لی۔ پھر میں نے سوچا چونکہ بابا جان کی اسی علاقے میں کئی مربع زمین تھی۔ جو کہ بے مقصد فالتو پڑی تھی۔ اور اسی زمین میں ہماری خاندانی، بدروس پہلے بنائی حویلی بھی شان و شوکت سے کھڑی تھی۔ بابا جان کے گزرنے کے بعد دونوں بھائیوں نے کاشت کاری اور حویلی سنبھالنے سے انکار کیا اور یوں بابا کے ہالیوڈ کے بعد امریکہ چلے گئے۔

میں ایک پرائیویٹ اسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ کام بہت زیادہ تھا اور تنخواہ کم، اس لئے سوچا کہ اگر اتنی محنت



میں گری تو میں نے سر پانی سے نکالا۔ پانی کی سطح پر نیلے رنگ کا دوپٹہ تیر رہا تھا۔ کہ اچانک بدحواسی کے عالم میں ایک نسوانی وجود پانی کی سطح پر برآمد ہوا۔ اس کے چہرے کو بالوں نے چھپا ہوا تھا۔ لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال پشت پر ہٹائے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر دل میں گھٹنیاں سی بجنے لگیں۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ اینیلہ تھی۔ میرے دل کی دھڑکن میرے خوابوں کی رانی، وہ اس وقت مکمل طور پر بھیگی ہوئی تھی۔ اور اس حالت میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ میں نے اپنے دونوں مضبوط ہاتھوں میں اسے اٹھایا اور پانی میں چلتا ہوا نہر کے کنارے پر اسے کھڑا کر دیا۔ وہ میری بانہوں میں آ کے شرم سے سرخ ہو گئی تھی۔

”تم پانی میں گری کیسے؟“ میں نے بے اختیار ہوا کر پوچھا۔

اس کی سبیلی بھی ہل کے اوپر کھڑی تھی۔ اس کا نام نازنین تھا۔ اس نے بتایا کہ اینیلہ سے اس کی شرط مل گئی تھی کہ ہل کے پار یک جنگلے پر کوئی بھی نہیں چل سکتا ہے۔ مگر اینیلہ بضد تھی کہ ”نہیں میں ہل کے جنگلے پر چل کر دکھاؤں گی۔“ اور اسی ضد کی وجہ سے اینیلہ نہر میں گر گئی۔ نازنین کی بات سن کر میں نے بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا

طریقوں پر کام کر رہا تھا۔ اور نوکروں سے بھی نئے طریقوں سے کام لے رہا تھا۔

نئی تہذیبیں پرانی تہذیبوں کو نگل لیتی ہیں۔ نیا آدمی پرانے آدمی کو کھا جاتا ہے۔ اسی طرح جدید طریقے سے کئے گئے کام نے میری ساری زمینوں کو ہرا بھرا کر دیا۔ میری حویلی کی رونقیں بحال ہو گئیں۔

حویلی کے قریب ایک لڑکی اینیلہ رہتی تھی جو کہ چوہدری زمان الدین کی بیٹی تھی۔ چوہدری ہمارے قریبی عزیز تھے مگر بہت سالوں کی دوری کی وجہ سے ہم لوگ جیسے ایک دوسرے کو بھول گئے تھے۔ اینیلہ اکثر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں میں گھومتی رہتی، اینیلہ کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔ اس کے کھنے سیاہ چمکدار لمبے بال، خوب صورت لمبا اونچا چتر کی طرح قد اور تھی۔ گول چہرہ، بھرے بھرے گال، سرخ و گلابی ہونٹ اور کھڑی ناک کی وجہ سے وہ ساری لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔

ایک دن گری کی وجہ سے میں گاؤں کے نہر میں نہا رہا تھا۔ میں نے نہر کے ٹھنڈے اور شفاف پانی میں غوطہ لگایا۔ اور تیرتا ہوا بڑے ہل کے نیچے سے گزرنے لگا۔ اچانک نہر کے ہل پر سے کوئی شے دھڑام سے نہر

انداز تھا۔ اس کے کالے چہرے پر سفید موتیوں کی طرح دانت مجھے بہت بھانک دکھائی دیئے۔ ایسا لگا جیسے اس وقت اسمتھ کوئی ڈر نکولا ہو۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد حبیب بیمار رہنے لگا اور اس کی بیماری اتنی بڑھی کہ ایک دن وہ مر گیا۔ میں نے اس کی آخری رسومات میں شرکت کی اور اس کے گھر والوں کو تسلی، حوصلے اور صبر کی تلقین کی، میرے دوست اسمتھ ورکل نے اس کی آخری رسومات میں شریک نہ ہوا۔ البتہ اس کے خاندان والوں کو تسلی دینے میں پیش پیش رہا۔

گرمی کا موسم تھا، کھیت کھلیاں ہرے بھرے تھے، خربوزوں اور تربوزوں کا موسم آیا۔ تو گاؤں میں ایک بھانک افواہ گردش کرنے لگی۔ کہ رات کو حبیب کی روح کھیتوں میں پھرتی ہے اور کھیتوں میں ایک عام انسان کی طرح کام کرتی ہے۔ اس افواہ کو سن کر ہم دونوں بہت ہنسے۔ ایک رات ہم دونوں ایک خوفناک فلم دیکھ رہے تھے کہ حویلی کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑانے لگا۔ ایسے لگا جیسے دروازے پر کوئی کے اور لاتیں مار رہا ہو۔ میں اٹھ کر گیا اور دروازہ کھولا، سامنے ہمارا خاندانی ملازم بد بخش کھڑا تھا۔ وہ اتنا گھبرا ہوا تھا کہ اس کے پورے کپڑے پسینے سے تر تھے۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ”اس نے ابھی ابھی حبیب کو کھیتوں میں پانی لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔“ اس بات پر میں ہنسے لگا۔ ”یار بدخشو تو کیا پاگل ہو گیا ہے۔ اسے تو میں نے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا ہے۔ وہ کیسے زندہ ہو سکتا ہے؟“

”میں اس کے زندہ ہونے کی بات کب کر رہا ہوں۔ صاحب وہ اس روح کی طرح ہے جو مر کر بھی چین سے نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی کھیتوں میں کام کرتی ہے۔“ وہ یقین اور بڑے وثوق سے بولا۔

”پتہ نہیں کب ورکل میرے پیچھے دروازے پر آیا۔ اور بدخشو کی بات سن کر بولا۔ ”اچھا بڑی سختی روح ہے جو مر کر بھی کام کرتی ہے۔“

تو انیل انار کی طرح سرخ ہو گئی۔ وہ جیسے ہوئے کپڑوں کے ساتھ نازنین کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ کچھ دیر تک میں نہر میں نہا تا رہا۔ اس کے بعد میں بھی اپنے گھر آ گیا۔

سارا کام میرے دوست، اسمتھ ورکل نے سنبھال رکھا تھا۔ میں دن بدن مرغن غذائیں، مکھن دودھ ملائی اور اچھی خوراک کی وجہ سے مست ہو رہا تھا۔ جبکہ سارا سارا دن میں دوستوں سے گپیں ہانکتا رہتا۔ پیسے کی فراوانی اور آرام و سکون کی وجہ سے بے فکری کی زندگی گزار رہا تھا۔ یا پھر سارا دن انٹرنیٹ پر غیر ملکی دوستوں سے کپ شپ کرتا رہتا۔ ان دنوں میری زندگی بہت مزے میں گزر رہی تھی۔

ہمارا ایک نوکر تھا۔ جس کا نام حبیب تھا۔ وہ تقریباً 20 سال کا خوب رو جوان تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور نو جوان تھا۔ حویلی کے باہر کے کام منٹوں میں کر لیا کرتا تھا۔ میں نے حبیب کو کبھی نوکر یعنی ملازم نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ ہمیشہ سے اسے ایک دوست سمجھا تھا۔ حبیب بہت محنتی، جفاکش، ایماندار اور بہت نیک دل تھا۔ پتہ نہیں کہاں سے اس کے دماغ میں کیونز کم کا کیزا سا گیا اور وہ میرے دوست اسمتھ ورکل کی برابری کرنے لگا۔

جس جگہ ورکل کام کرتا حبیب وہاں پہنچ جاتا۔ جہاں پر اسمتھ بیٹھتا۔ حبیب اس کی کرسی پر پہلے سے براجمان ہوتا۔ اگرچہ حبیب نے بھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی تھی۔ مگر اب وہ اسمتھ کی طرح تھری پیس بلیک وٹ میں محوم پھر رہا ہوتا۔ جس برانڈ کی سگریٹ اسمتھ دیتا۔ اسی برانڈ کی سگریٹ حبیب کی جیب سے برآمد ہوتی۔ بات اتنی بڑھی کہ اسمتھ نے اپنا کاؤ بوائے ہیٹ اٹار کر اتار کر رکھا۔ تو حبیب نے جھٹ وہی ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔

میں نے اسمتھ کی طرف دیکھا۔ کیونکہ یہ بات مجھے اچانک ہی لگی تھی۔

”اے ہرے پرکشی تم کے تاثرات نہیں تھے، وہ لکھنؤ، نہ حیرت، نہ پریشانی، بالکل پتھر لہ سا

ہیرا سائیکولوجی کی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہو۔ پر وہ خطرناک بیماری ہے۔ جس میں انسان کو فریب نظر میں جو کچھ نظر آتا ہے۔ وہ اسے حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ اسی بیماری میں انسانوں کو مرے ہوئے لوگ نظر آنے لگتے ہیں۔ مجھے تو تم سب لوگ اسی بیماری کا شکار لگتے ہو۔ یہ آوازیں یہ مرے لوگ ان کی رو میں سب کچھ تمہارا وہم ہے۔“

میں اس کی بات سن کر چپ رہ گیا۔ مگر گاؤں والے ان فرسودہ خیالات سے کب متفق تھے، وہ ہنوز اڑے ہوئے تھے۔

گرمی میں بدستور اضافہ ہوا تھا۔ وہ برسات کی جس زدہ رات تھی، بادلوں نے آسمان کو گھیر رکھا تھا۔ میری آنکھ، کسی کھٹکے سے کھل گئی، جس بے حد زیادہ تھا۔ بجلی بھی لگی ہوئی تھی۔ مینڈکوں اور حشرات الارض کی آوازیں اندھیرے میں بڑی بھیا تک گونج رہی تھیں، اوپر سے مچھروں کی بھن بھن جینا عذاب کر رہا تھا۔ اچانک بادل بکھرتا شروع ہو گئے، کچھ ہی دیر میں مطلع صاف ہونے لگا۔ رات کی گھپ تاریکی میں تاروں کی ہلکی اور دم ہم چاند کی روشنی میں، میں نے باہر کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میرا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی سے میرے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔

نیم ہلکی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ کھیتوں میں سائے کام کر رہے ہیں۔ وہ ہولے چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے، میں اٹھ کر کمرے کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ یہ میرا وہم نہیں تھا۔ واقعی کھیتوں میں کچھ لوگ کام کر رہے تھے۔

کھیتوں میں دھان کی بوائی کا موسم تھا۔ حبیب کو مرے ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے مگر اس وقت وہ میرے سامنے تھا۔ ہاں بالکل وہ کپڑے، وہی انداز وہی قد کاٹھ، وہی بالکل حبیب تھا۔ وہ میکا کی انداز میں ایک ایک پودا پانی سے بھرے کھیت میں لگوار ہا تھا۔ ”حبیب۔“ میں پوری قوت سے چلایا۔ مگر جیسے اس کو میری آواز سنانی نہیں دی۔ میں دوبارہ چلایا۔ مگر ایسا لگتا

میں نے بھی اسے نالنے کی کوشش کی۔ مگر بخشو ایک ہی بات کی ضد لگائے ہوئے تھا۔ ”صاحب جی آپ چل کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔“ اچانک اسمتھ بیچ کر بولا۔ ”جاؤ دفع ہو جاؤ۔ اگر روح ہے بھی تو ہم کیا کریں گے۔“ اور اس نے اسے باہر دھکیل کر دھڑام سے دروازہ بند کر دیا۔ اسمتھ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اگر اس طرح بی ہو کرو گے تو بیچارے سارے نوکر کام چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، کام کون کرے گا؟“

میں نے ناراضگی سے اسے ٹوکا۔

”سب کچھ ہوگا۔ کوئی کام نہیں رکے گا۔ پیسے بھی ملیں گے، کام بھی چلے گا، چاہے تمہارے یہ سب نوکر چھوڑ کر چلے جائیں۔ اسمتھ بیچ کر بولنے لگا۔ میں اسے جب کروانا چاہتا تھا مگر اس کا تاثر اتنا سرد تھا کہ میں آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

خیر ذریعہ دو ہفتے ہی بشکل گزرے ہوں گے کہ ہمارے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور بیٹے کا شکار ہو کر مر کھپ گئے، پورے گاؤں میں کہرام برپا ہو گیا۔ چھ مزدور بیک وقت مر گئے۔ اب کام کا کیا ہوگا، میں پریشان ہو گیا۔ خان بہادر واحد شخص تھا جو کہ ڈرائیونگ میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ سارا دن کھیتوں میں ٹریکٹر چلاتا تھا۔ اس کے مرنے پر میں بے حد دکھی تھا۔ مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ ٹریکٹر چلا سکوں اور وہ بھی جلتی دوپہر میں! ان ہی خدشات کا اظہار میں نے اسمتھ سے کر دیا تو اسمتھ نے بے فکری سے کندھے اچکائے جیسے کچھ بھی نہیں ہوا ہو۔

اور واقعی کام ہوتا رہا۔ راتوں رات ٹریکٹر چلنے کی آوازیں سنانی دیتیں۔ اس کے علاوہ کھیتوں میں پانی دینے کی آوازیں بھی سنانی دیتی تھیں۔ صبح جب دیکھا جاتا تو کھیتوں میں پانی بھر پور ملتا اور سارے کھیت جتے ہوتے تھے۔

جب میں نے اور گاؤں کے لوگوں نے ان واقعات پر دھیان دینا شروع کر دیا تو اسمتھ نے ہنس کر کہا۔ ”یار میرے خیال میں تم سب لوگ ”بیولی نیشن“

تھا کہ جیسے وہ گونگا بہرا ہو۔

کر رہا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ سب محنت میں اپنے ایک دوست کے لئے کر رہا ہوں۔ وہ سب میری بات سن کر بڑے حیران ہوئے۔ انہیں کیا پتہ بھلا! کہ ہم دوستی میں جان دیتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ کیوں احرار ٹھیک ہے ناں!“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ میں بظاہر تو مطمئن ہو گیا۔ مگر میں اندر سے شدید خوفزدہ تھا۔ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں شکاریوں جیسی چمک میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ اس کے سامنے میں خاموش رہ جاتا تھا۔

ایک دن میں نے اسمتھ کو خوشگوار موڈ میں دیکھا۔ تو کہنے سے باز نہ آیا۔ ”اسمتھ ایسا لگ رہا ہے کہ کچھ ہو رہا ہے۔ بلکہ حقیقت میں کچھ برا ہو رہا ہے۔ میں نہیں کہہ رہا۔ مگر میرا دل گواہی دے رہا ہے۔“

میری بات سن کر وہ ہنسنے لگا۔ ”یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ تم فوراً کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرو۔“ اور میں خاموش رہ گیا۔

اگلے دن بڑا ہنگامہ خیرات ہوا۔ ”شبیر جو کئی دنوں سے پراسرار بیماری میں مبتلا تھا۔ وہ بھی مر گیا۔“ شبیر کی بیماری کسی بھی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے میں نے اسے پراسرار بیماری کا نام دیا۔ گاؤں کے اکثر نوجوان بیمار ہو گئے تھے۔

خیر شبیر کی تدفین سے جب ہم فارغ ہوئے، تب مجھے یاد آیا، میری کلائی میں بندھی گھڑی شاید قبرستان میں گر گئی تھی، گھڑی کے لئے میں دوبارہ قبرستان جانے لگا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی ہر چیز کو جھلسا رہی تھی۔ ہر چیز جھلسی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

”انہی پریشانیوں کی وجہ سے میں اپنی محبت انیلہ کو بھی بھلا چکا تھا۔ کئی عرصے سے میں نے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ مگر میرے دل میں انیلہ رچ بس چکی تھی۔ اچانک میں نے اس جلتی دوپہری میں انیلہ کو دیکھا۔ اسے دیکھ کر میں کھل اٹھا۔

”انیلہ تم یہاں! اس دوپہر میں کیا کر رہی ہو؟“

”حبیب میں ہوں احرار، تم بولتے کیوں نہیں؟ میری بات کا جواب دو۔“ اس بار میں پوری قوت سے چلایا پھر اچانک رات کی تاریکی میں ڈھول پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ڈھول کی آوازیں کھیتوں میں کام کرنے والے سائے چمک اٹھے، اور میکا کی انداز میں کھیتوں سے باہر نکلے، اب ان کا رخ قبرستان کی جانب تھا۔ میں نے جلدی سے جوتے پہن لئے اور ان کے پیچھے بھاگا، میں جیسے صدر دروازے تک پہنچا، اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھول کر باہر نکلتا اسمتھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اسمتھ تم! تم جاگ رہے ہو۔۔۔۔۔ وہ حبیب!“

”ہاں آج یقیناً تم نے پھر حبیب کو دیکھا ہوگا! کام کرتے ہوئے، کیوں ٹھیک ہے ناں۔“ وہ سر داور مٹھکے خیر انداز میں بولا۔

”نہیں اسمتھ، حبیب کے ساتھ کچھ اور سائے بھی تھے! وہ سب مختلف کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔“

”احرار میرا خیال ہے۔ تم میرا احسان مانتے ہی نہیں، اس لئے یہ روح کا چکر چلا رہے ہو۔ میں تمہاری خاطر ساری ساری رات کام کرتا ہوں۔ اور تم سارا کریڈٹ ان روحوں کو دے رہے ہو۔ یہ دیکھو۔۔۔۔۔“ اس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں اس کے پیروں پر ٹخنوں تک کیچڑ لگی ہوئی تھی۔ ”ارے بھی حیران مت ہو، وہ میں ہی تھا۔ تم مجھے حبیب سمجھ کر چلانے لگے، اس لئے میں گھرا گیا۔ اور میں نے تمہیں اس لئے جواب نہیں دیا کہ تم ڈر جاؤ، اور تم واقعی میں ڈر گئے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

اس کے سیاہ چہرے چمکتے سفید دانت بے حد نمایاں لگ رہے تھے۔ ”مگر سنو تو۔“ میں نے اس کی بات رد کرنی چاہی۔

”یار کم آن، تم بھی جاہلوں کی طرح بولنے لگے ہو۔ معلوم ہے کل یہاں پراگیا بیکچر ڈارمنٹ والے آ رہے تھے، ان کو بڑی بجس تھی کہ میں یہاں پر کیا

اسمٹھ سنجیدگی سے بولا۔

”شیر؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں!“ وہ شیر کے قریب گیا اور اس کے قدموں

میں جھکا، اسمٹھ نے سر اٹھایا، جب وہ دوبارہ ہماری طرف مڑا، تب اس کے ہاتھ میں عجیب الخلقت بلی کے سائز کا ایک جانور تھا۔ اسی لمحے شیر کی بے جان تجسس کی طرح زمین بوس ہو گیا۔

”یہ کیا ہے اسمٹھ؟“ میں نے حیرت سے اس عجیب الخلقت جانور کو دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں! اسے تمہاری زبان میں کانجیو یا پاجو کہا جاتا ہے۔ اس کے ناخن دیکھو، کتنے باریک اور لمبے ہیں۔“ بلی سے مشابہہ وہ جانور اسمٹھ کے ہاتھ میں چل رہا تھا۔

”یہ یہاں پاکستان میں نہیں پائے جاتے، مگر میں تمہیں اس کی خاصیت بتاؤں، یہ قبریں کھودنے کا ماہر ہے۔ پھر یہ مردے کے ٹخنوں میں دانت گاڑتا ہے۔ ٹخنوں کی وجہ سے جو مخصوص اعصاب ہوتے ہیں۔ جن کے کھینچنے سے مردہ کھڑا ہو جاتا ہے اور مسلز کی وجہ سے مردے کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔“

وہ کچھ اور بھی بتا رہا تھا۔ مگر میں درمیان میں بول پڑا۔ ”مگر اسمٹھ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ قبر تو بہت گہری تھی۔ شیر باہر کیسے نکل آیا۔ اور پھر یہ صرف کھڑا ہی نہیں تھا۔ چل بھی رہا تھا۔“

”دیکھو ایسے“ وہ مردے کی طرح چل کر دکھایا۔ ”ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو۔ کیونکہ یہ بجوکہ وجہ سے چل رہا تھا۔“ درکل نے بجوکہ کی طرف اشارہ کیا۔ جواب مردہ پڑا تھا۔ اور میں ہمیشہ کی طرح اس سے مرعوب ہو کر خاموش ہو گیا۔

انیلہ کو اس کے گھر چھوڑا، وہ بہت خوفزدہ ہو چکی تھی۔ میرا دل ان دنوں بہت گھبرا رہا تھا۔ میں نے اس کا ذکر اسمٹھ سے کیا تو وہ ہنس کر بولا۔ ”اگر تم شادی کر لو، اگر زیادہ سوچوں گے تو تمہارے بال سفید ہو جائیں گے۔“

”جی گھبرا رہا تھا۔ سوچا ہوا خوری کر لوں۔ اسی لئے چلتے چلتے یہاں پر آ گئی۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ ”میں قبرستان جا رہا ہوں، کیا چلو کی میرے ساتھ!“

”قبرستان!!.....“ میری بات سن کر وہ گھبرا گئی۔ مگر جلد سنبھل کر بولی۔ ”جی چلیں!“ ہم دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے قبرستان کی طرف مڑ گئے۔

قبرستان کا راستہ دیران تھا۔ اس لئے انیلہ کچھ کچھ خوفزدہ تھی۔

”آپ اس وقت قبرستان کیا کرنے جا رہے ہیں؟“

”دراصل میری گھڑی وہی کہیں رہ گئی ہے اسے لینے کے لئے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ انیلہ کچھ مطمئن ہو گئی۔ ”جیسے ہی ہم شیر کی قبر کے پاس پہنچے تو خوفزدہ انیلہ میرے سینے سے لگ گئی۔ دراصل شیر کی قبر کھدی ہوئی تھی اور لاش قبر میں سے غائب تھی۔ میں خود اس باختم ہو گیا۔ ہم دونوں پلٹنے ہی لگے تھے کہ خشک چٹوں کی چرچاہٹ کی آواز سنائی دی۔ شیر ٹرائس کی سی کیفیت میں سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ میں تو بمشکل اپنے خوف پر قابو پا سکا۔

مگر انیلہ بری طرح سے چیخنے لگی، انیلہ میرے سینے سے لگی، لرزیدہ پتے کی مانند کانپ رہی تھی، اگر اسے میرا سہارا میرے نہ ہوتا، تو یقیناً وہ بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ انیلہ کی چیخ بدستور جاری تھی۔ پھر درختوں کے عقب سے ایک دم اسمٹھ نکل آیا۔

”اسمٹھ دیکھو سامنے شیر کی روح کھڑی ہے۔“ میں نے بمشکل کہا۔

میرے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے اور جیسے ٹانگوں سے جان نکل گئی، کیونکہ شیر کا بھوت ہمارے سامنے کھڑا نہیں بے تاثر آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

”ارے بیوقوف، یہ بھوت نہیں خود شیر ہے۔“

آجائیں، میں آج کل ڈیرے میں ہوتا ہوں، اس لئے سب تفصیلات لکھ بیجا ہوں۔
بخشو کے اس خط نے مجھے سخت پریشان کر دیا۔ میں نے خط بھائی کو دکھایا۔ تو بھائی بولے۔

”اسمٹھ وکل تمہارا پرانا دوست ہے۔ تمہاری خاطر اتنی بڑی اراضی سنبھال رہا ہے۔ دن رات ایک کر بیٹھا ہے۔ مجھے تمہارا خیر خواہ لگ رہا ہے۔ اس میں مجھے کوئی برائی نظر نہیں آتی اور اسے روپے پیسے کا بھی لالچ نہیں ہے۔ پھر وہ غلط کیسے کر رہا ہوگا۔ یقیناً بخشو نے انتقاماً ایسا خط لکھ دیا ہے۔ ویسے اگر تم جانا ہی چاہتے ہو۔ تو چلے جاؤ۔“ اور میں واقعی اس خط سے پریشان ہو گیا تھا۔ واپس پاکستان چلا آیا۔

وہ دمبر کا سرد ترین مہینہ تھا۔ سردی اپنے جون پر تھی۔ چھ ماہ پہلے گرمی اور حشرات کی وجہ سے جینا دو بھر ہو گیا تھا۔ اب سردی میں قدرے آرام تھا۔ چھ ماہ سے اسمٹھ یہاں تھا۔ اور میں نے باہر امریکہ میں تھا۔ میں نے سوچا یہ چھ ماہ کس قدر جلدی گزر گئے۔ میں نے کھیتوں پر سرسری نظر ڈالی۔ کھیت لہلا رہے تھے، پگڈنڈیاں سج چکی تھیں، درخت گھاس، پھول پودے بزمزہ، سب اپنی جگہ سج و سالم تھے، اور کوئی خرابی بھی نظر نہیں آ رہی تھی، مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ”کچھ نہ کچھ بچ پر غلط ہو رہا ہے۔“

اسمٹھ اپنی جگہ موج مستی میں تھا، مجھ سے پر تپاک طریقہ سے ملا۔

میں نے گاؤں میں چھائی ویرانی کے بارے میں پوچھا؟

تو وہ بے فکری سے بولا۔ ”میں نے سب کو نکال باہر کیا، تمام کے تمام نوکروں کو فارغ کیا، خواخواہ کا خرچہ تھا، مزے فضول نوکر۔“

”اسمٹھ یہ کیا کہہ رہے ہو، تم نے سب نوکروں کو فارغ کر دیا۔ کام کون کرے گا۔“ میں نے پوچھا۔

”ارے! تم جتنے دن ملک سے باہر رہے۔ کام ہوتا رہا۔ اگر تمہیں شوق ہے۔ کام کرنے کا۔ تو شوق سے کرو،

میں بھی اب شادی کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ان چھ مہینوں میں، میرے پاس بے تحاشہ پیسہ جمع ہو چکا تھا۔ کیونکہ نوکر سب مرکب کئے تھے، فصلیں خود بخود تیار ہو رہی تھیں۔ خوشحالی نے جیسے میرے گھر کا راستہ دکھ لیا تھا۔

اسمٹھ بے حد کھرا آدمی تھا۔ اس نے ایک مخصوص رقم کے سوا کبھی ایک ٹکے بھی زیادہ نہیں لیا تھا۔ وہ مجھے پیسے پیسے کا حساب دیا کرتا تھا۔

میں نے بھی سوچا یہاں رہ کر تو میں صرف اور صرف وہم و سوسوں کا شکار ہو رہا ہوں۔ اگر اس طرح میں پریشان ہوتا رہا تو یقیناً بہت جلد بوڑھا ہو جاؤں گا۔ اس لئے سوچا کیوں نہ کچھ عرصہ بھائی کے پاس امریکہ چلا جاؤں، اور اسمٹھ سے ذکر کیا۔

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اور اس نے مجھے ہنسی خوشی اجازت دیدی، بلکہ مجھے مکمل طور پر اطمینان دلایا کہ وہ ہر طرح سے زمینوں کو سنبھال لے گا۔ امریکہ جاتے ہوئے میں نے اسمٹھ کو گلے لگایا اور کہا۔ ”ہر چیز کا خیال رکھنا۔“

امریکہ آئے ہوئے مجھے ابھی دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ میرے وفادار ملازم بخشو کا خط مجھے ملا۔

”صاحب جی السلام علیکم! صاحب جی، یہاں پر روز بروز بدردھوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہیں۔ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ رات کو بدردھیں، کھیتوں میں کام کرتی ہیں، پراسرار سائے تب تک کھیتوں میں کام کرتے ہیں جب تک خاموشی ہوتی ہے۔ جب دور سے ڈھول کی آواز آتی ہے تب یہ سارے سائے میکا کی انداز میں کام کاج چھوڑ کر قبرستان کا رخ کر لیتے ہیں۔ جیسے کہ یہ سب روہیں، اس ڈھول کی آواز کی منتظر ہوں۔“

اسمٹھ وکل نے سارے نوکروں کو فارغ کر دیا ہے۔ وہ اکیلے دس دس مربع زمین کو کیسے سنبھال رہا ہے؟ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ گاؤں کے لوگ بہت خوفزدہ ہیں، ہر کوئی پریشان ہے؟ رات کو گاؤں والوں نے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ صاحب جی آپ جلدی سے

بھروسہ پر ٹریکٹر کی آواز آئی۔ میں نے کچے میں ٹریکٹر کو دیکھا۔ ڈرائیونگ نیاز خان کر رہا تھا۔ نیاز نے ٹریکٹر کو روکا۔ اور خواب کے سے انداز میں ٹریکٹر سے اترا اور گھنے کے گھٹے اٹھا کر ٹریکٹر میں رکھنے لگا۔

میں نے چیخ چیخ کر سب کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ مگر وہ سب میری طرف تو دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ نہ میری بات سن رہے تھے۔ اچانک قدموں کی چاپ ابھری۔ میں نے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ حبیب اور دوسرے میرے ملازم جو پراسرار بیماری سے ہلاک ہو چکے تھے۔ وہ سر پر گئے لادے ہوئے آ رہے تھے۔ اور ٹرائی میں رکھ رہے تھے۔

یہ سب لوگ ٹرائی کی کیفیت میں کام کر رہے تھے۔ وہ سب لوگ صبح کے سفیدہ محرتک کام کرتے رہے اور میں شاک کے عالم میں انہیں دیکھتا رہا۔

صبح کا لپکا اجالا پھلتے ہی قبرستان سے ڈھول پیٹنے کی آواز سنائی دی اور سب لوگوں نے کام کاج چھوڑ کر زندہ لاشوں کی طرح قبرستان کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

میرے ذہن میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔ عجیب و غریب سوالات ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

اور میں خاموشی سے گھر لوٹ آیا، جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کے بارے میں سوچا۔

امریکہ میں میرا ایک پروفیسر ”ٹام نکس“ میرا دوست بن گیا تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ اٹھایا۔ اور پروفیسر ٹام نکس کو ای میل بھیجا، ای میل میں، میں نے پروفیسر ٹام نکس کو ساری صورتحال بھیجی۔

دوسری طرف سے پروفیسر ٹام نکس جلدی سے نیٹ پر آن لائن ہو گیا۔ اس کا میل فوراً آ گیا۔

جس میں پروفیسر ٹام نے زومی، اور ویج ڈاکٹر کے بارے میں مکمل معلومات مہیا کی تھی۔

پیارے دوست، احمر۔

زومی!! ایک سچائی ہے اور زومی خود نہیں بن سکتی۔

ایک ویج ڈاکٹر ہی زومی بنا سکتا ہے۔ اور زومیوں کی حقیقت کیا ہے۔ یہ بھی میں بتا دوں۔ دراصل ایک مدت

میں چلا جاتا ہوں۔ جو تمہارا جی چاہے وہ کرو۔“ وہ بولا۔
”اسمٹھ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں ایسا نہیں چاہتا۔ میں تو بس ایک بات کر رہا تھا۔“

ایک مرتبہ پھر اسمٹھ نے مجھے کچھ بھی بولنے نہیں دیا۔
”اس دن پتہ نہیں کہ رات کا کون سا پہر تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ سناٹے میں، سے ڈھول پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اسمٹھ کے کمرے میں گیا، اس کا بستر خالی تھا۔ اور انچھٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔

ڈھول کی پراسرا آواز باہر سے آرہی تھی۔ میں نے جری پہنی، چادر لی پاؤں میں جو گر ڈالے۔ اب میں گھر سے باہر تھا۔ باہر گہری دھند تھی۔ جو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھول کی پراسرا آواز قبرستان کی سمت سے آرہی تھی۔ میں نے بھر بھر سی لی۔ قبرستان کا خیال ہی میرے لئے سوہان روح تھا۔ اور پھر اوپر سے کبھی اتنا زیادہ تھا کہ قریب کی چیزیں بھی بے شکل دکھائی دے رہی تھیں۔

اچانک کھیت میں چاند کی مدہم روشنی میں، میں نے سایہ دیکھا۔ وہ سایہ گئے کاٹ رہا تھا۔ میں دبے قدموں کھیت میں جانے لگا اور پھر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ شبیر تھا۔ میں نے اس کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ ”شبیر!“

وہ خاموش کھڑا ہاندا اس نے ہلنے کی کوشش کی، نہ چونکا، میری موجودگی سے لاعلم، وہ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ جیسے وہ ٹرائی کی کیفیت میں ہو۔ نہ اس نے مجھے دیکھنے کی سعی کی۔ نہ چونکا، وہ خاموش کھڑا تھا اور اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ گئے کاٹ رہا تھا۔ ”شبیر۔“ میں نے اسے جھنجھوڑا۔ مگر وہ شے سے مس نہ ہوا۔

وہ تو جیسے زندہ لاش تھا۔ میرے بدن میں خوف کی سرد لہریں سراپت کر گئیں۔

قریب قریب اور لوگ بھی گئے کی فصل کو کاٹ رہے تھے۔ میں شبیر کو چھوڑ کر آگے بڑھا۔ تو چونک گیا۔

آگے گاؤں کا نوجوان احمد، اکمل اور سمیل کھڑے تھے۔ وہ گئے کاٹ کر گٹھے بناتے تھے، ان نوجوانوں کی پراسرار بیماریوں میں موت ہوئی تھی۔

تک افریقہ میں وچ ڈاکٹروں نے زومی سے لوگوں کو ڈرایا اور پورے افریقہ میں زومی کے ذریعے خوب خون خرابہ کیا۔

مگر پھر انہی وچ ڈاکٹروں نے سوچا کہ زومی کے ذریعے بہت سے اور کام بھی لئے جاسکتے ہیں۔ افریقہ کے وچ ڈاکٹر اس طریقے سے محکموں کو زیر نگین رکھتے تھے، اور عام انسانوں کو زومی بنا کر ان سے روزمرہ کے کام کراتے تھے، پھر ریسرچ سے ثابت ہوا کہ زومی زندہ انسان ہوتے ہیں جو کسی ڈاکٹر کے آگے زومی کے ذریعے کٹ پتلی بن جاتا ہے۔ ریسرچ سے ہی ثابت ہوا کہ زومی ایک عمل ہے۔ جو صرف اور صرف افریقہ میں وچ ڈاکٹروں کے پاس ہے۔

زومی کیا ہوتا ہے؟ زومی دراصل وہ چیز ہوتی ہے جیسے زندہ لاش سے کام کرواتا۔

پہلے معمول کے کھانے میں ایسی اشیاء ملائی جاتی ہے جس سے عام انسان بیمار لگنے لگتا ہے۔ اور پھر وہ ظاہری موت مر جاتا ہے۔ درحقیقت اس کے دماغ کا وہ حصہ جو سوچنے سمجھنے اور بحث کرنے کے لئے ہوتا ہے وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ اس مرے ہوئے انسان کے تدفین کے بعد وچ ڈاکٹر فوراً اسے نکال لیتے ہیں اور پھر چند دوائیوں کے ذریعے اسے اس قابل بنالیتے ہیں کہ وہ اس کو کسی مخصوص اشارے کا پابند بنا سکے۔ اس کے ایک اشارے سے ہی وہ آدمی یا عورت اس کی نشاء کے مطابق کام کرنے لگ جاتا ہے۔

زومی پر امریکیوں نے بہت ریسرچ کی مگر اس کا علاج آج تک دریافت نہیں ہوا۔

تمہارا دوست اسمتھ ورکل سو فیصد وچ ڈاکٹر ہی ہے۔ فوراً اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ میں تم سے بہت دور ہوں۔ ورنہ میں خود تمہارے پاس آ جاتا۔ اسے پولیس کے حوالے کر کے دم لیتا۔ یہ میری نصیحت ہے۔ تمہارا دوست پروفیسر ٹام نکلس۔

مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جب میں نے ٹام تک اسمتھ کا انتظار کیا تو وہ گھر نہیں آیا۔ البتہ اس

نے میرے لئے ایک خط چھوڑا تھا۔ وہ بھی میں گیت کے نیچے سے مل گیا۔

”احمر میں ایک وچ ڈاکٹر ہوں۔ اب تمہیں پتہ چل چکا ہے۔ رات کو میں نے تمہاری آوازیں سنی تھیں۔ ساری دنیا مجھے ڈاکٹر ورکل کہتی ہے۔ مگر میں خود کو ڈاکٹر وچ کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ اور کروں گا۔ میں نے تم پر ان گنت احسان کئے مگر میں یہ بھول چکا تھا نیا آدمی پرانے آدمی کا دشمن ہے۔ تمہارے ملازموں کو میں نے زومی بنایا۔ مگر اپنے لئے نہیں تمہارے لئے۔ مجھے یہ خیال تمہارے ملازم حبیب کی گستاخانہ حرکتوں سے آیا۔

حبیب پر میں نے تجربہ کیا اور کامیاب رہا۔ لوگ ڈر گئے۔ تب میں نے تمام ملازموں کو زومی بنایا۔

یہ سب کیسے کیا۔ میں نہیں بتا سکتا اور نہ ہی بتاؤں گا۔ اب میں جا رہا ہوں۔ مگر جانے سے پہلے جو مجھے کرنا تھا وہ میں نے کر دیا ہے۔ تم لوگ سو سال میں بھی زومی کا تو نہیں ڈھونڈ سکتے۔ یہ میرا تم پر ایک اور احسان ہے۔ یہ راز میرے سینے میں دھن رہے گا۔ میں اب اپنے وطن جا رہا ہوں۔ اپنی دنیا میں، جہاں کے ساحل پر میں سورج کی روشنی میں خوش محسوس کر سکوں۔

خدا حافظ میرے پیارے دوست۔ کچھ دنوں بعد میرے دونوں بھائی پاکستان آ گئے۔ انہوں نے میری پسند کے مطابق میرا رشتہ انیلہ سے طے کر دیا۔

سال کے اندر اندر میری شادی ہو گئی۔ گاؤں والوں نے میری شادی میں خوب ہلا گلا کیا۔ اس کے بعد بھائی دوبارہ امریکہ جا رہے۔

کئی سال گزر گئے۔ دوبارہ کبھی میرا اس پر اسرار وچ ڈاکٹر اسمتھ ورکل سے رابطہ نہیں ہوا۔ وہ تو اپنے پر اسراریت کے ساتھ پر اسرار وطن میں کہیں کھو گیا۔ وہ آج تک میرے ذہن میں ہے۔ اور مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔





خونی کاوش

ایس امتیاز احمد - کراچی

اپنے دام میں خود صیاد آگیا اسی کے مصداق عقل و شعور کے مالک اور دنیا کے لوگوں کو انگشت بدندان کرنے والے کی عجیب و غریب دل گرفتہ دل سوز اور ناقابل یقین ذہن کو جھنجھوڑتی حیرت ناک روداد

اپنے آپ کو قتل قتل سمجھنے والے ایک شخص کا عبرتناک اور حیرتناک دل دہلاتا خونی واقعہ

نہیں تھی۔ وہ اور اس کا ساتھی سلیگ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا واحد جوڑا تھے۔ ان پر انتہائی اہم نوعیت کے تجربات کئے جا رہے تھے۔ وہ الاسکا میں دریائے چائینک کے کنارے رہتے تھے جہاں ٹیپرچر نقطہ انجماد سے تیس درجے کم تھا۔ پروفیسر ڈائل ان تجربات کے سلسلے میں وہاں تنہا رہا ہوا تھا۔ قریب ترین انسانی آبادی ڈکن لینڈھی جو وہاں سے ساٹھ میل دور تھی۔ پروفیسر ڈائل

جب ڈینا کے ہاں پلوں کا جوڑا پیدا ہوا تو اس کی زچگی کے لئے پروفیسر ڈائل بہ نفس نفیس موجود تھا۔ ڈینا ایک کتیا تھی اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا پروفیسر ڈائل کوری معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ وہ تجربیاتی بیالوجی میں پی ایچ ڈی تھا۔ وہ پریڈک یونیورسٹی میں کئی سال تک سربراہ شعبہ رہ چکا تھا۔ اگر وہ ڈینا پر خصوصی توجہ دے رہا تھا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ ڈینا کوئی معمولی کتیا

کے بعد تو پروفیسر ڈائل کو اس میں اور بڑیک یونیورسٹی کے اس بنگلے میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا تھا جہاں سے اس نے ہنگامی حالت میں استعفیٰ دے کر یہاں آنے اور تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ از خود مستعفی نہ ہو جاتا تو یونیورسٹی کے حکام اسے برخاست کر دیتے جو زیادہ اہانت آمیز ہوتا۔

وجہ یہ تھی کہ اس روز ایک مقامی اخبار میں تجرباتی بیالوجی کے موضوع پر اس کا ایک مضمون بڑے نمایاں انداز میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بیس منٹ کے بعد ہی گڑبڑ کی ابتدا ہو گئی تھی۔ ڈسٹرکٹ انٹاری کے دفتر کے آدمی اس کے پاس آ کر عجیب و غریب قسم کا استفسار کرنے لگے تھے۔ اب اسے اطمینان تھا کہ یہاں ان برفانی ویرانوں میں اسے کسی کے سوال جواب یا محاسب کا خدشہ نہیں تھا۔ یہاں اس کے سائنسی تجربات و تحقیقات کو غیر انسانی اور غیر اخلاقی قرار دینے کے لئے کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا اور وہ اطمینان قلب سے اپنے نظریات کے مطابق تجربات جاری رکھ سکتا ہے اور وہ یہی کر رہا تھا۔ اس کی لیبارٹری میں لاتعداد کاہیاں اس کے مشاہدات اور اخذ کردہ نتائج سے بھری پڑی تھیں اور نمونوں کے جائز بھی بہت زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ اس نے چار سالوں میں بے انتہاء اہم نوعیت کے تجربات کئے تھے جو وہ کامیاب رہے تھے لیکن پروفیسر ڈائل کو دنیا کی بے قدری کا شکوہ تھا کیونکہ دنیا والوں کو اس کے طریق کار پر اعتراض تھا۔ دنیا والے ہمیشہ ذہین لوگوں کے مخالف رہے ہیں۔

پروفیسر ڈائل نے ہاتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ لباس تبدیل کیا اور پھر اطمینان سے میز پر سے اپنی کاپی اٹھا کر اس میں اپنے تازہ ترین تجربے کے بارے میں نوٹ لکھنے لگا۔ اس نے لکھا۔

”آج ڈینا کے پلے پیدا ہوئے ہیں۔ ڈینا جانتی تھی کہ میں زچگی میں اس کی مدد کر رہا ہوں، اسے نقصان نہیں پہنچا رہا، اس لئے اس کا رویہ ٹھیک رہا۔ سلیک بھی یہ جانتا ہے۔ میں نے ان میں اتنی دماغی صلاحیت اور شعور تو پیدا کر ہی دیا ہے اس لئے وہ سوچ سکتے ہیں سلیک نے میری

کے لئے کوئی انسانی آبادی قریب تر رہنے کا تصور بھی ناقابل برداشت تھا۔ اسے ان تجربات کے لئے مکمل سکوت اور سکون درکار تھا۔ الاسکا کا ماحول اس کے لئے بہترین تھا اور اس وقت وہ پورے انتہاک سے حاملہ کتیا کی زچگی میں مدد دے رہا تھا۔

بلاخر جب پروفیسر ڈائل اس اہم تجرباتی فرض کو سرانجام دے چکا تو اس نے باڑے کا دروازہ کھول کر سلیک کو بھی اندر آنے کی اجازت دی۔ سلیک بڑے کائیاں انداز میں پروفیسر کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے اندر آیا پھر اس کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں نکلیں جو غراہٹ یا بھونکنے سے مختلف تھیں۔ ڈینا نے بھی اسی انداز میں اس کو جواب دیا پھر سلیک اندر آنے کے بجائے وہیں باڑے کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ وہ اب پروفیسر کے ہاتھوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

پروفیسر نے ہسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”ڈر نہیں سلیک! میرے ہاتھ خالی ہیں۔ میں تمہاری اور ڈینا کی اولاد میں سے کسی کو لے کر نہیں جا رہا۔ یہ سب بعد میں ہوتا رہے گا۔ تم اور ڈینا تو میرے کامیاب تجربات کا حاصل ہو۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے بچوں میں یہ قابلیت اور فہم و فراست تم دونوں سے بھی زیادہ اچھے طریقے پر پروان چڑھے گی۔“

اس کے بعد پروفیسر ڈائل نے باڑے کا بیرونی دروازہ بند کر دیا اور اپنے کیمین میں چلا گیا۔ اس نے یہ رہائش گاہ موسم کی شدتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی محنت سے بنائی تھی۔ اس کی کھڑکیوں پر مضبوط شیشے کے دوہرے پرت تھے اور فرش لکڑی کا تھا۔ زیادہ تر تعمیراتی سامان تیار شدہ حالت میں اسی کشتی کے ذریعے دریا ئے چائیک کے راستے یہاں تک لایا گیا تھا جس میں اس کی کتا ہیں اور سائنسی آلات وغیرہ آئے تھے۔

کیمین میں داخل ہو کر پروفیسر ڈائل نے اپنا اور کوٹ اتار دیا۔ باہر کے اور اندر کے درجہ حرارت میں خاصا فرق تھا۔ باہر سے یہ مکان جس قدر سادہ اور معمولی سا نظر آتا تھا اندر سے اسی قدر آرام دہ تھا۔ ایک مرتبہ اندر آنے

کے اور دروازے کے درمیان حائل ہو گیا۔

پروفیسر نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا: ”لے آتی! ایک لمحہ میں کچھ بھی لے کر نہیں جا رہا۔“

لیکن سلیم اب بھی غیر یقینی انداز میں اسے دیکھتا رہا اور عجیب آواز میں غراتا ہوا، پھر پروفیسر کو باڑے کے اندر سے ڈینا کی غراہٹ بھی سنائی دینے لگی۔ اس کے بعد سلیم اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ پروفیسر کے باہر نکلنے ہی سلیم دوبارہ پہریدار کی طرح دروازے پر ڈٹ گیا۔

پروفیسر نے باڑے کے باہر تاروں کے درمیان سے اسے دیکھ کر کہا: ”بڑے چالاک ہو تم سلیم! تم جانتے ہو کہ میں تمہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتا کیونکہ تم میرے کامیاب تجربات میں شامل ہو لیکن یہ نہ سوچنا کہ تم میری حکم عدولی کر سکتے ہو یا میرے تجربات کی راہ میں حائل ہو سکتے ہو! اگر ایسا ہوا تو میں کسی اور عام کتے میں تم جیسی خصوصیات پیدا کر کے اپنا تجربہ مکمل کر لوں گا اور تمہیں ہلاک کر دوں گا۔“

کیمین میں پہنچ کر اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا اور اس نے آج کے واقعے کے بارے میں اپنی کاپی میں تفصیل سے لکھنا شروع کر دیا۔

”ڈینا اور سلیم آپس میں کسی طریقے سے ضرور اپنا مطلب بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ واضح الفاظ کے ذریعے تو نہیں کیونکہ باقاعدہ الفاظ کی تشکیل اور قوت نطق تو ان میں آئندہ کئی نسلوں کے بعد ہی پیدا کی جاسکے گی لیکن اب بھی وہ ایک مخصوص قسم کی غراہٹ سے ایک دوسرے پر اپنا ماضی الضمیر واضح کر لیتے ہیں۔ مجھے یہ اس طرح معلوم ہوا کہ آج میں نے اپنی ایک حرکت سے سلیم کو اس شے میں مبتلا کر دیا کہ میں اپنے اوپر کوٹ میں

اس کا ایک پلا چھپا کر باہر نکل رہا ہوں۔ وہ دروازے پر ڈٹ گیا۔ مجھے راستہ دینے پر وہ تیار ہی نہیں تھا۔ لیکن جوئی اندر سے اپنا کی غراہٹ سنائی دی، سلیم نے فوراً میرا راستہ چھوڑ دیا۔ گویا اتنے لمبے لمبے منظر میں

اگر مجھے تمام لمبے لمبے کا دار نہ ہوتا اور اس میدان میں اپنے چرچوں کی اطمینان نگاہ کا مدد نہ ہوتا تو میں ان

واپسی پر میرے ہاتھوں کو بہت غور سے دیکھا۔ گویا یہ تسلی کر لیتا چاہتا ہو کہ میں کسی پلے کو اٹھا کر ساتھ تو نہیں لے جا رہا اس لئے سلیم کی قوت حافظہ کا اندازہ بھی ہوتا ہے مجھے یقین ہے کہ وہ یہ بات اب تک نہیں بھول سکا کہ اس سے قبل ڈینا کے ہاں جو پلے پیدا ہوئے تھے انہیں میں نے اپنے تجربات کی نذر کر دیا تھا۔ اب سلیم کو یقیناً یہی اندیشہ تھا کہ کہیں ان پلوں کا بھی یہی حشر نہ ہو! بہر حال ابھی ان پلوں پر تجربات کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ان میں کچھ اور جسمانی قوت پیدا ہو جائے گی میں ان پر اپنے تجربات کر دوں گا۔ کیونکہ انہیں تجربات میں تکلیف برداشت کرنا ہو گا۔“

پروفیسر اپنے کیمین میں بیٹھا نوٹس لکھ رہا تھا اور ادھر باڑے میں کتیا ڈینا مامتا بھری نگاہوں سے اپنے نوزائیدہ بچوں کو دیکھ رہی تھی اور انہیں زبان سے چاٹ رہی تھی۔ سلیم کسی چوکنے پہریدار کی طرح دروازے پر کھڑا تھا جیسے اسے کسی کے آنے اور اس کی اولاد کو نقصان پہنچانے کا خطرہ محسوس ہو رہا ہو اور وہ پوری مدافعت کرنے کا عزم کر رہا ہو۔

پروفیسر نے نوٹس لکھنے کے بعد کاپی میز پر رکھ دی اور لیبارٹری میں چلا گیا۔ آج وہاں اسے کوئی خاص کام نہیں تھا لیکن وہاں جا کر اسے عجیب سی خوشی اور طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ وہاں ایک حصے میں بے شمار کامیاب موجود تھیں۔ جن میں پوری تفصیل سے تمام تجربات و تحقیقات کا اعتراف بھی کیا تھا۔ خاص طور پر اس نے ان دو کتوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا۔ وہ تجربات کے آخری مرحلے پر آ کر جان دے بیٹھے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کے سر بھی ڈینا اور سلیم کی طرح غیر معمولی طور پر بڑی جسامت کے ہوتے۔

سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے وہ ایک مرتبہ پھر باڑے میں جا پہنچا۔ جب وہ پلوں کو دیکھ رہا تھا تو سلیم باڑے کے دروازے پر کھڑا اس پر کڑی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ واپسی پر پروفیسر نے اپنا ایک ہاتھ اور کوٹ کے اندر یوں چھپایا جیسے کوئی چیز سلیم سے چھپانا چاہ رہا ہو۔ سلیم یہ دیکھتے ہی غرا کر اٹھ پڑا۔ وہ پروفیسر

کتوں کی ان مخصوص آوازوں کی تفصیلی تحقیق و مشاہدے کے لئے کسی اور سائنسدان کو اپنے معاون کے طور پر رکھ لیتا لیکن افسوس کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ارتقائی عمل کے تجربے سے ہمیں انسان کی قوت نطق کا پتا بھی چل سکتا ہے۔“

اس روز برف باری بہت شدید ہوئی اور طوفانی ہوائیں چلتی رہیں کیمپن کے اندر بھی سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ پروفیسر کا اندازہ تھا کہ باہر کا ٹمبر بیچر نقطہ انجماد سے بھی کم از کم چالیس درجہ کم ہو چکا ہوگا۔ لیکن اس نے تھرما میٹر باہر لے جا کر اس کا ٹمبر پچڑ دیکھنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا! وہ کوئی معمولی آدمی نہیں بہت بڑا سائنسدان تھا اور تجرباتی بیالوجی میں مہارت رکھت تھا۔ وہ انسانوں اور جانوروں میں مصنوعی طور پر مستقل تبدیلیاں لانے کے سلسلے میں تجربات کر رہا تھا۔ کتوں میں انسانوں جیسا شعور و ادراک پیدا کرنا بھی اسی وسیع تر تجربے کا ایک حصہ تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر نے ایک کتاب ”بیالوجی کے ممکنہ فوائد اور انسانیت“ بھی تحریر کی تھی جس میں اس نے اپنے تجربات اور مفروضات تفصیل سے تحریر کئے تھے۔

پروفیسر کا خیال تھا کہ موجودہ تجربات اس کے مفروضات کو سچ ثابت کرنے میں معاون ہو کر دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنیں گے۔ پروفیسر کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی کتاب کو سائنسدان کے وسیع حلقے میں صرف ”ہمقانہ مفروضات“ کہہ کر ٹھکرایا گیا ہے۔ لیکن اسے یقین کامل تھا کہ کتوں پر تجربات کر کے اس نے جو حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے اس کی خبر جب سائنسی حلقوں تک پہنچی تو ایک تہلکہ مچ جائے گی۔ دنیا اسے ایک عظیم سائنسدان ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔ وہ اسی لئے ان تجربات کے معاملے میں سرھڑکی بازی لگائے ہوئے تھا۔

اس شدت کی برف باری میں بھی وہ روزانہ کیمپن سے نکل کر کتوں کے باڑے میں جا کر انہیں خوراک دیتا اور ان کی حرکات کا بغور جائزہ لیتا تھا۔ وہ ان کے نوزائیدہ پلوں کی بتدریج بلوغت کا مشاہدہ بھی کرتا تھا اور واپسی پر اپنے تاثرات

کو تفصیل کے ساتھ ڈائری میں قلمبند بھی کر لیا کرتا تھا۔ پروفیسر کے تجربات کے لئے ایک مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے معمول کو بے ہوش کر کے آپریشن نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے تجربات کی کامیابی کا دار و مدار ہی اس بات پر تھا کہ اپنے معمول کو بے ہوش کئے بغیر اسے ہوش و حواس میں رکھ کر اس پر تجرباتی آپریشن کئے جائیں۔ وہ ان دنوں بڑی بے چینی سے پلوں میں اتنی جسمانی طاقت پیدا ہونے کا منتظر تھا کہ ان میں آپریشن ٹیمپل کی تکالیف سہنے کے لئے قوت برداشت پیدا ہو جائے۔ یہ انتظار خاصا صبر آزمائے۔ کیونکہ پروفیسر ڈائل جلد از جلد دنیا کا واحد سائنسدان بننا چاہتا تھا جس نے ایک بالکل نئے میدان میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہو۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

”انسان میں ذہانت کی موجودگی کی وجہ اس کی کھوپڑی کی اصل شکل برقرار رکھنے کی اہلیت ہے۔ باقی تمام جانوروں کی پیدائش سے پہلے کسی نہ کسی مرحلے پر ان کی کھوپڑی بھی انسانی کھوپڑی سے خاصی مشابہت رکھتی ہے اور اگر وہ اسی حالت میں پیدا ہوں تو وہ بھی ذہین اور دماغی صلاحیتوں کے حامل ہو سکتے ہیں۔ ان میں اور انسانوں میں شاید بہت کم فرق رہ جائے لیکن پیدائش سے پہلے کسی نامعلوم وجہ سے کسی نہ کسی مرحلے پر ان کی کھوپڑی کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ جس سے ان کی دماغی صلاحیتیں وہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ میں اسی لئے بالغ جانوروں پر اپنے تجربات نہیں کر سکتا کیونکہ ان کی کھوپڑی کی ہیئت انہیں بالکل ناکارہ بنا چکی ہوتی ہے۔

میں ڈینا اور سلیک دونوں میں ان کی پیدائش سے پہلے ہی تجربات کر کے ان کی تسلی از پیدائش کھوپڑی کی ہیئت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب یقیناً ان میں اتنی ذہانت موجود ہے جو ایک دس سالہ بچے میں ہوتی ہے اگر اب میں اسی طرح ان کے پلوں میں بھی یہ خصوصیت پیدا کر دوں تو ارتقائی عمل کے ذریعے نتائج مزید حوصلہ افزا ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد میرا پروردگار یہ ہے کہ ان کی اس خصوصیت کو صرف عارضی حد تک محدود نہ رکھوں بلکہ کسی طرح کھوپڑی کی اس ہیئت کو موروثی

ہاڈوں تاکہ ان کی آئندہ نسلوں میں ہر کتا کم از کم ڈیٹا اور ملکہ جتنی ذہانت اور سوچ بچار کی قوت کا حامل ہو۔ اس کے بعد تو شاید اسی ارتقائی عمل کو مزید بڑھانے کے بعد میں ان کی نسلوں کو ایک ایسے مرحلے تک بھی لے آنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ جب شکل و صورت کو چھوڑ کر یہ کتے کسی بھی دماغی معاملے میں انسانوں سے کم تر نہیں ہوں گے۔ وہ انسانوں ہی کی طرح سوچ سکیں گے اور منصوبہ بندی کر سکیں گے.....“

ہر بار چندوں کے بعد پروفیسر ڈائل کو ایک دن معمولی قسم کے کاموں میں ضائع کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ بالکل اکیلا رہتا تھا اور اسے اپنے کیمین کو گرم رکھنے کے لئے ایندھن وغیرہ خود ہی اکٹھا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار چھوٹے موٹے کام اسے خود ہی کرنے پڑتے تھے۔ ویسے سال میں دو مرتبہ موسم گرما کی ابتدا میں اور موسم سرما شروع ہونے سے عین پہلے الا سکا کا ایک آدمی مٹن اس کے لئے تازہ ترین سائنسی جریدہ اخبارات اور بولوں میں بند سامان خورد و نوش وغیرہ لے کر آیا کرتا تھا۔ پروفیسر اسے اپنی آئندہ ضروریات کی فہرست دے دیا کرتا تھا۔ مٹن کے علاوہ بھی کبھی کبھار سال چھ ماہ میں کوئی راگبیر اس علاقے میں آ نکلتا تھا۔ لیکن پروفیسر ڈائل اس سے اتنی سرد مہری سے ملا کرتا تھا کہ راگبیر جلد از جلد جان چھڑا کر جانے کی سوچنے لگتا تھا۔

دراصل پروفیسر ڈائل کو عام لوگوں پر اپنی ذہنی برتری کا شدید احساس تھا۔ حتیٰ کہ وہ مٹن سے بھی شاذ و نادر ہی سیدھے منہ بات کیا کرتا تھا۔ پروفیسر اسے اپنے کیمین میں ٹھہرنے بھی نہیں دیتا تھا۔ وہ بے چارہ جب بھی آتا دیا کے کنارے خیمہ تان کر رات گزارا کرتا تھا۔ پروفیسر ڈائل محض ”چھوٹے لوگوں“ سے گریزاں رہنے کی خاطر لکڑیاں کاٹنے کا کام بھی خود ہی کرتا تھا۔ اسے خاصی مقدار میں لکڑی کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ سردی دور کرنے کے لئے اس خاص قسم کے کیمین میں بھی لکڑی کچھ کم نہیں جلا کرتی تھی۔

پروفیسر نے پلوں پر اپنے تجربات کا آغاز کرنے

سے پہلے کئی دن تک لکڑی کاٹ کر اس کی کافی مقدار جمع کر لی کیونکہ اسے احساس تھا کہ ان تجربات کے دوران میں اسے بہت کم فراغت نصیب ہوگی لیکن جب وہ لکڑیاں کاٹ کر فارغ ہو گیا تو بھی اسے انتظار میں کچھ دن گزارنے پڑے کیونکہ اس وقت تک پلوں میں آپریشن فیمل پر سرجری کی تکلیف سہنے کی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ناچار اسے انتظار ہی کرنا پڑا۔

پھر ایک اور طوفان آ گیا۔ اس سے پہلے بھی الا سکا کے اس مخصوص جغرافیائی خطے میں دن صرف تین گھنٹوں کا ہی رہ گیا تھا۔ باقی وقت تاریکی میں گزارنا تھا لیکن اب تو اس شدید برف باری اور تاریکی میں رات اور دن کا فرق ہی مٹ گیا۔ ہوا اس قدر تیز و تند تھی کہ باہر نکلتا عذاب سے کم نہیں تھا۔ دو دن میں وہ صرف دو مرتبہ باڑے تک جا کر کتوں کو خوراک دے سکا۔ تیسرے روز اس نے سوچا کہ اب مزید انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک پلے کو لیبارٹری میں لا کر اس پر تجربات کا آغاز ہی کر دینا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ باڑے میں گیا۔

جو بھی اس نے ایک پلے پر ہاتھ ڈالا تو ڈیٹا نے غراہٹ سے احتجاج کیا۔ پروفیسر نے نفرت سے گھور کر کہا۔ ”ڈیٹا! یہ پلے اور تم میری مخلوق ہو۔ میں تمہیں اس دنیا میں لایا ہوں، میں تمہارے ساتھ یاں پلوں کے ساتھ جو سلوک چاہوں کروں گا۔ اگر تم میری راہ میں حائل ہوئیں تو.....“ اس نے فقرہ مکمل کرنے کے بجائے بایاں ہاتھ جب میں ڈال کر رپوایور نکال لیا پھر دائیں ہاتھ سے دوبارہ پلے کو اٹھانے کی کوشش کی تو ڈیٹا نے جھپٹ کر اس کی کلائی کو دانوں سے پکڑ لیا اور غرانے لگی تاہم اس نے کلائی کو نقصان نہیں پہنچایا۔

پروفیسر کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک اعلیٰ دماغ کا پروفیسر ایک کتیا سے دب جائے۔ اس کے خوف سے اپنا اہم ترین تجربہ کرنے کا ارادہ ترک کر دے یہ ناقابل تصور تھا۔

پروفیسر نے شدید غصے کے عالم میں کتیا کو شوٹ کر دینا چاہا اور بایاں ہاتھ بلند کرنا چاہا لیکن پھر کسی نے اس

اسے ہوش میں رکھا۔ ریوالور کے گرتے ہی سلیک نے اس کی کلائی چھوڑ دی تھی اور ریوالور کو جڑوں میں دبا کر باڑے کے ایک طرف چلا گیا تھا۔ پھر ڈینا نے بھی اس کی کلائی چھوڑ دی گویا اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اب کلائی چھوڑ دینے پر بھی پروفیسر انہیں یا ان کے نواسیہ پلوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

پروفیسر وہاں سے تیز تیز چلتا ہوا اپنے کیمپن میں واپس آ گیا۔ اس کے خفیف و غضب کا یہ عالم تھا کہ ایک گھنٹے تک تو وہ اس واقعے پر سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہی نہ ہو سکا پھر اس نے اپنے آئندہ لائحہ عمل کو مرتب کیا اور اپنی نوٹ بک اٹھا کر اس میں آج کے واقعے کے بارے میں یادداشت لکھنے لگا۔

”سلیک اور ڈینا ابھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے ان دونوں کو جنسی ملاپ کی اجازت اس لئے دی تھی کہ ان کے پلوں کو اپنے تجربات کے لئے استعمال میں لاؤں انہیں یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے ہاں پلوں کا جوڑا جو پہلی مرتبہ پیدا ہوا تھے اسے بھی میں نے اپنے تجربات میں استعمال کر لیا تھا اور وہ سبھی مر گئے تھے غالباً وہ اس مرتبہ اسی لئے واضح طور پر تجویز کئے ہوئے ہیں کہ میں ان کے پلوں کو کسی صورت میں بھی استعمال نہ کر سکوں ستم ظریفی کی انتہائی تو ہے کہ ان میں یہ سمجھ اور فہم میری ہی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ میں ہی ان کی شعوری صلاحیتوں کا خالق ہوں۔ آج ان کی یہ صلاحیتیں خود میسے ہی خلاف استعمال ہو رہی ہیں لیکن ان کی اس گستاخی اور بدتمیزی کے باوجود میں نے سوچا ہے کہ سلیک اور ڈینا کو ہلاک نہ کیا جائے اس کا سبب یہ ہے کہ میرے آئندہ تجربات کی کامیابی پر اگر کوئی پلازما زندہ ہے تو ان کی نگہداشت کے لئے سلیک اور ڈینا کا وجود ضروری ہوگا۔ تاہم میں ان کے خلاف ایک قدم اٹھانے کا ارادہ تو کر ہی چکا ہوں۔

آج انہوں نے جس انداز میں مجھ سے مل کر لی ہے اور وقتی طور پر مجھے نیچا دکھایا ہے آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ اب میں ان کی خوراک میں ایک ایسی دوا ملانے والا ہوں جس سے وہ وقتی طور پر بے ہوش

کی باتیں کلائی کو بھی جکڑ لیا۔ پروفیسر نے چونک کر دیکھا۔ سلیک نہ جانے کب اس کے پیچھے پیچھے باڑے کے اندر آ گیا تھا۔ شاید اس نے ڈینا کی غراہٹ کا مطلب سمجھ لیا تھا اور اب خطرے کا احساس کرتے ہی اس نے پروفیسر کے ریوالور والے ہاتھ کو بھی بے بس کر دیا تھا۔

سلیک غیر معمولی جسامت اور سو پونڈ وزن کا کتا تھا۔ اس کے سر کی مناسبت سے اس میں طاقت بھی زیادہ تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں پروفیسر کی کلائی کو چیر پھاڑ دیتا لیکن اس نے صرف کلائی کو جکڑا ہوا تھا اور کسی بات کا منتظر تھا۔ اس کی خوشخوار آنکھیں پروفیسر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ادھر ڈینا پروفیسر کی دوسری کلائی پکڑے ہوئے تھی۔ وہ دونوں غراہٹ کی مخصوص زبان میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ پروفیسر ڈال کا غصہ اب حیرت اور خوف میں بدل چکا تھا۔ وہ اس وقت انسانی آبادی سے دور بہت دور صرف دو کتوں کے آگے بے بس تھا۔

”سلیک، ڈینا! میری کلائیاں چھوڑ دو!“ اس نے تندہی سے کہا۔

ڈینا یوں غرائی جیسے اس نے پروفیسر کی بات سمجھ لی اور سلیک سے کچھ کہا ہو۔ سلیک نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اور پھر اس نے جڑوں کی ایک جنبش سے پروفیسر کے ریوالور والے ہاتھ کو جھٹکا دیا جس سے ریوالور پروفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر سلیک کے پاس زمین پر گر گیا۔ پروفیسر ڈال ریوالور چھوڑ دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ سلیک کے جھٹکے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ دونوں کتے اس کے دونوں ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ کر بازوؤں سے جدا کر دیتے اور وہ اس حالت میں تو اس برفانی خطے میں ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے ریوالور چھوڑتے وقت غصے، نفرت اور بے بسی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اس نے خود ہی تو ان کتوں میں ذہانت اور شعور پیدا کیا تھا۔ ایک لحاظ سے وہ اسی کی مخلوق تھے لیکن تھے تو وہ جانور ہی، ان کی یہ جرات کماحقہ تو بے بس کر لیں! اس سے نفرت کا کھلا اظہار کریں شاید وہ پاگل ہی ہو جاتا مگر جان کے خوف نے

وہ اطمینان سے اس حصے کی جانب بڑھا جدھر اس کے خیال میں ڈیٹا اور سلیک سری اور طوفان سے بچ کر آرام کر رہے تھے لیکن باڑہ خالی پڑا تھا۔

سلیک اور ڈیٹا اپنے دونوں بچوں سمیت وہاں سے جا چکے تھے۔ پروفیسر ڈائل کو غصے کے ساتھ ساتھ شدید صدمہ بھی ہوا کیونکہ انہی کتوں پر تو اس کی زندگی بھر کے تجربات کا دار و مدار تھا۔ وہ جلدی سے اپنے کیمین میں چلا گیا اور پھر مناسب لباس اور جوتے پہن کر باہر نکل آیا۔ وہ جلد از جلد کتوں کو تلاش کر لینا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ اور اب تو سلیک کو ان کے لئے خوراک کا بھی انتظام کرنا تھا۔

پروفیسر کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد انہیں تلاش کر لے گا۔ اس نے سوچا کہ اب اگر دونوں بڑے کتوں کو ہلاک ہی کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ انہوں نے پروفیسر سے ٹکر لینے کی حماقت کی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی اس نے سوچا کہ نہیں انہیں ہلاک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں زخمی کر کے پکڑ لینا ہی کافی رہے گا یا اگر وہ کسی ایسے وقت ان کی پناہ گاہ تک پہنچ جائے، جب وہ دونوں وہاں موجود نہ ہوں۔ خوراک وغیرہ کا انتظام کرنے کے لئے نکلے ہوئے ہوں تو وہ چپکے سے ان کے پلوں کو اٹھا کر اپنی لیبارٹری میں لے جائے گا۔ اس صورت میں سلیک اور ڈیٹا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے کیونکہ اپنی ذہانت کی بدولت وہ اسے پلوں پر قابض دیکھ کر ان کی زندگی کی خاطر پروفیسر کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں گے۔ پروفیسر تمام دن ان کی تلاش میں ناکام پھرتا رہا۔ اس کا یہ اندازہ غلط نکلا تھا کہ وہ انہیں بہت جلد ڈھونڈ نکالے گا۔

اگلے روز وہ دوبارہ اسی مہم پر نکلا اور اس کی تلاش بے سود ثابت نہیں ہوئی۔ برف پر سلیک کے قدموں کے نشانات نظر آئے جو بہت آگے تک جانے کے بعد ایک اور راستے سے دوبارہ واپس آ رہے تھے۔

پروفیسر کو یقین ہو گیا کہ اب وہ ان کی پناہ گاہ کے قریب آ پہنچا ہے۔ وہ ان نشانات کے ساتھ ساتھ چل دیا لیکن ایک دم اسے اپنے عقب میں ایک تیز غراہٹ سنائی

ہو جائیں اور پھر میں ان پر کوئی اس طرح آپریشن کروں گا کہ آئندہ وہ کبھی بھی میرے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہ بن پائیں یہ آپریشن کرنے سے قبل بھی مجھے اچھی طرح سوچنا ہوگا کہ ان کا آپریشن کس نوعیت کا کیا جائے جس سے وہ مجھے نقصان پہنچانے کے قابل تو نہ رہیں مگر اپنے پلوں کی دیکھ بھال کے قابل ضرور رہیں اور خود اہت چل پھر بھی سکیں۔“

طوفان کے شور و غل میں سلیک اور ڈیٹا اسی طرح غراہٹ آمیز آوازیں نکال نکال کر آپس میں کچھ کہہ رہے تھے پھر سلیک نے ریو اور کو بچوں میں اٹھایا اور ایک جگہ سے سخت برف کھود کر اسے خوب گہرے گڑھے میں دبا کر اوپر سے برف ڈال دی۔ برف باری کے سبب فوراً ہی اس کے باڑے تک آنے جانے کے نشانات بھی معدوم ہو گئے۔ اب کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس نے ریو اور کو کہاں چھپایا ہے! پھر اس نے ڈیٹا کے پاس پہنچ کر اسی مخصوص انداز میں غرا کر کچھ کہا۔ ڈیٹا بے چینی سے پہلو بدل بدل کر اپنے پلوں کو دیکھنے لگی۔ سلیک پہلے سے تیز آواز میں غرا لے گا جیسے ڈیٹا کو کوئی حکم دے رہا ہو۔

آخر ڈیٹا نے بڑی غری سے اپنے ایک پلے کو دانتوں میں پکڑا اور سلیک نے اسی طرح دوسرے پلے کو اٹھالیا۔ وہ دونوں برف باری میں باہر کی طرف چل دیئے۔ جہاں خاردار تاروں کے قریب برف کی سطح پہلے سے اونچی ہو گئی تھی۔

اگلے روز جب عارضی طور پر طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی اور سورج کی کمزور کرنیں برفانی وسعتوں پر پھیلیں تو پروفیسر ڈائل حسب معمول ان کے لئے خوراک لے کر باڑے میں پہنچا۔ آج پروفیسر نے خوراک میں وہ دو ابھی ملائی ہوئی تھی جو ڈیٹا اور سلیک کو فوری طور پر بے ہوش کر کے انہیں آپریشن کے لئے تیار کر دیتی۔ لیکن اس کے بار بار پکارنے کے باوجود کوئی بھی خاردار تاروں کے جھنگ سے باہر نہ آیا۔ اس نے خوراک کا برتن وہیں رکھا اور کیمین سے اپنی رائفل لے کر واپس باڑے میں آیا۔ وہ ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ تالا کھول کر

دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا بہت دور اسے سلیک نظر آ گیا لیکن سلیک اس کے وجود سے بے خبر نظر آتا تھا۔ اور اپنی ہی دھن میں غراتا ہوا کہیں جا رہا تھا۔ پروفیسر نے ان نشانات کے سراغ میں چلتا چھوڑ دیا اور چپکے سے سلیک کے پیچھے چل دیا۔ ان کے درمیان فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ سلیک کو کوئی بار کر ہلاک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ویسے بھی پروفیسر ڈائل اسے ہلاک کرنے کے بجائے اس کا پیچھا کر کے اس پناہ گاہ تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں ڈینا اور پلے چھپے ہوئے تھے۔ وہ اسی لئے سلیک کے قدموں کے تازہ نشانات پر چلتے لگا۔ سلیک خامی دور پہنچ چکا تھا۔ اب تو وہ نظر بھی نہیں آ رہا تھا مگر پروفیسر کو اطمینان تھا کہ وہ اس کے قدموں کے نشانات پر چلتے چلتے اس تک پہنچ ہی جائے گا۔

وہ بات جس کا پروفیسر ڈائل کو علم نہیں تھا، وہ یہ تھی کہ دراصل سلیک اسے غچہ دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ سلیک اپنے مستقبل کے تحفظ کی خاطر یہ معلوم کرنے کے لئے اپنے آقا کے کہن کی طرف گیا تھا کہ وہ کن سرگرمیوں میں مصروف ہے وہاں اس نے پروفیسر کو موجود نہیں پایا تھا۔ وہ پروفیسر کے قدموں کے نشانات کا پیچھا کرتا ہوا اس تک آ پہنچا تھا۔ رائفل دیکھ کر اس نے پروفیسر کے قریب آنے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ پروفیسر تو اس کے اوپر ڈینا کے پاؤں کے نشانات پر چلتے چلتے ان کی پناہ گاہ کے بالکل قریب آ پہنچا ہے تو اس نے غرا کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی اور اب وہ اسے پیچھے لگا لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سلیک بار بار دوڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا اور پھر پیچھے دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیتا تھا کہ پروفیسر اس کے پیچھے آ رہا ہے۔

پروفیسر کو ابتدا میں کتے کی اس دھوکے بازی کا علم نہ ہو سکا اور وہ بے وقوفوں کی طرح اس کا پیچھا کرنے میں لگا رہا۔ کئی میل تک چلتے کے بعد جب تاریکی پھیلنے لگی تو اسے احساس ہوا کہ سلیک اسے چل دے گیا ہے۔ اس نے جھلاہٹ کے عالم میں اس سمت کا رخ کیا جہاں سے

سلیک نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہاں دو ہی فرلانگ کے فاصلے پر اسے وہ جگہ بھی مل گئی جہاں انہوں نے پناہ لی تھی۔ اس جگہ کے ارد گرد بے شمار بچوں کے نشانات موجود تھے۔ یقیناً یہی ان کی پناہ گاہ تھی۔

پروفیسر ڈائل محتاط قدموں سے پناہ گاہ کی طرف بڑھا مگر اب وہ پناہ گاہ خالی پڑی تھی۔

ہوا یوں تھا کہ جب ڈینا نے سلیک کی غراہٹ سنی تھی تو اسے خطرے کا احساس ہو گیا تھا جس دوران میں سلیک پروفیسر کو اپنے پیچھے لگائے ہوئے تھا۔ ڈینا نے جلدی سے اپنے دونوں پلے یکے بعد دیگرے کسی اور جگہ منتقل کر دیئے تھے۔

پروفیسر کو شدید جھنجھلاہٹ ہونے لگی لیکن پھر اسے دکھائی دے گیا کہ ان کی نئی پناہ گاہ تک بھی بچوں کے واضح نشانات موجود ہیں۔ پروفیسر نے اب ان نشانات پر چلنا شروع کر دیا۔ وہ ہر قیمت پر ان کا سراغ لگا لینا چاہتا تھا لیکن اس تک دو دو میں تاریکی زیادہ ہو گئی تھی۔ ڈائل کو سلیک کی خوفناک غراہٹ بھی سنائی دینے لگی تھی۔ جیسے وہ اسے آگے بڑھنے پر خوفناک نتائج کی دھمکی دے رہا ہو۔ آخر پروفیسر ڈائل نے وہاں سے کیبن کی طرف واپس چلا جانا ہی مناسب سمجھا۔ کام دن کی روشنی میں ہی کرنا بہتر تھا۔ وہ محتاط انداز سے کیبن کی طرف چل دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر کہیں سلیک اس پر حملہ نہ کر دے! وہ یچھڑ چوکنٹا تھا۔ ایک کتے سے شکست کھانے پر وہ کسی طرح تیار نہیں تھا۔

کیبن تک پہنچنے کے بعد پروفیسر ڈائل اندر داخل نہیں ہوا بلکہ وہیں دروازے کے باہر کھڑا غور سے کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی جھٹھی حس اسے متنبہ کر رہی تھی کہ سلیک اس کے کیبن کی طرف ضرور آئے گا اور اس کا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ بہت دیر کے بعد اس نے دور سے کسی جانور کے ہونے کو کیبن کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یقیناً وہ سلیک ہی تھا۔ سلیک بڑے کانیاں انداز میں چند قدم چل کر رک جاتا تھا پھر ادھر ادھر کا جائزہ لیتا تھا کچھ سننے کی کوشش کرتا تھا اور آگے بڑھتا تھا۔

اس لئے اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر اسے اپناج نہ کر سکا تو ہلاک ہی کر ڈالوں گا۔

کاش! وہ پلے جلدی سے میرے ہاتھ لگ جائیں تاکہ میں اپنے تجربات کا آغاز کر سکوں۔ سلیک اور ڈینا کی ذہانت دیکھتے ہوئے مجھے ان کے پلوں پر اپنے تجربات کی کامیابی کا یقین سا ہونے لگا پھر ساری دنیا کے احق سائنسدان میری برتری اور عظمت کا اعتراف کریں گے.....“

اگلی صبح پروفیسر دوبارہ ان کی پناہ گاہ کی تلاش میں چل دیا۔ اس رات برف نہیں پڑی تھی اس لئے ان کے بچوں کے نشانات ابھی تک برف پر موجود تھے۔ وہ ان کی تلاش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ ان دونوں کو بچروں میں بند کر کے لیبارٹری میں رکھے گا تاکہ وہ دونوں اپنے پلوں پر ہونے والے تمام تجربات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ بعد میں وہ ان دونوں کو ہلاک کر ڈالے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہلاکت سے پہلے وہ دونوں کم از کم یہ احساس تو کر لیں کہ آخر انسانی ذہانت وہ بھی ایک برتر انسان اور ایک عظیم سائنسدان کی ذہانت ان کی حیوانی ذہانت سے بدبجز زیادہ اعلیٰ افضل اور برتر ہے۔ وہی ان کا آقا ہے لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا برف پر ان کے بچوں کے نشانات دھندلے پڑتے گئے کیونکہ وہاں کی برف بہت نرم تھی۔ رفتہ رفتہ نشانات بالکل معدوم ہی ہو گئے۔ شام تک وہ بالکل ناکام ہو کر دوبارہ کیمین کی طرف جا رہا تھا۔

کیمین کے پاس پہنچتے ہی پروفیسر کو محسوس ہوا کہ سلیک پھر وہاں تک آیا تھا۔ کیمین کے آس پاس اس کے بچوں کے نشانات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سلیک اس کی غیر حاضری کا یقین کر لینے کے بعد بڑی جرأت کے ساتھ دروازے کے ہینڈل کو دانتوں سے گھما کر کھول لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ وہاں سے وہ خشک گوشت کا ایک خاصا بڑا ٹکڑا اٹھا کر لے گیا تھا۔ کھانے پینے کی اور کئی چیزیں بھی ڈبوں میں بند وہاں موجود تھیں لیکن سلیک نے ان میں سے کوئی چیز نہیں اٹھائی

پروفیسر ڈائل اس کے مزید قریب آنے کا منہ نہ کر سکا۔ راتفل کی ریچ میں آجائے تو اس پر فائر کیا جائے۔ لیکن سلیک بھی بڑا کایاں اور چونکا ثابت ہوا۔ وہ پروفیسر کی راتفل کی ریچ میں آبی نہیں رہا تھا اور پھر ایک موقع پر وہ آگے بڑھنے کے بجائے واپس چل دیا، پروفیسر نے اسے واپس جانا دیکھ کر اس کے غیر واضح ہیولے پر ہی گولی چلا دی لیکن گولی چلاتے وقت پروفیسر کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ متحرک ہیولہ پہلی گولی کی آواز سنتے ہی جھٹکے کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

کیمین کے اندر پہنچ کر پروفیسر نے غصے اور جھلاہٹ کے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور ایک ٹھنڈے متوازن مزاج اور ہوش مند سائنس دان کی طرح اس واقعے پر خوب غور و خوض کرنے کے بعد اپنی ڈائری میں لکھا۔

”اب مجھے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ سلیک اور ڈینا کی ذہانت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ آج چالاک کتے سلیک نے اپنے بچوں کے نشانات کے ذریعے مجھے خوب گمراہ کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر مجھے اس راستے سے کسی طرح ہٹایا نہ گیا تو میں پندرہ منٹ بعد ان کی پناہ گاہ تک پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد جب میں ان کی پہلی پناہ گاہ کو خالی دیکھ کر دوسری پناہ گاہ تک جانے لگا تو واضح طور پر سلیک نے مجھے اس کام سے روکا۔ اس کے تیور بتاتے تھے کہ اگر میں آگے بڑھا تو وہ مجھ پر ضرور حملہ آور ہو جائے گا۔ جب میں کیمین میں واپس آیا تو وہ احتیاط سے میرے تعاقب میں آیا تاکہ یہ یقین کر سکے کہ میں آج رات دوبارہ اس کے پلوں تک پہنچنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا! یہاں بھی سلیک کی ذہانت کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ وہ کیمین کے نزدیک اس لئے نہیں آیا کہ کیمین کے اندر روشنی نہیں تھی اور اسے اس تاریکی میں کیمین سے قریب آتے ہوئے اپنے لئے خطرے کے وجود کا احساس تھا۔ اب تو میں اس پر فائر بھی کر چکا ہوں اس لئے اسے خطرے کا اور زیادہ احساس ہو چکا ہوگا۔ ممکن ہے اس کی اتنی زیادہ ذہانت آئندہ میرے لئے نقصان کا باعث بنے

تھی کیونکہ اسے یقیناً یہ علم تھا کہ وہ ابند ڈوبوں کو کھولنا اس کے لئے آسان نہیں ہوگا۔

پہلے تو پروفیسر ڈائل کو سلیک کی اس حرکت پر غصہ آیا لیکن پھر جب پروفیسر کو اس کی بڑھتی ہوئی ذہانت کا خیال آیا تو وہ مسکرانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو۔ بھلا میرا اور ایک کتے کا کیا مقابلہ، وہ ایک جانور اور میں عام انسانوں سے کہیں زیادہ ذہین انسانمندان، اس نے اپنے اسٹور روم میں جا کر وہ آہنی پھندے نکالے جو ریچھ پکڑنے کے کام آتے تھے۔ اس نے انہیں صرف کر کے صبح کا انتظار شروع کر دیا اور اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں تفصیل سے ڈائری لکھتا رہا۔ باہر ساری رات برف باری ہوتی رہی۔

ادھر سلیک اس برف باری میں اپنی نئی پناہ گاہ کے باہر کھڑا پہرہ دے رہا تھا شاید اسے خطرہ تھا کہ کہیں پروفیسر ڈائل رات کو بھی ان کے تعاقب میں وہاں نہ آ پہنچے! یہ پناہ گاہ ایک درخت کے کھوکھلے تن میں تھی اور اس میں ڈینا ماستا کے چننے سے سرشار ہو کر بار بار اپنے پلوں کو جھپٹ رہی تھی۔ اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد باہر سے سلیک کی ہلکی ہلکی غراہٹ کی صدا سنائی دے رہی تھی جسے سن کر وہ مطمئن ہو جاتی تھی کہ انہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

چار دن تک برف باری اتنی شدت سے ہوتی رہی کہ پروفیسر ڈائل کیبن سے باہر ہی نہ نکل سکا۔ تاہم اس نے موسم کی اس خرابی کو بڑے صبر سے برداشت کیا کیونکہ ایک لحاظ سے وہ اسے اپنے حق میں بھی سمجھ رہا تھا۔ اس طوفانی موسم میں یقیناً کتوں کو کوئی شکل نہ مل پاپا ہوگا اور لمبے بھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے نڈھال ہو چکے ہوں گے۔ پروفیسر یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ سلیک ان کی بھوک مٹانے کی خاطر کیبن کی طرف ضرور آئے گا اور پھر وہ اس کا شکار کر لے گا لیکن اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ سلیک نہیں آیا۔

پانچویں دن جب برف گرمی بند ہوئی تو پروفیسر نے خاص لباس اور جوتے پہنے، رائل رائل اٹھائی اور کیبن سے

باہر آ گیا، اسے ان کی تلاش نہ ہوتی تو بھی وہ آج کیبن سے ضرور نکلتا کیونکہ اسے امید تھی کہ آج سلیک اس کے کیبن سے خوراک حاصل کرنے ضرور آئے گا اور ان پھندوں میں سے کسی ایک میں ضرور پھنس جائے گا۔ اس نے یہ پھندے کیبن کے دروازے کے پاس اس طرح بچھا دیئے تھے کہ اندر پاؤں رکھنے والے کی ٹانگیں فوراً ان میں پھنس جائیں۔

برف پر چلتے ہوئے پروفیسر ڈائل مسکرا مسکرا کر یہی سوچ رہا تھا۔ پروفیسر کو آج بھی یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ وہ ان کی پناہ گاہ تلاش کر سکے گا۔ اس لئے وہ اندھا دھند چلا جا رہا تھا۔ وہ تو صرف واپسی کے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا تا کہ سلیک اس کے بچھائے ہوئے پھندوں میں پھنس چکا ہو۔ اسے یقین تھا کہ سلیک کے چھپنے کے بعد ڈینا اسے چھڑانے کے لئے ضرور وہاں تک آئے گی۔ اور وہ اسے دیکھتے ہی ہوائی فائر کر دے گا اور پھر ڈینا ضرور خوفزدہ ہو کر سیدھی اپنی پناہ گاہ کی طرف بھاگے گی پھر وہ اس کا تعاقب کرے گا اور یوں لمبے بھی اس کے ہاتھ آ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ چاہے تو ڈینا کو ہلاک بھی کر سکتا ہے اور واپسی پر سلیک تو اس کے قبضے میں ہی ہوگا۔

لیکن اچانک پروفیسر ڈائل کو ان کی دوسری پناہ گاہ نظر آ گئی۔ یہ ستم ظریفی ہی تو تھی کہ اس سے پہلے وہ پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتا تھا اور کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ پناہ گاہ کی تلاش نہیں کر رہا تھا اور وہاں تک آپہنچا تھا۔ کچھ دور اسے ایک گرے ہوئے درخت تک کتوں کے پنجوں کے بہت سے نشانات نظر آ رہے تھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ ضرور وہیں پناہ لئے ہوئے ہیں۔ پروفیسر نے فوراً رائل کا سیٹھنی بیچ ہٹا دیا اور آگے بڑھ کر زور زور سے آواز دی۔ ”سلیک، ڈینا! باہر نکل آؤ۔“

اسے یقین تھا کہ وہ فوراً باہر آ جائیں گے اور اتنے دنوں کے بعد دوڑ دھوپ کا ڈراپ سین ہو جائے گا کیونکہ انسانوں کی طرح سلیک اور ڈینا بھی رائل چلنے کے خطرناک نتائج سے آگاہ تھے۔ اب پروفیسر اپنی جگہ مندی

بلند ہوئی پھر اچانک کوئی بھاری بھر کم شے پروفیسر ڈائل پر اتنے زور سے آپڑی کہ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ سلیک اس کے عقب سے پوری قوت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا تھا اور اس کے پنجوں میں پروفیسر کے اور کوٹ کے چھتروے لٹک رہے تھے۔

رائفل پروفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب ڈینا بھی اس پر حملہ آور ہوگی۔ مگر پھر یہ دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا کہ ڈینا اور سلیک دونوں اسے چھوڑ کر اس کی رائفل کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ سلیک نے رائفل چھوڑ دی جو ڈینا کے جڑوں میں دبی ہوئی تھی۔ سلیک اپنی زبان میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ڈینا اس کا مطلب سمجھ کر رائفل کو گھسیٹ کر بہت دور لے جا رہی تھی۔ اور سلیک اب اس کھوہ کے باہر کھڑا تھا۔ جہاں سے پلوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنی سرخ آنکھوں سے پروفیسر کو گھور رہا تھا۔ اس کے تیرے بے حد خطرناک تھے۔

پروفیسر نے چپ چاپ وہاں سے کھٹکنا چاہا۔ اس حالت میں ان کے مقابلے کا خیال بھی حماقت سے کم نہ ہوتا۔ پروفیسر نے بھاگ نکلنا چاہا لیکن اب ڈینا رائفل کو کہیں دور چھوڑ کر واپس آ گئی تھی اور وہ سلیک سے بھی زیادہ برہم نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔ آخر وہ ماں تھی اور اس شخص نے اس کی اولاد پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کی تھی۔ اب وہ اس پر حملہ آور ہونے کے لئے لپکی۔ پروفیسر ڈائل نے خوفزدہ ہوا چیخ ماری اور پھر اس کے حملے سے بچنے کے لئے بھاگا۔

وہ حیرت انگیز پھرتی سے ایک نڈ منڈ درخت لے تنے پر چڑھ گیا۔ ڈینا غرائی ہوئی اس درخت کے ارد گرد چکر لگا رہی تھی۔ وہ درخت پر چڑھ نہیں سکتی تھی۔ ورنہ اب تک اس نے پروفیسر کی ٹکا بونی کر ڈالی ہوتی۔ اب وہ دونوں پروفیسر سے ذرہ بھر بھی خوفزدہ نہیں تھے۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ غیر مسلح ہونے کے بعد وہ ان کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتا۔

پروفیسر ڈائل کی انا کو شدید ترین ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ

کے احساس سے مسکرا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ”انسان آخر انسان ہی ہے، بھلا جانور اس کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے! اس نے دوبارہ چلا کر کہا۔ ”باہر نکل آؤ سلیک اور ڈینا! انہیں تو میں وہیں آ کر تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

کھوہ میں کچھ پلچلی سی پیدا ہوئی اور پھر ڈینا غرائے ہوئے باہر نکلے۔ وہ شعلہ باز نظروں سے اسے گھور رہی تھی لیکن یہ ظاہر تھا کہ وہ رائفل سے ڈر کر فرار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی کیونکہ اس طرح اس کے بلے پروفیسر کے قبضے میں آ جاتے۔ بھلا وہ یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اور پروفیسر کی طرف بڑھ بھی نہیں رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس صورت میں پروفیسر یقیناً اس پر گولی چلا دے گا۔ بس وہ وہاں کھڑی اسے گھورتی جا رہی تھی۔

”ہوں، اب بتاؤ قابو میں آئی ہو یا نہیں!“ پروفیسر نفرت سے اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ سلیک یا ڈینا اس کے الفاظ سمجھنے کی کتنی اہلیت رکھتے ہیں لیکن اس سے پہلے بھی تو وہ ان سے باتیں کرتا ہی رہا تھا۔

”ڈینا اگر تم نے کوئی حرکت کی تو میں تمہیں فوراً شوٹ کر دوں گا۔ میں اب تمہارے اور سلیک کے بچوں کو ساتھ لے کر کیمپن میں جا رہا ہوں۔ اب مجھے ان میں ذہانت کے ساتھ ساتھ اطاعت کا جذبہ بھی پیدا کرنا پڑے گا تاکہ وہ تمہاری طرح بے وفا اور نافرمان نہ نکلیں سمجھیں!“

اب پروفیسر ڈائل آہستہ آہستہ ڈینا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے کسی طرف سے بھی اپنے لئے خطرے کا کوئی احساس نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ سلیک تو اب تک اس کے کیمپن میں جا کر پھندے میں پھنس چکا ہوگا۔ اب وہ ڈینا کی دو ٹائلیں بیکار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تاکہ وہ پلوں کی پرورش کے لئے زندہ رہے اس کے بعد وہ ان سب کو کیمپن میں لے جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں پہنچ کر بے بس سلیک کے زخموں پر نمک چھڑکے اور اسے تملانے پر مجبور کر دے۔ سلیک کو تو وہ ہلاک ہی کر دینا چاہتا تھا تاکہ نہ رہے بائیں نہ بچے بائیں۔

پروفیسر نے رائفل کی نال کا رخ ڈینا کی طرف کر دیا۔ ڈینا کے حلق سے شدید غصے اور نفرت کی غراہٹ

پروفیسر کے تمام جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ غالباً سلیک اور ڈیٹا بیدار ہو گئے تھے اور پروفیسر کو درخت پر نہ پا کر اس کی تلاش میں روانہ ہو گئے تھے۔ اب وہ پروفیسر کو ڈھونڈ چکے تھے اور کسی بھی لمحے اس پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔

پروفیسر کے اندازے کے مطابق اب کیمین زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اسے کیمین کا ہیولہ نظر آنے لگا تھا اگر وہ اپنے جسم کی پوری قوت و طاقت صرف کر کے ایک دم دوڑ لگا دے تو ان خونخوار کتوں کے حملے سے محفوظ ہو سکتا تھا۔ کیمین میں پہنچ جانے کے بعد کتے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

پروفیسر ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے تیز غرائشیں سنائی دیں۔ یقیناً کتے اس پر حملہ کرنے والے تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ پوری قوت سے کیمین کی طرف دوڑ پڑا۔ پروفیسر بھاگتا ہوا کیمین کے دروازے میں داخل ہوا اور اسی وقت اس کے منہ سے ایک بھیا تک چیخ بلند ہوئی۔ وہ منہ کے بل ٹھوکر کھا کر گر اٹھا۔ پھر اس کی گردن ٹھکنے میں پھنس گئی تھی۔

سلیک اور ڈیٹا جب کیمین کے دروازے پر پہنچے پروفیسر دم توڑ چکا تھا۔ سلیک نے غلہ کر ڈیٹا سے کچھ کہا اور دونوں ہی کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ سلیک کا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔

پروفیسر ٹھنچے لگاتے وقت یہ بھول گیا تھا کہ سلیک ٹھنجنوں کو دیکھ رہا ہے اور ان کے استعمال سے بھی واقف ہے۔ جب پروفیسر ان کی تلاش میں بھٹک رہا تھا تو سلیک کیمین تک آ کر ٹھنجنوں کو دیکھ چکا تھا اور کیمین میں داخل ہوئے بغیر واپس ہو گیا تھا۔ سلیک اور ڈیٹا نے دانستہ طور پر پروفیسر کو فرار کا موقع دیا تھا تا کہ پروفیسر کیمین کی طرف روانہ ہو جائے اور وہ دونوں راستے میں اسے اتنا بدحواس کر دیں کہ پروفیسر کو ان ٹھنجنوں کا خیال ہی نہ آئے جو اس نے کیمین کے دروازے سے لگا کر رکھ دیئے تھے۔



پروفیسر بی ایچ ڈائل بریڈک یونیورسٹی کا مانا ہوا سائنسدان ایک عظیم اور برتر انسان، جو دوسرے انسانوں سے بھی مات نہیں کھاتا تھا، آج دو حقیر کتوں نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ کتے بھی وہ جن میں ذہانت اور شعور خود اس کی تجربات کے ذریعے پیدا ہوئی تھی لیکن وہ انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ انتظار اس بات کا کہ اب وہ دوبارہ کسی نئی پناہ گاہ کی تلاش میں چل دیں گے پھر وہ درخت سے اتر کر کیمین میں چلا جائے گا۔ لیکن کتوں کا ارادہ وہاں سے ٹٹنے کا نہیں آتا تھا۔ بھلا اب انہیں اس جگہ پر کیا خطرہ درپیش تھا کہ وہ کسی نئی پناہ گاہ کی تلاش میں نکلیں، پروفیسر ڈائل تو بے بس انداز میں درخت پر چڑھا ہوا تھا۔

چنانچہ پروفیسر ان کے وہاں سے ٹٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ سردی میں بھی شدت پیدا ہو گئی اور پھر برف باری شروع ہو گئی، اسے اپنا خون جتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اور چار دہائی ہوئی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ پروفیسر ڈائل نے سلیک اور ڈیٹا کے درمیان غراہوں کا تبادلہ محسوس کیا۔ برف باری اب ختم ہو چکی تھی۔ پروفیسر نے سوچا کہ یقیناً ان دونوں نے اسی کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا ہے۔ اس نے دونوں کے ہیولوں پر نگاہیں گاڑ دیں۔ کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں اسے اونگھتے نظر آئے پھر جیسے وہ اپنے مکے پر سر رکھ کر سو گئے۔

پروفیسر کے کانپتے ہوئے جسم میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔ وہ بہت احتیاط اور خاموشی کے ساتھ پہلے سے نیچے اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب انسان اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہو تو یوں بھی اس کی قوت دوچند ہو جاتی ہے۔ پروفیسر انتہائی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کیمین کی طرف لوٹ رہا تھا لیکن اس کے حواس پر کتوں کا خطرہ بھی مسلط تھا۔ ابھی اس نے کچھ فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ اسے احساس ہوا جیسے دبے پاؤں کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ اس برفانی ویرانے میں اس کا تعاقب صرف سلیک یا ڈیٹا ہی کر سکتے تھے۔



پراسرار وجود

ساجدہ راجہ - ہندواں سرگودھا

ایک خوب رو نوجوان صوفے پر بیٹھا تھا کہ اچانک اس جگہ دھواں اٹھا اور پھر اس جگہ ایک بہت ہی خوفناک ناگ موجود تھا اس کی قہر آلود نگاہوں سے جنگاریاں نکل رہی تھیں کہ اس کی پہنکار سے پورا کمرہ دھل گیا۔

ایک مافوق الفطرت ہستی کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر اہل دل عیش کر انھیں گے

وہ روزانہ ٹائٹ کلب جانے کی عادی تھی ڈرنک بھی کرتی تھی کبھی کبھار کسی کے بستر تک بھی..... مغرب میں یہ سب فیشن ہے اور اگر کوئی ان چیزوں سے دور ہو تو لوگ حیران نظروں سے اسے دیکھتے اور پاگل سمجھ کر چل دیے ہیں۔

جینا بھی ان میں سے ایک تھی لیکن وہ صرف ان کوئی اپنے بیڈروم تک آنے دیتی جن میں کچھ خاص ہوتا اور دولت تو پھر لازمی چیز ہوتی۔

واک کے لئے جانا اس کا معمول تھا پہلے تو یہ آدی اسے کبھی دکھائی نہیں دیا کہ اچانک ہی ایک دن اسے راستے

جینا ہر روز اسے اپنے راستے میں کھڑا ہوا دیکھتی تو وہ یک ٹک جینا کو ہی گھور رہا ہوتا تھا۔

جینا کی عادت تھی ہر روز واک کے لئے پہاڑیوں کے دامن تک جانے کی، پہلے دن وہ اسے ہری بھری سڑک کے کنارے کھڑا نظر آیا تھا وہ دلچسپی سے جینا کو تیز تیز چلتے ہوئے دیکھ رہا تھا اس دن جینا نے اسے نظر انداز کر دیا اور تیز تیز چلتے کا سلسلہ جاری رکھا، ویسے بھی وہ بہت خوبصورت تھی اور نہ جانے کتنے ہی اس کی قربت کے خواہش مند تھے، اس کی ایک جھلک سے وہ اپنی جتنی آنکھوں کو لحظہ بھر کے لئے ہی سہی سکون پہنچاتے تھے۔

اسے جانا ہوا دیکھتی رہی لیکن ایک بات اسے مسلسل چھہ رہی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا بات ہے اس نے کندھے اچکائے اور اپنے راستے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

رات کو کلب کا وہی مخصوص ماحول تھا تیز میوزک، نیم تاریک ماحول..... ایک دوسرے کی بانہوں میں جھولنے لٹے رکھ کر تے جوڑے..... جام پہ جام..... اور مختصر لباس میں قیامت ڈھانچا لڑکیاں جن میں جینا بھی تھی وہ آج خصوصی تیار سے آئی تھی۔ وہ آدی جس نے اپنا نام پتیر بتایا تھا مسلسل اس کے حواسوں پر چھایا ہوا تھا۔

وہ بار بار مرکزی دروازے کی طرف دیکھتی تھی اور پتیر کو نہ پا کر مایوس ہو جاتی۔ بہت سے لوگ جو جینا کی توجہ کے منتظر تھے اسے کسی اور کا منتظر پا کر رشک اور کچھ حسد میں مبتلا تھے کئی آدی جینا کو اپنے ساتھ قص کی دعوت دے چکے تھے لیکن وہ سب کو مصنوعی مسکراہٹ سے انکار کرتی رہی۔ حیرت کی بات ہی تو تھی کہ وہ آدی جو مسلسل نہ جانے کتنے دن اسے دیکھنے کے لئے اس کی راہ میں کھڑا ہوتا تھا اور جسے یوں اپنی طرف دیکھا پا کر جینا کو غصہ آ جاتا تھا آج وہ اتنی ہی بے چینی سے اس آدی کی منتظر تھی جو شاید اپنی اہمیت بڑھانے کے لئے جان بوجھ کر اتنی دیر کر رہا تھا۔

اب اسے سمجھ بھلا ہٹ سی ہونے لگی تھی وہ بھلا کسی کا اتنا انتظار کرنے والی کب تھی بلکہ دوسرے کو انتظار کی کوفت میں مبتلا کر کے لطف اٹھانے والوں میں سے تھی لیکن آج.....؟

اس نے دروازے سے نظریں ہٹا کر اکتائے ہوئے انداز میں اسٹیج کی طرف دیکھا اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا ادھر سے نظریں ہٹا کر اپنے گلاس پر نظریں جمادیں۔

کچھ دیر یوں میزری اور پھر اچانک اس نے اپنی نظریں اٹھائیں اور پتیر کو اپنے سامنے پا کر دھک سے رہ گئی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں یک تک اس کی طرف

میں نظر آیا اور پھر یہ معمول بن گیا، کبھی نہ وہ نظر انداز کرتی رہی پھر ایک دن اس نے اس آدی سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ وہ تیز چلتے ہوئے اس کی طرف کئی اور تیز لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”اے مسٹر..... کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ کیوں، ہر روز میرے راستے میں کھڑے ہو جاتے ہو؟“ جینا تنک کر بولی لیکن دل ہی دل میں اس کے حسن سے خائف ضرور ہو گئی۔

وہ آدی تھا کہ کوڈی دپوتا آج سے پہلے اس نے اتنا حسین مرد کہاں دیکھا تھا وہ سمجھتی تھی کہ جتنے مرد بھی اس کی زندگی میں آئے تھے وہ سب حسین ترین تھے لیکن اس آدی کو دیکھ کر اسے اعتراف کرنا پڑا کہ دوسرے تو کچھ بھی نہیں تھے، اصل وجاہت تو یہ ہے۔

جینا کی بات سن کر اس کی پرکشش ترین آنکھوں میں تسخرانہ حیرت پھیل گئی۔ ”کیا میں؟“ اس نے اپنے آس پاس دیکھا۔

”میں تو اپنے راستے پر ہی کھڑا ہوں آپ کا راستہ تو غالباً یہ ہے جہاں آپ کھڑی ہیں۔“ اس نے ہاتھ سے لمبی سیدی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

جینا شپٹا گئی آدی مسکرایا اور جینا کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ ”تھی خوبصورت مسکراہٹ۔“ وہ دل ہی دل میں اس کی وجاہت کی اور قائل ہو گئی۔

”ویسے محترمہ..... کیا چپ چاپ کھڑے ہو کر کسی کو دیکھنا جرم ہے کیا؟“ اس نے سوالیہ نظریں جینا کی نظروں میں گاڑ دیں اور جینا کو لگا وہ سرزد ہو چکی ہے۔ وہ بنا آنکھیں جھپکائے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور وہ ساکت سی اس کی شہد رنگ آنکھوں کے سحر میں جکڑی جا چکی تھی۔ وہ ایک سے ٹھنکنا راتو جیسے طلسم ٹوٹ گیا جینا نے گہرا سانس بھرا بلکہ وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”ویسے محترمہ مجھے پتیر کہتے ہیں اور آپ.....؟“

”جینا.....“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”اوکے مس جینا پھر کلب میں ملاقات ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف بڑھ گیا اور جینا حیرت سے

دیکھ رہا تھا اس کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی شاید اسے اندازہ تھا جینا کی اپنے لئے بے قراری کا۔

وہ مسکراتے ہوئے ٹیبل کے قریب آیا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے میں پیوست تھیں پھر پیڑ نے ہی ہولے سے ہٹکھار کر اس کے ساکت وجود میں حرکت پیدا کی۔

نہ جانے کیوں وہ جب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھتی سحر زدہ ہی دیکھے جاتی اسے ایسا لگتا جیسے کسی نے اسے باندھ دیا ہو۔ وہ آکر جینا کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
”ہیلو مس جینا کیا حال ہے؟“

”معذرت چاہتا ہوں مجھے کچھ دیر ہوگئی دراصل میں کہیں مصروف تھا آپ کو انتظار کی زحمت سے گزرنا پڑا۔“

جینا خاموش ہوگئی حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ”کچھ“ نہیں بلکہ کافی زیادہ دیر ہوگئی ہے لیکن نہ جانے کیوں اس شخص کے سامنے اس کی زبان بند ہو جاتی تھی وہ کبھی خاموش بیٹھنے والوں میں سے تو نہیں تھی۔

”مس جینا کیا آپ بولتی نہیں ہیں؟ اگر اس دن میں آپ کو بولتے ہوئے نہ سنتا تو میں یہی سمجھتا کہ اتنی حسین لڑکی یقیناً گونگی ہے۔“ یہ سن کر جینا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”نہیں..... دراصل میں آپ سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتی میں نے حقیقت میں آپ سے اتنی متاثر ہوئی ہوں کہ جب آپ سامنے آتے ہیں تو میرے الفاظ جیسے کہیں کھو جاتے ہیں۔“ جینا نے صاف گونگی سے کام لیا۔
”اوہ.....“ پیڑ نے معنی خیزی سے کہا۔ ”یعنی مجھے لگتا تھا کہ صرف میں ہی اس آگ میں جل رہا ہوں لیکن

کئی تو ابھر بھی نہیں۔“ اس نے جینا کی طرف اشارہ کیا۔ ”یقیناً کرو مس جینا میں نے جتنے بھی انسان دیکھے ہیں ان میں صرف آپ ہی سے متاثر ہوا ہوں اور آپ یقیناً ہیں ہی پسند کرنے کے لائق۔“

جینا اس تعریف پر خوش تو کیا ہوتی اس کا ذہن اس جملے پر اٹک گیا۔ ”انسان..... تو کیا یہ انسان نہیں ہے؟“

اس نے محض سوچا ہی نہیں بلکہ پیڑ سے سوال بھی کر لیا۔ اس کی بات پر پیڑ اپنی زور سے ہنسا کہ جینا کو لگا کہ وہ پاگل ہو چکا ہے۔

”اوہ! کم آن جینا میری اس بات کو تو تم نے ذہن پر سوار کر لیا ہے میں نے یونہی ایک لفظ بول دیا۔“ جینا مطمئن ہوگئی۔ ”تم کچھ پیو گے؟“ اس نے پیڑ سے پوچھا جو بڑی فرصت سے اسے ہی دیکھنے میں مصروف تھا۔

”نہیں ڈارلنگ میں بس تمہیں دیکھوں گا۔“ مغربی ماحول میں رہنے والی جینا ایک پل کو تو حیران ہوگئی لیکن جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا ہشرم و حیا کا وہاں کیا تعلق.....؟

”ایسے کیوں دیکھتے رہتے ہو؟“ جینا نے اک ادا سے پوچھا جو اب پیڑ کے لبوں پر پیار بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔
”دل ہی نہیں بھرتا۔“ جواب حسب توقع اور من پسند تھا جینا اور اٹھلا گئی۔

وہ دونوں اپنے آپ میں مگن تھے یہ جانے بنا کہ ان کی میز سے کچھ ہی فاصلے پر کوئی مسلسل انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا ہے۔

وہ پارک تھا جینا کا چاہنے والا۔ جس کو جینا گھاس ڈالنا بھی گوارہ نہیں کرتی تھی اور وہ کئی پنک کی مانند اس کے ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا اب بھی وہ اس وجہ سے آدمی سے نفرت کی حد تک حسد محسوس کر رہا تھا جو آج پہلی بار کلب آیا تھا اور آتے ہی کلب کے سب سے انمول ہیرے کو چھسایا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ آدمی کلب تو آج ہی آیا لیکن جینا اور اس کی شناسائی پہلے کی ہے۔

پیڑ کو کچھ عجیب سامعوس ہوا اس نے بالکل اسی طرف دیکھا جہاں پارک انہیں ہی دیکھنے بلکہ گھورنے میں مصروف تھا پیڑ کو اپنی طرف دیکھا پارک اس کی آنکھوں میں نفرت کی سرفی پھیل گئی۔

جینا کی نظریں پیڑ کی نظروں کے تعاقب میں اٹھیں اور پھر پارک پر جم گئیں پارک کو دیکھ کر اس کی خوبصورت

آنکھوں میں نفرت ہلکوریے لینے لگی۔

دور تک ان کا پیچھا کیا۔

”تم پیتے بھی ہو۔“ جینا نے مخمور لہجے میں اس سے کہا اور اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔

”نہیں.....“ جینا کچھ اور کھسک آئی۔ یہ پہلا آدمی تھا جس کی طرف جینا کو خود پیش قدمی کرنا پڑی تھی۔

جینا نے اپنے بازو اس کی گردن میں جامل کر دیئے

اور اپنے چہرے کو اس کے چہرے کے قریب لائی۔ پیڑ نے

اسے مزید قریب کر لیا اس کے گرم سانس جینا کا چہرہ

اور گردن جھلسانے لگا اسی گرمائش بھلا سانسوں میں کب

ہوتی ہے؟ جینا نے دل میں سوچا۔

کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک پیڑ نے جینا کو ایک

جھٹکے سے خود سے الگ کر دیا۔ جینا حیران اور مخمور نگاہوں

سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا ہوا؟“ اس نے پیڑ سے

پوچھا جو اپنے آپ کو سنبھالنے میں مصروف تھا۔

”کچھ نہیں مجھے جانا ہوگا۔“ اس نے خلاف

توقع بات کی

ایسا تو آج تک نہیں ہوا تھا کہ کوئی یوں جینا کے

پاس سے ایسے اٹھ کے آ جاتا۔ طوفان میں بیچ بھور میں

چھوڑ کے چلا جاتا ابھی تو شیشی کنارے پر ہی تھی کہ وہ واپس

لوٹنے کی بات کر رہا تھا۔

”کہاں اور کیوں۔“ جیسے الفاظ بے معنی تھے۔ وہ

چلا گیا جینا کو حیران و پریشان چھوڑ کے۔

دوسرے دن وہ پھر کلب میں موجود تھا جینا کے

پاس اسی میز پر..... بارکرویسے ہی انہیں گھورنے میں

مصروف تھا کل والی کوئی بات ان کے درمیان میں نہیں

ہوئی تھی کوئی اور ہوتا تو جینا اپنی اس بے عزتی کا بدلہ ضرور

لیتی کہ اسے نظر انداز کرنا کیا ہوتا ہے لیکن یہاں پیڑ تھا جس

کے آگے وہ بے بس ہی ہو جاتی تھی۔

پیڑ نے سوالیہ نظروں سے جینا کی طرف دیکھا جینا

اس کا اشارہ سمجھ گئی یہ پارکر ہے۔ ”ایک نمبر کا

فلرٹی۔ بد معاش..... کب سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے

مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا لیکن میں اس میں کچھ پیس کر پارسی

کیونکہ کسی کو دیکھنے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے وہ مجھے اپنے

بیڈروم تک لے جانا چاہتا ہے میں کئی بار انکار کر چکی ہوں

مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی مل چکی ہیں لیکن مجھے اس

کی کوئی پرواہ نہیں۔“

پیڑ نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا لیکن اس کی

خوبصورت پیشانی ٹکٹوں سے بھر چکی تھی۔

”تم اسے چھوڑو۔ ہم اپنی بات کرتے

ہیں۔“ جینا نے پیڑ کی توجہ ادھر سے ہنادی اور وہ اس

میں کامیاب بھی ہو گئی۔

”تم نے بتایا نہیں کہ تم کہاں رہتے ہو۔؟ کیونکہ

اس ہفتے سے پہلے میں نے تمہیں بھی نہیں دیکھا۔“

”میں یہاں سے کافی دور رہتا ہوں پہاڑوں کے

اس پار، اس علاقے میں یونہی آ نکلا اور تمہیں دیکھ کر یہیں کا

ہو کر رہ گیا اب تو لگتا ہے کہیں جانیں پاؤں گا۔“ اس کے

لہجے میں کوئی توبہات تھی کہ جینا آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھنے

پر مجبور ہو گئی اور پھر اس کی آنکھوں میں محبت اور چاہت کا

اک جہان آباد دیکھ کر جلدی سے نظریں نیچے جھکا گئیں۔

وہ ایک ٹک اس کی طرف محبت پاش نظروں سے

دیکھتا تو جینا کے اندر اٹھل پھٹھل سی ہونے لگتی۔

”کافی رات ہو گئی ہے مجھے چلنا چاہئے تمہیں بھی

گھر جانا ہوگا۔“ پیڑ نے جینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

اس کی بات پر جینا بے چین ہی ہو گئی۔

”کیا تم میرے گھر چلو گے۔“ یہ پہلا موقع تھا

جب اس نے کسی اور کو اپنے گھر لے جانے کی بات کی تھی

، پیڑ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

جینا خوش ہوئی۔

”چلو.....“ اور وہ دونوں جینا کے فلیٹ جانے

کے لئے اٹھ گئے پارکر کی نفرت بھری نگاہوں نے

ہوئے پارکر سے کہا۔

”تمہیں جو کہنا مجھ سے کہو پیڑ کو کچھ مت کہو۔“
”نہیں آج فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے۔“ اس نے

ٹرک پر بازو دھاپا پتول کارخ تو پہلے ہی پیڑ کی طرف تھا۔
وہ ہر حال میں مرنے مارنے کا ارادہ کر کے آ
تھا پیڑ جان چکا تھا اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا ایک عجیب
بات ہوئی۔ جس جگہ پیڑ بیٹھا ہوا تھا وہاں اب کچھ بھی
موجود نہیں تھا۔

مگر ایک سنہرے رنگ کا خوبصورت اور بہت بڑا
سانپ وہاں موجود تھا۔ جینا اور پارکر دونوں بچنی پھٹی
آنکھوں سے اس سانپ کی طرف دیکھ رہے تھے جو رینگتا
ہوا صوفے سے نیچے اتر رہا تھا۔

جینا سخت صدمے کی کیفیت میں تھی اسے اچانک
یاد آیا تھا کہ اسے پیڑ سے ہر بار ملاقات پر کیا عجیب سی بات
محسوس ہوتی تھی۔

وہ عجیب بات پیڑ کی آنکھیں نہ جھپکتا تھا وہ ہمیشہ
ایک ٹک بغیر آنکھیں جھپکے جینا کی طرف دیکھتا رہتا تھا
اور اسے اب پتہ چلا تھا کہ سانپ بھی آنکھیں جھپکتا اور یہ
بھی کہ سو سال کی عمر کے بعد وہ ہر روپ میں آسکتے ہیں۔

سانپ تیزی سے بت بنے پارکر کی طرف
بڑھا۔ سانپ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر پارکر کے بے جان
وجود میں حرکت ہوئی اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا سانپ
اس کی پنڈلی پڑس چکا تھا، اس کا زہر اتنا شدید تھا کہ منٹوں
سینکڑوں میں پارکر کا رنگ نیلا پڑ گیا اور وہ جیس پھٹی
آنکھیں لئے گر گیا۔

جینا پاؤں سینے پیڑ پر بیٹھی ہوئی تھی اس کی آنکھیں
کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ سانپ نے پارکر
کو ڈسنے کے بعد مڑ کر جینا کی طرف دیکھا اور پھر دروازے
کی طرف بڑھ گیا۔

جینا کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی، اس نے
زور سے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

نظروں سے دیکھا۔ پیڑ نے ایک گہرا سانس بھرا اور جینا
کے ساتھ چل پڑا۔ پارکر نے غصے سے ہاتھ کا مکامیز پر مارا
پھر ہاتھ پکڑ کر گراہ کر رہ گیا۔

اس رات بھی وہی ہوا۔ چنگاری شعلہ بنی لیکن اس
سے پہلے کہ شعلہ بھڑک کر آگ بنا پیڑ اس سے الگ ہو گیا
جینا کی آنکھوں میں مارے حزیں کے آنسو آ گئے۔ یہ
اس کی ذات کی نفی تھی..... مکمل نفی..... لیکن وہ پیڑ سے کچھ
نہیں کہہ سکتی تھی اسے اس سے محبت جو جو بھی تھی۔ زندگی کی
پہلی حقیقی محبت..... پیڑ اس کے پاس سر جھکا کر بیٹھا تھا۔
باہر دروازے پر کھٹکا ہوا..... جینا چونکی، پیڑ نے
عجیب سی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ جیسے
اسے کوئی خطرہ محسوس ہوا ہو۔

اور وہی دروازے کے پتھوں بچ پارکر کھڑا تھا
ہاتھ میں ریوالتور لئے جس کا رخ پیڑ کی طرف تھا۔
جینا کی آنکھیں خوف سے پھٹنے کے قریب
ہو گئیں اس کے عکس پیڑ پر سکون انداز میں پارکر کی طرف
دیکھ رہا تھا۔

”حرام زادے.....“ پارکر کی آواز
گونجی۔ ”تو میرے اور اس کے بیچ آ گیا۔“ اس نے جینا کی
طرف اشارہ کیا۔ ”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“
”ایک منٹ میری بات سنو۔“ پیڑ نے ہاتھ کے
اشارے سے اسے روکا۔ ”کیا جینا اور تمہارا کوئی معاہدہ
ہوا تھا؟“

”نہیں.....“ پارکر نے الجھن بھری نظروں سے
اس کی طرف دیکھا۔

”پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں تم دونوں کے بیچ
آ گیا ہوں.....؟ جہاں تک مجھے پتہ ہے جینا تمہیں پسند
بھی نہیں کرتی پھر تم کیسے اس سے زبردستی کر سکتے ہو؟“

”جو بھی ہو میں تمہیں تو چھوڑوں گا نہیں ساتھ میں
اس کو بھی اور پہنچا دوں گا۔“ اس کا اشارہ جینا کی طرف تھا۔
جینا کا تو کاٹو بدن میں ایبونی کے مترادف
حالت تھی پھر بھی بولی۔

”پارکر دیکھو.....“ اس نے بشکل تمکونے



چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال بی گئی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شملہ جان لیوا اور نفاقل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کھلنی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دینار ہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دگلداز کہانی

”تم کیا سوچنے لگے ہو.....؟“ سرلا اس کے پاس کھڑی ہوئی تو اس کا سر اپا آتش فشاں کی طرح تپش دیتا تھا..... وہ جس ہوشربا حالت میں تھی وہ نہ کسی خزانے سے کم نہیں تھی بلکہ قیامت تھی۔ اس کے جذبات تند ہو رہے تھے..... ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے جذبات کے دلدل میں گر سکتا ہے۔

”میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ ان دونوں میں سے کس کا انتخاب کروں؟“ آکاش نے جذبات کے بھنور سے نکل کے جواب دیا۔ ”اس لئے کہ میں ان دونوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں..... میرے لئے ناممکن ہے کہ صرف ایک کا انتخاب کروں؟ میں بڑی الجھن اور کش مکش میں پھنس گیا ہوں۔“

”میں تمہیں اس مشکل سے نکال سکتی ہوں.....؟“ وہ بولی۔ ”لیکن اس کے لئے میری ایک شرط ہے.....“

”تمہاری کیا شرط ہے سرلا.....؟“ وہ حیرت سے بولا۔ ”بات یہ ہے کہ آکاش میں تمہیں سپنوں میں صدیوں سے دیکھتی آ رہی ہوں..... تمہیں سامنے پا کر مجھے کسی بات کا ہوش نہیں رہا ہے..... تم جیسا تصوراتی محبوب میں نے اپنی دنیا میں اور سپنوں میں نہیں دیکھا..... میں یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے صرف ایک مرتبہ

”آکاش“ کو اپنی ساعت پر فوراً احساس ہوا، کیا اسے اپنی بہن یا نیم مل سکتی ہے۔ اس ایک منٹ کے عوض.....؟ وہ تو ایسے ایک نہیں دس منٹ بھینٹ کر سکتا ہے.....؟“

”لیکن یہ تو ایک کڑی شرط تھی..... بڑا مہنگا سودا تھا۔ اسے جس طرح نیم عزیز تھی۔ اس سے کہیں زیادہ بھلا بھی عزیز تھی..... وہ اتنا خود غرض نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو قبول کر لے..... دوسری کو نظر انداز کر دے.....“

وہ ایک جتنی کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا..... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا فیصلہ کرے.....؟ یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا..... جو کام جادو گرنا نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ رام دیال کر سکتا تھا.....

رام دیال کی ذہانت اور صلاحیت کا وہ معترف ہو چکا تھا۔ جو مہمند مندر کے تین خزانوں میں سے ایک خزانہ نکال لایا تھا۔ جس پر ناگ دیوتا اور ناگن جوڑا کا نہ صرف پہرہ تھا بلکہ وہاں ایک سحر جیسے ہر کوئی تو نہیں سکتا تھا..... لیکن رام دیال نے اپنی ذہانت سے ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دیا جس کی مثال نہیں ملتی تھی اور کالا جادو بھی کام نہیں دے سکتا تھا.....



”لیکن تم اسے بے ہوش کیوں کرو گی؟۔۔۔۔۔؟ یہ کیا بات ہوئی؟“ آکاش نے تعجب سے کہا۔
 ”اس لئے کہ تم نے جو وعدہ کیا ہے؟“ وہ مستی بھری نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔
 ”میں نے تم سے کون سا وعدہ کیا۔۔۔۔۔؟ تم کس وعدے کی بات کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

”مجھے خوش کرنے کی! مجھے خوش کرنے سے پہلے یہ مسئلہ تم مجھے دو گے؟“
 ”اوہ۔۔۔۔۔؟“ آکاش چونک کے بولا۔ ”رام دیال کیا تمہیں اس بات کی اجازت دے دے گا کہ میں تمہارے حوالے کر دوں۔۔۔۔۔؟ بقول تمہارے مسئلہ کے عوض ان دونوں میں سے ایک کو میرے حوالے کر دے گا۔۔۔۔۔؟“

”دیکھو۔۔۔۔۔۔ اس وقت میں ابھی اور اس وقت رام دیال کے پاس جا رہی ہوں جو تمہاری لاٹھی کھانے کے بعد بستر پر دراز تکلیف سے تڑپ رہا ہے۔۔۔۔۔۔ یہاں ایک خوشبودار بوٹی ملتی ہے جسے کھٹکا کر بے ہوش کر دوں گی۔۔۔۔۔۔ وہ چھ سات گھنٹے بے ہوش رہے گا۔۔۔۔۔۔“
 ”ہوش میں آنے اور میرے جانے کے بعد وہ مسئلہ تم سے چھین لے گا تو تم کیا کر دو گی؟“

”مسئلہ میرا ہوگا۔ میری ملکیت۔۔۔۔۔۔ مسئلہ جس کے پاس ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی شہتی کا مالک ہو جاتا ہے جس کے آگے دنیا کی ہر شہتی کمزور اور بے بس ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ رام دیال نہ صرف میرا غلام بلکہ پالتو کتا ہو جائے گا۔ میرا بال تک بیک نہیں کر سکا گا۔۔۔۔۔۔“
 ”اچھا جاؤ۔ نیلیم۔۔۔۔۔۔ اور بملا کو جلدی سے لیتی آؤ۔۔۔۔۔۔ آکاش نے کہا۔

”مجھے ان دونوں کو لانے میں چھ سات گھنٹے لگ سکتے ہیں۔“ سرلانے جواب دیا۔
 ”لیکن تم نے کہا تھا کہ تھوڑی دیر میں لے کر آؤں گی۔۔۔۔۔۔؟ اب تم چھ سات گھنٹوں کی بات کر رہی ہو؟“
 ”اب حالات پر منحصر ہے۔“ وہ بولی۔ ”لانے کو بیس منٹ میں بھی لاسکتی ہوں۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے پہلے پجاری

خوش کر دو۔۔۔۔۔۔ اور پھر مجھے رام دیال سے نجات دلا دو۔۔۔۔۔۔ یعنی اسے موت کی بھیٹ چڑھانے میں میری مدد کرو۔۔۔۔۔۔ پھر تم اپنی بہن اور پتی کو حاصل کر کے یہاں سے جا سکو گے۔۔۔۔۔۔“ وہ اپنی رو میں کہتی گئی۔
 ”رام دیال نے میرا کیا بگاڑا جو میں اسے قتل کرنے میں تمہاری مدد کروں؟“

”بات یہ ہے کہ رام دیال تمہاری بہن کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن چوں کہ پجاری شکر سوامی بھی اس کی عزت دیوتا پر بھیٹ دینے کے بعد خود حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے رام دیال اسے کھلونا نہیں بناسکا۔ رام دیال نے ایک مرتبہ تنہائی میں موقع پا کر دست درازیاں کیں تو بملا نے اس کی مٹی پلید کر دی۔ بملا کو پانے کے بعد وہ مجھے ختم کر دے گا۔ اس لئے میں اسے ختم کر کے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن تم بملا کے مقابلے میں بلا کی حسین ہو۔ تمہارا اس کا کیا مقابلہ؟ رام دیال کو تم جیسی پتی کہاں مل سکتی ہے۔۔۔۔۔۔؟“ آکاش نے کہا۔ ”تمہیں وہم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔؟“
 ”تو کیا تم مجھے خوش نہیں کرو گے؟“ وہ بولی۔ ”میں تمہیں پانے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہوں۔“

”لیکن اس وقت جب میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو حاصل کر لوں؟“ آکاش نے اس طرح سے کہا۔ ”جیسے وہ جج بول رہا ہو۔۔۔۔۔۔“
 ”لیکن مسئلہ تم رام دیال کی بجائے مجھے دو گے۔۔۔۔۔۔؟“ سرلانے کہا۔

”میں مسئلہ صرف اسے دوں گا جب میں جسے کہوں اسے میرے حوالے کر دیا جائے گا۔“
 ”تم یہاں میرا انتظار کرو۔۔۔۔۔۔ میں تھوڑی دیر میں بملا اور نیلیم کو لے کر آتی ہوں۔ پھر تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ کسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ بملا کو لے جاؤ تو نیلیم کو واپس کر دوں گی۔۔۔۔۔۔ پھر بملا کو بے ہوش کر دوں گی اسے جادو کے زور پر۔۔۔۔۔۔ منظور ہے؟“ سرلانے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

مندرجہ ذیل سے نکال کے اس کے سامنے لے آئے گا؟
ادھر سر لا کہہ رہی ہے کہ وہ لے آئے گی اور منکہ
اسے دے دیا جائے گا؟

”اب وہ یہاں سے جانے سے پہلے بملا اور نلیم کو
تھوڑی دیر میں لانے کا..... اور پھر اس نے یہ بھی کہا ہے
کہ اس میں چار پانچ گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔

کیا واقعی ان دونوں کو وہ لے آئے گا اس کے سامنے کھڑا
کر دے گی اور اسے صرف ایک ہستی کو لے جانے کی
اجازت ہوگی۔

کیا اسے کسی ایک کے بدلے منکہ دے دینا
چاہئے؟

اس کے دل کے کسی کونے میں ایک شک کی لہر
اٹھی..... اگر سر لانے ان میں سے کسی ایک کے عوض
منکہ پانے کے بعد وہ انہیں واپس لے گئی تو وہ کیا کرے
گا؟ پوری روٹی کے چکر میں آدمی سے بھی کیا؟

کیا سر لا اسے دھوکے دے گی؟ اگر اس نے ایسا
کیا تو پھر وہ اس کے خلاف کیا کر سکے گا؟

سر لانے اس سے کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی
ہے..... وہ اسے صدیوں سے پنپوں میں دیکھتی آرہی
ہے..... پوچھا کرتی ہے اور وہ اسے اپنی محبت دے دے
اور اپنی گرفت میں لے لے۔

رام دیال یہاں کسی بہانے سے فرار ہو کے روپوش
ہو گیا ہے..... سر لانے اسے بتایا تھا کہ اس کا شکار کرنے
کے لئے ان دونوں نے ایک ڈھونگ رچایا..... جب وہ
کنیا میں پانی پینے کے لئے گھسا تھا تو اس نے دیکھا تھا
کہ رام دیال..... سر لا کی عزت تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا.....
بہت ساری باتیں بے ربط تھیں..... ان میں اعتقاد
تھا..... اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر سارا کھیل کیا
ہے؟ اس کی بات کا یقین کر لیتا چاہئے..... یا نہیں.....

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا..... سب سے
پہلے سر لا اندر داخل ہوئی..... اس کے پیچھے پیچھے اس کی
بہن بملا اور نلیم تھی..... اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں
آیا..... اسے سننے کی طرح لگا۔

شکر سوامی کے شراب میں بے ہوشی کی دوا غیر محسوس
انداز سے ملاتا ہوگی جو اتنا آسان نہیں ہے.....؟ وہ بڑا
مکار اور ذلیل شخص ہے..... لیکن تم چتنا نہ کرو..... لیکن
ایک صورت ایسی ہے کہ تم مجھے اپنا منکہ دے دو، میں ان
دونوں کو پندرہ بیس منٹ میں لیتی آؤں.....؟“

”میں اس وقت تک منکہ نہیں دوں گا جب تک تم
اپنا وعدہ پورا نہیں کرو گی؟“ آکاش نے چونک کے کہا۔
”کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے جو شرط پوری
ہونے سے قبل منکہ تمہاری جھولی میں ڈال دوں۔“

”کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے.....؟“ سر لا
نے کہا۔ ”یقین کرو میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گی؟“

”میرے باپ نے کہا تھا کہ..... میں نے کبھی
اپنے باپ پر بھروسہ نہیں کیا تم بھی مجھے نہیں کرنا.....
خصوصاً عورت پر..... چاہے وہ تمہاری ماں، بہن، محبوبہ
اور بیوی ہی کیوں نہ ہو.....؟“

آکاش کا جواب سن کر سر لا کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے
آکاش نے اس کے دجور پر دھکتا ہوا انگارہ رکھ دیا
ہو..... اگر اس کے پاس پستول، چاقو یا خنجر ہوتا تو وہ
آکاش کو قتل کر کے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے
کتوں اور جانوروں کو کھلا دیتی..... وہ کچھ نہیں کر سکتی
تھی..... وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی..... اس لئے بھی
کہ ہر قیمت پر اسے منکہ حاصل کرنا تھا۔

”جیسے تمہاری مرضی.....“ وہ سپاٹ لہجے میں
بولی۔ ”ان دونوں کو لانے میں جاری ہوں..... میرا
یہاں انتظار کرو۔ یہاں سے کہیں نہ جانا۔“

آکاش کو تجربات نے اتنا کچھ سکھادیا تھا کہ وہ کسی
عورت پر بھروسہ کرنا نہیں چاہتا تھا..... سر لا کا جسم اس
قدر دلکش اور کشش کے خزانوں سے بھرا ہوا تھا کہ ایک
سنیاسی بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکتا تھا۔ اگرچہ جی
حس نے اسے خبردار کیا نہ ہوتا تو وہ اس غلاطت میں
آکھیں بند کر کے کوو جاتا اور موت کی نیند سو جاتا۔

پھر وہ سر لا کے بارے میں سوچنے لگا۔

کیا واقعی رام دیال اور اس کی بہن اور نلیم کو مرہٹہ

پتی نیلم ہے.....؟“ سرلا حیرت اور غصے سے بولی۔
 ”مکار..... کیسی..... تو مجھے بے وقوف بنادی ہے۔ یہ ہرگز..... ہرگز نیلم نہیں ہے.....؟“ آکاش نے بکڑ کر کہا۔ یہ کوئی اور عورت ہے..... عورت بھی نہیں بلکہ کوئی ناگن ہے..... تو اسے پتی کا روپ ڈھال کے لائی ہے۔ اسے بھی تم نے بھلا کر روپ دیا ہوا ہے..... کوئی بہن کیا اتنی بے شرم ہو سکتی ہے کہ ایک بھائی کے ساتھ تم دونوں کے سامنے خش خش حرکات کرے..... تم نے عجلت میں جو منصوبہ بنایا اس میں گڑبڑ ہوگئی اور یہ ناگنیں چوک گئی تھیں..... ٹھہر..... میں تیزاب تم تینوں اور رام دیال کے جسموں اور چروں پر پھینکتا ہوں.....“ وہ اپنی ٹھکری ٹٹولنے لگا جس میں اس کے دو جوڑے تھے۔ اس نے خالی خولی دھمکی دی تھی۔ اس کی دھمکی سنتے ہی وہ تینوں گدھے کے سر کے سیگ کی طرح غائب ہو گئیں۔ جب اس نے فوراً ہی کٹیا سے نکل کر باہر دیکھا..... اس نے شمال کی سمت چار سانپوں کو تیزی سے جاتے دیکھا۔ اس کی دھمکی کا رگڑ ثابت ہوئی تھی۔ رام دیال کی صلاحیت اور ذہانت خاک میں مل گئی اور سرلا کا بنایا ہوا منصوبہ دھڑے کا دھڑا رہ گیا..... وہ ناگنیں تھیں کوئی اداکارا میں نہیں۔

یوں بھی اس نے دل میں فیصلہ کیا ہوا تھا کہ وہ دونوں سچ سچ اس کے سامنے لائی جاتیں تو وہ منہ نہ دیتا، انکار کر کے انہیں واپس کر دیتا۔ اس لئے کہ وہ منہ کی شکست کی بدولت ان دونوں کو رہا کروا لیتا..... وہ یہ بات بھی جانتا تھا کہ بھلا اور نیلم کو جو قیدی بنا کے رکھا ہوا تھا۔ انہیں نکال لانا کوئی کھیل مذاق نہیں تھا۔ ان سے نجات پانے کے بعد اس نے بڑے سکھ چین کا سانس لیا تھا۔ اور منہ کی حفاظت اور ضروری ہوگئی تھی۔

جانے یہ کس کی کٹیا تھی۔ آکاش پانی پی کے اپنی مہم پر نکلا اور تیزی سے چل پڑا۔

سورج چڑھنے تک وہ مرہٹہ مندر کے خاصا قریب ہو گیا تھا۔ اس نے دور سے ہی مندر کے خدو خال صاف واضح اور نمایاں طور پر دیکھ لئے تھے۔ وہ مندر جتنا پر شکوہ

وہ تینوں اس کی نظروں کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں..... سرلا ان سے قدرے ہٹ کر کھڑی آکاش، بھلا اور نیلم کو دیکھ رہی تھی..... بھلا اور نیلم آکاش کو دیکھ رہی تھیں۔

آکاش نے بھلا اور نیلم کو دیکھا تو اس کا دل اس طرح نہیں دھڑکا جس طرح دھڑکنا چاہئے تھا اور نہ ہی اسے کوئی خوشی ہوئی، کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے منہ چلے جانے کا غم و صدمہ ہو رہا ہو؟ اس نے سوچا۔

لیکن وہ اپنی بہن اور پتی نیلم پر ایسے دس منہ نہ بھرا کر سکتا تھا۔

وہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد مورتیاں لگ رہی تھیں۔

وقت بھی ساکت ہو گیا تھا..... ایک گہری خاموشی تھی جو پورے ماحول پر مسلط تھی۔

پھر یک لخت خاموشی کا سحر ٹوٹا..... پہلے بھلا کے سراپا میں ایک ارتعاش سا اٹھا..... پھر وہ دیوانہ وار آکاش کی طرف بڑھی اور اسے اپنی آغوش میں لے کے اسے بے تحاشا پیر کر نے لگی۔

”آکاش..... میری جان.....! میں تمہاری نیلم ہوں..... تم نے مجھے پہچانا نہیں..... میری جان! تم مجھے بھول گئے..... میں تمہاری نیلم ہوں..... میں کب سے تمہاری جدائی میں تڑپ رہی ہوں.....“

جب وہ لباس سے بے نیاز ہونے لگی تو آکاش چونکا..... اسے ہوش سا آیا..... بھلا نے اس کو جس طرح چوما۔ پیار کیا اس میں ایک بہن کی محبت نہیں تھی.....

پھر نیلم نے پل بھر کی تاخیر بھی نہیں..... وہ آکاش کے بازوؤں میں تڑپ کے سانگی..... وہ بڑی جذباتی ہوگئی۔ اس نے اپنے ہونٹ آکاش کے لبوں میں پیوست کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود کو عریاں کرنا چاہا تو آکاش نے اسے خود سے جدا کر کے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ خود پر قابو نہ پا سکی اور نہ اس کا توازن برقرار رہا۔ لڑکھڑاتی ہوئی فرش کی خاک چاٹنے لگی۔

”آکاش.....! یہ کیا کر رہے ہو.....؟ یہ تمہاری

کیوں کہ صدیوں سے پجاری، سنیا سی، پنڈت اور سادھو جو ناریاں دان دیتے ہوئے آئے تھے ایک بھی بھلا کی جانی نہیں تھی۔ یہ پہلی ایسی حسین اور نوجوان دوشیزہ تھی جو تانگ رانی بن سکتی بلکہ بنائی جاسکتی تھی۔

اس طرح سے کہ کالا ناگ دیوتا..... جب کسی نہایت حسین اور نوجوان کنواری دوشیزہ کی بھینٹ قبول کر لیتا تھا تو اس کے ساتھ وہ چالیس دنوں تک جشن سہاگ راتیں مناتا تھا۔ اس دوران وہ ہر رات اس کے حسن و شباب اور جسم سے سرفراز ہوتے ہوئے اس کے گلے کے نیچے دانت گاڑ کے اس کا خون پیتا تھا۔ جتنی مقدار کا خون پیتا تھا اتنی ہی خون اس لڑکی کے بدن میں منتقل کرتا رہتا تھا..... پھر چالیس دنوں کے بعد وہ اسے تانگ رانی کا خطاب دیتا اور اپنی رانی بنالیتا تھا۔

ان چالیس دنوں میں وہ اس نسل کی فرو بن جاتی تھی اور اس کی عمر صدیوں پر محیط ہو جاتی تھی۔ پھر اتنی شکتی اور قدیم جادو منتر اور سفلی علوم، ہر جان دار اور بے جان چیزوں کا روپ بھرنے کی صلاحیت کے علاوہ دنیا کی ہر قدیم اور نئی زبان پر قادر کر دیا جاتا تھا۔ لیکن عمل صرف کالی راج دھانی میں ہوتا تھا

ناگ دیوتا چالیس دنوں کے بعد اپنی رانی کو اس بات کی اجازت دیتا کہ وہ اس ناگ، ناگ دیوتا، سانپ اور اڈو سے تعلق رکھنے والی رانی کو اس کی ساری ساری بننا پسند کرے اس کے نیچے پھر اسے کوئی قانون اور بندھن نہ ہوگا۔ اور وہ پھر انسان کی نسل نہیں بن سکتی۔

یہ باتیں..... قصے کہانیاں اور واقعات اس نے بچپن میں سنیا سیوں اور پیروں سے نہیں..... پھر پدا، امرتا، چوہا اور بھی سادھوؤں سے سنی تھیں..... یہ کتابچ ہے..... جھوٹ کا پلندہ ہے..... من گھڑت ہے..... لیکن وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا، یہ مبالغہ آرائی ہے اور جھوٹی کہانیاں ہیں۔ بہت ساری باتیں اور شواہد ایسے تھے کہ وہ انہیں جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

چپانے اسے بتایا تھا کہ اس کی بہن بھلا جو مرہٹ

تھا اتنا ہی خوف ناک دکھائی دیتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہاں عفریتیں موجود ہیں..... اسے رندھیر نے بتایا تھا کہ راستے میں بڑے زہریلے، خطرناک اور ایسے مہلک سانپ اور ناکسین جھاڑیوں اور اپنے زیر زمین بل نما گھروں میں چھپی ہوئی ہیں جو انسانی بو اور آہٹ پاٹے ہی نکل آتی ہیں۔ ان کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا ہے۔

حالانکہ اس نے خاصی مسافت طے کر لی۔ اس نے جھاڑیوں، درختوں کے جڑوں اور بولوں کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن ان میں سے موذی جانور کیا اس کا بچہ بھی باہر نہیں آیا..... شاید منکھ کی وجہ سے..... کوئی تانگ رانی اور ناگ بھی باہر آتا تو اسے کوئی نقصان پہنچاتا یا ڈس لینے کی کوشش کرتا۔

وہ سستانے کی غرض سے ایک مٹی کے نیلے پر بیٹھ گیا جو ایک گھنے درخت کی جھاڑیوں میں تھا۔ اسے عجیب شافی محسوس ہوئی۔ یہاں جو ہوا چل رہی تھی وہ قدرے خوش گوار تھی جس سے وہ اپنی نس نس میں فرحت کی لہریں دوڑاتا محسوس کرنے لگا۔

اس کے سامنے فراگام بھر دور مرہٹ مندر تھا۔ اس مرہٹ مندر میں اس کی بہن بھلا قید تھی۔ نیلم یہاں نہیں تھی..... کالی دنیا..... کالی راج دھانی اور جانے اس کے نبھانے کیا کیا نام تھے۔ جس کے منہ میں جو آیا وہ کہتا تھا..... کوئی کالی دنیا..... کالی راج دھانی..... اب اسے بھلا کو یہاں سے رہائی دلو کہ اس کالی راج دھانی کی تلاش میں جاتا تھا..... وہ دنیا کہاں آباد تھی۔ اب تک یہ راز تھا۔

آکاش کو اس بات سے اطمینان تھا کہ بھلا کی عزت پجاری شکر سوای سے محفوظ ہے۔ کیوں کہ اسے کالا ناگ دیوتا کی بھینٹ چڑھانا تھا جو کہ کنواری اور انتہائی حسین اور پرکشش دوشیزاؤں کی بھینٹ قبول کرتا تھا۔ پجاری چاہتے ہوئے بھی بھلا کی عزت سے کھیل نہیں سکتا تھا۔ کھیلنے کی صورت میں اس کا کالا ناگ دیوتا کے قہر سے بچنا بہت مشکل ہو جاتا۔

چپانے اسے یہ بتایا تھا کہ پجاری شکر سوای کی اس بھینٹ سے کالا ناگ دیوتا خوش ہو جائے گا۔

گمیا اس کی وحشت بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہونے لگا۔ اس نے صدیوں قدیم مندر کا ایک تنقیدی انداز سے جائزہ لیا..... اس عمارت کی دیواروں سے ایک عجیب سی وحشت اور ویرانی چمک رہی تھی..... چوں کہ نہ تو اس کی دیکھ بھال کی جارہی تھی اور نہ صاف ستھرائی کی گئی تھی وہ کسی ٹھنڈے نقشہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کا کوئی جان دار رخ کرتا ہے..... سنسناتی ہوئی ہوائیں..... بنجر زمین سے اس پر کسی شیشاں گھاٹ کا دھوکا ہوتا تھا۔

پھر وہ مندر سے دو سو قدم کے فاصلے پر کسی زیر خیال سے رک گیا تاکہ وہ تازہ دم ہو جائے اور اپنی ساری قوت کو یکجا کر لے۔ اس مندر کو پجاری شکر سوامی نے اپنا عشرت کدہ بنا رکھا تھا..... وہ پوری طرح تیاری سے پجاری سے مقابلہ کرتا چاہتا تھا اور اسے کیفر کردار تک پہنچا کے بملا کو نکال لے جائے..... پہرے پر جوتا گن کی وہ دن اور رات کے حصے پر بملا کی نگرانی اور حفاظت پر مامور تھی۔ اس موڑی سے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔

گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنے آپ کو ہر طرح سے پجاری شکر سوامی کے مقابلے پر تیار پایا۔ پھر وہ مندر کے آہنی داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بے حد محتاط اور چوکنا تھا۔

ابھی اس نے صرف چند قدم ہی طے کئے تھے کہ عقب سے اسے کسی نے آواز دی۔ یہ مانوس سی آواز محسوس ہوئی۔

وہ اس طرح سے اچھل پڑا جیسے اس نے بجلی کی ننگی تار پر پیر رکھ دیا۔

چوں کہ آتش چنی طور پر بے حد پریشان، الجھا ہوا اور باؤ کا شکار تھا۔ ذہن میں انتشار تھا اس لئے وہ آواز کو ٹھیک سے شناخت نہ کر سکا۔ اس کے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی جو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں نوکیلے چاقو کی طرح اترتی چلی گئی جس نے اس کے سارے وجود کو دہلا کے رکھ دیا..... اور وہ اس پر ششدر تھا کہ یہاں اس بیابان میں کون اس کا شناسا آ گیا جس کے بارے میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

مندرجہ میں قید ہے وہ شیطان پجاری شکر سوامی کا ایک اذیت ناک امتحان ہے۔ پجاری شکر سوامی نے اسے جس کمرے میں قید کیا ہوا ہے۔ وہ ایک جادوگر کی کی نگرانی اور تحویل میں ہے۔ وہ ایک ناگن ہے۔ گوا سے اختیار ہے کہ بملا کی زندگی سے فائدہ اٹھا کے اس کی عزت پامال کرے۔ لیکن وہ چاہے بھی تو ایسا نہیں کر سکتا..... اس لئے کہ وہ کالا ناگ دیوتا کی امانت ہے..... وہ جادوگر کی اس لئے بملا کی عزت کی حفاظت کرتی ہے..... اگر بملا پر آج آگنی تو دیوتا کو فوراً وہ خبر کر دے گی..... پھر ناگ دیوتا اسے ایسی عبرتناک موت مارے گا کہ کتے سے بھی بدتر ہوگی۔ پجاری نے بملا کو ایسی حالت میں رکھا ہوا ہے کہ جو ایک شریف عورت کے لئے نامناسب اور شرمناک ہے۔ وہ دن میں اور رات میں بھی دو ایک مرتبہ جا کے نظروں کی پیاس بجھاتا ہے..... دست درازیاں اور من مانیاں کرتا ہے لیکن حد سے تجاوز نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے اس لئے کہ اسے خبر ہے کہ اس کا کیا انجام ہوگا..... بملا اس کے منہ پر تھوک دیتی ہے..... اے خوب گالیاں دیتی ہے۔ لیکن اس رذیل کو شرم نہیں آتی ہے..... دیوتا کو صرف بملا کے حسن سے دلچسپی اور غرض ہے اس لئے وہ پجاری سے باز پرس نہیں کرتا ہے.....

ان باتوں سے آکاش کو اندازہ ہو گیا تھا کہ پجاری شکر سوامی کس قدر پاپی ہے..... وہ دن میں سوچ رہا تھا کہ آکاش! اس کا سامنا پجاری سے ہو جائے..... اگر وہ کمینہ اس کے مقابلے پر آ گیا اور اسے علم ہو گیا کہ وہ بملا کا رشتہ دار بھائی ہے تب اس کا رد عمل کیا ہوگا.....! وہ اسے اپنی کسی پوشیدہ طاقت کے سہارے اسے مفلوج اور بے بس کرنے کی کوشش کرے گا..... لیکن اس کے علم میں یہ بات نہیں ہوگی کہ اس کے پاس طلسماتی منہ ہے۔ وہ آکاش کا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا..... لیکن وہ اس بات کی کوشش کرے گا پجاری کو کتے کی موت مارے.....

وہ تازہ دم ہو کے اٹھا پھر وہ مرہٹہ مندر کی طرف بڑھا تو اس کا دل فکراور تشویش میں مبتلا ہوتا گیا۔ جوں جوں اس کے اور مندر کے درمیان فاصلہ کم ہوتا

آکاش نے بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کے دیکھا تو اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔

اس کی نظروں کے سامنے چمپا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ لہو کی بوند بھی نہ تھی۔ اس کے ہونٹ مردہ سے لگ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف و دہشت بھری ہوئی تھی۔

”آکاش! آکاش! میری جان! ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاؤ“ وہ بدیانی لہجے میں بولی۔

چمپا کو اچانک اور غیر متوقع سامنے پا کے اس کے دل کو ایک عجیب سی فرحت محسوس ہوئی۔ وہ خوشی سے بولا۔

”چمپا! تم اس وقت یہاں کیسے؟ اگر بیماری شکر سوا می نے تمہیں دیکھ لیا تو؟“

چمپا نے فوراً اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ کیوں کہ اس کے سینے میں سانسوں کا زیر و بم چپکے لے لے رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا پولنا دشوار ہو رہا تھا۔ سانسیں تھیں کہ قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔

چمپا نے اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ کر سانسوں پر قابو کرنے کی کوشش کی۔ پھر درمیان میں انک انک کے بولی۔

”بھول گئی۔ اتنی بڑی بھول کہ کیا بتاؤں؟ ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی ہے۔ اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔“

”تمہارا کیا مطلب جانی! آکاش نے اس کے چہرے سے کھمرے بالوں کو ہٹایا۔ ”میں کیا کروں؟“

”تم مرہٹہ مندر سے اتنی دور بھاگ جاؤ کہ اس کا سایہ بھی نہ پڑے۔“ چمپا نے سر اٹھکے سے کہا۔

”تم جب تک مجھے پوری بات نہیں بتاؤ گی میری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ میں بدحواس سا ہو رہا ہوں۔“

”یہ مرہٹہ مندر نہیں بلکہ تمہارے لئے عقوبت خانہ ثابت ہوگا۔“ وہ رک رک کے کہنے لگی۔ ”انہیں کسی طرح علم ہو گیا ہے کہ تم اپنی بہن کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہو۔ تمہارے لئے یہاں ایک آہنی

بجھرہ تیار کیا گیا ہے جس میں تمہیں کسی پنچھی کی طرح ساری زندگی کے لئے قید کر دیا جائے گا۔ پھر تمہیں سکا سکا کر مار دیا جائے گا۔ تمہیں نہ تو آزادی ملے گی اور نہ سکھ۔ کھانا بھی تین دن میں صرف ایک مرتبہ ایک وقت دیا جائے گا۔“

”لیکن چمپا! آکاش نے تجیر زدہ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں اس بات کا علم کیسے اور کیوں کر اور کس سے ہوا؟“

”وراصل میں غلطی سے فریب کھا کے اس رذیل کے حال میں آگئی تھی۔“ چمپا سانسوں کے درمیان کہنے لگی۔ ”مجھ پر یہ بات آشکارا ہوئی کہ تمہاری بہن بھلا کسی انسان کے رحم و کرم پر نہیں ہے۔ تمہاری بہن کو ڈھال بنا کے تمہیں پھانسنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ یہ منکھ حاصل کر لیا جائے۔“

”میری جان چمپا! آکاش بھونچکا سا ہو کر تیز و تند لہجے میں بولا۔ ”تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالا تر ہیں۔“

”آکاش! یہ وقت ان باتوں اور تفصیل میں جانے کا نہیں ہے۔“ چمپا نے اس کا ہاتھ تھام کے مضبوط گرفت میں لے لیا۔ ”میں تمہیں یہ تو بتاؤں کہ بازی الٹ گئی۔ امرتارانی نے جو بساط بچائی تھی اس میں ناکامی سی ہو گئی ہے۔ شیونگ ادھر ادھر بھٹکتا ہوا مرہٹہ مندر آ گیا اور ادھر اس میں روپوش ہو گیا۔ اس نے اس ناگن کو جو اس کی بیماری شکر سوا می سے حفاظت اور نگرانی اس کی ہوس کاری سے باز رکھنے کے لئے مامور تھی اس سے دور تیں کھیل کے بھگا دیا۔ بیماری شکر سوا می سے کہہ دیا کہ بھول کے بھی ادھر کارخ نہ کرنا۔ بیماری شکر سوا می نے اسے بتا دیا کہ یہ کالا ناگ دیوتا کی امانت ہے جو اسے جشن والے دن بھیٹ کر لیا جائے گا۔ تاکہ اسے اپنی رانی بنائے۔ یہ سن کے شیونگ نے تمہاری بہن کی بے حرمتی نہیں کی۔ پھر شیونگ نے مجھ سے کہا کہ۔ میں جانتا ہوں کہ تم آکاش سے عشق کرتی ہو۔ آکاش کی زندگی اور بھلا کی عزت

اپنی رشتہ دار بہن کو اغوا کر کے کہیں چھپا کر رکھا ہے.....
چوں کہ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ لہذا تم اس سے کھیلتے
ہو..... اور پھر بملا بھی تمہاری وجاہت اور خوب صورتی
سے متاثر ہو کے رنگ رلیاں منار ہی ہے..... اغوا اور
پراسرار گردش کی ایک ڈھونگ ہے.....

پھر شیونگ نے مجھے فریب دے کر میرے
راستے سے تمہیں درغلا دیا۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ تم
اپنی بہن کا سراغ ملتے ہی مرہٹہ مندر جاؤ گے اور یوں
بھی تم نیلم کی تلاش میں یہاں آئے ہو..... اور پھر
جانے بغیر شیونگ سے تمہاری مڈ بھڑ ہوگی..... وہ کسی
نہ کسی تدبیر سے تم اس سنپا سی بابا کا سکہ چھین لے گا اور
اس کی مدد سے امرتا رانی تاگن کو بے بس کر کے اپنا
قیدی بنالے گا..... پھر وہ تمہاری بہن بملا کو کالا رنگ
دیوتا کی بھینٹ کر دے گا۔ کالا ناگ دیوتا جو اس خوشی
میں اسے انعام دے گا وہ اس کی بینائی یعنی دو
آنکھیں..... پھر چالیس دن کے بعد وہ کالا ناگ دیوتا
سے تمہاری بہن کو مانگ لے گا۔“ چپا کی زبانی یہ کھا
سن کے آکاش کی آتما جیسے کاپ اٹھی۔

گو کہ شیونگ اپنی بینائی سے محروم ہو چکا تھا اور
امرتا نے اس کی آنکھیں ضائع کر دی تھیں لیکن وہ اپنی
نادیدہ قوت سے ہر ایک چیز کو دیکھ سکتا تھا..... محسوس
کر سکتا تھا..... مقابلہ دشمن سے کر سکتا تھا..... آکاش
اس کے ہر حملے کا مقابلہ اور مزاحمت کر سکتا تھا۔ اس پر
شیونگ کی کسی بھی جادو اور ہستی اور حملے کا اثر نہیں ہو سکتا
تھا۔ لیکن اس کے پاس ایسی کوئی ہستی اور چیز نہیں تھی جس
سے وہ شیونگ کا مقابلہ کر سکے..... شیونگ نے اسے
ناکارہ اور بے بس کر کے منکہ چھین لینے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔
دوسری طرف وہ اس کی بہن کی جوانی کا دیوانہ
ہو گیا تھا..... گو کہ بملا کا دیوانہ تو پجاری شکر سوامی بھی تھا
لیکن اب وہ بھی امیدوار تھا..... گو کہ بملا پر آنچ نہیں
آ سکتی تھی اس لئے کہ وہ کالا ناگ دیوتا کی منظور نظر اور
چالیس دنوں کے لئے رانی بننے والی تھی..... لیکن وہ
مندر کی تہائی میں اس سے من مانیاں کر سکتا تھا.....

عزیز ہے تو تم میرے پاس مرہٹہ مندر آؤ..... ورنہ میں
بملا کی عزت کو داغ دار کر دوں گا اور آکاش کو موت کی
گود میں سلا دوں گا۔

میں یہ بات جانتی تھی کہ شیونگ کچھ بھی کر لے
بملا پر آنچ نہیں آ سکتی..... لیکن تمہاری زندگی ختم ہو سکتی
ہے۔ اس نے اس طرح مجھے درغلا دیا اور فریب دے کے
مرہٹہ مندر آنے پر مجبور کیا..... میں اس خطرناک کھیل
اور اس کے جال سے بے خبر تھی۔ جب میں مندر پہنچی تو
اس نے مجھے بے عزت کر دیا..... لیکن میں نے اس کی
شراب میں بے ہوشی کا سفوف ملا دیا۔ اس نے مجھے
شراب پینے اور ساتھ دینے پر مجبور کیا۔ میں نے شراب
اس کی نظریں بچا کے پھینک دی لیکن میں نے نشے کی
اداکاری کرتے ہوئے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو میں
نے تمہیں بتا دیا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے میری عقل پر
پردے پڑ گئے..... یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ
مرہٹہ مندر صدیوں سے ویران اور غیر آباد پڑا ہوا
ہے..... یہاں کوئی پجاری نہیں رہتا..... لیکن اسے
صرف پجاری شکر سوامی نے شہرت کدہ بنا رکھا ہے.....
جب سے شیونگ نے یہاں اپنا ٹھکانہ بنایا ہے پجاری
شکر سوامی ادھر کا رخ نہیں کرتا ہے اس لئے کہ شیونگ
کی گرفت یہاں بہت مضبوط ہے۔ اس مندر کے تہہ
خانوں میں صدیوں سے جو خزانے رکھے ہوئے ہیں ان
پر برسوں سے اس کے گرگوں کا راج تھا..... جب کسی
نے بھولے سے بھی مندر کے اندر قدم رکھ دیا تو دنیا کی
کوئی ہستی اور جادو اسے شیونگ کے پنجے سے نکال نہیں
سکتی..... وہ جانتا تھا کہ آنکھیں کل جانے کے بعد امرتا
تاگن رانی کے مقابلے میں کمزور پڑ گیا ہے اور اب
آسانی سے امرتا تاگن رانی کو اپنی ہستی کے بل بوتے پر
زہر نہ کر سکے گا..... اس نے امرتا تاگن رانی کے
پہنڈے سے نکلنے ہی سب سے پہلے یہ منصوبہ بنایا کہ
تمہیں پھانسنے کے لئے جال بنایا..... اس نے تمہیں
اپنے جال کے ہاں پکے تمہاری موجودگی سے فائدہ اٹھا
لے بملا کو اغوا کر لیا تھا..... یہ تاثر دینے کے لئے تم نے

پجاری شکر سوامی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شیوناگ سے مقابلہ کر سکے۔

وہ کسی قیمت پر منگہ کسی کے بھی حوالے کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ادھر شیوناگ اسے قابو میں کر کے بے بس کرنے میں مکمل حاصل کرنے کے لئے جال بچھا چکا تھا کہ اسے عقوبت خانے میں بند کر کے تڑپا تڑپا کے مار دے۔ پھر چپانے دوبارہ اس کا ہاتھ تھام کے اسے مندر کی مخالف سمت تیزی سے لے کے چل پڑی۔

پھر آکاش کو تیز تیز چلنا پڑا۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ اس نے ہانپتے ہوئے سوال کیا۔

”امرتا رانی کہاں ہے..... اس کی کوئی خبر نہیں ہے..... کیا اس نے شیوناگ کو قابو میں نہیں کیا جو یہ مکینڈا ادھر آ کے مندر میں روپوش ہو گیا ہے.....؟“

”وہ ادنیٰ مگر چلی گئی ہے۔“ چپانے بتایا۔

”ادنیٰ مگر.....؟“ آکاش کے لہجے میں استعجاب

ساتھا۔ ”میں یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔“

”ادنیٰ مگر کا نام اور جگہ ہماری نسل کے سوا کوئی نہیں

جانتا ہے.....“ چپا بتانے لگی۔ ”یہ سمندر کے پاس

کنارے پر جو چٹانیں ہیں اس کے نیچے یہ مگر آباد

ہے..... ایک طرح سے یہ ادنیٰ مگر ایک دنیا ہے جو

صدیوں سے آباد ہے..... اسے دیوتاؤں نے بسائی

تھی..... اس نے اس ادنیٰ مگر میں پنہاں لی ہوئی ہے۔“

”وہ کس لئے.....؟“ آکاش کی حیرت دو چند ہو گئی۔

”اس ڈر اور خوف سے کہ کہیں تم شیوناگ کے

جال میں نہ پھنس جاؤ۔“ چپا بولی۔ ”اس کے پاس پنہا

لینے کی وجہ سے شیوناگ تمہیں اب تک اپنے جال میں

پھانس نہ سکا..... وہ امرتا کو قابو میں کئے بغیر تم پر ہاتھ

نہیں ڈال سکتا..... اس رذیل شیوناگ کا یہ خیال ہے کہ

امرتا رانی کو قابو میں کرنے سے وہ اس کے سامنے جک

جائے گی..... اور تم با آسانی زیر ہو جاؤ گے..... یہ

شیوناگ کی غلط فہمی ہے..... وہ مرجائے گی لیکن

شیوناگ کے سامنے جھکے گی نہیں..... چوں کہ اسے خبر

نہیں ہے کہ تم اب تک شیوناگ سے محفوظ ہو، یہ علم

ہوتے ہی وہ ادنیٰ مگر سے نکل آئے گی..... پھر ایسی کوئی

تدبیر کرے گی کہ شیوناگ کو سبق دے سکے۔“

”تم نے ادنیٰ مگر کے بارے میں تفصیل سے نہیں

بتایا؟“ آکاش نے پھر سوال کیا۔

سمندر کی تہ میں جو یہ ادنیٰ مگر آباد ہے اس میں

صرف اور صرف جل ناگ اور ناگئیں رہتی ہیں..... یہ

دنیا بالکل الگ، انوکھی اور بڑی خوب صورت بھی

ہے..... اس دنیا میں ایسے ایسے دل فریب مناظر ہیں کہ

اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا..... اور پھر اس کے اندر

جو بلی نما محل ہے..... پر شکوہ..... جل ناگوں کی دھرتی

بالکل پسینوں کی مانند ہے..... کالی راج دھانی والوں

سے ان ادنیٰ مگر والوں میں بسنے والوں کی صدیوں سے

دشمنی چلی آرہی ہے..... اتنی نفرت ہے کہ تم تصور نہیں

کر سکتے..... لیکن یہ دنیا والے ناگوں پر ترس کھا کے انہیں

پناہ دیتے ہیں..... لیکن سانپوں اور ناگوں کو نہیں.....

امرتا رانی نے اس محل میں پنہاں لی ہوئی ہے.....“

چپا ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔ ان دونوں کی

سانسیں پھول رہی تھیں..... دائیں جانب ہمارا مندر

تھا..... پہاڑیاں تھیں..... آکاش نے سانسوں کا قابو

پانے کے لئے رک کے اور پلٹ لے مرہ مندر کی

طرف دیکھا..... وہاں گرد و غبار کا ہادل تھا جس کی

آغوش میں مرہ مندر دکھائی دیتا تھا۔

”آکاش.....! میرے دیوتا.....! میری

جان.....! یہ بہت برا..... بہت ہی برا ہوا ہے۔“ چپا

دہشت زدہ لہجے میں چیخی۔

”کیا ہوا..... کیا ہوا چپا جانی.....!“ آکاش بولا۔

”تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو رہی ہو؟“

”اس لئے کہ ہم دونوں بہت بری طرح پھنس گئے

ہیں.....؟“ چپا کی آواز گلے میں انک رہی تھی۔

آکاش نے محسوس کیا مندر ان سے صرف چند قدم

پر موجود ہے..... حالانکہ وہ جس تیزی سے دوڑتے

رہے تھے ان سے مندر کو دو تین میل دور ہونا چاہئے تھا۔

لیکن بات عجیب و غریب اور ناقابل یقین تھی کہ اتنا تیز

دوڑنے کے باوجود چند قدم بھی طے نہیں ہوئے تھے۔
اس نے محسوس کیا کہ زمین سرکتی جا رہی تھی۔

اس احساس کے ہوتے ہی وہ ٹھٹھک کے رک گیا۔
کیوں کہ چپا جو اس سے قدرے آگے کھل گئی تھی اسے
بھی رکنا پڑا۔

”اب تم رک ہی جاؤ..... کیوں کہ دوڑنے سے
کچھ حاصل نہیں.....“ چپا نے اپنی جگہ سے کہا۔ ”اس
لئے کہ زمین نہ صرف سرک رہی ہے..... بلکہ جتنی جا رہی
ہے..... زلزلہ جیسے آنے والا ہے۔“

پھر وہ فوراً ہی پلیٹ کے اس کے پاس آئی۔ چپا
کے سینے میں سانس دھونکی کی چل رہی تھی۔

”شیونامگ تمہیں پکڑنے کے لئے اپنے حصار میں
لے رہا تھا..... تمہارے رکتے ہی سرکتی زمین بھی رک
گئی..... میں بھی اس کے جال سے نکل آئی ہوں.....
اب میں شیونامگ کا بال تک بیکانیں کر سکتی۔“

”اس نئی افتاد سے تمہیں امرتا رانی ہی بچا سکتی
ہے..... میں بے بس ہوں..... شیونامگ سے مقابلہ نہیں
کر سکتی۔“ چپا نے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ لیا.....
اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

”لیکن امرتا رانی.....؟ تم نے تو بتایا تھا کہ اس نے
سمندر کی دنیا میں پناہ لی ہوئی ہے۔“ آکاش بولا۔
”معلوم نہیں یہ مکینہ میرے خلاف کیا مصیبت کھڑا
کرنے والا ہے؟“

”تم کسی بات کی چٹانہ کرو.....“ چپا نے اسے
دلاسا دیا۔ ”وہ تمہیں زک یا کوئی نقصان نہیں
پہنچا سکتا..... تم ایسا کرو کہ اس سایہ وار گھنے درخت کے
نیچے..... سائے میں کھڑے ہو کے اپنے گرد منکھ سے
حصار بنا لو۔ شیونامگ چوں کہ تعاقب میں ہے، بس
اب وہ چند لمحوں میں پہنچنے والا ہے، وہ تمہیں جو بھی کہے
اس کی باتوں میں نہ آنا..... کسی قیمت پر اس حصار سے
باہر قدم نہ رکھنا..... وہ بڑے مکر و فریب سے کاٹے
گا..... دنیا کی سب سے حسین، نوجوان اور پرکشش
دوشیزہ کو تمہاری نظروں کے سامنے عریاں حالت میں

لا کے کھڑا کر دے گا کہ تم اسے دے کے بہک جاؤ اور
قدم نکالنے پر مجبور ہو جاؤ..... وہ ایسے ایسے مکر و فریب
سے کام کرے گا کہ اس کے جال میں پھنس جاؤ..... وہ
شاید بسلا اور نیلیم کا چارہ بھی ڈالے گا۔“

چپا اتنا کچھ کہنے کے بعد زمین پر لوٹ لگا کہ ایک
ناگن کے روپ میں آگئی اور پھر تیزی سے سمندر کی
طرف رینگتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

آکاش کو اب ہمت سے ہی کام نہیں لینا تھا بلکہ حوصلہ
بھی دکھانا تھا۔ گوا سے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔

اسے یاد آیا کہ ایک بار اس نے شیونامگ کو امرتا
رانی کی موجودگی میں دیکھا۔ اس کی منحوس شکل وہ ابھی
تک بھولا نہیں تھا۔ اب اس کا تنہائی میں شیونامگ سے
واسطہ پڑنے والا تھا۔ اور یہ مقابلہ بہت سخت ہوگا۔ اس
نے سوچا۔ لیکن اس نے سوچا کہ اسے ڈٹ کے مقابلہ
کرنا ہوگا..... چپا نے اسے بتایا تھا کہ سرلا اور رام دیال
کا جال تھا جو شیونامگ نے بچھایا تھا..... کنیا میں جو
ہیرے جواہرات کے ڈھیر تھے وہ نظر کا دھوکا تھے۔
وہ سارے پتھر تھے۔ ادھر شیونامگ کو منہ کی کھانی پڑی
تھی۔ اس کی کوئی چال کامیاب نہ دے سکی تھی۔

اب شیونامگ جو اس سے مقابلہ کرنے آرہا تھا وہ
ناگ راج کے ہمراہ اور ایک آزاد غلام کی حیثیت سے۔
اب لمحہ لمحہ آکاش کے لئے بہت قیمتی اور اہم تھا۔
اس نے فوراً ہی گلے سے منکھ نکال کے اپنے گرد ایک بڑا
سا حصار زمین پر کھینچا۔ آزمانے کے لئے یہ دیکھنا چاہا
کہ وہ مندر سے دور نکل سکتا ہے یا نہیں.....؟ اس نے
دوڑ لگائی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو حصار میں ہی
پایا..... یہ بات اس کے لئے طمانیت بخش تھی کہ وہ حصار
میں ہر طرح سے محفوظ تھا۔

آکاش نے لمحے کے لئے سوچا کہ اسے شیونامگ
سے ڈرنے کی ضرورت نہیں..... اسے ذہانت، تدبیر اور
دوراندیشی سے کام لینا تھا کیونکہ اس کا مقابلہ ایک مکار
اور خطرناک جاوہر اور ناگ سے پڑا تھا۔

اب وہ اپنے منکے سے بنائے حصار میں ایک پتھر

پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ پتھر وسط میں تھا جس پر بیٹھ کے چار
سمتوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کس سمت
سے وارد ہوگا۔ اس سے ہوشیار اور چونکنا رہنا اس لئے
ضروری تھا کہ کہیں اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کے
اس پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ وہ کسی بھی لمحے اس پر حملہ آور
ہو سکتا تھا۔ امرترائی جو اس کے عشق میں مبتلا ہو کے اس
کی ہر طرح سے مدد کر رہی تھی اور قدم قدم ساتھ دیتی
آ رہی تھی۔ ادنیٰ ٹکری پر اسرار دنیا میں روپوش تھی۔ اسے
اندازہ نہیں تھا اور نہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی مدد کے لئے
کب تک آسکے گی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے دوڑتا ہوا کیوں نہ مندر میں گھس جائے جہاں اس کی بہن قید ہے۔ پھر اس نے مندر کی جانب تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ جس تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ اس سے کہیں تیزی سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جلد ہی اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ اس کے پیروں کے نیچے زمین صرف سرکنے کا تاثر دے رہی ہے..... اس کے قدم کوئی فاصلہ طے نہیں کر پا رہے ہیں..... وہ جہاں تھا وہیں موجود ہے..... وہ اپنے بنائے ہوئے منکے کے حصار میں موجود ہے۔

مرکزہ مندر کی ویرانی، بوسیدہ اور بدصورت سی عمارت جو بھی پر شکوہ، شان دار اور عظیم الشان ہوتی تھی کسی بوڑھی اور کمزور گھٹاؤنی چیل کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کی پراسراریت گرد و غبار کی آغوش میں تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس گرد و غبار میں اس کے خلاف کون سی عفریت روپوش ہے..... ایک ان جانا خوف و ڈر اسے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کا پردہ اور نواں۔ یہ وہ
کے ہر قد و خال سے نفرت اور انتقام کا جذبہ ملک رہا
تھا۔۔۔۔۔ اس کی سیاہ گھنی پچلیں اور پچولے تیزی سے
جھپک رہے تھے لیکن اس کی آنکھوں کے ڈھیلے اور
بٹلیوں کی جگہ دو سیاہ گڑھے چمک رہے تھے۔۔۔۔۔ کیوں
کہ امراترانی نے ایک زوردار مقابلے میں اپنی ہشتی کی
مات سے اس کی آنکھوں کو سیال بنا کے بہا چکی تھی۔
وہ آکاش کی طرف منہ کئے کھڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔
نکھیں نہ ہونے کے بعد ایسا لگ رہا تھا اس کی ہند

اس نے سوچا کہ جانے امرتارانی کو آنے میں کتنا سے لگے۔ شاید کسی وجہ سے اسے دیر ہو گئی ہے۔ ورنہ وہ اتنی تاخیر نہ کرتی اور پھر شاید شیونامگ بھی آنے سے رہا۔۔۔۔۔ پھر اسے ڈر خوف کس بات کا جب کہ اس کے پاس منکھ ہے۔۔۔۔۔ شیونامگ کو مد مقابل ہاکے وہ فوراً حصار بھج لے گا۔ شیونامگ منکھ کے حصار کو توڑ سکے گا

سامنے کے لئے تڑپ رہی ہوں..... حالاں کہ تو دنیا کا سب سے حسین اور وجہ مرد ہے..... جو لڑکی عورت تجھے دیکھتی ہے اس کا سینہ دھڑکنے لگتا ہے..... تجھے شاید اس بات کا علم نہیں کہ یہاں صرف اور صرف میری اور میرے گروں کی راج دہانی ہے۔“

وہ غرایا۔ آکاش نے آج تک ایسی خوف ناک انسانی آواز جو کھوکھلی تھی نہ سنی ہو..... اس آواز نے اس کا لہو رگوں میں منجمد کر دیا تھا۔ اس کا لہجہ بڑا سرد اور سفاک تھا۔

”سن احمق.....! اب اس ویرانے میں تیری چتا بنے گی..... مورکھ تیری لاش کو جلا کے اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے گی..... ابھی تیری زندگی کی کچھ گھڑیاں باقی ہیں تو جتنی سانسیں لے سکتا ہے..... لے لے..... چھپانے تجھے مندر میں گھسنے سے روک دیا..... وہاں..... میں نے تیرے سوا گت کا ایسا بندوبست کیا تھا کہ تو رو رو کر موت کی پرارتھنا کرتا بھی تو موت نہیں آتی..... پھر تجھے ایسا محسوس ہوتا کہ موت سے بڑی نعت اس دنیا میں کوئی نہیں..... لیکن تو یہ بات مت بھول کہ شیونگ کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں جن سے کوئی نہ بچ سکا اور تو کہاں بچ پائے گا..... تو نے گلابی ناگن! رانی امرتا کو اپنے عشق کے جال میں ایسا پھانس لیا کہ وہ تیری پوجا کرنے لگی ہے..... لیکن اس سے کیا ہوگا۔ یہ تیری بھول ہے کہ تو میرے انتقام سے بچ جائے گا.....“

آکاش خاموشی سے اس کی بکواس اور دھمکیاں سنتا رہا۔ پھر اس نے حوصلہ کر کے جواب دیا۔

”یہ تیری بھول ہے..... تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا..... نہ میری جان تیرے ہاتھ میں ہے.....“

”یہ میری نہیں تیری بھول ہے.....“ وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ ”تو بے وقوفی کی بات نہ کر..... مجھے تیری خوب صورتی اور جوانی پر رحم آ رہا ہے..... تو نے ابھی دنیا کہاں دیکھی.....؟ عیش کہاں کئے.....؟ میں نہیں چاہتا کہ تو زندگی کی پریشانیوں میں مارا جائے..... میں تجھے ایک نئی زندگی اس شرط پر دے سکتا ہوں کہ تو منکھ میرے

آنکھوں سے وہ آکاش کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا ہو..... اس کے موٹے موٹے مکروہ سیاہ ہونٹوں پر بے رحم اور سفاک فاتحانہ مسکراہٹ اسے بہت خوف ناک دکھائی دے رہی تھی..... اور اس کے سر کے بالوں کی جگہ اگے ہوئے ہزاروں باریک باریک اور نوکیلے بال سلاخوں کی طرح لگ رہے تھے..... اپنی ختم دار دموں سے اس طرح لہرا رہے تھے جیسے وہ اس کے حلق میں نیزوں کی طرح پیوست ہو جائیں گے..... ان کی سرسراہٹ اور پھینکاروں کے آہنگ اس کے کانوں میں جیسے گرم گرم سیسہ پگھلا دیا تھا۔

اس ساعت آکاش کو شدت سے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ شیونگ کا انسانی روپ بہت ہی مکروہ، گھناؤنا اور ڈراؤنا ہے۔ ورنہ جب وہ امرتا رانی کی خواب گاہ میں اسے دیکھتا تو کچھ تاریکی اور کچھ یکا یک وہشت کے باعث وہ اس کا ناقذ انداز سے جائزہ نہ لے سکتا تھا۔

چوں کہ وہ اس کے سر پر آ پہنچا تھا اس لئے آکاش حصار سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اسے جیسے اس حصار میں رہنا ہی سلامتی محسوس ہوئی تھی۔ یہ حصار اس کے لئے ڈھال بنا ہوا تھا۔ اور وہ پوری طرح تحفظ میں تھا۔ شیونگ نے اس کے لئے اس مندر میں مقبوت خانہ بنا رکھا تھا۔ شیونگ کسی نہ کسی طرح اسے مقبوت خانے میں قید کرنا چاہتا تھا۔ گو کہ اس کے سامنے موجود تھا..... پوری طرح آزاد اور خود مختار..... چہاں اسے بتا چکی تھی کہ وہ اب اس حالت میں بھی ایسی ناپیدہ اور پراسرار ہلکتوں کا مالک تھا..... دراصل چھپانے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ منکھ سے اپنے گرد حصار کھینچ لے تاکہ شیونگ کی ہر شے کی اور چادو سے محفوظ رہے..... اب اسے امرتا گلابی ناگن کا انتظار تھا۔ اس لئے اس نے شیونگ کے مقابلے پر حواس میں تھا۔

”احمق! تو جو ان لڑکے تو نے یہاں آ کے اپنے بیروں پر گھلاڑی ماری ہے..... یہ کوئی سرسبز و شاداب وادی نہیں ہے جہاں نوجوان ناریاں تیری آغوش میں

.....” تو ایٹور نہیں جو مجھے موت کی نیند سلا دے گا.....
میں بھی دیکھتا ہوں کہ تو مجھے کیسے مارتا ہے؟..... تو.....
کتے سے بھی بدتر اور حقیر ہے.....“ آکاش بولا۔
”اچھا..... دیکھ میں تیرا کیا حشر کرنے والا ہوں؟.....
شیوناگ نے اسے چپٹے کے انداز میں لاکارا..... ”میں تجھے
کیڑے کوڑوں کی طرح مسل دوں گا..... اب تو اپنی موت
کا تماشا دیکھ..... دیکھ کیسی موت مرتا ہے..... اب بھی کہتا
ہوں کہ منکہ مجھ سے.....“

شیوناگ حلال کہ اس سے خاصا دور کھڑا ہوا تھا۔
آکاش نے اس کے منہ پر تھوکا تو ہوا کا رخ اس کے منہ
کی طرف تھا جو اس کے منہ پر جا گرا۔
شیوناگ اور مشتعل ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو کے
بھٹی بن گیا تھا..... اس نے دو قدم آگے اپنا دہانہ ہاتھ
فضا میں بلند کیا اور منہ میں کچھ بڑبڑایا۔
پھر آکاش نے جو کچھ دیکھا وہ نہایت تحیر انگیز بلکہ
ناقابل یقین تھا..... اس بیابان اور بے رہانے میں نہ
جانے کہاں سے بے شمار خوف ناک سانپ ابل
پڑے۔

آکاش نے اپنی زندگی میں، کبھی اتنے سینکڑوں
سانپ نہیں دیکھے تھے جو اس کے حصار کے باہر پھیل
گئے تھے اور بری طرح پھنکارنے لگے تھے۔
چمپانے اسے سمجھایا ہوا تھا کہ شیوناگ کچھ بھی کر سہ
بالکل خوف زدہ اور پریشان نہ ہو..... صرف منکہ کے حصار
ہی میں رہے، کیوں کہ اسے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور
نہ ہی وہ حصار میں آ سکتا ہے۔ چمپانے غلط نہیں کہا تھا بلکہ
جس نیکی کے سادھو نے اسے یہ منکہ دیا تھا اسے بتایا تھا کہ یہ
منکہ کس طرح سے اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔

اس نے ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز تماشا
دیکھا تھا۔ جو بڑا سنسنی خیز بھی تھا۔

وہ سانپ جو حصار میں گھسنے کی کوشش کرتے وہ ایک
دم سے اس طرح سے ہٹ جاتے تھے جیسے کسی پراسرار
اور نادیدہ طاقت انہیں نہ صرف روک رہی ہے بلکہ زخمی
کر رہی ہے..... وہ زخم کی تاب نہ لا کے حصار کے قریب

حوالے کر دے..... ورنہ تو ساری زندگی کتے کی طرح
سک سسک کے مرے گا۔“

آکاش کے گلے میں منکہ تھا جس سے اسے
تقویت اور اطمینان تھا کہ شیوناگ اس کا پال تک بیکا
نہیں کر سکتا اور نہ ہی حصار میں ٹھس سکتا ہے..... دوسری
طرف ایک انجانا سا خوف بھی محسوس کر رہا تھا..... اس
مصیبت کی گھڑی میں وہ تہا تھا..... نہ تو امرتارانی تھی اور
نہ ہی چمپا..... اس لئے خود کو بے بس سا پارہا تھا اور حوصلہ
پست ہوتا محسوس کر رہا تھا..... اس کی ذرا سی کوتاہی، غلطی
اور غفلت موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔

مصیبت کی گھڑی میں جب آدمی اپنے آپ کو تنہا،
بے بس اور کمزور پاتا ہے تو بے بس بھگوان یاد آتا ہے.....
وہ یہ جانتا تھا کہ جب تک اس کے پاس منکہ موجود ہے۔
شیوناگ اسے موت کی نیند نہیں سلا سکتا۔ اب اس کے لئے
منکہ کی حفاظت اور ضروری ہو گیا تھا۔ پھر وہ دل ہی دل میں
گڑگڑا کے بھگوان سے پرارتہا کرنے لگا۔ آکاش نے لحظہ
بھر میں سوچا کہ..... آدمی دھرم سے کتنا ہی دور کیوں نہ
ہو جائے..... بھگوان کو اچھے ذہن میں یاد کیوں نہ کرے
لیکن اسے مصیبت کی گھڑی میں یاد آ جاتا ہے۔

آکاش نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے
وہ بھگوان کو یاد کرنے لگا تھا جس سے اس کی خاموشی
شیوناگ کو زہریلی تھی۔ وہ غضب ناک ہو کے چمپا۔

”بولتا کیوں نہیں ہے؟..... تو نے کیا فیصلہ
کیا؟..... کیا موت کی جینٹ چڑھا دوں..... بول.....
تیری چتا کو جلانے کے بجائے کیوں نہ تیرا گوشت.....
ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں اور ورنوں کو کھلا دوں.....
سنا نہیں میں کیا بک رہا ہوں؟“

”مکار..... کمینہ..... تو مجھے موت سے ڈرا رہا
ہے..... میں موت سے ڈرنے والا نہیں.....“ آکاش
نے ہمت کر کے جواب دیا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ تجھے موت سے کون بچاتا
ہے؟.....“ شیوناگ دباڑا۔ ”آج تک کوئی تجھی
میرے ہاتھ سے موت سے نہیں بچا..... تو کیا بچے گا؟“

ان تینوں میں سے ایک لڑکی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

”آکاش جی.....؟ ہمارے راج کمار..... آؤ.....“

ہمارے ساتھ مندر میں چلو..... ہم وہاں ہوں گی اور تم..... وہاں ہمارے سوا کوئی نہ ہوگا..... ہم ہوں گی..... آؤ..... جلدی کرو.....“

آکاش کو شیونگ نظر آیا اور نہ ہی اس کا خیال آیا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک خمار سا چھایا ہوا تھا..... ان دوشیزاؤں کے انگ انگ سے البتہ مستی اسے درغلز رہی تھی۔ وہ خود فراموشی کی حالت میں ان کی طرف بڑھا..... زمین پر ایک بڑا سا پتھر پڑا ہوا تھا۔ آکاش اس کی ٹھوکر کھا کے منہ کے بل گر پڑا۔ منہ کے بل گرنے سے اسے چوٹ آئی اور ہونٹ زخمی ہوئے تو اس کے منہ سے خون نکل آیا۔

زخمی ہوتے ہی آکاش کو ہوش سا آ گیا..... وہ جو سحر زدہ تھا اس کا سحر ٹوٹ گیا۔ اس نے تنہا کھڑے ہو کر دیکھا۔

اس کی نظروں کے سامنے جو تین نوجوان دوشیزائیں تھیں اب وہ نہایت بد صورت اور کریمہ صورت دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر اسے ایک طرف شیونگ کھڑا دکھائی دیا۔ اس کا یہ حربہ بھی بری طرح ناکام ہو گیا تھا جس پر وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا..... اگر آکاش زمین پر گر کے زخمی نہ ہوتا تو یہ سحر ٹوٹا نہیں۔

شیونگ نے داہنا ہاتھ فضا میں بلند کیا..... اس کی پانچوں انگلیوں سے شعاعیں خارج ہو کے آکاش کی طرف لپکیں۔ لیکن حصار کے قریب آ کے دم توڑ گئیں..... پھر ایک سمت سے تیز روشنی کا کوند فضا میں لپکا جو آنکھوں کو خیرہ کرنے والا تھا۔ وہ حصار کی طرف لپکا اور پھر فضا میں تیر کی طرح حصار سے پلٹا۔

شیونگ نے فوراً ہی اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھر نامانوس زبان میں کچھ بولنے لگا۔ وہ مسلسل چیخا، جارہا تھا کہ وہ کوند اس کی طرف آیا تو وہ خود کو اس سے بچا نہ سکا..... وہ اس کے پیروں سے ٹکرا کے مغرب کی

سے بھاگ جاتے تھے۔ وہ زمین سے اٹھنے والے سانپ غصے سے پھنکارتے اور اپنی آتشیں زبانیں پھیلاتے حصار کی طرف آتے تاکہ آکاش کو ڈس لیں لیکن ان کا حشر بھی پہلے والے سانپوں کا ہو رہا تھا۔

اب آکاش کے دل کے کسی کونے میں خوف و دہشت بالکل نہ رہی تھی یہ دیکھ کے سانپ حصار میں گھس نہیں سکتے اور تو اور شیونگ بھی نہیں..... گو کہ ان سانپوں کی تعداد میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا..... پھر اس نے ایک اور منظر دیکھا جو اس کے لئے خوشی اور طمانیت کا باعث بن گیا تھا۔

ان زہریلے سانپوں کی یلغار جو کمک کی صورت میں آئی اور حصار کی طرف بڑھ رہی تھی وہ لکھ بھر کے لئے رک گئی..... پھر دوسرے لمحے تیز اور طاقت ور برقی ققمتوں جیسی روشنی کے جھماکوں اور راتوں سے کوند انہی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام سانپ گدھے کے سر کے سینک کی طرح غائب ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک سانپ کا وجود بھی نہیں ہے..... آکاش نے سوچا..... کہیں ایسا تو نہیں اس نے جاگتے میں کوئی ڈراؤنا سا خواب دیکھا ہو..... لیکن یہ حقیقت تھی جسے وہ جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

آکاش کو اندازہ تھا کہ شیونگ کو اپنی مافوق الفطرت قوتوں کے باعث پتہ چل گیا ہوگا کہ اس کا حربہ بری طرح ناکام رہا..... اسے ذلت آمیز شکست کھانی پڑی ہے۔

لیکن آکاش یہ بھی جانتا تھا کہ شیونگ منہ کی کھانے کے بعد بھی کسی دوسرے حربے سے باز نہیں آئے گا۔

شیونگ مردوں کی کمزوریوں سے آگاہ تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ تین نہایت نوجیز عمر کی دوشیزائیں اچانک نمودار ہو گئیں۔ آکاش کی نظروں کو ان کا مسموم کرنے لگا۔ وہ لمحے بھر کے لئے خود کو فراموش کر بیٹھا..... اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی حسین دوشیزائیں نہ دیکھی ہوں گی..... وہ اسے دعوت نگارہ دے رہی تھیں.....

وہ پتھر جو کرکٹ کی گیند کی سائز کا تھا اس نے شیونگ کی کھوپڑی بجا دی۔

اس پتھر کی ضرب نے اس کی کھوپڑی میں زخم کمر دیا تو خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اس کی دھار پیشانی، آنکھوں اور

چہرے پر سے ہوتی اس کے سینے میں جذب ہونے لگی۔ وہ یہ محسوس کر کے آکاش کو انتہائی بے ہودہ، فحش

اور تنگی تنگی گالیاں بکنے لگا تو آکاش نے کہا۔

”کیا تو اپنی زبان کو لگام نہیں دے سکتا.....! بک

بک کئے جا رہا ہے پاجی.....!“

”میں تیری ماں اور باپ کو بھی گالیاں دوں گا.....

تیری ماں نے تجھے نہیں بلکہ کتا جتنا ہے.....“

آکاش کو اس کی یہ بات نیزے کی طرح سینے میں

پیوست ہو گئی۔

پھر آکاش نے فرش پر پڑے کچھ چھوٹے بڑے

پتھر اٹھائے..... پھر اس نے ان پتھروں کی شیونگ پر

بوچھاڑ کر دی۔ بڑی بے دردی اور سفاکی سے شروع

کر دی۔ ماں کو گالی بھی کوئی بھی شریف آدمی برداشت

نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ کیسے کرتا.....؟

پتھروں کی بوچھاڑ اس قدر شدید اور زوردار تھی کہ

شیونگ کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور اسے اپنی ماں یاد

آ گئی۔ اس کا سر، رخسار اور ہونٹ کی جگہ سے پھٹ کے

اس میں سے خون رسنے لگا۔ وہ درد اور تکلیف سے کسی

زخمی پرندے کی طرح تڑپنے لگا۔

آکاش نے تہیہ کر لیا کہ وہ امرتا کے انتظار تک

شیونگ کو سنبھالنے اور زمین سے اٹھنے نہیں دے گا۔ وہ چاہتا تھا

کہ شیونگ کو سختی و ذلت اور تکلیف دے سکتا ہو۔

شیونگ خون آشام شبیہ کی طرح آکاش کو

مارتا چاہتا تھا اور مندر میں اس کے لئے عقوبت خانہ بھی

تیار کر رکھا تھا..... اگر وہ شیونگ کے ہتھے چڑھ جاتا تو اس

کی بے بسی سے خوب فائدہ اٹھاتا۔ اسے جس خوفناک

موت سے دوچار کرتا اس کا تصور ہی سوہاں روح تھا۔

”شیونگ.....!“ آکاش نے نفرت اور حقارت

سے اسے گھورا۔ ”تمہارا عقوبت خانہ ہے کیوں نہ میں

سمت چلا گیا..... شیونگ کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور وہ کسی کئے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گر پڑا۔ اس روشنی کے کوندے نے اسے معذور اور مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

آکاش کو اندازہ نہ تھا کہ یہ کوندا شیونگ کا حشر

کروے گا جس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس کی نس

نس میں سرشاری سی دوڑ گئی۔ وہ پھر بھی محتاط تھا۔ کیوں کہ

شیونگ ایک خطرناک اور بہت بڑا جادوگر تھا۔ اس کا

کوئی غیر متوقع اور اچانک حربہ شاید اس کے لئے مصیبت

کا پیش خیمہ ہو..... اور پھر دشمن تو دشمن ہی تھا۔ گو کہ

شیونگ اپنی بینائی سے محروم تھا لیکن اسے اپنی درگت کا

اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی مافوق الفطرت سے معلوم

کر لیا تھا کہ اس کی مٹی پلید ہو چکی ہے۔ اس لئے اس نے

دوسرا حربہ استعمال کرنے کیلئے کوئی چاب کرنے لگا تھا۔

”شیونگ.....! اب تو کوئی بھی حربہ اور منتر مجھ پر

کر لے میرا بال تک بیکار نہیں کر سکتا..... کیا تجھے احساس

نہیں ہو گیا اور پتا نہیں چل گیا کہ میں نے تجھے اپنا ج اور

معذور کر دیا ہے..... تیرے پاس تو بڑی ہتکتیاں موجود

ہیں.....؟ کیا اب وہ ناکارہ ہوئی ہیں؟ مجھ سے مقابلہ

کرنا ہے تو اپنی ہتکتی کی مدد سے میدان میں آ جا.....؟“

آکاش کا یہ انداز چیلنج کا سا تھا۔ شیونگ بری

طرح تملتا گیا اور اس کا چہرہ سرخ سا ہو گیا۔

”تو اتنا ہی بہادر ہے تو حصار سے باہر آ کے مقابلہ

کر.....؟ یہ کیا حصار میں رہ کے اتر رہا ہے.....؟ مرد کا

بچہ بن.....؟“ شیونگ نے جکڑ کر رہی سے کہا۔

”شیونگ..... تیرے پاس چوں کہ بہت ساری

ہتکتیاں ہیں جب کہ میرے پاس نہیں ہے..... میں اس

لئے حصار سے باہر نہیں آ رہا ہوں اور میں پورے جاذبوں کا

مالک ہوں..... میرے پاس ذہانت ہے۔ دیکھ.....

میں اپنی ذہانت سے کیا کرتا ہوں..... تیری ہتکتی کو پامال

کر دوں گا..... وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکے گی اور.....“

آکاش نے حصار میں پڑے ہوئے ایک پتھر کو اٹھایا اور

اس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کے پھینکا.....

تمہیں اس میں لے جاؤں..... اس میں بند
کردوں.....؟“

یہ سنتے ہی شیوناگ کی مٹی گم ہو گئی۔ پھر دوسرے
لحظے وہ دہشت زدہ سا ہو کر بجلی کی سرعت سے اٹھا جو
آکاش کے لئے ناقابل یقین تھا۔ پھر وہ کراہتا، لٹکڑاتا
اور اپنے وجود کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹتا ہوا سر پر بھر رکھ کے
جیسے بھاگا..... اور بار بار مڑ کے دیکھتا بھی جا رہا تھا۔

آکاش نے اسے خالی خولی دھمکی دی تھی۔ وہ بے
تحاشا مرہٹہ مندر کی طرف جا رہا تھا۔ دو ایک مرتبہ زمین
پر ٹوکر کھا کے گرا تھا..... آکاش اس کے مقابلے میں
جانے سے رہا۔ وہ جیسے ہی حصار سے نکلتا شیوناگ فوراً
ہی پلٹ کے اس پر حملہ آور ہو جاتا۔ وہ کوئی خطرہ مول
لیتا نہیں چاہتا تھا۔

آکاش نے پہلی بار اپنی ذہانت اور حاضر دماغی
سے منے کی ایک نئی تاثیر دریافت کی تھی۔

اس کے سہارے آکاش نے خود کو خطرات سے
بچایا تھا بلکہ ایک خطرناک دشمن کو منہ کی کھا کے راہ فرار
اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا..... اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا
کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا منکے کے نئے نئے اسرار
اس پر ایک ایک کر کے کھلتے جا رہے تھے..... اب اس کے
نزدیک منکے کی اہمیت اور قدر و قیمت اور بڑھ گئی تھی۔
تو شیوناگ اس کے مقابلے میں ذلت آمیز
فلکست کھا کے بھاگ نکلا تھا۔

آکاش جلد بازی کر کے حصار سے باہر نہیں آتا
چاہتا تھا۔ اس لئے دشمن نہ صرف خطرناک بلکہ مکار اور
شاطر بھی تھا۔ اس کی کینہ پروری سے اسے محتاط رہنا تھا۔
اس کے حصار سے نکلتے ہی شیوناگ چشم زدن میں
اسے دیوبچ لیتا اور اسے مندر میں لے جاتا۔

شیوناگ کے لئے کوئی مشکل امر نہ تھا..... کیوں
کہ وہ کئی حکمتوں کا مالک تھا..... اس کے لئے کوئی بھی
حر بہ ناممکن نہیں تھا..... پھر آکاش نے اپنے آپ کو
سمجھایا کہ آخر اسے ایسی کسی بات کی جلدی اور کیا
تکلیف ہے.....؟ وہ بڑا مسرور تھا کہ شیوناگ کو اس نے

جو سبق دیا وہ کبھی نہیں بھولے گا.....

لیکن اسے یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ دشمن سے
غافل نہیں ہونا چاہئے..... وہ اپنی اس ذلت شکست کا
انتقام لینے کے بعد اس کی گھات میں ہوگا..... وہ چپ
نہیں بیٹھا رہے گا۔

پھر اس نے سوچا کہ اس میں اس کی سلامتی ہے کہ
وہ امر تارانی کا انتظار کرے۔ یہ حصار اس کا تحفظ ہے۔
امر تارایا چمپان دونوں میں سے کوئی بھی آئے وہ اسے
اپنے سینے میں جذب کر لے گا۔

جب شیوناگ مندر کی عمارت کے باہر کی
جھاڑیوں میں روپوش ہو کے نظروں سے اوجھل ہو گیا تو
تب بھی اسے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ شیوناگ اس
سے غافل ہو گیا ہوگا۔

ایک لذت اس نے ایک آواز سنی جس میں دکھ اور
درد کی آمیزش تھی۔

اس نے ہنسی کی سمت دیکھا تو اس نے ایک سیاہ
غبار سا دیکھا جس میں یہ ہنسی گونجی تھی..... سنوائی آواز
تھی..... آکاش کا اندیشہ غلط ثابت ہوا تھا۔ جب غبار
چھٹا تو اس نے دیکھا۔ شیوناگ سیاہ غبار میں آ رہا تھا۔
آکاش فوراً ہی چونک کے کھڑا ہو گیا۔

شیوناگ اکیلا نہیں تھا۔ وہ اس کے مقابلے پر پھر
سے آیا تھا۔ ذلت آمیز شکست سے اس کے چہرے پر
نفرت اور غصہ تھا وہ ابھی تک موجود تھا..... اس کے سر پر
جو باریک باریک سانپ کلبلا رہے تھے ان کی زبانوں
سے شعلے لپک رہے تھے..... چون کہ یہ سنپو لے اس کی
دسترس میں تھے جو اپنے مالک کے تابع تھے۔ اس کی
حرکات کو اس کے اشاروں سے ظاہر کرتے تھے۔ اس کا
بیجان کا اثر براہ راست ان سنپولیوں سے ظاہر ہوتا تھا۔

آکاش نے دیکھا کہ وہ ایک نہایت حسین اور
نوجوان لڑکی کا تھا تھا اسے کسی حیوان کی طرح گھسیٹتا
لا رہا تھا۔ لڑکی مزاحمت کر رہی تھی لیکن اس کا بس نہیں چل
رہا تھا..... چون کہ اس لڑکی کے چہرے پر یاسیت کے
بادل تھے جس نے اس کے رنگ روپ کو متاثر کیا ہوا تھا۔

”تو اپنے آپ کو عقل کل سمجھ رہا ہے..... تیرا دار اور حملہ زیادہ سے زیادہ حصار سے صرف دس گز تک کر سکتا ہے، اب تو جتنے پتھر مار کے دیکھ لے..... میرا کچھ نہیں بگڑے گا.....“

”شیوناگ! تو یہ چاہتا ہے کہ مجھ کمزور پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کر لے.....“ آکاش نے بے پروائی سے کہا۔ ”تیرے دل میں جو جو حسرت ہے پوری کر لے۔“

”میرے پاس ایسی شہتی ہے جسے تو دیکھ کے جیتے جی مر جائے گا..... اسے حصار میں بلا لے..... یہ تجھے ایسا خوش کرنے کی زندگی میں آج تک کسی لڑکی اور عورت نے نہیں کیا ہوگا اور نہ کرے گی..... تو خوش ہو کے اسے انعام میں منگدے دے گا.....“

آکاش نے غور سے لڑکی کو دیکھا تو اچھل پڑا..... شیوناگ نے ایسا چکر چلایا تھا کہ آکاش دھوکا کھا جائے..... ان دونوں کے درمیان کوئی پردہ اور فاصلہ نہ رہا..... بہن بھائی کا رشتہ ختم ہو جائے..... ”بھلا! میری بہن!.....!“ آکاش اسے پہچان کے چلایا.....

”بھیا! آکاش بھیا.....“ بھلا نے پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”میرے بھیا!؟“

”ہاں بھلا! میں تمہیں لے جانے آیا ہوں..... یہ..... یہ..... کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری..... تم پہچانی نہیں جا رہی ہو..... میرا سینہ اندر سے کٹ رہا ہے۔“

”میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی کہ تم آؤ گے..... یہ میری عزت تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے..... یہ ایسا نہیں کر سکتا کہ مجھے کالا ناگ دیوتا کی سمیٹ چڑھانا ہے..... اور پجاری شکر سواہی نے اسے روک رکھا ہے..... ورنہ اب تک میں اس درندے کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہوتی..... اب تو میں گھر واپس جانے اور دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہوں.....“ پھر اس کی زخم خورہ آواز دردناک سسکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

اس کے چہرے پر زردی نہ ہوتی وہ صاف پہچان جاتی..... اوہ وہ بہت زیادہ خوف سی بھی جس نے اس کی سفید رنگت کو ماند کر دیا تھا..... آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی دکھائی دیتے تھے۔ اس کی خوب صورت اور بڑی آنکھیں نہ سونے کے باعث سوچی سوچی ہی لگ رہی تھیں..... ایسا لگتا تھا کہ وہ دن رات روتی رہی ہو۔

آکاش نے شیوناگ کو دیکھتے ہی زمین سے مٹھی بھر مٹی اٹھا کے اس کی طرف اچھال دی، اس نے لڑکی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ کیوں کہ وہ شیوناگ کو گھورے جا رہا تھا۔

آکاش سمجھ گیا کہ یہ کوئی ستم رسیدہ لڑکی ہے جسے جبر و زیادتی سے کسی جانور کی طرح کھینچنا ہوا لا رہا ہے تاکہ اس کے جلوے دکھا کے اسے متاثر کر سکے..... پھر وہ کسی بہانے سے آکاش کو حصار سے نکلنے پر مجبور کر کے منگہ حاصل کر لے..... شیوناگ کے ذہن میں کیا تدبیر ہے اسے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا..... یہ لڑکی بہت حسین اور بے پناہ پرکشش دکھائی دیتی تھی۔ آکاش محسوس کر رہا تھا کہ اس لڑکی کا بجلی بھرا بدن اسے اپنے سحر میں جکڑ رہا ہے..... وہ اپنے آپ کو حصار سے نکلنے پر روک نہ سکے گا..... اگر اس لڑکی نے اس سے منگہ مانگا تو وہ فوراً ہی نکال کے اس کی جھولی میں ڈال دے گا.....

آکاش کو اس بات کا اندازہ تھا مرد کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے..... عورت کا حسن ایک ایسا جادو ہے کہ جس کے آگے دنیا کا بڑے سے بڑا اور خطرناک جادو ماند پڑ جاتا ہے..... اس وقت یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس لڑکی کے جادو کے آگے وہ بے بس اور بے اختیار ہوتا جا رہا ہے..... شیوناگ جانے کہاں سے اس لڑکی کو لے آیا تھا جس سے وہ اسے مات دے دے گا.....

آکاش نے اس سحر کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس نے زمین پر سے ایک پتھر اٹھا کے شیوناگ کی پیشانی کا نشانہ لپا اور تاک کے مارا.....

لیکن اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ شیوناگ قہقہہ مار کے بڑے زور سے ہنسا اور استہزاء سے لہجے میں بولا۔

سالگرہ نمبر

قارئین کرام و راء انتر حضرات!
السلام علیکم!

ہر سال کی طرح اکتوبر 2014ء کا

ڈرڈ انجسٹ ”سالگرہ نمبر“

ہوگا۔ جس میں مشہور و معروف اور کہنہ مشق راء حضرات اپنے زور قلم کا جادو جگائیں گے یعنی اپنی اچھی اچھی کہانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے۔

راء حضرات سے التماس ہے کہ

”سالگرہ نمبر“

کے لئے اپنی اچھی اچھی کہانیاں جلد از جلد ارسال کریں تاکہ آپ کی کہانی سالگرہ نمبر میں نمایاں طور پر شامل اشاعت ہو۔ لیکن کہانی نقل شدہ نہ ہو۔

”سالگرہ نمبر“

کے لئے جو کہانی ارسال کریں اس

کا ”سالگرہ نمبر“ ضرور لکھیں۔ شکریہ۔

طالب نیہت

ادارہ ارباب

آکاش نے بے بسی سے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر دوسرے لمبے شیونگ کا تہقہہ سن کے سر اٹھا کے دیکھا۔ بھلا اس شیطان کے ہاتھ سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اپنی پوری قوت سے کھل رہی تھی کیوں کہ شیونگ نے بھلا کو بازوؤں میں لے رکھا تھا..... وہ غریب اس شیطان کے مقابلے میں ایک نرم و نازک سی بچی کی مانند تھی۔ شیونگ نے بھلا کو اس کے سامنے اس طرح کھڑا کر دیا تھا کہ بھلا کو بے لباس کر دے۔

آکاش کی کنپٹیاں جیسے پھٹنے لگی تھیں اور اس کا خون جوش مارنے لگا تھا۔ اس کی غیرت یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ یہ شیونگ اس کی بہن کی ایسی تذلیل کرے۔ وہ آپے سے باہر ہو کے حصار سے نکلنے کے لئے بڑھا تو ایک دم سے اسے خیال آ گیا کہ شیونگ اسے مشتعل کر رہا ہے کہ وہ بے دھیانی میں حصار سے باہر آ جائے۔ وہ رک کے غضب ناک ہو کے بولا۔

”میں کہتا ہوں کہ اگر تو نے میری بہن کے ساتھ ذلیل حرکت کی تو تیرا وہ حشر نشر کروں گا کہ.....“

”تو کیا کرے گا.....؟ تو حصار سے باہر آنے سے رہا..... چوہا بھتا ہوا ہے.....“

شیونگ اس کی بے بسی اور کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔

اب ہر بات کی انتہا ہوتی جا رہی تھی۔ شیونگ کی ہر حرکت ناقابل برداشت تھی۔ آکاش کی نس نس میں لہو اٹھنے لگا اور اس کی نفرت اور انتقام کی چنگاریاں آنکھوں سے برسنے لگیں۔

آکاش نے سوچا کہ اگر اب اس نے لمبے بھر کی بھی دیر کی تو بھلا..... شیونگ کی ہوس کا دھار مہا ہے گی..... یہ مکار اور کمینہ بھلا کے لباس کی دھماں بکھیر دے گا۔ وہ اپنی بہن کو فطری حالت میں لے آئے گا..... اس منظر کو دیکھنے سے بہتر ہے کہ مر جائے اور پھر اس کے پاس منکہ جس سے وہ شیونگ سے مقابلہ کر سکے گا۔ اسے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی ایا

بات ہے.....! شیوناگ اس کا بال بکا نہیں کر سکے گا۔
وہ نفرت اور غصے سے کھولتا ہوا عقاب کی طرح اس
پر چھٹا۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

وہ حصار سے نکل کر شیوناگ کے قریب پہنچا تو
شیوناگ نے ایک فاتحانہ قبضہ لگایا۔ پھر اس نے بھلا کو
اپنی آغوش سے نکال کر ایک طرف زور سے دھکا دے
دیا۔ بھلا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ لہرائی ہوئی ٹخلیں
گھاس پر گر گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔
پھر شیوناگ نے اپنی ٹانوں سے آواز میں کچھ بڑبڑایا
جسے وہ سمجھ نہ سکا۔

دوسرے لمحے آکاش نے محسوس کیا کہ اس کے
پیروں میں نادیہ زنجیر کے گری جس کی چوٹ بڑی
سخت تھی جس کو وہ برداشت نہ کر سکا زمین پر منہ کے بل
گر پڑا۔

”شیوناگ سے ٹکر لینا کیا تو بچوں کا کھیل سمجھتا
ہے.....؟“ شیوناگ نے اس کی پیشانی پر ٹھوک ماری۔
”تو منہ کے حصار میں بڑا بہادر بن گیا اور یہ سمجھ رہا تھا
کہ ہر طرح سے محفوظ ہو گیا ہے..... دیکھ مورکھ.....!
میں نے تجھے کتنی آسانی سے بے وقوف بنا دیا اور تو حصار
سے نکل آیا؟“

آکاش بری طرح کراہ کے رہ گیا۔ شیوناگ نے
اس کی پیشانی پر جو ٹھوک ماری تھی اس کی ضرب اتنی شدید
تھی کہ اسے دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔

”دیکھ..... اپنی بہن کو..... وہ کیسی بے سدھ کسی
لاش کی طرح پڑی ہے..... میری آغوش میں جتنی
لڑکیاں عورتیں آتی ہیں وہ سدا کے لئے میری پجاریں
بن جاتی ہیں۔“ وہ حقارت سے بولا۔

آکاش نے خود کو قابو میں کر کے بائیں جانب
دیکھا جہاں بھلا بے جان موتی کی طرح پڑی تھی۔

بھلا میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنی جگہ سے بل
تک سکے..... شیوناگ اس کے لباس نکالنا چاہتا تو اسے
کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ صرف بھلا کا سانس نہیں چل
رہا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے..... اور اس

کے چہرے پر مصیبت کا نقوش تھا۔ وہ مر چکی تھی۔
آکاش کے لئے شیوناگ کا یہ گھناؤنا کھیل اب اس کی
سمجھ میں آچکا تھا..... اس کے ہاتھ سے بازی نکل چکی
تھی..... اور اس نے حصار سے نکل کر اپنے پیروں پر کھڑی
ماری تھی۔ لیکن وہ کتا بھی کیا..... اگر وہ حصار سے باہر نہ آتا
تو شیوناگ اس کی بہن کو اس کی نظروں کے سامنے بے آبرو
کر دیتا جو آکاش کو کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔

شیوناگ نے بھلا کو بچ مالا کے اس کی غیرت کو
لگا کر اور اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا..... اگر وہ حصار
سے باہر نہ آتا تو اس کی معصوم بہن ایک درندہ صفت کی
دردنگی کی بھیٹ چڑھ چکی ہوتی تھی..... اب بھلا کا
سارا بدن نیلا پڑ چکا تھا۔

بھلا کی موت کا صدمہ اور بے بسی کے احساس نے
آکاش کو دہلا کے رکھ دیا تھا۔ غم و صدمے سے وہ مڑھال
ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔

آکاش نے سوچا کہ اب وہ چوں کہ مکار شیوناگ
کے جال میں پھنس گیا ہے اور اس کے رحم و کرم پر ہے۔
اب شیوناگ اسے زیر کرے گا۔

”کہاں ہے تیری امرتا ناگن رانی..... چپا اور
حصار.....“ شیوناگ نے نفرت اور حقارت سے اسکی
پہلیوں میں ٹھوکریں ماریں۔

”کمینہ..... حرام زادے.....“ آکاش کراہتے
ہوئے بولا۔ ”تو نے مکاری سے مجھے زیر کیا ہے.....
ورنہ تو مجھے بھی اسیر نہیں بنا سکتا تھا۔“

آکاش نے محسوس کیا کہ سخت درد کی زمین
پر پتھروں کے درمیان اسے بے دردی سے کھیٹا جا رہا
ہے۔ آکاش نے چونک کے دیکھا۔ اس ویرانے میں
اس کے اور شیوناگ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا..... لیکن
اسے پھر بھی ایک نادیہ اور پراسرار طاقت تھی
تھی..... اور اسے اپنے ٹخنوں میں زنجیروں کی جھپن
محسوس ہو رہی تھی..... حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے
زنجیریں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں.....

(جاری ہے)



شاہکار تخلیق

فائزہ رحمن - انک

نوجوان کی آنکھیں کھلیں تو وہ انجان علاقے میں تھا، سارا علاقہ دیدہ زیب اور زرخیز تھا اور سامنے ہی ایک خوبصورت جھیل موجود تھی اور جھیل کے پاس ہی ایک خوبصورت خیمہ لگا ہوا تھا، نوجوان خیمہ میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رک گیا کیونکہ.....

ایک ماورائی مخلوق کی محبت کی انٹ کہانی جسے پڑھنے والے عیش عیش کر اٹھیں گے

وقت؟“ اس بارناہرنے زور سے آواز لگائی۔
”صاحب دروازہ کھولیں۔“ ناہرنے دروازہ کھولا تو
سامنے ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔ ”آپ ہی ناہر صاحب
ہو۔“ اجنبی نے سوال کیا۔

”جی ہاں میں ہی ناہر ہوں۔“ ناہرنے اسے
سر تاپاؤں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ زہان طہاس سے
آئے ہیں اس علاقے کا رہائشی نہیں لگ رہا تھا۔“ صاحب

دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی تھی۔ رات
کے اس وقت کین ہو سکتا ہے یہ حیران کن بات اس لئے تھی
کہ ناہر کے دوستوں کا سرکل محدود تھا اور وہ اطلاع کے بغیر
کبھی نہ آتے تھے اور باقی پینٹنگ بنوانے کے شوقین لوگوں
کے لئے اس کا مخصوص وقت تھا خیر وہ اٹھا اور کوریڈور سے
ہو کر مین دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ ”کون ہے؟“
باہر سے کوئی آواز نہ آئی۔ ”کون ہے اس

”محبوب“

ناہر اس ملی سے مانوس ہونے کے باوجود اندر سے خوف زدہ سارہتا تھا۔

امتحانات ہو رہے تھے اور ناہر کافی دن میدان میں کرکٹ کھیلنے نہ گیا۔ ایک رات وہ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اپنے پیپر کی تیاری میں مصروف تھا کہ اس کی نظر کھڑکی پر پڑی کھڑکی میں وہی ملی موجود تھی ناہر کے دیکھتے ہی اس نے جھپ لگایا اور ناہر کے اوپر آگری اس کے پنجے ناہر کے منہ پر لگے تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

اسے ہوش آیا تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں اس کی والدہ نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ ”ناہر بیٹا آنکھیں کھولو۔“

”کیا ہوا ہے؟“ اس کے والد مسجد سے قاری صاحب کو بلا لائے قاری صاحب نے دم کیا تو ناہر کی طبیعت ذرا سنبھلی۔

قاری صاحب نے ملی والا واقعہ سننے کے بعد ناہر کو گھر سے نکلنے سے منع کیا اور بتایا کہ ”اس کا مستقل حل یہی ہے کہ آپ لوگ فوراً ایک ملڈ اور گھر چھوڑ دیں۔“

ناہر والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور اسے پانے کے لئے انہوں نے کتنے در کی ٹھوکریں کھائی تھیں یہ صرف وہی جانتے تھے انہوں نے فوراً گھر بدل لیا۔

اس کے بعد ایسا کچھ نہ ہوا مگر ناہر پر گھر سے زیادہ دیر باہر رہنے پر پابندی لگ گئی تھی اب وہ اپنا کرکٹ کھیلنے اور کھلاڑی بننے کا خواب بھول گیا تھا۔ اس کے بچر اسے گھر ہی پڑھانے آتے۔

دن گزرتے گئے ناہر وقت کی سیڑھیاں چڑھتا گیا گھر میں رہتے ہوئے اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لئے پینٹنگ شروع کی۔ حیران کن طور پر اس کی پینٹنگز دیکھنے والوں کو معجز کر لیتی تھیں۔

ناہر ان دنوں بہت مصروف تھا، اس کی تمام تر توجہ اپنے CSS کے امتحانات پر تھی جن میں کامیابی ہی اس کو اپنے مقصد تک پہنچا سکتی تھی۔ امتحانات ختم ہونے والے

ایک پینٹنگ تیار کروانی ہے۔“

”ایسی کیا ایمر تھی ہے۔ آپ کو پینٹنگ تیار کروانے کی، کم از کم صبح تو ہو لینے دیتے آپ۔“ ناہر نے حلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک کہا آپ نے مگر صبح ہونے سے پہلے مجھے اپنے علاقے میں پہنچنا ہے ضروری کام ہے، اس وجہ سے سوچا آپ کو تکلیف دی جائے۔“

ناہر مطمئن ہو گیا اور اس کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ اسے کینل سے گرم قبوہ نکال کر اس میں دودھ مکس کیا اور اس شخص کی طرف بڑھایا۔ ”جی بتائیے آپ کو کس قسم کی پینٹنگ تیار کروانی ہے۔“

اس کے ہاتھ میں ایک ڈرائنگ بیج تھا جس پر ایک چیتے کی تصویر تھی۔ ”مجھے یہ پیکر کروانی ہے بالکل ایسا لگے جیسے یہ اصلی ہے۔“

ناہر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تیار ہو جائے گی۔“

اجنسی نے اجازت چاہی اور باہر نکل گیا۔ ناہر اس تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”آخر یہ تصویر مجھے اتنی مانوس کیوں لگ رہی۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تصویر سے اس چیتے سے میرا کوئی تعلق رہا ہو مگر کیسے؟“

وہ یہ سوچتے ہوئے اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ مگر نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ آنکھیں بند کئے وہ اپنے ماضی میں پہنچ گیا۔

محلے کے سارے بچے میدان میں کرکٹ کھیل رہے تھے اور کھینچنے والے انہیں داد دے رہے تھے مگر بچوں میں زیادہ جوش اس وقت پیدا ہوا جب ناہر نے بیٹ سنبھالا، وہ ان تمام بچوں سے عمر میں کم تھا مگر جب بھی بیٹ سنبھالتا تو دوسری ٹیم کے چھکے چھڑا دیتا۔

تماشا بی بچے اسے خوب داد دیتے، اس کے تماشا بیوں میں ملی بھی موجود ہوتی اور دم ہلا ہلا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتی۔

کھیل ختم ہوتا تو اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر تک جاتی اور پھر نجانے کہاں اور کیسے غائب ہو جاتی۔ اب تو سارے بچے ناہر کو تنگ کرتے۔ ”ناہر لو آگئی تمہاری

ہیں احساس ہی نہیں ہوتا۔ مجھے تو ابھی یقین ہی نہیں آ رہا کہ میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں۔“

ای نے اس کا ہاتھ چوما اور مسکرا دیں۔ ”نماز پڑھ لو بیٹا اور جو ذمہ داری تمہیں ملی ہے وہ تمہیں اس دنیا کے علاوہ آخرت میں جنت بھی دلوا سکتی ہے اور جہنم کا حقدار بھی ٹھہرا سکتی ہے تمہیں خود فیصلہ کرنا ہے کہ تمہیں کون سا راستہ منتخب کرنا ہے۔“

”جی امی! میں سمجھ رہا ہوں، انشاء اللہ! اگر اللہ نے چاہا تو میں ویسا ہی بنوں گا جیسا بتانے کا خواب پایا دیکھتے تھے۔“ نماز سے فارغ ہو کر ناہر نے آپسکڑ کا یونیفارم پہنا تو اس کی آنکھوں میں غمی اتر آئی۔ ”آج میرے بابا اگر ہوتے تو وہ کتنے فخر سے مجھ کو دیکھتے۔“

ای کی آواز پر وہ چونکا اور اپنی آنکھیں صاف کیں۔ وہ ای کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دن گزرتے گئے دن مہینے پھر سال بن کر اڑتے گئے، ناہر کا شمار پٹی درجے کے پیٹرنز میں ہوتا گیا، ساتھ ساتھ وہ اپنے عہدے کے فرائض بڑے اچھے طریقے سے نبھاتا رہا۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ ڈسٹرب سا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں علاقے میں بچوں کا آئے دن اغوا ہو جانا اور ابھی تک کوئی سراغ تو کیا کوئی ایسی علامت نہ ملی کہ کچھ کیا جاسکے بچے کو کس انداز سے اغوا کر کے کہاں غائب کیا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ کئی دن ہو گئے رات تقریباً ٹھیک بارہ بجے اس کی آنکھ فون کی بیل مسلسل بجنے سے کھل جاتی اور ریسورٹھانے پر صرف کسی کی سانس لینے کی آواز سنائی دیتی اور پھر بند۔

آج کل اسے اپنی ہی بنائی گئی پینٹنگ جو کہ خیالاتی ہوتی کہیں نہ کہیں حقیقت بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ انہی دنوں میں اس نے ایک بھکاری کی خیالاتی تصویر بنائی، بہت ہی خستہ حال بھکاری اس کی آنکھوں کلکڑ پتے وقت اس نے بھورا رنگ چٹا اور پینٹنگ مکمل کی مگر خود بخود اس کی آنکھوں کا رنگ بھورے سے سرخ

تھے اور بس آخری پہر جس پر کامیابی کا دارومدار تھا وہ رہ گیا تھا اس کے لئے ناہر نے دن رات ایک کر دیا تھا اور آخر کار پہر چل کرنے کے بعد وہ ہال سے نکلا اور کینے میرا کارخ کیا۔ اس کی جیب میں جیسے زلزلہ آیا ہو وہ ایک دم چونکا اور پھر مسکرا اٹھا اس کا سیل فون واٹریشن پہ تھا۔ اس نے جیب سے نکالا اور اسٹینڈ کیا۔ ”جی اسلام علیکم۔“

دوسری طرف اس کا کرن شامیر تھا۔ ”بولو شاہ میر کیسے یاد کیا؟“ مگر شاہ میر نے روتے ہوئے جو خبر سنائی اس نے ناہر کے حواس سلب کر دیے۔ ”انکل کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے ناہر اور وہ اور وہ.....“

اس کے بعد ناہر کو ہوش نہ رہا کہ وہ کیسے گھر پہنچا۔ گھر کے سامنے ایک جھوم تھا اس جھوم کو چیرتا ہوا وہ اپنے بابا کی چار پائی تک پہنچا۔ ”بابا..... بابا.....“ انھیں ایک بار آنکھیں تو کھولیں..... دیکھیں آج آپ کا ناہر کامیاب ہو گیا ہے..... آپ کے ناہر کی آپسکڑ کے لئے سلیکشن ہو گئی ہے۔ آپ کا خواب پورا ہو گیا۔ بابا ایک بار آنکھیں کھولیں۔ ”مگر اس کے بابا اس جہاں کی طرف چلے گئے تھے جہاں سے واپس آنا کسی کے لئے ناممکن ہے۔ نہ کوئی آیا ہے نہ آئے گا تو اس کے بابا کیسے آ سکتے تھے۔“

ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں اور چند دن رہنے اور تسلیاں دینے کے بعد تمام رشتہ دار اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ناہر تو جیسے سکتے میں آ گیا تھا۔

کبھی کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ لوگ ڈرائیور پر چلا جاتا اور تھوڑا سکون محسوس کرتا۔

سب کلیر ہو گیا تھا اور صبح ناہر کو باقاعدہ اپنی ڈیوٹی پر جانا تھا۔ کافی دن سے اس نے کسی پینٹنگ پر بھی کوئی کام نہ کیا تھا وہ جلدی سونا چاہتا تھا تاکہ صبح تھوڑا فریش محسوس کر سکے صبح ناہر کی اذان کے ساتھ ہی آ نکھ کھلی وہ اٹھا اور اپنی امی کے کمرے کی طرف چل دیا، دروازہ کھلا تھا۔ وہ آہستہ سے اندر داخل ہوا تاکہ اگر وہ سوری ہوں تو ڈسٹرب نہ ہوں مگر وہ جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھیں ”ای۔“ ناہر نے آہستگی سے مخاطب کیا۔ اور ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اور امی کے دونوں ہاتھوں کو چومنے لگا۔ ”ای دن کتنی جلدی گزر رہا ہے

ہو گیا، تاہر گھبراہٹ میں پیچھے ہٹا۔ ”اوہ!“ میرے خدا کتنا بھیا تک ہو گیا ہے اس کا چہرہ، کیا یہ میری ہی تخلیق ہے۔“
وہ باہر نکل گیا اور قریبی پارک میں جا کر بیٹھ گیا سورج غروب ہو رہا تھا سارا ماحول سورج کی کرنوں سے عجیب گھٹاری رنگ کا ہو گیا تھا۔

اس نے ایک مانوس سی آواز سنی اور آواز کی طرف پلٹ گیا، اس کا کالج کا دوست دشا درسا تھا۔ ”دشا درتہ!“
”جی جناب بڑے افسر بن گئے ہومیں کہاں بچپانوں کے ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں چلو گھر چلتے ہیں اور رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔“
”ارے نہیں آج نہیں پھر کبھی تمہیں تو پتہ ہے، میرے ابو مغرب کے بعد گھر سے باہر رہنے کو کتنا برا سمجھتے ہیں۔“

”اور ٹھیک ہی کہتے ہیں حالات ہی ایسے ہیں۔ اوکے میں بھی گھر جاتا ہوں امی انتظار کر رہی ہوں گی۔“
تاہر واپسی والے راستے سے مڑا اور تھکے لگے تھکے لگے لگا۔ اسے لگا جیسے اس کے پیچھے کوئی ہے، وہ دیکھنے کے لئے مڑا تو اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

وہی تصویر والا بھکاری حقیقت میں اس کے سامنے تھا۔ ”مگر..... وہ تو میرے اپنے ذہن کی تخلیق تھی۔“

”تاہر انکار مت کرنا۔“ یہ الفاظ اسی بھکاری کے تھے اور پلک جھپکتے ہی وہ اس سڑک کے آخری کنارے پہنچ گیا تھا اور مجرورہ مڑ گیا اور تاہر سکتے میں وہیں کھڑا رہ گیا۔
”کس چیز سے انکار نہ کرنا میرے خدا میری رہنمائی کرے۔“

”اور اب اس شخص نے جو تصویر دی وہ جیتا بالکل اس جلی سے ملتا ہے، ایسا لگتا ہے وہ جلی ہی اس چیتے کی شکل اختیار کر گئی ہو۔“ تنجا نے وہ مینڈی واڈی میں اتر گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن ڈیوٹی کے دوران بھی کئی بار اس کا ذہن ہونے والے واقعات کی طرف چلا جاتا مگر اس وقت تمام باتوں سے اہم بات تھی بچوں کے انوکھا کایس، جس کا کوئی سراغ نہ مل رہا تھا۔ بچے اکثر پارک اور دوسری تفریح گاہوں سے لاپتہ ہو رہے تھے۔

تاہر نے دوکانٹیل کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ ہمیشہ بدل کر پارک اور تفریحی مقامات پر نظر رکھیں مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل رہا تھا۔

رات کے دس بجے تاہر اپنے پینٹنگ روم میں ایک خوبصورت ڈھن کی تصویر بنا رہا تھا بہت ہی خوبصورت ڈھن کی تصویر اسے آخری مراحل میں تھی، تنجانے تاہر کو کیا سوچا کہ اس نے ڈھن کے ماتھے پر بندیا کی جگہ ایک کوبرا کا پھن بنا دیا اور ایسا کر کہ وہ خود حیران تھا۔

”کیوں ایسا کیا میں نے؟ لیکن ٹھیک ہے تمام پینٹنگ کو ایک طرح کا نہیں ہونا چاہئے کچھ تو مختلف ہواں میں۔“ وہ ابھی اسی کو دیکھ رہا تھا کہ اسے مخصوص وقت پر ڈھن کی گھنٹی بجی۔ ”جی کون ہے؟ پلیز! بولیں! کون؟“ تاہر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”خلاف توقع آواز ابھری۔“ درشا ملک! میں درشا ملک بول رہی ہوں۔“

”میں پہنچا نہیں، آپ مس درشا..... آپ کون ہیں؟ کافی دن سے ایسا کیوں کر رہی ہیں؟“

”جناب ذرا غور کرنے کی بات ہے، آپ کے دوست ہی ہیں۔ آپ کے ارد گرد رہنے والے۔“

”بس درشا کھل کر بات کریں آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”آپ ایک مشہور پینٹر بھی ہیں مسٹر تاہر! بس اسی سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”تو آجائیں میرے تمام Customer آتے رہتے ہیں۔“

”آپ سمجھ نہیں ہم یہ چاہتے ہیں کہ میرے بجائے آپ ہمارے ہاں آئیں اور ہماری والدہ کی پسندیدہ پینٹنگ ان کے سامنے تیار کریں، اگر آپ آنا چاہتے تو کل آرٹ گیلری میں آجائیں، میں وہاں سے پک کر لوں گی آپ کو۔“

”جی ٹھیک! مگر آپ مجھے یا میں آپ کو کیسے پہنچانوں گا۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں، میں ہزاروں میں بھی

آپ کو پہچان لوں گی۔“

شہرت سنی ہوئی تھی میرا بھی دل چاہا کہ تمہارے کام کا انداز دیکھوں۔“

اتنے میں ملازم چائے لے آیا اور ورشا ایک مخصوص انداز سے مسکراتی ہوئی اُٹھی اور چائے ناہر کے ہاتھ میں تھما دی۔ ناہر نے شکریہ کے ساتھ چائے کا کپ پکڑ لیا اور پینے کے لئے کپ اپنے ہونٹ سے لگا لے ہی والا تھا کہ اسے لگا۔ ”اس میں خون ہے۔“ اسے ایکا آگئی۔

مگر پھر سے اسے ایسا لگا۔ ”نہیں اس میں چائے ہے۔“ اس نے چسکی لے کر چائے پی لی مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے فوراً بھاگ جائے۔

”جی پلیز! آپ بتائیں آپ کو کس قسم کی پینٹنگ تیار کروانی ہے؟“

میرے ساتھ چلیں وہ لہراتے ہوئے انداز میں اُٹھی اور ایک طرف چل دی۔ ناہر نے بھی اس کی پیروی کی۔

ایک کمرہ میں جا کر وہ رک گئی۔ ”ناہر یہ تمہارا کمرہ ہے، میرا مطلب ہے تم یہاں آسانی سے کام کر سکتے ہو۔“

ناہر تین دن سے مسلسل آفس ٹائم کے بعد ورشا ملک کے بنگلے پر چلا جاتا اور ان کی مرضی کی پینٹنگ بناتا وہ ایسا اس لئے کر رہا تھا کہ اسے ان لوگوں کے رویہ پر بہت حسرت غرض ہر چیز میں ایک پراسراریت سی محسوس ہوتی تھی وہ جانتا چاہتا تھا کہ حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ جن پینٹنگ کے لئے اسے کہا گیا تھا، وہ معمولی تھیں اور انہیں کوئی بھی پیشر آسانی سے بنا سکتا تھا۔ ”پھر اس کا انتخاب ہی کیوں کیا گیا؟“

اتوار کا دن تھا، ناہر صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ سو گیا، اور نو بجے اٹھا اور ناشتہ کرنے کی غرض سے کچن میں چلا آیا۔ ”امی آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں جاگ گیا ہوں؟“ میرا خیال تھا، میں خود ہی اپنے لئے ناشتہ بنا لوں گا مگر آپ میری امی..... دنیا کی سب سے پیاری امی۔“

”ہاں بیٹا! بچوں کے اُٹھنا کیس حل ہوا؟ پتہ چلا کہ وہ کون بد بخت ہیں۔“

”نہیں امی ہی اللہ کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ نہ آ سکا۔“

ناہر فون آف کرنے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا، اس دہن کی تصویر کو اس نے اپنے کمرے میں لٹکائی اور سو گیا۔ ناہر ایک سبز میدان میں کھڑا تھا۔ ایک طرف ایک جھیل تھی جھیل کے کنارے ایک بہت خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی جو کہ رو رہی تھی۔

ناہر نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی لڑکی کا چہرہ دوسری طرف تھا، اس وجہ سے وہ دیکھ نہ سکا لڑکی نے اپنا چہرہ دوسری طرف کئے بغیر جواب دیا ”تم بہت ظالم ہو، بہت ظالم ہو۔“

اتنے میں ناہر پسینے میں شرابور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لیمب آن کر کے پانی پیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ”میں اور ظلم..... میرے خدا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ نہ جانے وہ ورشا ملک کون ہے اور کیسا طوفان لانا چاہ رہی ہے؟ میرے مالک اگر واقعی انجانے میں مجھ سے کوئی خطا ہوگئی ہے تو معاف کر دے۔“ صبح ناہر آفس گیا اور ضروری فائل وغیرہ کو اسٹینڈی کرنے کے بعد وہ نکلا، اس کا رخ آرٹ گیلری کی طرف تھا وہاں ایک ہجوم تھا ناہر ہر چیز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا مگر بے سود۔

آہستہ آہستہ رش کم ہونے لگا اور چند ہی افراد وہ گئے سورج بھی اپنی ڈیوٹی ختم کرنے والا تھا۔ ناہر بے دلی سے واپس مڑا اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا کہ اسے ایک آواز سنائی دی ”مسٹر ناہر..... میں ادھر ہوں پلیز! Come Here“

”ناہر آواز کی سمت بڑھا، بلکہ ساڑھی میں ملیں خوبصورت لڑکی کھڑی تھی..... میں ورشا ہوں..... مسٹر ناہر چلے می ویٹ کر رہی ہوں گی۔“ ناہر نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے اپنے آگے ڈرائیو کرنے کو کیا۔ ورشا اپنی گاڑی میں اور ناہر اپنی گاڑی میں تھے آبادی سے کافی دور آ کر لینڈ کروزر رک گئی۔ ناہر نے بریک لگائی اور نیچے اتر آئے۔ اس نے خوبصورت بنگلہ تھا۔ ”چلے ناہر صاحب۔“

ڈرائنگ روم میں بیٹھنا کلام سا گھٹ رہا تھا اتنے میں ورشا اپنی می کے ساتھ داخل ہوئی تو ناہر کھڑا ہو گیا۔ ”بیٹھو..... بیٹھو ناہر..... تمہیں تکلیف دی دراصل تمہاری بہت

ناہر۔ ”کوئی بات نہیں، کیا گھر میں کوئی مہمان آئے ہیں؟ ابھی مجھے کچھ مردانہ وائس سنائی دی تھیں۔“

”ارے وہ..... نہیں نہیں۔ ان کے چہرے کے رنگ متغیر ہو گئے اور پھر سنبھلے ہوئے۔“ وہ باورچی ملازم اور چوکیدار سب لوگوں کو میں ڈانٹ رہی تھی اور وہ باتیں بنا رہے تھے۔

سب مل کر کہیں ہانکتے ہیں اور کام کو ہاتھ لگانے سے کتراتے ہیں۔“

”اوکے“ ناہر نے بحث کو طول دینے سے بچایا۔

”آج تم اطلاع کئے بغیر کیسے؟“

”بس سوچا کہ سر براہز دوں ویسے بھی اتوار تھا۔ فارغ تھا میں“ ناہر نے محسوس کیا جیسے اسے کہا جا رہا ہوں ”اب تم جاسکتے ہو۔“

”مگر آپ کو ڈسٹرب کیا ہے تو معذرت چاہتا ہوں۔ اب میں چلتا ہوں۔“ درشانے ماں کی طرف دیکھا جیسے شہر ادا کر رہی ہو۔

اچانک مسز ملک نے پکارا۔ ”ناہر دراصل ہم تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“

”جی پولیس.....؟“ ناہر تم پولیس انسپکٹر ہو، سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ محکمہ پولیس خواہ مخواہ شریف شہریوں کو تنگ کرتا ہے۔ آئے دن ہماری گاڑی چیکنگ، آئے دن پوچھ گچھ۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

مسز ملک نے تھوک نچکتے ہوئے۔ ”میرا مطلب ہے، ہم لوگ روز کسی نہ کسی تفریحی مقام پر جاتے ہیں اور ریل چکر جو کہ بچوں کی پسینہ بخاں تفریحی ہے، وہ فٹ کرتے میرے ملازم جو کہ ریل چکر پر کام کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ پولیس روز، پوچھ گچھ کے لئے آتی ہے جس سے بچے سہم جاتے ہیں اور ہمارے کاروبار کو کافی نقصان ہو رہا ہے اگر آپ انہیں منع کر دیں ایسا کرنے سے تو۔“

ناہر کے چہرے پر فکر و غصے کی لٹکریں ابھریں مگر اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے آئندہ ایسا نہیں ہوگا مگر حالات ایسے ہیں کہ آئے دن تفریحی مقامات سے

لیکن مجھے یقین ہے، جلد ہی ان کو کفر کر دلاؤں گا۔“

وہ بچے ڈور تیل بجی اور ایک صاحب اندر داخل ہوئے۔ ”ناہر صاحب کوئی خوبصورت شاہکار دکھائیں، میں خریدنا چاہتا ہوں۔“ چتر میری پسند کی اور دام..... اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ارے نہیں جناب پیسے کی بات نہیں آپ دیکھ لیں، جو آپ کو مناسب لگے لے لیجیے، آپ کو پتہ ہے یہ میرا شوق ہے، میں قیمت مناسب لیتا ہوں۔“

”تمام آرٹ آپ کے سامنے ہے جناب۔“

”ناہر صاحب ان کے علاوہ کچھ اور دکھائیں بلکہ یہ جو آپ بنا رہے ہیں میرے لئے وہی مکمل کر دیجیے۔“

”یہ کسی کے آرڈر پر بنا رہا ہوں ورنہ ضرور آپ کو دیتا۔ مگر ایک منٹ یہ پیسے ضرور اچھی لگے گی آپ کو۔“

ناہر نے اپنے بیڈ روم سے اس ڈسٹ کی تصویر اتار کر اس شخص کے حوالے کی۔

”بہت خوب! واقعی بالکل حقیقی لگ رہی ہے، ایسا جادو کی کسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“ قیمت ادا کرنے کے بعد وہ شخص تصویر کے ہمراہ چلا گیا۔

ناہر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی طاقت اسے درشا کی جانب زبردستی بھیج رہی ہے اس نے گاڑی نکالی اور نکل گیا۔ تقریباً دو بج رہے تھے اور وہ بغیر اطلاع کے جا رہا تھا اور پھر وہ اس جگہ پہنچ گیا چوکیدار اسے پہچان چکا تھا اور دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا کرتا مگر آج دروازہ کھلنے میں کافی دیر ہو گئی، ناہر نے کئی بار ہارن بجایا اور تقریباً وہ واپس مڑنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔

ناہر ڈرائنگ روم میں بیٹھا اور گرد گدگد جازز لے رہا تھا ہر چیز بے انتہا قیمتی تھی۔ ”آخر اتنا دیکھ یہ کہاں سے آتا ہے ان کے پاس؟“ وہ ابھی سوچوں کی وادی میں تھا کہ اسے لگا چند افراد اس کو شایں کر رہے ہوں۔ ان کے گھر کوئی مرد نہ تھا بقول ان کے درشا کے والد کا تین سا پہلے انتقال ہو گیا تھا اور باقی رشتہ دار بھی کم و بیش ہی آتے تھے۔

اتنے میں درشا اور اس کی مٹی اپنے مخصوص انداز میں چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ”وہ دوسری۔“

بچوں کا انخواہو جاننا، ہر ایک کو مشکوک بنا رہا ہے۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے ناہر مگر اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟“

ناہر خود حیران تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔
 اس نے یہ تصویر پھر اپنے بیدروم میں لگالی اور خود کام مکمل کرنے لگا۔ اور پھر تھک کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔

آج پھر ناہر نے خود کو اسی وادی میں پایا پھر سے وہی منظر وہ لڑکی بار بار اسے ظالم گردان رہی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی اس بار ناہر نے ہمت کی اور لڑکی کا رخ جس جانب تھا اس طرف سے آگے بڑھا پلیز! نہ روئیں کون ہوتم اور مجھے ظالم کیوں کہہ رہی ہو؟“

لڑکی نے سر اٹھایا، وہی تصویر والی دہن تھی، وہ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میرے دشمن کو کیوں میرے ماتھے پر بٹھادیا۔“

”کون ہوتم؟“ ناہر نے سوال کیا۔

”میرا نام ایرش ہے تم بہت ظالم ہو.....“

ناہر کی آنکھ کھل گئی، اس نے جلدی سے لائٹ آن کی۔ ”اوہ میرے خدا! کیا ہے یہ سب۔ یہ تو میرے ذہن کی تخلیق ہے مگر یہ خواب اور دن..... اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

اگلے دن اس نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا۔ وہ اپنا شک یقین میں بدلنا چاہتا تھا اس نے دو کانٹھیل کی ڈیوٹی ریل چکر کے ارد گرد لگادی اور سختی سے نظر رکھنے کو کہا اور ایک کانٹھیل کو بھکاری بنا کر مسز ملک کے بنگلے کے باہر فاصلے پر بٹھادیا۔

پہلے دن شام کو تینوں کانٹھیل اپنی اپنی رپورٹ ناہر کو دے رہے تھے، کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا دوسرا دوسرا دن بھی بے کاری رہا۔

ناہر نے خود فیصلہ کیا کہ اب وہ خود گمرانی کرے گا۔
 رات گیارہ بجے مسز ملک کا فون آیا۔ ”ہیلو ناہر! یہ کیسے ہو، کیا تم اس وقت آ سکتے ہو؟“

ناہر تو خود ہی چاہتا تھا، وہ مزید جاننا چاہتا تھا ان کے بارے میں فوراً ”اوکے“ کہہ کر فون بند کر دیا۔

ناہر داخل دروازے کے قریب کھڑا مشاہدہ کر رہا تھا

”آپ سے پہلے بھی جو اسپیکر تھا اس کے تعاون سے ہمارا کاروبار چل رہا تھا۔ مگر اب۔“

ناہر نے سنجیدگی سے درشا کی طرف دیکھا جو کہ شعلہ بار آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ ایک دم وہ بھی پزل ہو گئی اور ناہر نے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بچہ چیخ رہا ہو۔ ناہر نے پلٹ کر مسز ملک کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”وہ دراصل درشا کی وی آن ہی چھوڑ آئی تھی، کسی ہارر مودی میں بچہ.....“

ناہر گاڑی درمیانی اسپید سے ڈرائیو کرتا تھا مگر اب اس کی اسپید بہت آہستہ تھی وہ سوچوں کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا مسز ملک کے الفاظ اور تقریبی مات سے بچوں کا انخواہو ہوتا۔ ”کہیں مسز ملک تو یہ گھناؤنا کھیل نہیں کھیل رہی۔ اگر ایسا ہے تو پھر میرا کام بہت آسان ہو گیا ہے ان کا کھیل ختم ہونے والا ہے۔“

ناہر فریض ہوا اور پینٹنگ روم میں چلا گیا کیونکہ چھتے کی تصویر ابھی نامکمل تھی اور اس کا گاہک کسی وقت بھی لینے آ سکتا تھا۔

اتنے میں ڈور بیل بجی تو وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا، سامنے وہی شخص تھا جو صبح دس بجے اس کی پینٹنگ خرید کر گیا تھا۔

”جی جناب فرمائے؟“ ناہر نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”ناہر صاحب! یہ تصویر آپ واپس لے لیں مجھے تم کی بھی ضرورت نہیں، جو میں نے ادا کی تھی مگر پلیز! یہ تصویر آپ واپس لے لیں۔“

”ہوا کیا..... کیا تمہارے گھر والوں کو پسند نہیں آئی۔؟“

”نہیں ناہر صاحب بات دراصل یہ ہے کہ اس میں کو برہا ہے وہ حقیقت بن کر تصویر سے باہر نکل آیا تھا

کہ مسز ملک نے آواز دی۔ ”مسز ناہر! اندھا ہے۔“
 ناہر ڈانگ روم میں بیٹھ گیا۔ ”جی فرمائیے اس
 وقت کیوں بلایا ہے آپ نے؟“

”آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے شاید آپ نے منع کیا ہے پولیس والوں کو ہمارا کاؤ بار اچھا چل رہا ہے آج کل۔“

”جی تمام معزز شہریوں کی حفاظت ذمہ داری ہے ہماری۔“ ناہر بولا۔

تاہر کی نظر مسز ملک کے بازو پر پڑی ہاف آستین
تھس لئے بازو پر بنا کوبرا کا پھن ظاہر ہو رہا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا مگر اسی لمحے مہرملک کی آنکھوں سے تیز روشنی نکل کر تاہر کے دماغ تک پہنچی اور وہ ہونٹوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا اس کا دماغ مہرملک کی پیروی کر رہا تھا۔

مصر ملک اسے ایک تہ خانے میں لے گئی وہاں ایک مجسمہ تھا بالکل اسی بھکاری کا مجسمہ جسے ناہر نے پینٹ کیا تھا اور حقیقی طور پر اس سے مل چکا تھا۔ ”یہ میرے باپ کا مجسمہ ہے۔“ اس نے مجھے بتایا تھا ”تمہاری طاقت صرف یہی لوٹا سکے گا جو خلیا لاتی طور پر میری تصویر بناتا ہے۔“ میں نے کئی سال انتظار کیا اور آج تم میرے سامنے دو دیکھو انکار نہ کرنا۔“

یہ الفاظ اس بھکاری کے تھے تاہم سوچنے سمجھنے کے وجود پر بنا تاں ظہور پر سیاسی کردار تھا جیسا وہ کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنی انکلی سے خون نکال کر مجھے پر ڈالا تو مجھے میں حرکت پید ا ہوئی۔ حرکت کے ساتھ ہی مسز ملک نے اس مجھے کے منہ سے انگوٹھی اتاری۔

وہ بڑی ہوشیاری سے اپنا مقصد پورا کروا رہی تھی
رانا ہرے بس تھا۔

”بس اب آخری کام کرو، اس مجسمے کو سمجھ کر دتا کہ مری کھوئی ہوئی طاقت مجھے مل جائے جلدی کرو اور جدوجہد کر کے یہ ثابت کر دو کہ جو تم نے کیا اپنی مرضی سے کیا۔“

تاہر جھکے لگا وہ تقریباً زمین سے چند انچ کے فاصلے تھا کہ اس کی کولہ دو ماغ میں آنسو پڑ گئے۔

”سجدے کے لائق بس وہی ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے کسی اور کے سامنے جھکنا شرک ہے۔“
 ”وہ تو حمد و ثناء کا شریک ہے۔“

”رُک جاؤ تاہر..... رُک جاؤ تاہر ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا اس پر مسز ملک کا جادو ختم ہو گیا تھا۔

میرے خدا تیرا شکر ہے تو نے مجھے گناہ عظیم سے بچالیا۔“ سامنے وہی تصویر والا چیتا کھڑا تھا اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

”ناہر سوار ہو جاؤ اس پہ۔“ ناہر اس پہ بیٹھ گیا اور چلتا
جست لگاتا ہوا بجلی کی تیزی سے باہر آ گیا۔ اس کا رخ ناہر
کے گھر کی طرف تھا۔

گھر پہنچ کر ناہر نے دیکھا کہ چیتا پھر سے پینٹنگ بورڈ پر تصویر میں بدل گیا۔

رات کے دو بج رہے تھے ناہر کی امی سجدے میں
نجانے کیا دعا مانگ رہی تھیں۔ ”ناہر بیٹا تم آگئے۔“

”جی امی آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔“
 ”ہاں بیٹا۔“

”میں نے بہت بھیاںک خواب دیکھا تھا کہ
 منہارے اندر گرد کی سانپ منڈلا رہے ہیں اور تم ان کے
 گھیرے میں بے بس ہو۔ میں اُچی اور نوافل ادا کر کے
 منہارے ساتھ کہ دعا مانگے گا۔“

تاہر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”میری پیاری امی یہ آپ کی دعا ہی ہے جس نے مجھے پھر سے آپ کے سامنے اکھڑا کیا ہے اور مجھے یقین ہے جب تک آپ کی دعا میرے ساتھ ہے کوئی بھی اپنے غلط عزائم میں مجھ پر حاوی نہیں ہو سکے گا۔“

ناہر نے خواب دیکھا، آج پھر وہی لڑکی جھیل کے کنارے بیٹھی ہے اور ساتھ ساتھ کچھ کہہ رہی ہے۔ مگر پہلے لی طرح آج وہ رونہیں رہی۔ ایک دم وہ اٹھی اور ناہر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "ناہر آپ آگئے۔ شکر ہے آپ نے اس بھاری مرتد قین کو سجدہ نہیں کیا ورنہ..... وہ سانپ مجھے ڈٹا اور تمام طاقتیں اس کی بیٹی اور نواسی کو مل جاتیں وہ بہت ظالم ہیں اس کے بعد انہوں نے جو بتایا وہ جانی بھی خدا

کی پناہ.....

بچوں کو۔

ناہری کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا وہ لوہے کی مضبوط زنجیروں کے ٹکڑے میں تھا۔ ایک طرف اس کا اپنا ایمان تھا جو کہ اسی کی پہچان تھا ورنہ اندر نہ صفت شیطانوں اور اس میں کیا فرق رہ جاتا اور دوسری طرف کئی معصوم جانیں تھیں۔ کانشیل اکبر ریل چکر کے قریب ہی کھڑا تھا اور ریل چکر چلانے والے جسے بچے اکل ٹومی کہتے تھے اس سے مخوف لگتا تھا۔

”یار بچے بڑی خوشی سے تمہارے ریل چکر میں بیٹھے ہیں، اکثر میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی بیٹھوں مگر یہ سوچ کر اسنے خیال کا اظہار نہیں کرتا کہ تم لوگ مجھے آہستہ سمجھو گے۔“

”اچھا تمہارا بھی دل کرتا ہے کہ تم ریل چکر کے مزے لو۔“

”ہاں یار ابھی بچے نہیں ہیں کیا تم مجھے ایک چکر دے سکتے ہو۔“

”ارے نہیں بلکن ناراض ہوگی۔ تیرا وزن یہ چھوٹی چھوٹی سیٹیں کیسے برداشت کریں گی جاؤ کام کرو۔“

”دیکھ لقمہ 80 روپے کا ٹکٹ دیتے ہو میں تمہیں ایک ہزار دیتا ہوں بولاب دو گے مجھے جھولا۔“ ٹومی سوچ میں پڑ گیا ابھی اس کا سامھی نہیں آیا تھا اور کوئی بتانے والا موجود نہ تھا وہ ان ہزار روپوں کو اپنے کھاتے میں ڈال سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے مگر تھوڑی دیر بعد میں روک دوں گا۔“

ٹھیک۔۔ اکبر ریل چکر میں کھڑا ہو گیا۔ ریل چکر اتنی تیزی سے گھوما کہ پاس کھڑے ہونے والا شخص اندازہ کر پاتا تھا کہ کیا ہے اس نے بغور ہر ایک جگہ کو دیکھا وقت کم تھا آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی وہ ہر سیٹ پر اپنے ہاتھ سے وزن ڈالتا اور آگے چل پڑتا، تقریباً 17 ویں سیٹ پر جیسے ہی اس نے ہاتھ کا وزن ڈالا سیٹ نیچے کو گرنے لگی نیچے جیسے کسی تہہ خانے کی طرف اس کا خیال ٹھیک لگلا جو بچہ اس سیٹ پر بیٹھا وہ غائب ہو جاتا ریل چکر میں بچوں کو اس طرح کچھ بھج دیا جاتا کہ بچوں

ناہری کی آنکھ کھل گئی۔ ”آ خر کون ہے یہ معصوم سی لڑکی؟“ اگلے دن شام کو کانشیل نے جو رپورٹ دی وہ حیران کن تھی۔

”سرا ہم ریل چکر کے پاس کھڑے تھے بس ایسے ہی ریل چکر میں بیٹھے والے بچوں کی تعداد گنتے لگا۔ وہ 26 تھے اور اتنے وقت 25 آ خرایک بچہ کہاں گیا؟ سر میں نے اس کے علاوہ اور کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھی۔ نہ ہی غائب ہونے والے بچے کو کسی نے اٹھایا نہ ہی اس نے شور مچایا اور ریل چکر بھی بچوں کے ترنے کے بعد خالی تھا۔“ ناہری بڑی توجہ سے کانشیل اکبر خان کی بات سن رہا تھا۔ ”ٹھیک تم مزید توجہ سے دیکھو اور ہاں اگر ہو سکے تو جب ریل چکر خالی ہوا سے غور سے مشاہدہ کرو۔ اصل چکر کیا ہے۔“

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے ناہر بنگلے کے باہر موجود تھا اور میسر سے دیواروں کو چیک کر رہا تھا کہیں ان میں شارٹ سرکٹ تو نہیں چھوڑ گیا۔

اطمینان کر لینے کے بعد ناہر نے آرام سے بنگلے کی دیوار پار کی اور احتیاط سے چلتا ہوا ایک، ایک کمرے کو چیک کر رہا تھا تمام کمرے اندر سے لاک تھے اچانک ایک کمرہ اس کے سامنے نمودار ہوا اور اس کی آنکھوں سے بالکل دیکھی ہی شعاعیں نکلتے لگیں جیسی مسز ملک کی آنکھوں سے نکلی تھیں، ناہر نے وہاں سے ہٹنا چاہا مگر وہ اپنے حواس سے بیگانہ ایک طرف لڑھک گیا۔

”دودن سے اپنچر ناہر غائب ہے۔“ تمام عملہ اپنی پوری کوشش کے باوجود ناکام ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ ناکابندی کرا دی گئی مگر کوئی سراغ نہ ملا۔

ناہر ہوش میں آچکا تھا۔ ”مجھے یقین تھا چوہے تم ضرور اھر کا رخ کرو گے“ آخر تم بھی تو جاسوسی کے ماہر ہو، اب بتاؤ کیا وہ آخری کام کرو گے۔ اگر تم میرا آخری کام کرو تو تم سینکڑوں بچوں کو موت سے بچا سکتے ہو ورنہ تم تو مردو گے ہی ساتھ ہی مجھے قہن کو راضی کرنے کے لئے سینکڑوں بچوں کی بلی دینی ہوگی اگر بچا سکتے ہو تو بچا لو ان

کو اتنی تیزی میں گھومتے ہوئے ریل چکر میں احساس ہی نہ ہو پاتا کہ کیا ہوا ہے۔

اچانک ریل چکر رک گیا۔ ”چلو جلدی سے اترو، میرا سستی آ رہا ہے اور دیوے بھی بچوں کا وقت ہے جاؤ اب یہاں سے۔“ ٹوٹی اکبر سے مخاطب تھا۔

”ٹھیک ہے ٹوٹی یا تمہارا شکر یہ بہت مزا آیا واقعی اب پتا چلا بچے اتنی خوشی سے کیوں اس میں سوار ہوتے ہیں۔“ اکبر نے ایک بچہ جو کہ اس کا بڑی تھا اور کافی عقلمند بھی ہر وقت اکبر سے سوالات کرتا رہتا تھا۔

”انکل بتائیں کیا پولیس کیسے بنتے ہیں، میں بھی پولیس بنوں گا۔“

اسے تیار کر لیا اپنے مشن کے لئے۔ ”بیٹا تم کہتے ہونا کہ تم پولیس بننا چاہتے ہو تو پھر آؤ آج تمہارا امتحان ہے۔ اگر تم پاس ہو گئے تو تم پولیس بن جاؤ گے۔“ بچہ خوشی خوشی تیار ہو گیا۔

کانٹینل اکبر نے بچے کو ایک سیل فون دیا اور کہا کہ ”تم 17 ویں سیٹ پر بیٹھ جانا اس کے بعد تمہارے ساتھ جو جو واقعات پیش آئیں تم مجھے آگاہ کرتے رہنا۔“

اگر تاہم تین دن سے بھوکا پیاسا زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور مزید اس پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک ڈھانچہ آ کر کوڑے رسا تا ”بول دیا کرے گا نہیں“

وہ سنے تو انہیں بچوں کی ملی دینے میں بھی کوئی وقت نہ تھی۔ لیکن اگر تاہم اپنی مرضی سے وہ سب کرتا جیسا اسے کہا جاتا تو ان کو زیادہ طاقتیں ملتی تاہم جانتا تھا اگر وہ ایسا کر بھی لیتا ہے تو وہ بچوں کو نہ بچا سکے گا کیونکہ وہ مزید طاقتیں حاصل کرنے کے لئے بچوں کی ملی ضرور دیں گے۔

ریل چکر میں کانٹینل اکبر نے بہت ہوشیاری سے بچے کو 17 نمبر سیٹ کی طرف بڑھنے کو کہا جیسے ہی وہ بچہ 17 نمبر سیٹ پر بیٹھا وہ گہرائی میں اترا چلا گیا۔

اب وہ گہرائی کے بجائے اوپر آ شروع ہو گیا تھا۔ اور جیسے ہی وہ کچھ کیسنے کے قابل ہوا وہ کھنے جنگل میں تھا۔ ایک ڈھانچے نے اسے کمر پر لادیا اور سامنے موجود بیکلی کی طرف لے گیا۔ اس نے سمجھا جب بے ہوش ہو چکا ہے

ڈھانچے نے باقی بچوں کے ساتھ جا کر اسے بھی لٹا دیا۔ جیسے ہی ڈھانچہ باہر سے دروازہ لاک کر کے وہاں سے ہٹا بچے نے سیل فون نکال کر اکبر کو ایک ایک بات بتائی سرگوشی کے انداز میں اور یہ بھی بتایا کہ اس کو وہاں پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ اس کا مطلب ہے ٹھکانہ کہیں قریب ہی شہر میں ہے۔

اس نے باقی بچوں کو خاموش رہنے کو کہا اور کہا کہ تم سب آزاد ہونے والے ہو بس خاموش رہنا۔

دوسری طرف ناہر کی والدہ کی حالت بہت خراب تھی وہ رورو کر دعا مانگ رہی تھی۔ ”اے پالنے والے اے پروردگار میرا ناہر کے سوا اور کوئی نہیں۔ اے اپنی حفظ و امان میں رکھنا لک جرم فرما۔“

ناہر کے سامنے کھانا کھا گیا تھا، تین دن بعد ورثا سامنے کھڑی تھی۔ ”ممی یہ زندہ رہے گا تو ہمارا کام ہو سکے گا، پلیز اس کے ہاتھ کھولیں تاکہ یہ کھا سکے۔“

ناہر کے ہاتھ کھولے گئے مزید دو ڈھانچے اور ایک پہلوان اس کی نگرانی کر رہے تھے، ناہر نے آہستہ آہستہ کھانا زہر مار کر کھانا شروع کیا مگر اس کی پوری توجہ سامنے ڈھانچوں اور اس پہلوان نما گارڈ پر تھی وہ آہستہ سے کھڑا ہوا اور اس گارڈ پر جھپٹا کافی موٹا تازہ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ پھرتیلا نہ تھا ناہر نے جھکے سے اس کی بازو ناکارہ کر دیا اور گر ن فرس پر گر پڑی۔ ڈھانچوں کی آنکھوں سے شعاعیں نکلیں اور ناہر کو اپنی لیٹ میں لینے لگیں مگر ناہر پرسکون تھا ناہر نے ڈھانچوں پر فائر کھول دیا جسے وہ ہڈیوں کے ڈھیر میں تحلیل ہو گئے۔ باہر کافی شور تھا مگر اس طرف کوئی نہ آیا۔

”جلدی سے سیل فون دو مجھے، جلدی کرو ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔“ ناہر نے ڈھانچے کی طرف اشارہ کر کے اس گارڈ سے کہا ”ٹھیک ہے لے لو۔“ اس نے سیل فون آگے بڑھایا ناہر نے ایک ہاتھ سے اس پر گن تان لی اور دوسرے سے وہ نمبر ملائے لگا۔

اگر کانٹینل اکبر کی فون کی تیل مسلسل بج رہی تھی مگر وہ جس مشن پر جا رہا تھا وہ ایک لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا ناہر نے اس گارڈ کو عالم فانی سے رخصت کیا اور باہر آ گیا وہ

”ہاں انسان ہی ہوں بقیلہ شکان کی ملکہ برش سے میری دشمنی ہے، میں اسے مار کر اتنی طاقتیں حاصل کروں گی کہ نوایدہ قوتیں میرے اشاروں پہ چلیں گی۔“

”تیرا کھیل ختم ہو گیا مکروہ عورت تو نے کئی جانوں کی زندگی کو موت کی دہلیز پر لائی، کئی انسانوں کو زندہ زندہ رہنے کے قابل چھوڑا نہ مرنے کے۔“

”ناہر چوہے تو نے میرا جال مجھ پہ ہی پھینک دیا بس چند لمحے انتظار کرو تو بھی ان انسانوں کی لسٹ میں شامل ہو جائے گا جو مرنا چاہتے ہیں مگر مر نہیں سکتے، زندہ رہنا چاہو گے تو زندگی تم سے دور بھاگے گی۔“

ناہر نے ایک چمپ لگایا اور مسز ملک لہرتی ہوئی فرش پر گر گئی ناہر نے مضبوطی سے اس کو بانہ دیا اور بچوں کو لے کر باہر لٹکا سا سننے جنگل میں فائرنگ ہو رہی تھی ناہر نے تو بچوں کو چھوڑ سکتا تھا نہ ہی جنگل کی طرف جائزہ لینے جاسکتا تھا اتنے میں ایک بچہ آگے آیا۔

”انگل آپ ہماری فکر نہ کریں، آپ دیکھیں جا کر کہ کیا معاملہ ہے؟“

”نہیں بیٹا یہاں خطرہ ہے۔“

ناہر نے تھانے میں رابطہ کیا۔ ”جلدی سے آری ٹرالر بھجواؤ بچوں کو باحفاظت پہنچانے کا انتظام کرو۔“

ناہر کے ہاتھ میں اکبر کا دیا ہوا سیل فون بج رہا تھا۔ ”سرفرہبی جنگل میں ہم پہ اچانک فائر کھول دیا گیا ہے، دو اہلکار شہید ہو چکے ہیں اور ان کے کئی افراد بھی مر رہے ہیں۔ مگر ہماری گاڑیوں کو ناکارہ بنا دیا گیا ہے۔“

”تم فکر نہ کرو مزید عملہ آ رہا ہے، میں بچوں کو باحفاظت بھجوا کر خود بھی آ رہا ہوں تمہاری طرف۔“

کافی دیر ہو گئی، بچے بھوک پیاس سے نڈھال تھے اوپر سے دو پہر کی دھوپ نے کسرپوری کر دی تھی اتنے میں ٹرالر کی آواز آئی ”رشید ٹرالر کو آگے بٹکلے والی جگہ لاؤ، وہاں بچوں کو لانا خطرے سے خالی نہیں۔“ ناہر نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

بچے اطمینان سے ٹرالر میں سوار ہو گئے تھے اور شہر پر جاتے ہوئے ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے وہ موت

پر ایک کمرے کو غور سے دیکھ رہا تھا، ایک کمرے سے بچوں کی ہلکی سی آواز کا شک گزرا اس نے دروازے کو زبردست لات ماری اور دو تین بار ایسا کرنے سے دروازہ کھل گیا سامنے سینکڑوں بچے چوزوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر بڑے تھے کافی بڑا کمرہ تھا ایک بچہ لپک کر آگے آیا ”ناہر انگل آپ پولیس ہوتاں۔“

”مجھے اکبر انگل نے یہ سیل فون دیا تھا دیکھیں انہوں نے کہا تھا کہ میں انہیں راستے سے آگاہ کروں مگر مجھے اندازہ نہیں۔“

ناہر نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے سیل فون لیا اور اکبر کا نمبر ڈال کیا۔

”ہاں سناؤ بچے کسی قسم کا خطرہ تو نہیں، ہم جلد ہی تم لوگوں تک پہنچ جائیں گے مگر جگہ ٹریس کرنے میں وقت لگے گا۔“ راستہ میں بتاتا ہوں اکبر۔“

ناہر کی آواز پر اکبر چونک گیا۔ ”سر آپ! آپ وہاں۔“ ”ہاں سونو غور سے۔“

ناہر نے راستہ سمجھایا اکبر کو۔ اکبر اور سب انسپکٹر پولیس نے بھاری نفری ساتھ لی اور بتائے گئے راستے پر گامزن ہو گئے مسز ملک کی حالت غیر ہو رہی تھی وہ خفیہ کمرے میں سب کچھ دیکھ چکی تھی اور اس کے تمام کارندے ایک مشن پر گئے ہوئے تھے وہ مطمئن تھے اس طرف سے مگر اب مسز ملک بار بار رابطہ قائم کر رہی تھی۔

پولیس گاڑیاں شہر کے مشرقی طرف واقع جنگل سے گزر رہی تھیں۔ ایک طرف سے دو لینڈ کروزر نے بریک لگائی اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی گئی انہوں نے آتے ہی سب سے پہلے پولیس موبائلز کے ٹائرا ناکارہ کر دیے۔

ناہر نے مسز ملک کے کمرے کا رخ کیا۔ مسز ملک بے چینی میں ٹھہل رہی تھی۔ ناہر نے دروازہ لاتوں کے زور سے توڑا اور اندر داخل ہو گیا۔ ”بتا چڑیل۔ تو ایسا کس مقصد کے لئے کر رہی ہے تیری زندگی تو اب ختم ہے، بس ایک میرا آخری شک بھی یقین میں بدل دے۔ بتا کیا تو انسان ہے؟“

”اٹھو ناہر ہماری ملکہ ابرش اپنے محسن سے ملنا چاہتی ہے۔“

ناہر نے آنکھیں کھول دی سانسے وہ شخص تھا جس نے اسے جیتے کی پیشنگ بنانے کو دی تھی۔

سانسے ہی خوبصورت جمیل تھی ناہر اٹھ بیٹھا بالکل وہی خواب والی جگہ، مسور کر دینے والی خوبصورت جگہ۔

وہ شخص چاچا کا تھا اور ناہر ادھر ادھر اس کے انتظار میں بیٹھنے لگا۔ گردہ نہ آیا۔

ناہر کو سامنے ایک خوبصورت خیمہ نظر آیا تو وہ ہچکچاتے ہوئے خیمے کے باہر جا کھڑا ہوا اور محسوس کرنے لگا کہ اندر کوئی ہے یا نہیں مگر خیمہ خالی تھا ناہر اس میں داخل ہو گیا۔

اب چاند نکل آیا تھا اور چاند کی روشنی میں وہ جگہ مزید خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ خیمے میں ہر طرح کے پھل اور میوہ رکھا تھا ناہر نے پھل کھائے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

ناہر آنکھیں بند کئے سوچوں کے سمندر میں ڈوبتا گیا کہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟ کیا یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب، اب آگے کیا ہونے والا ہے؟

اتنے میں ایک آواز سنائی دی اسے جیسے کوئی اعلان کر رہا ہو۔ ”اگر کوئی ہے تو وہ جمیل کی طرف نگاہ نہ کرے شہزادی ابرش جمیل میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ تشریف لارہی ہیں۔“ ناہر ایک دم سے اٹھ بیٹھا اور خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھنے لگا۔

سامنے پریوں کا گروہ آتا دکھائی دیا۔ ان کا رخ جمیل کی طرف تھا اس کے سامنے ملکہ ابرش کا چہرہ تھا بالکل ویسا ہی حسین۔

شہزادی ابرش ایک دم رک گئی۔ ”آج میں جمیل میں نہیں جاؤں گی مجھے لگ رہا ہے، میرا محسن ناہر یہاں کہیں ہے۔“ اس نے تالی بجائی اور وہی شخص جو ناہر کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا حاضر ہوا۔

”جی فرمائیے۔“

اس نے موزب لہجے میں کہا۔ شہزادی نے اس

کو شکست دے کر زندگی کے استقبال میں جا رہے ہیں۔

ناہر جنگل کی طرف بھاگا۔ مسز ملک کے کارندوں میں اچانک بھگدڑ مچ گئی ایک طرف سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی تھی، ناہر نے فون پر اکبر سے رابطہ کیا۔ ”جنگل کے باہر گاڑیاں انتظار میں کھڑی ہیں ہم بچتے والے عملے اور زخمیوں کو لے کر اس طرف جاؤ ان کے ساتھ میں منت لوں گا۔“

”OK سر اویسے بھی کئی نوجوانوں کی حالت سیریس ہے۔“

صرف دو آدمی مسز ملک کے بچے تھے وہ اس نامعلوم افراد کو تلاش کر رہے تھے جس نے ان کے تقریباً 13 کارندوں کو آٹا ٹافا موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ناہر جھاڑیوں میں کرانک کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

”رک جاؤ اور آرام سے باہر آ جاؤ تم ایک بھی فائر کھولنے کی غلطی نہ کرنا۔“

ناہر آرام سے باہر آ گیا اور اس نے اطمینان کر لیا کہ وہ واقعی دوتے اور فائر کھولنا اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ دیے تو وہ موت سے ڈرتا نہیں تھا مگر ابھی اس نے مسز ملک کو اس کے انجام تک پہنچانا تھا اور دوسری خواہش قبیلہ شا کا کی ملکہ ابرش تک پہنچانا تھا۔ جو کئی بار اس کے خوابوں میں آ چکی تھی۔

ناہر ان کے ساتھ چل پڑا ان کا رخ جنگل کی طرف تھا مگر جنگل میں آگ لگی ہوئی تھی اور شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ناہر نے دیکھا جس جگہ مسز ملک کا کمرہ تھا اصل میں آگ وہیں سے شروع ہوئی تھی اور باقی جنگل کو اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا۔

نہ جانے کہاں سے ایک چیتا نمودار ہوا اور ان دونوں کارندوں کو چیر پھاڑ کر تار ہوا ناہر کے پاس رک گیا۔

چیتے نے ناہر کو اپنے مخصوص انداز میں اپنے اوپر بیٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا اس کی رفتار بجلی کی سی تھی ناہر نڈھال ہو کر اپنے ہوش سے بیگانہ ہو گیا جب اس کے حواس بحال ہوئے تو ایک آواز سنائی دی۔

سے نجانے کیا کہا کہ وہ بھاگتے ہوئے خیمے کی طرف آیا اور ناہر کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ”چلے ناہر صاحب آپ کو ملکہ بلارہی ہیں۔“

ناہر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا، وہ ایک پتھروں سے بنے محل میں داخل ہوئے اور ایک کمرے میں ناہر کو بیٹھا دیا گیا چند منٹ بعد شہزادی ابرش ہاتھ میں تھال لئے کمرے میں داخل ہوئی ناہر ابرش کو دیکھ کر جیسے کہتے ہیں آگیا اس کا خیالاتی پیکر حقیقت میں اس کے سامنے تھا۔

شہزادی نے اپنی کمر کو گھنٹوں تک ناہر کے سامنے شکر یہ ادا کرنے والے انداز میں جھکایا۔ ”ویسے تو میں قیلے کی شہزادی ہوں ناہر مگر آپ نے مجھ پر احسان کر کے مجھے اپنی کنیز بنالیا ہے۔“

”میں آپ کے ساتھ آپ کی دنیا میں جانا چاہتی ہوں۔ آپ اپنا فیصلہ سنائیے کیا آپ مجھے لے کر جائیں گے۔“

ناہر ایک دم چونکا۔ ”جی..... جی..... آپ..... میرے ساتھ..... ہاں۔“

”مگر آپ کو اعتراض ہے تو میں ضد نہیں کروں گی۔“

”نہیں شہزادی ابرش! آپ میرے ساتھ ضرور چلیں گی مگر۔“

”مگر کیا.....؟“ میرے والدین نے میری کبھی کوئی بات نہیں مانی۔“

اتنے میں ایک خوبصورت مرد اور بالکل ابرش کی طرح ایک عورت کمرے میں داخل ہوئیں شاید وہ شہزادی کے والدین تھے۔

”ہم نے آپ کی بات سن لی ہے، ابرش تم ضرور جاؤ۔ مگر جب وقت پھر کا ہونے لگے اور تمہارے ناخن سفید پڑنے لگیں تو تم ضرور واپس آ جانا۔“

انہوں نے اپنے قیلے کے مطابق ناہر اور ابرش کا نکاح کر دیا اور دعاؤں کے ساتھ دونوں کو رخصت کیا۔

☆.....☆.....☆

”دروازہ کھولنے امی جان۔“

ناہر کی امی ناہر کی آواز سن رہی تھی مگر شاید دروازے تک اٹھ کر جانے کی ہمت ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جیسے تیسے وہ دروازے کے قریب پہنچی اور دروازہ کھول دیا سامنے ناہر اور ایک خوبصورت دلہن کے روپ میں ایک لڑکی کھڑی تھی بالکل ویسی ہی دلہن جو ناہر کے کمرے میں لگی تصویر میں تھی۔

محکمہ پولیس ناہر کے واپس آنے والے معاملے کو حل نہ کر سکے تھے ان کا خیال تھا کہ ناہر شاید بنگلے میں لگنے والی آگ کی نذر ہو چکا تھا مگر یہ حقیقت صرف ناہر ہی بتا سکتا تھا۔

ناہر نے کچھ دن سے مشاہدہ کیا کہ ابرش ہر وقت ناخنوں پر رنگ برنگی نیل پاش لگائے رکھتی ہے۔ ”ابرش کیا بات ہے؟“

”نیل پاش کا شوق تمہیں کب سے ہو گیا ہے، تمہیں پتہ ہے ناں کہ نیل پاش لگانے سے نماز نہیں ہوتی۔“

”ہاں! مگر بس میرا دل کرتا ہے۔“

ایک دن ناہر اپنے پینٹنگ روم میں ایک پینٹنگ پہ کام کر رہا تھا اور ابرش بھی اسے دیکھ رہی تھی۔

ناہر باتیں کرتے کرتے تھک گیا مگر ابرش نے کوئی جواب نہ دیا۔ ”کیا بات ہے مجھ سے ناراض ہو کیا؟“ ناہر بولا۔

ناہر نے پلٹ کر دیکھا مگر ابرش نے کوئی تاثر نہ دیا، نہ ہی وہ ہل جلی تو ناہر نے اسے جھنجھوڑا لا۔ اٹھو! ابرش میری بات کا جواب دو۔“

مگر ابرش تو پتھر کی بن چکی تھی اب ناہر سمجھا کہ وہ نیل پاش اپنے ناخنوں پر کیوں لگا کر رکھتی تھی ابرش واپس اپنے قیلے میں نہ گئی بلکہ ناہر کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے خود کو ہمیشہ ہمیش کے لئے اس کے حوالے کر دیا یعنی اس کی تخلیق میں سامگئی۔



واصل جہنم

نعیم بخاری آکاش - اوکاڑہ

ہر سو رات کا گھنٹا ٹوپ اندھیرا مسلط تھا، آبادی کے سارے لوگ نیند میں مدھوش تھے کہ ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا، ایسا خونی واقعہ شاید ہی کسی نے سنایا دیکھا ہو کہ پھر اچانک دلوں کو دھلاتی گولی کی آواز گونجی۔

خود غرض، مطلب پرست کی ایک ناقابل یقین دل برداشتہ لڑہ برانداس کرتی خونی کہانی

میں نے پھر اسے بانہوں میں بھر لیا۔ ”جان تمہارے لئے آکس کریم لانے گیا تھا..... دیکھو بریانی بھی لایا ہوں تمہاری من پسند.....“

اس نے شوشی سے جواب دیا۔ ”مجھے بہلائیں مت..... اتنا ہی خیال تھا تو مجھے باہر کھانے پر لے جاتے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں، آپ مجھے گھمانے نہیں لے گئے۔“

”اچھا ابھی کل چلیں گے..... اور تمہاری ہلکی سی واک بھی ہو جائے گی۔“ میں نے کہا تو انزہ خوش ہو گئی۔ ہم کبھی کہاں کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں چلے جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے انزہ کافی خوش ہوتی تھی۔ ”آپ بیٹھیں، میں برتن لاتی ہوں۔“ اس نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کھینچا۔

”نہیں..... تم بیٹھو آرام کرو آج سارا کام میں کروں گا۔“ میں نے کہا اور بچن میں آ گیا۔ بریانی کو برتن میں ڈال کر پیچ رکھے پانی کا جگ اٹھایا اور صحن میں آ گیا۔ کھانا اور آکس کریم کھانے کے بعد میں نے اس کو صحن میں ہی تھوڑی سی واک کرائی۔ انزہ کی لیڈی ڈاکٹر کے مشورے پر میں انزہ کو روزانہ تقریباً 15 منٹ واک کراتا تھا۔ پھر سونے کے لئے لیٹے تو وہ میرے بازو پر سر رکھتے ہی سو گئی۔

تقریباً ایک بجے کے قریب میری اچانک آنکھ

میں بہت ہی خوش تھا۔ کیونکہ میری بیوی ماں بننے والی تھی۔ صرف چند دنوں کی ہی تو بات تھی۔ پھر ہماری زندگی میں ایک ننھی سی جان کا اضافہ ہو جاتا۔ جس کی خواہش دنیا کے ہر میاں بیوی کو ہوتی ہے۔ انزہ بہت ہی ایکساٹنڈ تھی۔ اس نے ڈھیر سارے کپڑے، کھلونے اور جھولا خریدا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دنیا کی ہر چیز خرید لے..... اور اس کی خوشی میں، میں خوش تھا۔ آمدنی بھی محدود تھی۔

ویسے بھی اخباری رپورٹر کی آمدنی کا دار و مدار دعاؤں پر ہوتا ہے۔ لیکن ہاں نہیں یہ ہمارے بچے کی قسمت تھی کہ ہمیں نہ کہیں سے روپوں کا بندوبست ہو ہی جاتا تھا۔ میں نے ایک دہائی جوتلو میں بطور رپورٹر انٹرویو دیا تھا لیکن ابھی تک کہیں سے بھی کال نہیں آئی تھی۔ پر میں پر امید تھا اور مجھے اپنے رب پر مکمل بھروسہ تھا کہ وہ میری محنت رائیگاں نہیں جانے دے گا۔

وہ مشکل کا دن تھا شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا میں نے اپنی بیگم کی من پسند مشن بریانی، آکس کریم اور کوئلہ ایک خریدا اور گھر آ گیا۔ گرمیوں کی خوشگوار مشن تھی۔ بیگم چار پانی پر بیٹھی ایک فلمی میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

”انزہ نے اترا کر مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”چھوڑیں مجھے، آپ نے تو چار بجے آنے کہا تھا۔“



’من..... نہیں..... ڈاکٹر کے پاس چلے۔
میرے خیال میں وقت آ گیا ہے۔“ وہ بولی تو میں تاخیر
کے بغیر باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دوری پر مجھے رکشہ مل گیا۔ میں نے اس
کورکشے میں بیٹھایا اور ڈرائیور سے کہا۔ ”چاچا کسی بھی
نزدیکی اسپتال لے چلو اور رکشہ ذرا آہستہ چلانا.....“
ڈرائیور ذرا پکی عمر کا تھا اور صورتحال کو سمجھتا تھا۔

وہ کمال مہارت سے رکشہ چلاتے ہوئے ایک
اسپتال میں لے آیا..... میں نے باہر نکل کر محسوس کیا کہ
اسپتال آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ لیکن اس کی عمارت
جدید طرز کی تھی باہر پارکنگ میں کوئی بھی گاڑی نہیں
کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان باتوں کو نظر انداز کرتے
ہوئے انزہ کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ ہم جیسے ہی
اسپتال میں داخل ہوئے تو استقبال کاؤنٹر خالی تھا۔ ایک
طرف ایک صوفے پر ایک ڈاکٹر اور نرس کسی بات پر غصے
رہے تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑے
ہوئے اور ہماری طرف بڑھے۔

ڈاکٹر کے قریب آتے ہی میں نے
کہا..... ”ڈاکٹر صاحب..... ڈیوری کیس ہے میری
وائف کو شدید تکلیف ہے۔“

کھلی۔ وہ چارپائی پر موجود نہیں تھی میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔
میں نے دائیں بائیں نظریں دورائیں تو ایک طرف
اندھیرے میں وہ دیوار کو پکڑے کھڑی کر رہی تھی۔ اس
کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ اپنے سر کو جھٹکے دے
رہی تھی۔ میں بھاگ کر اس کے قریب گیا اور پوچھا۔
”کیا ہوا؟ تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟“ اس نے چہرہ میری
طرف گھمایا اور بمشکل بولی ”شہباز مجھے درد ہو رہا ہے۔“
شدت تکلیف سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

”تم نے شام کو دوا لی تھی نا.....“ میں نے
فکر مندی سے پوچھا۔

”لی تھی.....“ وہ آہستہ سے بولی۔ میں نے
اسے سہارا دیا اور چارپائی پر لٹاتے ہوئے پوچھا۔ ”تم
اندھیرے میں کھڑی تھی مجھے اٹھا دیتی۔“ اس نے میری
طرف دیکھا پھر ایک ہاتھ میرے گال پر رکھتے ہوئے
بولی..... ”میں نے سوچا چلنے سے درد ختم ہو جائے گا۔
اور آپ کو اس لئے ڈسٹرب نہیں کیا کہ آپ سارا دن
مارے مارے پھرتے ہیں تنگھے ہوئے ہونگے۔“

مجھے اس پر بے اختیار ہی پیار آ گیا میں نے
جھک کر اس کی پیشانی چوم لی اور پوچھا..... ”کیا درد کم
ہو رہا ہے۔“

گھورتے ہوئے بولا۔ ”اب کوئی اور سوال مسٹر.....
 یا میں اپنا فرض پورا کروں۔“
 ”سوری ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے شرمندگی
 سے جواب دیا۔

پھر ڈاکٹر نے ایک کمرے کی طرف انگلی کی
 اور بولا۔ ”برائے مہربانی ویننگ روم میں تشریف رکھیے
 آپ کی ضرورت ہوگی تو آپ کو ضرور تکلیف دیں گے۔“
 میں خاموشی سے راہداری میں اپنے کمرے کی
 طرف بڑھنے لگا۔ سامنے وہی نرس ہاتھ میں ٹرے لئے
 جس میں دوائیاں رکھی ہوئیں تھیں چلی آ رہی تھی اس
 نے مجھے کراس کیا اور اسی کمرے میں غائب ہو گئی۔

میں نذر حال قدموں سے چلتا ہوا ویننگ روم میں
 داخل ہوا، کمرہ بہت ہی صاف تھرا تھا، فرش چمک رہا تھا۔
 مہنگے صوفے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ جبکہ ایک ٹی وی
 دیوار میں نصب تھا۔ میں ایک طرف صوفے پر بڑھے گیا
 اور آنکھیں موند کر اپنے پروردگار سے آفات سے نجات
 مانگنے لگا، بار بار انزہ کا معصوم چہرہ میرے سامنے آ رہا تھا۔
 ایک طرف مجھے پریشانی تھی تو دوسری طرف میں دل کو سلی
 دیتا تھا کہ انشاء اللہ ہم ماں باپ بن جائیں گے۔

پھر پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی..... صبح میری
 آنکھ شورن کر کھلی ویننگ روم میں ایک بچہ رو رہا تھا جبکہ
 اس کا باپ اسے چپ کرانے میں مصروف تھا۔ وہاں
 پر ایک بزرگ بھی موجود تھے۔ کھڑکی میں سے دن کا
 اجالا نمودار ہو چکا تھا۔ میں نے وال کلاک پر ایک
 نظر دوڑائی صبح کے 8 بج رہے تھے۔ ویننگ روم میں
 موجود دونوں افراد نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی
 اپنی سوچوں میں مگن ہو گئے۔

میں آنکھیں ملتا ہوا ویننگ روم سے نکلا اور
 استقبالیہ کا ڈسٹرکی طرف بڑھا۔ کچھ مریض آ جا رہے تھے
 جبکہ کچھ مریضوں کے عزیزان سے ملنے کی غرض سے
 استقبالیہ ہال میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ اس وقت
 استقبالیہ کا ڈسٹر پر ایک لڑکا اور لڑکی بیٹھے تھے۔ لڑکا
 کمپیوٹر پر اپنے کام میں مصروف تھا۔ میں نے لڑکی

ڈاکٹر نے کسی صابر نامی لڑکے کو آواز دی وہ لڑکا
 ایک کمرے سے نکلا وہ کچھ کھا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے
 اسٹرینچر لانے کا کہا تو وہ لڑکا بھاگتا ہوا گیا اور راہداری سے
 ایک اسٹرینچر کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس وقت میں کچھ
 عجیب سا لگا کیوں کہ ڈاکٹر اور نرس کن آنکھوں سے انزہ
 کو دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھار وہ ایک دوسرے کی طرف
 دیکھتے جیسے آپس میں کب بات پر اتفاق کر رہے ہوں۔
 اسٹرینچر آتا تو میں نے انزہ کو اس پر لٹا دیا۔ صابر
 نامی لڑکا اسٹرینچر کو دھکیلنے لگا ڈاکٹر نے انزہ کی نبض اور
 آنکھیں چیک کیں اور پیڈ پر کچھ لکھ کر نرس کو دیا
 اور اسٹرینچر کے ساتھ چلنے لگا۔ جبکہ نرس ایک کمرے میں
 غائب ہوئی تھی۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا ”ڈاکٹر صاحب ایڈمٹ
 فارم منگوالیں میں نام پتا لکھ کر سائن کر دیتا ہوں۔“
 ”اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے سر..... رات
 کو عملہ کم ہوتا ہے۔ ڈیوری ہو جائے فارم تو صبح بھی بھرا
 جاسکتا ہے۔“ ڈاکٹر نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔
 لیکن پتا نہیں کیوں میں گھبرا رہا تھا۔ میں نے
 ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“
 ڈاکٹر نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔
 ”عبدالقیوم..... فکر مت کریں سر، یہ اسپتال شہر کا اچھا
 اسپتال ہے۔“

راہداری کے اختتام پر ایک کمرہ تھا صابر نامی لڑکا
 اسٹرینچر کو کمرے میں لے گیا۔ انزہ سر اٹھا کر میری طرف
 دیکھ رہی تھی شاید وہ بھی گھبرا رہی تھی۔

جیسے ہی ڈاکٹر اندر جانے لگا میں نے اس کا ہاتھ
 پکڑ لیا۔ ”ڈاکٹر صاحب یہ کمرہ آپریشن تھیٹر نہیں
 ہے۔“ میں نے دریافت کیا۔

ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔ ”
 اگر آپ بہت اچھے ڈاکٹر ہیں یا بہت کچھ جانتے ہیں تو
 آپ خود ہی کیوں نہیں کر لیتے کیس اور بائی داوے.....
 ڈیوری کیس ہم آپریشن تھیٹر میں نہیں کرتے ہیں..... وہ
 صرف سرجیکل کے لئے مخصوص ہے۔“ وہ رکا اور مجھے

کو مخاطب کر کے پوچھا؟

ملاقات ضرور ہوئی ہوگی، مجھے ان کا نام بتادیں آپ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“

”عبدالقیوم..... ڈاکٹر عبدالقیوم تھے رات کو۔“

میں نے فٹ سے کہا

لڑکے نے لڑکی کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس نام کا ڈاکٹر تو کیا کوئی مریض بھی اسپتال میں نہیں ہے۔“

”وہاں یہ کیا مذاق ہے رات کو ڈاکٹر نے بولا تھا کہ رات کو عملہ کم ہوتا ہے ایڈمٹ فارم صبح بھر لیں گے۔ لیکن آپ کو مجھ پر شک ہو رہا ہے۔“ میں نے دہاڑ کر کہا تو دونوں سر ہنس ہو گئے۔

”لیکن غلطی بھی تو آپ کی ہے سر۔“ لڑکی نے کہا۔

”میں جانتا ہوں پر میری وائف کی طبیعت ایسی نہیں تھی کہ میں اس وقت ڈاکٹر کے ساتھ بحث کرتا۔“ میں نے اپنی مجبوری بیان کی تو لڑکا بولا۔

”سر آپ میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو گانتی وارڈ لے چتا ہوں شاید آپ کی وائف وہاں ہو۔“ میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

لڑکا کاؤنٹر سے باہر آیا تو ہم گانتی وارڈ کی طرف چل پڑے۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل کسی انہونی کی پشیمانی گدہا تھا۔ گانتی وارڈ میں داخل ہوتے ہی لڑکا ایک طرف دروازے کے پاس رک گیا اور میں تیزی سے بیڈ پر لیٹی

خواتین کو دیکھنے لگا۔ ایک، ایک کر کے میں نے تمام بیڈ دیکھ لئے لیکن انزہ کہیں بھی نہیں تھی۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آنسو میری آنکھوں کے کنارے بھگو رہے تھے۔ لڑکا میری طرف آیا اور بولا۔

”سر آپ کی بیوی یہاں پر؟“ میں نے بے شکل لہجے میں سر ہلا دیا۔

لڑکا کچھ دیر بیٹھ دیکتا رہا اور بولا۔ ”سر چلیں مریض ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔“ اور میں بو جھل قدموں کے ساتھ چلنے لگا میرے من میں ہزاروں دوسے آرہے تھے۔ اور اپنی بے بسی پر شدید غصہ بھی۔

ایسے انزہ کس طرح غائب ہو سکتی ہے؟

واپس استقبالیہ کاؤنٹر پر آ کر مجھے اچانک

”مس! رات کو میری وائف ایڈمٹ ہوئی تھی۔“

ذرا بتا سکتی ہیں کہ وہ کس وارڈ میں ہے۔؟“

لڑکی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اور ایک رجسٹر نکال کر دیکھنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بولی۔

”سر آپ کی وائف کا نام کیا ہے؟“

انزہ شہباز، رات کو ایک بجے کے قریب ہم آئے تھے ڈیوری میس تھا۔“ میں نے جواب دیا تو لڑکی دوبارہ بولی۔

”سوری سر یہاں کوئی انزہ شہباز نام کا اندراج نہیں ہے۔ اور دوسرے بھی کل رات کو دوسری مریض آئے تھے ایک بچہ مزل نامہ وہ ENT میں داخل ہوا ہے اور دوسرا گل خان ہے لیکن آپ کا اندراج نہیں ہے۔“

مجھے یاد آیا ہم نے ایڈمٹ فارم نہیں بھرا تھا، میں نے لڑکی کو بتایا۔ مجھے یاد آیا۔ ”اصل میں ہم سے ایڈمٹ فارم نہیں بھرا دیا گیا تھا۔ شاید وہ گانتی وارڈ میں ہو۔ کیا آپ دیکھ کر بتا سکتی ہیں۔“

لڑکی مجھے گھور کر دیکھتی رہی۔ پھر بولی ”ٹھیک ہے۔“ اس کے بعد وہ رجسٹر کے مختلف اوراق ادھر سے ادھر کرتی رہی۔ پھر فلز سے بولی۔

”دیکھیں مسٹر یہ اسپتال ہے جہاں ایڈمٹ فارم کے بغیر مریض کا علاج ہی نہیں کیا جاتا۔ اور پورے گانتی وارڈ میں آپ کی مسز کا نام نہیں ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ صرف کل رات کی بات ہے۔ پھر میں پاگل نہیں ہوں کہ اپنی بیوی کو اسپتال لا کر بھول جاؤں۔ وہ کوئی کھلونا نہیں تھی۔“ میری آواز

ترش تھی اور انہی بھی۔

کاؤنٹر پر بیٹھے لڑکے نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آ گیا اور سخت لہجے میں بولا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ آپ کا گھر نہیں ہے ذرا آواز نیچی رکھیں۔ اور دوسری بات اگر اندراج نہیں ہے تو آپ بتایم کیسے کر سکتے ہیں۔“

پھر وہ رکا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے رات کو کسی ڈاکٹر سے آپ کی

یاد آیا۔ ”دیکھیں کیا آپ مجھے اس کمرے میں جانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ جہاں میری وائف کا کس کیا گیا تھا۔“ میری آواز اکتائی تھی۔ لڑکے نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور پھر اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”چلیں آپ کا شک دور کرنا ہمارے لئے مقصود ہے۔ ورنہ آپ اول فوٹ بولنا شروع کر دیں گے۔“ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا پھر لڑکے کے ساتھ میں چلتا ہوا راہداری میں بنے اسی کمرے کے قریب آ گیا جہاں گزشتہ شب انزہ کو پہنچایا گیا تھا۔ کمرے کے قریب رک کر میں نے کہا ”یہی وہ کمرہ ہے۔“

لڑکے نے حیرانگی سے مرکز مجھے دیکھا اور بولا۔ ”سر آپ کی کوئی بھی بات ذہن تسلیم نہیں کر رہا ہے۔ آپ جو بھی کہہ رہے ہیں میرے خیال میں وہ آپ کی نیند کی کمی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ آپ جس کمرے کا کہہ رہے ہیں یہ کمرہ علم کا اسٹاف ریٹ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اگر کوئی مہمان آ جائے تو ہم اس سے ملاقات اسی کمرے میں کرتے ہیں۔ پھر بھلا ڈیوری کیس آپریشن تھیٹر کے بجائے ایک سادہ سے کمرے میں کیوں کیا جائے گا۔ جبکہ اس کے لئے آپریشن تھیٹر بنایا ہوا ہے۔ جس میں تمام مشینری ہے۔“ میں نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”دیکھیں رات کو میں نے بھی ڈاکٹر سے یہی کہا تھا کہ ”یہ کمرہ آپریشن تھیٹر نہیں۔“

جس پر انہوں نے جواب دیا کہ ”آپریشن تھیٹر صرف سرجیکل کے لئے مخصوص ہے اور ڈیوری کیس یہاں پر کئے جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے اپنا شوق پورا کیجئے مکمل چھان بین کر لیں۔“ لڑکے نے جھٹکے سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا، میں کمرے میں داخل ہو گیا کمرے کے ایک حصے کو بچن کا روپ دیا گیا تھا جبکہ ایک طرف بیڈ اور صوفہ رکھا ہوا تھا۔ یہ کمرہ کسی طور بھی آپریشن تھیٹر نہیں لگتا تھا۔ میں خاموشی سے باہر آ گیا۔

لڑکا تیز قدموں سے چلتا ہوا استقبالیہ کاؤنٹر

کے قریب آ گیا اور بولا۔ ”آپ میرا کافی وقت برباد کر چکے ہیں اب بہتری اسی میں ہے کہ آپ خاموشی اختیار کر لیں ورنہ میں سیکورٹی والوں سے کہہ دوں گا اور ممکن ہوا تو پولیس کو بھی اطلاع کر سکتا ہوں۔“ وہ مجھے غصے سے وارننگ دے رہا تھا اور میں بے بس تھا۔

میرے پاس انزہ کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں تھا لہذا میں اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا باہر آ گیا۔ ہزاروں سوال میرا دماغ چاٹ رہے تھے۔ کہیں میں نیند میں چل کر تو اسپتال نہیں آ گیا؟ یا پھر انزہ خود ہی گھر نہ چلی گئی ہو؟ لیکن ایسا بھی ممکن نہیں تھا۔ بار بار جو میرے دماغ میں بات آ رہی تھی وہ یہی تھی کہ انزہ کو اغوا کیا گیا ہے۔ اور اس میں اسپتال کا علمہ ملوث ہے لیکن بے بسی کی بات تو یہ تھی کہ میں کسی صورت بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ انزہ اسی اسپتال سے اغوا ہوئی ہے یا کوئی گواہ بھی نہیں تھا۔

رہ رہ کر میرے ذہن میں یہی خیال آ رہا تھا کہ ایک دفعہ گھر جا کر تسلی کر لوں اس کے بعد پولیس اسٹیشن جاؤں گا اور رپورٹ درج کرادوں گا پھر دوسرے ہی پل میرے دل میں یہ خیال آیا کہ پولیس والوں کو بتانے سے کسی مسئلے کا حل نہیں نکلے گا۔ ایک توہ اخباری رپورٹروں سے ویسے بھی خاکرہاتے ہیں۔ اور پھر ان کا منہ پیسوں سے بھرنا پڑے گا اس کے بعد وہ معمول کی کارروائی کرتے اور اسپتال والوں سے بھی پیسے کھاتے اور ویسے بھی یہ ایک پرائیویٹ اسپتال تھا یہ لوگ بھی میری اپنے اسپتال کی ساخت کو تباہ نہیں ہونے دیں گے اور اپنا پیچھا چھڑا لیں گے جبکہ میں مایوس ہی لوٹتا اس لئے بہتر یہی تھا کہ میں خود کچھ نہ کچھ کروں لیکن ساری باتوں سے پہلے گھر جانا لازمی تھا۔

گھر خالی تھا کھانے کے برتن ابھی تک دھونے والے پڑے تھے ایک آکس کریم کا خالی ڈبہ پڑا تھا کمرہ بھی بالکل خالی تھا۔ اس کا مطلب تھا کل رات کو انزہ واپس نہیں آئی اسے اسپتال سے ہی اغوا کر لیا گیا تھا وہ بھی میری آنکھوں کے سامنے انتہائی چالاکا سے جال بچھایا گیا تھا کوئی بھی غلطی نہیں تھی، نہ ہی چوکیدار نے

ہمیں دیکھا تھا، اسپتال کے عملے میں سے کسی فرد نے بھی ہمیں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر، نرس اور صابر نامی لڑکا بھی پورے اسپتال میں نہیں تھا، دن کے 12 بج رہے تھے اور میرے دل میں ساری کارروائی کسی فلم کی طرح چل رہی تھی۔

اچانک ایک جھماکہ ہوا اور مجھے گواہ مل گیا اور وہ گواہ رکشہ ڈرائیور تھا جو ہمیں اس اسپتال میں لے کر گیا تھا، میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا مجھے کچھ تیاری کرنی تھی۔ میں نے فون نکالا اور اپنے دوست حیدر کا نمبر ملانے لگا وہ بھی ایک اخباری رپورٹر تھا۔

اسلام و علیکم! جی فرمائیے ”رابطہ ہونے پر دوسری طرف حیدر بولا۔“

”یار حیدر ایک حادثہ ہو گیا ہے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ میں نے حیدر سے کہا تو حیدر بے تکلفی سے بولا۔ ارے تو حکم تو کر جان بھی حاضر ہے۔

”تمہاری جان کی ضرورت نہیں ہے..... بس آج کی رات تمہارا ہینڈی کیمرہ، پلسل اور پائیک چاہئے اور اگلے صبح تمہارے پاس دھماکے دار خبر ہوگی جو تم کسی بھی ٹی وی چینل کو دے دیتا۔“

حیدر نے پوری بات سنی اور پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”تینوں چیزیں حاضر ہیں جب مرضی لے لیتا۔“

میں نے رابطہ منقطع کر دیا، رات کے تقریباً دو بج رہے تھے لیکن ابھی تک مجھے وہ ڈرائیور نظر نہیں آیا تھا میں نے پائیک سڑک کے کنارے کھڑی کی ہوئی تھی اور خود روٹی سے ہٹ کر اندھیرے میں کھڑا تھا۔ یہاں کھڑے کھڑے کافی دیر ہو گئی تھی میں کسی اور جگہ جا کر رکشہ ڈرائیور کو تلاش کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک روڈ کی جانب سے رکشہ آتا دکھائی دیا اور پھر وہ رکشہ سڑک کے ایک جانب آ کر رکا میں نے لائٹ کی روشنی میں فوراً اس جگہ عمر کے شخص کو پہچان لیا۔ میں نے جلدی سے چادر سے منہ کو لپیٹ لے تا کہ وہ مجھے پہچان نہ لے، جیسے ہی میں رکشہ کے قریب گیا ڈرائیور نے مخصوص انداز میں پوچھا..... ”جانا ہے

ایک پاکستانی (سندھی) نوجوان کی روداد، جس نے مسلم کش تنظیم ”نرانی اسٹار“ کا خاتمہ، اپنی اعلیٰ تعلیم، بے پناہ جسمانی طاقت اور ذہنی صلاحیتوں سے کیا۔ قدم قدم پر چونکا دینے والے مناظر، جاسوسیت کا طریقہ کار، خفیہ رازوں کے انکشافات اور مسلمانوں کے خلاف بننے والے عالمی منصوبوں کی مکمل معلومات، اس ناول کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک مکمل، دلچسپ اور

معلومات کا خزانہ ناول

کمین گاہ

ناول نگار: ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ہر جلد 320 صفحات پر مشتمل

قیمت فی جلد = 250 روپے

پبلشرز..... ظفر اکیڈمی، کتاب مارکیٹ،

اردو، بازار، کراچی

فون نمبر: 0345-2610434

صاحب: ”اس کے چہرے پر پیشہ درانہ مسکراہٹ تھی۔ میں رک گیا اور بولا۔ ”ہاں چاچا میری ایک عزیزہ کو ڈیوری ہے ذرا جلدی چلیں۔“ اس نے فوراً رکشہ اشارت کر لیا۔

میں نے بانیک پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”میں بانیک پر آگے آگے جاتا ہوں آپ پیچھے آ جائیں۔“ ”جی صاحب۔“ ڈرائیور نے کہا تو میں نے بانیک اشارت کی اور اپنی مخصوص جگہ کی سمت چل دیا، رکشہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

ایک زیر تعمیر مکان کے قریب میں رک گیا، وہ مکان آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا اور میری کارروائی کے لئے نہایت ہی موزوں تھا میں بانیک سے اتر کر رکشہ کے قریب آیا اور بولا۔ ”چاچا جی آپ کو میرے ساتھ آنا ہوگا مریضہ چل نہیں سکتی ہمیں اٹھا کر لانا ہوگا۔“ چاچا نے رکشہ بند کیا اور نیچے اتر آیا۔

جیسے ہی وہ نیچے اتر میں نے ہسپتال کی نال اس کی کمر میں سمیٹ دی اور درشت لہجے میں بولا۔ ”چاچا اگرچوں چراں کی تو میں گولی چلانے میں ہنپکاؤں گا نہیں۔ اس لئے خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔“

”پپ..... پپ..... پر بب..... بیٹا میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے اگر پیسے لینے ہیں تو لے لو میں شونہیں کر دوں گا۔“ چاچا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”میں نے ہسپتال کا ہٹ چاچا کے سر پر مارا تو وہ بلبل اٹھا۔“ بکواس بند کر اور خاموشی سے چلو چاچا۔“ خاموشی سے چلنے لگا۔

زیر تعمیر مکان کے ایک کونے میں جانے کے بعد میں نے چاچا کو نیچے بیٹھا دیا۔ اور خود ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا پھر میں نے اپنی کارروائی شروع کی۔ ”چاچا میں تمہیں مارنے میں دیر نہیں لگاؤں گا اس لئے اگر جان پیاری ہے تو صرف اس کا جواب دینا جو میں پوچھتا ہوں۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”جی صاحب! آپ جو پوچھو گے میں بتاؤں گا۔“ چاچا نے گڑبڑاتے ہوئے کہا وہ مجھے پہچان چکا تھا

کیوں کہ میں چار دہائیوں کا ایک طرف رکھ چکا تھا۔

”کل رات تم مجھے اور میری حاملہ بیوی کو ایک پرائیویٹ اسپتال لے کر گئے تھے لیکن صبح میری بیوی غائب تھی۔ اسے یقیناً اغوا کیا گیا ہے لہذا جی بتاؤ تم کیا جانتے ہو؟“ میرے پوچھنے پر چاچا خاموش رہا تو میں نے ہسپتال لہراتے ہوئے کہا۔ ”جلدی سے جواب دو ورنہ..... ٹائم برادمت کر دو۔“

چاچا رک رک کر بولنے لگا۔ ”بیٹا یہ سچ ہے کہ میں تمہاری بیوی کو اسی اسپتال میں لے کر گیا تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ لوگ عورتوں کو اغوا کر لیتے ہیں اور ان کے بچے کسی کو بیچ دیتے ہیں۔“

”اس میں تمہارا کتنا حصہ ہوتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”بیٹا زیادہ نہیں صرف 5 ہزار روپے ملتے ہیں۔ میرا کام صرف حاملہ عورتوں کو اسپتال پہنچانا اور ان کو اطلاع دینا ہوتا ہے۔“ چاچا نے جواب دیا۔

”تم اطلاع ان کو دیتے ہو جو اسپتال میں موجود تھے۔“ میرے پوچھنے پر چاچا نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... میرے پاس ان کا فون نمبر ہے۔“ وہ لوگ ڈیوری کے بعد بچے اور اس کی ماں کو کہاں لے جاتے ہیں؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ”پتا نہیں صاحب! میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ عورت کو اسپتال چھوڑ دو اور پھر غائب ہو جاؤ۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے!“ میں نے حتی فیصلہ کرتے ہوئے چاچا سے کہا۔ ”آج بھی فون کرو اور بولو کہ تم ایک ڈیوری کیس لے کر آ رہے ہو اور وہ اکیلی عورت ہے اس کا شوہر دوسرے شہر میں ہے۔ اور ہوشیاری مت کرنا ورنہ ایک گولی ہی کافی ہے تمہارے لئے۔“ چاچا نے اثبات میں سر ہلایا اور موبائل نکال کر نمبر ملانے لگا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”صاحب ایک ڈیوری کیس ہے۔“ پھر دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اور چاچا نے جواب

دیا۔ ”جی میں جلدی آ جاؤں گا آپ تیاری کرو.....“ یہ کہتے ہوئے چاچا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے جھپٹ کر موبائل چھین لیا اور چاچا سے پوچھا۔ ”اس ہسپتال میں کوئی اور بھی راستہ ہے اندر جانے کا؟“

چاچا نے جواب دیا۔ ہاں ہے ایک راستہ ہسپتال کے پیچھے سے ہے، میں ایک دفعہ گیا تھا ایک اکیلی عورت کو لے کر وہ لوگ تہ خانے میں کیس کرتے ہیں بعد کا پتہ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے چلو۔“ میں نے کہا اور ہم بائیک پر بیٹھ گئے..... رکشہ وہیں پر کھڑا کر دیا تھا۔ ہسپتال سے ذرا ہٹ کر میں نے بائیک روکی اور ہم تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہسپتال کے عقبی حصے کی جانب آ گئے۔ یہاں پر درختوں کا بڑا جھنڈ تھا جبکہ نزدیک کوئی بھی مکان نہیں تھا۔ درختوں کے درمیان میں لکڑی کا چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا چاچا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا پھر اس نے جھک کر زمین سے پلاسٹک کی شیٹ ہٹائی جس پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ نیچے ایک لکڑی کا پیٹا سا رکھا ہوا تھا چاچا نے وہ ہٹایا اور بولا۔ ”بیٹا اب میں جاؤں؟“

میں نے چاچا کو آگے دھکا دیا تو وہ بیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے گر گیا میں جلدی سے بیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ چاچا کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے کھڑا کیا آگے ایک راہ داری بنی ہوئی تھی جبکہ اس کے اختتام پر ایک دروازہ تھا اور دیوار میں ایک روشن دان بھی تھا جو زیادہ اونچا نہیں تھا۔ میں نے چاچا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود آہستہ قدموں سے چلتا ہوا روشن دان کے قریب آ گیا۔ اور کیمرہ نکال کر روشن دان میں رکھ دیا جبکہ اس کی LCD اسکرین میں نے اپنی جانب رکھی تھی تاکہ اندر کی صورتحال کو دیکھ سکوں کیمرہ پورے کمرے کا دیوہ رہا تھا۔ ایک کرسی پر وہی عبدالقیوم نامی ڈاکٹر بیٹھا تھا جبکہ دوسری کرسی پر نرس براجمان تھی جو کہ سگریٹ کے کش لگا رہی تھی کمرے کے درمیان میں ایک لمبا سا میز رکھا ہوا تھا جس پر خون بکھرا پڑا تھا اور دوسرے اوزار بھی پڑے ہوئے تھے صابر ابھی

تک منظر سے غائب تھا میں نے کچھ سوچتے ہوئے چاچا کا بازو پکڑا اور دروازے کو ایک لات رسید کی تو دروازہ ایک جھکے سے کھل گیا۔ ڈاکٹر اور نرس بے اختیار کھڑے ہوئے۔ ”بیٹھ جاؤ ڈاکٹر۔“ میں دہاڑا.....

کمرے کے ایک جانب بیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ ایک لخت بیڑھیوں کا دروازہ کھلا اور صابر بھاگتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کمرے کے پیچھے ہاتھ لے جانے کی کوشش کی پر میں نے مہلت نہیں دی اور ٹیگر دبا دیا اور گولی صابر کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ منہ کے بل بیڑھیوں پر گر ا۔ اور نیچے لڑھکتا ہوا فرش پر گر گیا۔ میں نے چاچا کو دھکا دے کر ڈاکٹر اور نرس کے قریب کر دیا وہ لوگ اچنبھے میں کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے انہیں امید نہیں تھی کہ میں اچانک آ جاؤں گا یا پھر صابر کو بل بھر میں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔

میں نے ڈاکٹر کو خون خوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کیا سمجھا تھا کہ مجھے جھکا دے دو گے اور میں اتنی جلدی اپنی بیوی کو بھول جاؤں گا۔“ وہ ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔

”بولو میری بیوی کہاں ہے۔؟“ میں دہاڑا تو ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”دیکھو ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں اس طرح کسی مسئلے کا حل نہیں نکلتا۔“

”میں خوب جانتا ہوں کہ حل کیسے نکلتا ہے بس وہ بکوجو میں پوچھ رہا ہوں کیا میری بیوی کو بچہ ہوا تھا۔؟“ اس بار نرس بولی۔ ”جی ہاں وہ لڑکا تھا آپ کی بیوی بہت ہی خوش تھی۔“

”اب وہ دونوں کہاں ہیں؟“ میری آواز زندہ مٹی تھی ڈاکٹر حالات کی نشانی کو سمجھ گیا تھا اس لئے وہ چلا کی پراتر آیا تھا۔ ”دیکھو پہلے یہ پہل ہٹا لو پھر ہم کچھ بتاتے ہیں۔“

”ہاں بیٹا ان کی بات مان لو اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“ چاچا نے بھی ڈاکٹر کی تائید کی جبکہ میرا خون کھول رہا تھا میں نے ایک اور گولی چلائی اور چاچا کے منہ سے فلک شکاف خچ نکل اور وہ فرش

آواز دیتی تھی۔ جب ہم اسے زہر کا انجکشن لگانے لگے تو اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ ”صرف ایک بار اپنے شوہر کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ پھر جا ہے مجھے جان سے مار دینا۔“ پڑا کٹر نے پردہ اٹھانے کے بغیر انجکشن لگا دیا۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا میری انزہ مجھے دیکھنے کے لئے بے تاب تھی اور میں اتنا بد قسمت تھا کہ اپنی انزہ اور اپنے تخت جگر کو نہ بچا سکا۔ میں نے پھر سوال کیا۔ ”میری بیوی کی لاش کہاں ہے۔“

”ہم نے اس کے اعضاء نکال کر فروخت کر دیئے تھے جبکہ لاش ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری صابر کی تھی اور اسے تم مار چکے ہو۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

قسمت نے لمبی میرے ساتھ کتنا عجیب مذاق کیا تھا میرا بیٹا بھی پتا نہیں کس کے پاس تھا اور میں اپنی بیوی کی لاش کو کبھی سپرد خاک نہیں کر سکتا تھا۔ پتا نہیں کس گناہ کی سزا ملی تھی مجھے، جو میرا ہنستا رہتا گھر منٹوں میں اڑ گیا، اب میری زندگی کا مقصد بھی ختم ہو گیا تھا۔

میں نے اچانک دو فائر کر کے ڈاکٹر اور نرس کو جہنم واصل کر دیا، میں نے جیب سے موبائل نکالا اور حیدر کا نمبر ڈال کرنے لگا۔ دوسری طرف سے حیدر نے فون اٹھایا۔

”حیدر میرے دوست۔“ میں نے اس کی بات کا انتظار کئے بغیر بولنا شروع کر دیا۔ ”اختیار اسپتال میں میری بیوی کو قتل اور میرے نومولود بچے کو فروخت کر دیا گیا ہے میں گناہگاروں کو ان کے انجام تک پہنچا چکا ہوں اس واقعہ کی ساری ویڈیو ریکارڈنگ ہمیں اسپتال کے پیچھے عقبی حصے میں موجود تہ خانے میں بنے کیمرے میں مل جائے گی اللہ حافظ میرے دوست۔“

دوسری طرف سے حیدر مجھے بکارتا رہا پھر میں نے اس کی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور یو یو اور اپنی کپڑی پر رکھ کر ٹریڈر بدایا۔



پڑھیر ہو گیا، میں انزہ اور اپنے بیٹے کے اتنے قریب آ کر رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ”چالاکی مت دکھاؤ ڈاکٹر..... قتل میرے لئے اب معمولی بات ہے، مجھے میری بیوی اور بچے دو، میں قسم کھاتا ہوں کہ تم دونوں کو چھوڑ دوں گا۔“ میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور میں جلد از جلد انزہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر نے گردن جھکا لی۔ ”میں معذرت خواں ہوں تمہارا بچہ ہم اسی رات بچ چکے ہیں۔“

”بگومت..... اتنی جلدی ممکن نہیں ہے سچ بتاؤ۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”سچ ہے ہم نے بچہ اسی رات فروخت کر دیا تھا۔“ اس بار نرس نے جواب دیا تھا۔

”تو پھر مجھے افسوس کا نام بتاؤ تاکہ میں اپنا بچہ واپس لے سکوں۔“

”ہم نہیں جانتے..... خریدار کبھی بھی اپنا نام اور پتا نہیں بتاتے۔ بہر حال آپ کا بیٹا خوش رہے گا کیونکہ اسے خریدنے والا ایک رئیس زادہ تھا۔“ ڈاکٹر نے کہا تو میں غصے سے آگے بڑھا۔

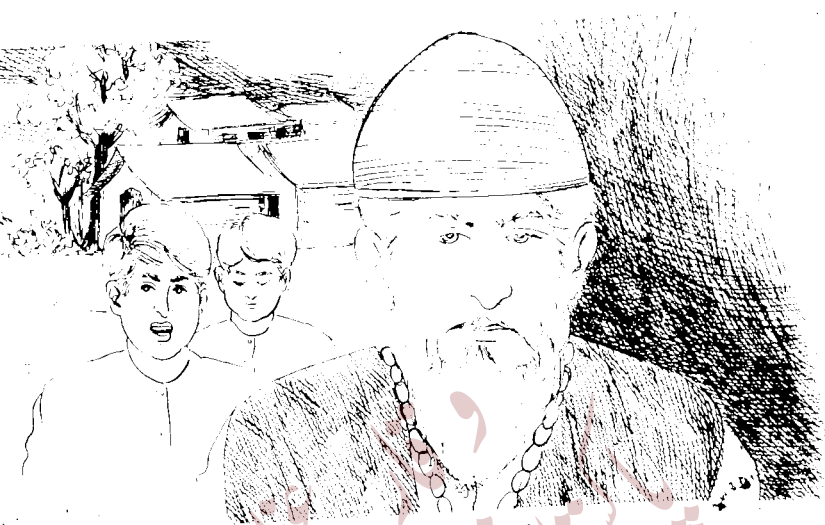
”اس کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟ وہ میرا خون تھا ہمارا خواب تھا اور میرا سہارا تھا جسے تم نے بے رحمی سے ہم سے چھین لیا۔“

نرس نے التجا کی ”دیکھیں اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”میری بیوی کہاں ہے.....؟ میں نے سفاکی سے پوچھا؟ اس سوال پر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔ پھر ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”اب چاہے تو ہمیں مار دو لیکن سچ یہی ہے کہ تمہاری بیوی مر چکی ہے اسے ہم نے مارا تھا۔“

میرے جسم سے جان نکل گئی میں نے میز کا سہارا لیا اور بمشکل پوچھا۔ ”کیا اس نے آخری بار کچھ کہا تھا؟“

اس بار نرس نے کہا۔ ”جی ہاں جب ہم بچہ فروخت کر رہے تھے تو آپ کی بیوی کو ہوش آ گیا تھا وہ ٹوٹا ٹوٹا کر اپنا بچہ واپس مانگتی رہی اور کبھی وہ چیخ کر شہباز کو



آزمائش

شائستہ سحر - راولپنڈی

نوجوان نے جیسے ہی سونے کی اینٹ اٹھائی تو وہ اینٹ اچانک آگ کا جلتا ہوا انگارہ بن گئی اور نوجوان کے ہاتھ سے چمٹ گئی اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اینٹ ہاتھ سے الگ نہ ہوئی اور پھر اچانک.....

رات کے گھٹاؤپ اور ہاتھ کو ہاتھ بھائی بندہ اپنے والے اندھیرے میں ختم لینے والی کہانی

مگر چند سال پہلے ایسا نہ تھا، چند سال پہلے میں ایک ایسا نوجوان تھا جو مطالعی اور جدوجہد گاری کی وجہ سے بدترین حالات میں آ رہا تھا۔ وہ ہمارے ہر گھر سے باہر ہو چکا تھا، قریب تھا کہ میں اس کی مدد کر سکتا تھا، مگر اس کے سامنے جا کر خود ہمدردی کر لیتا تھا کہ ان حالات میں مجھے ایک فرشتہ نما زبان ملا جس نے مجھے ہمدردی کی باتیں کرنے سے کمال کر دیا۔

میرا نام ندیم ہے اور میں آج اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں جس کے قدموں میں دنیا کی ہر آزمائش ہے، روپے پیسے کی بیل بیل ہوری ہے کہ میں سمجھ ہی نہیں پاتا یہ دولت کی برسات کہاں ہو رہی ہے، جس کام میں ہاتھ دالتا ہوں کامیاب ہوں۔ قدم چوتھی ہیں اور لوگ حسرت زدہ ہو کر میری باتیں رشک کرتے ہیں۔

وہ ہستی میرے لئے کس قدر اہم ہے، اس کا اندازہ آپ کو میری سید و اد پڑھ کر ہوگا۔

گر بیجوشن کرنے کے بعد مجھے انتھک کا شوق کے بعد ایک دفتر میں انتہائی کم تنخواہ پر ملازمت ملی جس سے گزارہ انتہائی مشکل سے ہوتا تھا۔ مگر میں نے اسے بھی غنیمت جانا اور پوری توجہ سے اپنا کام کرنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ دفتر کے مالک کو مجھ سے کیا رنجش ہوئی اور اس نے بلا وجہ ہی مجھے ملازمت سے نکال دیا۔ یہ بات میرے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ مجھے آج بھی وہ تکلیف دہ مناظر یاد ہیں جب میں نے اس دفتر کے مالک کے سامنے بلکتے ہوئے منت سماجت کی تھی اور یہی نہیں بلکہ اپنی انا کو روند کر اس کے آگے ہاتھ تک جوڑے تھے اپنی نوکری کو بچانے کے لئے میں کچھ کچھ کر سکتا تھا وہ میں نے کہا۔

مگر جب انسان سفاکی اور خود غرضی پر اتر آئے تو وہ شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اس پر بھی کسی بات کا اثر نہ ہوا اور اس نے مجھے وہاں سے زبردستی نکال دیا۔

اس دن کے بعد کئی ہفتہ تک میں مختلف دفاتر کے چکر کاٹتا رہا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا مگر میں نوبت فاقوں تک پہنچ گئی تھی تنگ آ کر میرے بوڑھے اور بیمار والد نے باہر محنت مزدوری شروع کر دی تھی، جب وہ دن بھر کام کر کے تھکے ہارے رات کو گھر لوٹتے تو میں ان کی حالت دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتا اور اپنی زندگی پر لعنت و ملامت کرنے لگتا۔ میری زندگی اچیرن ہو چکی تھی بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کی پریشانی مجھے کسی بل بھی چین نہ لینے دیتی تھی۔

ایک شام مجھے اپنا ایک قریبی دوست ملا جس نے مجھے ایک بزرگ کے متعلق بتایا، اس کا کہنا تھا کہ ”وہ بزرگ جس کے لئے دعا بھی کرتے ہیں وہ فوراً قبول ہو جاتی ہے۔“ میں اتنا زیادہ فقیروں پر یقین نہیں رکھتا تھا کیونکہ کئی فراڈ لوگ بھی یہ روپ دھار کر لوگوں سے پیسے بوڑتے ہیں مگر دوست کے اصرار پر میں اس کے ساتھ ان بزرگ کی طرف روانہ ہو گیا، وہ بزرگ آبادی سے بہت دور ایک ویران جنگل میں تشریف فرما تھے۔ میں جب وہاں پہنچا تو

لوگوں کا ایک ہجوم وہاں جمع تھا کتنی عجیب بات تھی اس ویران جگہ پر بھی لوگ ان کے فیض سے فیض یاب ہونے کے لئے بڑی تعداد میں آتے تھے۔ اس ہجوم سے گزرتا ہوا ان بزرگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ان کی عمر تقریباً ستر سال کے قریب تھی۔ مجھے اس وقت ان کی ہستی سے جو عقیدت محسوس ہو رہی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ اور ایک ایک کر کے سارے لوگ چلے گئے۔

جب وہ میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے انتہائی دکھ سے کہا۔ ”میں اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکا ہوں شاید میں ہوں ہی بد نصیب میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اگر مجھے دو دن تک کوئی اچھی نوکری نہ ملی تو میں خود کشی کر لوں گا۔“

میری بات کے اختتام پر ان بزرگ نے فوراً میری طرف دیکھا، ان کی نگاہوں میں میرے لئے ہمدردی اور خفگی کے طے جلے تاثرات تھے اور پھر وہ بولے۔ ”خبردار آئندہ کبھی خود کشی کا ارادہ مت کرنا، زندگی خدا کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہے، اس کی قدر کرو۔ جو تقویٰ اور یقین لے کر تم میرے پاس آئے ہو کیا اس تقویٰ اور یقین سے تم نے خدا سے کبھی دعا مانگی؟“

ان کی بات سن کر میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ پھر بولے۔ ”ہم مسلمان خدا سے دعا تو کرتے ہیں مگر اس اندیشے کے ساتھ کہ یہ دعا خدا جانے قبول ہوگی کبھی کہ نہیں اگر مکمل تقویٰ کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ کبھی بھی رد نہیں ہوتی۔“

”جی آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں۔“ میں نے تائید میں سر ہلایا۔

وہ پھر گویا ہوئے۔ ”میں نہیں کہتا کہ میں خدا کا برگزیدہ بندہ ہوں بلکہ میں تو خود کو بہت گناہگار سمجھتا ہوں مگر میں تم سب انسانوں کے لئے جو بھی دعا کرتا ہوں مجھے یقین ہوتا ہے وہ دعا خدا ضرور قبول کرے گا۔“ پھر ان بزرگ نے ہاتھ اٹھا کر میرے لئے دعا کی۔

اور کسی انہونی بات تھی کہ اگلے ہی دن مجھے ایک اچھی ملازمت مل گئی، میں جس قدر خوش تھا بتا نہیں سکتا اسی خوشی

ڈائجسٹوں کی دنیا میں ایک اور خوب صورت اضافہ

خواتین کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ
صائمہ
کراچی

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

جس میں نامور انگریزی کہانیاں، افسانے، ناول اور
کچ پر مبنی بہت سی کہانیاں، اور بہت کچھ جو آپ
پڑھنا چاہتی ہیں ابھی اپنے کسی بھی قریبی بک
اسٹال یا باکرسے نام لے کر طلب فرمائیں۔

معزز خواتین! آپ سب کے لئے سنہری موقع
ہے کہ آپ دیگر رسالوں میں اپنی تحریریں بھیج کر
انتقار کی گھڑیاں گن رہی ہیں۔ لہذا اپنی تحریریں
صائمہ میں ارسال کریں۔ پہلی فرصت میں آپ
سب کی تحریریں شامل اشاعت ہوں گی۔

قیمت فی شمارہ ————— 50/- روپے صرف

(تحریریں بھیجنے کا پتہ)

ذرائع آرٹیکل مگزائن فلور تین طائر نمبر 3 کراچی

PH: 32711915

0334-3649610

میں، میں نے شکرانے کے نوافل ادا کئے اور ان بزرگ کے
لئے کپڑوں کا ایک جوڑا خریدا اور مٹھائی کا ڈبہ لے کر ان کی
خدمت میں حاضر ہوا اور عقیدت سے ان کے سامنے بیٹھتے
ہوئے سرشار لہجے میں بولا۔

”آپ کی دعا کی وجہ سے مجھے بہت اچھی نوکری مل
گئی ہے۔“

”اللہ تیرا شکر ہے۔“ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے۔

”باباجی میں یہ کپڑوں کا جوڑا اور مٹھائی کا ڈبہ آپ
کے لئے لایا ہوں۔“ وہ چیزیں ان کے سامنے رکھتے
ہوئے بولا۔

وہ اشارے سے مجھے روکتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہ
سب نہیں چاہئے بیٹا، تمہارا خلوص اپنی جگہ، میری طرف
سے یہ دونوں چیزیں کسی مستحق انسان کو دیدینا، میری تم سے
بس اتنی گزارش ہے کہ تم جب بھی خدا کے سامنے دعا کے
لئے ہاتھ اٹھاؤ تو مجھے ضرور یاد کر لینا اور میری بخشش کے
لئے ضرور دعا کرنا۔“

میں حیران کن نگاہوں سے ان کو دیکھنے لگا، دوسروں
کے لئے دعا مانگ کر ان کی پریشانی دور کرنے والا خدا
جانے خود کس پریشانی کا شکار تھے۔

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”مگر آپ تو خود
خدا کے نیک بندے ہیں بھلا آپ کو کیا کسی کی دعا کی
ضرورت ہوگی۔“

بزرگ نے میری اس بات پر یوں مجھے دیکھا جیسے
میں بہت بڑا احمق ہوں اور حقیقتاً میری یہ بات احمقانہ ہی
تھی۔ پھر یکدم ان کے چہرے پر دکھ اور پریشانی کی ملی جلی
کیفیات ابھرنے لگیں۔ میں بغور ان کے چہرے پر ظاہر
ہونے والے تغیر کو دیکھتا رہا۔

وہ بڑے دھمی لہجے میں بولے۔ ”ضروری نہیں کہ
خدا کی شب و روز عبادت کرنے والا قرب الہی حاصل
کر لے، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں خدا سے بہت دور
ہوں..... کاش مجھے بخش دیا جائے، میری اس خطا کو
معاف کر دیا جائے، جس نے میری زندگی کا کمن ہوا
کر دیا تھا۔ اگر خدا کی یاد میں، میں مصروف نہ رہوں تو

مگر بھر اچانک ہی اس غار کے اندر روشنی پھیلنے لگی، میں نے غور کیا تو اس غار کے اندر سرنگ میں سے آ رہی تھی، میں اس سرنگ کی جانب بڑھ گیا، وہ روشنی میری رہنمائی کرنے لگی وہ سرنگ نما راستہ جیسے ہی ختم ہوا مزید ایک غار آ گیا، میں جیسے ہی اس غار میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی کے مارے اچھل پڑا، کیونکہ غار میں سونے کی اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اس سونے کی چمکتی ہوئی روشنی سے گویا میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

میں بے قابو ہو کر اس سونے پر ٹوٹ پڑا مگر میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ اس قدر بھی نیک ہوگا۔

میں نے جیسے ہی سونے کی اینٹوں کو چھونا چاہا کوئی چیز آ کر میری گردن کے ساتھ لپٹ گئی اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں بدحواس ہو کر زمین پر گر پڑا۔

دفعتاً اس کا منہ میرے سامنے آیا تو میری آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیل گئیں وہ ایک خوفناک سانپ تھا جو اپنی سرخ آنکھوں سے بڑے غضب ناک انداز سے مجھے گھور رہا تھا۔

میں دونوں ہاتھوں سے اس سانپ کی مضبوط گرفت سے اپنی گردن چمڑانے لگا مگر اس کی گرفت سے چھٹکارا پانا میرے بس سے باہر تھا وہ پلک بچھکتے ہی میری گردن کی ہڈیاں توڑ سکتا تھا یا اپنے خطرناک پن سے مجھے ڈس سکتا تھا، مجھے اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی میں نے آنے والے اذیت ناک لمحات کے لئے خود کو تیار کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

لیکن عجیب بات ہوئی اس سانپ نے جھٹکے سے میری گردن سے الگ ہو گیا اور پھٹکارتا ہوا یوں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا جیسے وہاں کبھی موجود ہی نہیں تھا۔ میں اپنی گردن کو سہلاتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کرنے لگا، چند ثانیے پہلے جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا وہ غیر یقینی تھا۔ میں سر جھکانے خود پر بیٹھنے والے حالات پر غور کرنے لگا۔ اس خطرناک زہریلے سانپ کا حملہ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ میں سنبھل نہیں پایا تھا۔ اور اس کی خوفناک گرفت میں مایہ بے آب کی طرح

بے چینی مجھے پاگل کر دیتی ہے۔“

”بابا جی ایسا کیا ہوا ہے آپ سے جو آپ اتنے پریشان ہیں؟“ میرے اس سوال پر ان بزرگ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی اور وہ مشکل سے بولے۔ ”میں اب خدا کا وہ گنہگار بندہ ہوں جس نے خدا کے انتہائی نیک اور برگزیدہ بندے کو دھوکا دینے کی کوشش کی۔ میں نے ان کا اعتماد توڑا بہت دل دکھایا ان کا۔“

”ایسا کیا ہوا ہے آپ سے؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ اپنی روداد سناتے لگے۔

”آج سے کئی سال پہلے میں تمہاری طرح کا ہی لاہابی سانو جوان ہوا کرتا تھا۔ مجھے سیاحت کا بڑا شوق تھا اور صدیوں پرانے کھنڈرات سے مجھے جنون کی حد تک دلچسپی تھی۔ میں جیسے ہی بلوغت کی عمر کو پہنچا اپنے گھر سے نکل گیا، شہر شہر گاؤں گاؤں کی سیر کی جس جگہ جاتا وہیں چھوٹا موٹا کام کر لیتا اور اپنی ضروریات پوری کر لیتا، مجھے کسی چیز کی فکر نہیں تھی کھلے آسمان تلے جہاں جگہ ملتی سو جاتا۔

ایک روز یونہی گھومتے پھرتے میں ایک ویران علاقے میں داخل ہو گیا کوئی پہاڑی علاقہ تھا جہاں دور دور تک بڑے قد آور پہاڑ موجود تھے۔ مگر انسانی آبادی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہاں میری دلچسپی کے لئے کچھ نہ تھا، اس لئے میں نے واپس پلٹ جانا مناسب سمجھا، ابھی میں اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے ہی والا تھا کہ اچانک آسمان سرخ ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سرخی، تاریکی میں بدلنے لگی، امکان تھا بہت شدید طوفان کا! میں آسمان کے حالات دیکھ کر پریشان ہو گیا اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں پہاڑوں کی طرف بڑھنے لگا۔

دفعتاً اس قدر شدید طوفانی آندھی چلی کہ مجھے محسوس ہوا میرا وجود اس آندھی میں سنبھل نہیں پائے گا، میں نے بہت مشکل سے خود کو سنبھالا اور گرتا پڑتا ایک پہاڑی نیلے کی طرف بھاگا اس پہاڑ میں ایک غار تھا جو اس طوفان سے بچنے کے لئے بہترین پناہ گاہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا اس غار کے اندر داخل ہوا، غار کے اندر ممل تاریکی اور خاموشی تھی۔

پاک ہو جاتا ہے۔“
 ”تو آپ کیا کہتے ہیں آپ مجھے اجازت دیں گے
 کچھ سونے کو ساتھ لے جانے کی؟“
 میں ان کی اس قدر خوب صورت باتوں کو نظر انداز
 کرتے ہوئے بولا۔

وہ بزرگ بولے۔ ”یہاں سے صرف تم پانچ سونے
 کی اینٹیں لے جا سکتے ہو مگر یہ جو سامنے سونا پڑا ہے اس میں
 سے نہیں، تمہیں واپس اسی غار میں جانا ہوگا جس سے گزر کر
 تم یہاں آئے ہو۔“

میں بڑا خوش ہوا اور اپنا سفری تھیلہ اٹھا کر تیز قدم
 اٹھاتا ہوا اسی غار میں پہنچ گیا جس میں طوفان سے بچنے
 کے لئے آیا تھا۔ اس وقت اس غار میں تاریکی تھی مگر اب
 وہ غار مکمل روشن تھا۔ وہ کسی روشنی تھی، میں کچھ نہ سمجھ سکا
 اور اس وقت مجھے کسی اور چیز پر غور کر دینے کی فرصت ہی
 کہاں تھی، میرے سر پر تولا لالچ کا بھوت سوار تھا، مجھے کسی
 اور چیز کا ہوش ہی کہاں تھا۔

اس غار میں بے شمار سونے کی اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا،
 اتنا سونا میں نے کبھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا، سب کچھ
 ایک خواب سا محسوس ہو رہا تھا، اپنا یہ وہم دور کرنے کے لئے
 میں نے خود کو دو تین بار چٹکی بھی کالی، میں نے فوراً اپنا سفری
 تھیلہ سامنے رکھا اور سونے کی پانچ اینٹیں اٹھا کر اس میں
 ڈال دیں اور جیسے ہی میں اس غار سے نکلنے کے لئے آگے
 بڑھا ایک شیطانی خیال نے گویا میرے قدموں کو جکڑ لیا۔
 ”وہ بزرگ تو دوسرے غار میں اپنی عبادت میں مگن ہیں اور
 یہاں کوئی اور میرے علاوہ نہیں تو کیوں تاخر یہ سونا اپنے تھیلے
 میں ڈال لوں کسی کو کیا پتہ چلے گا..... مگر وہ سانپ!“

اس سانپ کا خیال آتے ہی میں نے خوفزدہ انداز
 سے چاروں طرف دیکھا مگر اس سانپ کا کہیں نام و نشان
 نہیں تھا، اپنی اچھی طرح سے تسلی کرنے کے بعد میں دوبارہ
 سونے کی اینٹوں کی طرف بڑھا اور جیسے ہی میں نے ایک
 اینٹ کو اٹھایا تو وہ سونے کی اینٹ میرے ہاتھ لگتے ہی
 آگ کا جلا ہوا انگارہ بن گئی، اور بے ساختہ میرے منہ سے
 بڑی دلخراش چیخ نکلی۔

ترپ رہا تھا ممکن تھا وہ مجھے ماری ڈالتا، پر یہ نہیں کیوں اس
 نے ایسا نہ کیا۔ ”آخر کس نے اسے ایسا کرنے سے روکا؟“
 جیسے ہی یہ سوال میرے دماغ میں ابھر امیرے کانوں
 میں بالکل دھیمی اور ہلکی آواز گونجنے لگی، جیسے کوئی منہ ہی منہ
 میں کچھ پڑھ رہا ہو۔ جیسے ہی مجھے اس بات کا احساس ہوا
 میں نے فوراً سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو ایک بے حد نورانی
 چہرے والے بزرگ جاتے نماز پر بیٹھے دروالہ گی میں مشغول
 تھے، ان کے چہرے سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں
 اس قدر خوب صورت اور روشن کرنیں کہ جن کے سامنے اس
 سونے کی چمک بھی ماند پڑ گئی تھی، بلاشبہ یہ وہی روشنی تھی
 جس کی رہنمائی میں، میں اس غار تک پہنچا تھا۔ میں بے حد
 حیران ہوا اور فوراً اٹھ کر بزرگ کی دائیں جانب بیٹھ گیا۔

”یہاں کیوں آئے ہو تم؟“ تھوڑی دیر بعد ان
 بزرگ کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ وہ آنکھیں بند
 کئے بیٹھے تھے۔ مگر ان کو میری موجودگی کا اندازہ تھا۔

میں ہلک گیا تھا طوفان سے بچنے کے لئے یہاں پناہ
 ڈھونڈنے آ نکلا“ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اب طوفان ٹل چکا ہے جاؤ اور یہاں واپس کبھی
 لوٹ کر مت آنا۔“ ان بزرگ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
 ”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ میں نہایت
 ادب سے بولا۔

”بولو۔“ اس بار ان کے لہجے میں نرمی تھی۔

”میں ایک غریب انسان ہوں، یہاں بہت سا سونا
 پڑا ہے اگر آپ اجازت دیں تو اس میں سے کچھ اپنے
 ساتھ لے جا سکتا ہوں؟“ میں نے ڈرے ہوئے انداز
 سے پوچھا۔

تو وہ بولے۔ ”حقیقی غریب وہ ہوتا ہے جس کے پاس
 ایمان کی دولت نہیں ہوتی جب ایمان کی دولت انسان کو
 حاصل ہو جائے تو وہ دنیا کا سب سے امیر انسان بن جاتا
 ہے۔ اس انسان کو کسی چیز کی کمی نہیں رہتی، دنیا کے سب
 پوشیدہ خزانے سمٹ کر اس کے قدموں میں آ جاتے ہیں مگر
 اس شخص کو سوائے اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کی طلب
 کے سب بیکار لگتا ہے کیونکہ اس کا دل لالچ اور ہوس سے

پڑھنا شروع کر دی تو گویا دل کو سکون مل گیا۔ اسی سکون میں ہر لمحہ رہنے کے لئے میں نے زیادہ سے زیادہ خود کو ذکر الہی میں مشغول کر لیا۔ مگر جب بھی ان بزرگ کا دل میں خیال آتا ہے تو میں ندامت میں ڈوب جاتا ہوں۔

کاش وہ بزرگ مجھے پھمرا جاتے تو میں ان سے معافی مانگ سکتا۔ مجھ سے جو خطا ہوئی یہی سوچ کر کانپتا ہوں خدا مجھے بخشے گا کہ نہیں۔“

وہ بزرگ چپ ہوئے اور اپنی آنکھوں میں اترنے والی نمی کو صاف کرنے لگے۔ میں چپ رہا، میرے پاس ان کے لئے کہنے کو کچھ نہ تھا۔ مگر میں ان کے لئے خدا سے دعا میں معافی کی درخواست ضرور کر سکتا تھا۔

میں نے یہی کیا اور مسلسل کئی روز تک ان بزرگ کے لئے دعا کرتا رہا۔ پھر ایک دن مجھے پتہ چلا ان بزرگ کا انتقال ہو گیا ہے۔“ مجھے بے حد دکھ اور افسوس ہوا یوں لگا جیسے میرا اپنا بہت قریبی اس دنیا سے چلا گیا ہو۔ میں نے مشکل سے خود کو سنبھالا اور ان بزرگ کے جنازے میں شریک ہوا۔ جنازے میں سینکڑوں کی تعداد میں لوگ شریک تھے اور کتنی عجیب بات تھی ان بزرگ کی میت سے اٹھنے والی خوش گوار خوشبو نے وہاں موجود ہر شخص کی سانسوں کو معطر کر دیا تھا۔

اس روز شدید گرمی تھی مگر پھر اچانک ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی یقیناً آسمان بھی ان کی موت پر سو گوار تھا۔ ان بزرگ کا مزار بنایا گیا اور آج بھی اس مزار سے اٹھنے والی خوشبو دور دور تک محسوس ہوتی ہے اور جو لوگ بھی ان کے مزار پر دعائیں مانگتے آتے ہیں وہ لازمی قبول ہوتی ہیں۔ جس شخص کے اتنے عقیدت مند ہوں اور خدا اس کے ذریعے اپنی مخلوق کو اپنی رحمت سے نوازا رہا ہو۔ وہ شخص کیسے بخشا نہیں گیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے پہاڑ کے غار میں ملنے والے ان بزرگ نے ان کو بہت پہلے ہی معاف کر دیا ہوگا۔ تب ہی خدا نے ان کو اپنی ہدایت اور رحمت سے نوازا تھا۔ اور اس قدر زیادہ عزت دی تھی۔

میں نے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے اس انگارے کو نیچے پھینکا چاہا مگر وہ انگارہ تو گویا میرے ہاتھ سے چٹ گیا تھا میں متواتر چیختے ہوئے زمین پر گر گیا اور اس انگارے والے ہاتھ کو پکڑے زمین پر مایہ آبی کی طرح تر پنے لگا اسی اثنا میں وہ بزرگ اچانک میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔

”میں نے کہا تھا صرف پانچ اینٹیں اٹھانا یہاں سے دیکھ لیا اپنی لالچ اور کسی دوسرے کے اعتماد کو دھوکا دینے کا نتیجہ!“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں خدا کی عبادت میں مشغول ہوں تو مجھے دنیا کی کچھ خبر نہیں مگر تم لوگ نہیں جانتے جو شخص خدا کی یاد میں غرق ہوتا ہے خدا اس کو ایسا فہم عطا کرتا ہے جن کو سمجھنے کا تم جیسے بندوں کو کچھ شعور نہیں۔“

”بابا جی مجھے معاف کر دیں، خدا را مجھے معاف کر دیں، میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔“ میں شدید تکلیف میں روتے ہوئے بولا۔

ان بزرگ نے منہ میں کچھ پڑھ کر جیسے ہی میرے ہاتھ پر پھونک ماری وہ آگ کا انگارہ فوراً میرے ہاتھ پر سے غائب ہو گیا، اور شدید تکلیف اور جلن بھی ختم ہو گئی میں روتے ہوئے ان کے قدموں میں گر گیا۔

”اب کوئی فائدہ نہیں نو جوان! لالچ میں آ کر تم نے سب کچھ کھو دیا اگر تم میری بتائی ہوئی ہدایت پر عمل کرتے تو یہ سب خزانہ تمہارا ہوتا مگر افسوس تم نے شیطان کی پیروی کی۔“

میں روتے ہوئے گڑ گڑایا۔ ”بابا جی مجھے معاف کر دیں مجھے اپنے دست فیض میں لے لیں۔“

مگر میں اپنا اعتماد کھو چکا تھا اور اپنے اندر سراسر اٹھانے والے شیطان پر قابو نہ پاس کا تھا وہ بزرگ اور سونا پلک جھپکتے ہی یوں میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوئے جیسے وہاں کبھی تھے ہی نہیں۔

پھر اس روز کے بعد وہ بزرگ کبھی مجھے دوبارہ نظر نہیں آئے، اس واقعے کے بعد میرا اس دنیا سے دل بالکل اچاٹ ہو چکا تھا کہیں میرا دل نہیں لگتا تھا اپنے اندر کی اس بے چینی کو ختم کرنے کے لئے میں نے باقاعدگی سے نماز



قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

دل دھڑکتا ہے تو صرف تیرے لئے ہی درد
خاک کا ڈھیر ہوں، اس خاک میں کیا رکھا ہے
آندھیاں ایسی اٹھیں کہ مجھ گئے سورج لیکن
اک دیا ہم نے بہر طور جلا رکھا ہے
(ساحل دعا بخاری..... بصیر پور)

سفر یادوں کا دل سے بھلایا نہیں جاتا
دکھ اپنا کسی کو پھر سنایا نہیں جاتا
جاگے پھر کوئی آتا نہیں ہے زمانے میں
اندھیری راہوں میں یوں چراغ جلایا نہیں جاتا
(محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد)

خشک ہونٹوں پہ میرے اپنے لب تر رکھ دے
میرے ساقی مرے صحرا پہ سمندر رکھ دے
(شرف الدین چیلانی..... نڈوالہ یار)

پھر یوں ہوا کہ نکلے کسی کی تلاش میں
پھر یوں ہوا کہ خود کو نہ پائے تمام عمر
پھر یوں کہ اور کسی کے نہ ہو سکے
پھر یوں ہوا کہ وعدے نبھائے تمام عمر
(مسلمان احمد..... کراچی)

ہوگئی درد سے آشنا زندگی
جب چلی چھوڑ کر بے وفا زندگی
کس قدر خوف سے دھڑکن رک گئیں
دے رہی ہے یہ کیسی سزا زندگی
(عارف عمر دراز..... نواب شاہ)

جب یاد میری آئے تو لوٹ آنا
جب دنیا ستائے تو لوٹ آنا
تمہارے لئے سہوں گی دنیا کے مارے لم ندیم
جب قدم لڑکھڑائے تو لوٹ آنا
(مصباح کیم..... پٹنہ)

تم میری سوچ ہو کوئی اور تمہیں سہ تو ہوں
تم میری چاہت ہو کوئی اور تمہیں ہا تو ہوں
(عامر..... نڈوالہ آدم)

بچہلی رفاقتوں کے تقاضے بدل گئے
جھڑتے تھے جن سے پھول وہ لہجہ بدل گئے
ہم سے جدا ہو کہ تو اتنا نہ ہو خوش ندیم
یہ جان لو کہ ہم بھی کب کے بدل گئے
(ملک ندیم ساگر..... شاہ پور جاگر)

قیامت ہے تیرا یوں بن سنور کے سامنے آنا
ہمارے دل کی چھوڑ آئینے پر کیا گزرتی ہوگی
(محمد عاصم اشفاق..... صادق آباد)

تیرے جانے کے بعد کون روکتا مجھے
میں نے جی بھر کے خود کو برباد کیا
(محمد عارف..... صادق آباد)

حسن کردار سے نور مجسم ہو جا
کہ ابلیس بھی تجھے دیکھے تو مسلمان ہو جائے
(رمضان حسین..... رحمت آباد فیصل آباد)

عشق کرنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں
جاگتی آنکھوں کے بھی کچھ خواب ہوا کرتے ہیں
ہر کوئی رو کے دکھائے یہ ضروری تو نہیں
خشک آنکھوں میں سیلاب ہوا کرتے ہیں
(طاہر اسلم بلوچ..... سرگودھا)

مرکھنا مت پکھنے سے کوئی اپنا نہیں رہتا
مکھی بھی آئینے میں دیے تک چہرہ نہیں رہتا
بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
کہ دریا جب سمندر سے ملتا ہے تو دریا نہیں رہتا
(انتخاب: کاشف عید کاوش..... بدھ موڑی بھگرام)

ہر لفظ کو کاغذ پہ اتارا نہیں جاتا
ہر نام سر عام پکارا نہیں جاتا
ہوتی محبت میں بھی کچھ راز کی باتیں
ایسے ہی تو اس کھیل میں ہارا نہیں جاتا
لکھ کر ہمارا نام زمین پر مٹا دیا
ان کا قہا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
(انتخاب: آدشیہ نیازی..... بٹ موڑی)

میری یاد آئی تو رو دیا جو تو مل گیا تجھے کھودیا
میرے سلسلے بھی عجیب ہیں تجھے چھوڑ کر تجھے ڈھونڈنا
(ایمان لک..... رحیم یار خان)



دیکھتے اب، ہم کو رخصت برلا
جائے بس آپ کہہ نہ پائیں گے
ہے ہمیں خاتم سے چاہت برلا
(فریدہ خاتم..... لاہور)

چہروں پہ حسن پھولوں میں گفتگوئی نہ رہی
تیرے بغیر کسی شے میں دلکشی نہ رہی
یہ اپنی دنیا فردوس بریں سے کم نہیں ہے
زمانے میں اگر، کہیں یہ بھی بے کسی نہ رہی
ہماری انجمن میں تم یوں آکے چلے گئے
پھر اس اس کے بعد جہاں میں روشنی نہ رہی
نہ دوش پینے پہ ہوگا نہ بھر بلانے پہ
لبو کے جام پلاؤ کہ سے کشی نہ رہی
صلہ یہ دیا ہے پھولوں کو ان کی خوشبو کا
کہ ملے جاتے ہیں جب ان میں تازگی نہ رہی
برسوں سے ہے نظام زندگی برہم سا
تم اپنا طرز وفا بدلو کہ برہی نہ رہی
کسی کے دل میں چاہت نہیں ہے جاوید
یہ زیست ہے یوں پھر ایسی زندگی نہ رہی
(محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد)

ٹوٹ گئے ہیں خواب سہانے لوگوں کے
لٹ گئے سب انمول خزانے لوگوں کے
دنیا والے کرتے ہیں سب اپنے نفع نقصان کی بات
کوئی بھی دکھ درد نہ جانے ہم پریشان لوگوں کے
ڈوبا ہوا ہے ہر کوئی بشر سوچ کے سمندر میں
اب کون آئے گا واجد بار اٹھانے لوگوں کے
چارہ گروں کے ہاتھ بندھے ہیں ہونٹ لے ہیں
موت کھڑی ہے ظالم آج سرہانے اپنے لوگوں کے
ہاتھ رنگے ہیں جن کے آج خون ناحق سے
آئے ہیں وہ سوگ منانے اب اپنے لوگوں کے
کب سے لگی ہیں سب کی نظریں امید کی راہوں پر
اب آئے کوئی بھاگ جگانے غریب غزدہ لوگوں کے
ان کو منادیں گے واجد اغیار اور اپنے لوگ
باقی دنیا میں رہ جائیں گے درد منانے اپنے لوگوں کے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد کنویں..... کراچی)

مگر مگر کی خاک اڑائی ہمیں محبت راس نہ آئی
قدم قدم پر ٹھوکر کھائی ہمیں محبت راس نہ آئی
سارا زمانہ جب سوتا ہے چپکے چپکے دل روتا ہے
چہین گنویا نیند گنوائی ہمیں محبت راس نہ آئی
دل دیتا ہے صدائیں تجھ کو ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں تجھ کو
اپنا مقدر تیری جدائی ہمیں محبت راس نہ آئی
ہم دونوں کے دل اندر رخش سے جب نفرت آئی
اپنوں نے پھر آگ لگائی ہمیں محبت راس نہ آئی
چل چل پاؤں پھول گئے ہیں کھر کا رستہ بھول گئے ہیں
دور نظر سے منزل پائی ہمیں محبت راس نہ آئی
رت پھولوں کی جب بھی آئی صورت تیری نظر نہ آئی
ارمانوں نے آگ لگائی ہمیں محبت راس نہ آئی
چندا کو میں تاک رہا ہوں، ہمرہ جاگ رہا ہوں
یاد ہے تیری اور تہائی ہمیں محبت راس نہ آئی
چاندنی راتیں جب بھی آئیں دل کے سوتے زخم جگائیں
دل دیتا ہے رو رو دہائی ہمیں محبت راس نہ آئی
خون جگر سے دیا جلا کے چلنا پڑا مجھے ساتھ ہوا کے
عشق میں تیرے گنوائی ہمیں محبت راس نہ آئی
(حکیم خان حکیم..... کابل پور موسیٰ)

ہم کو تم سے ہے شکایت برلا
یہ بھی ہے انداز الفت برلا
جاتے رہتے ہیں کدھر آپ آج کل
رہتی ہے کیوں غیر محبت برلا
دیکھ کر ہم کو بھی اب رکتے نہیں
چہرے پہ برے ہے حیرت برلا
حوصلہ ہے، تو کرو اظہار بھی
جذبہ یہ ہے پیش قیمت برلا
خاموشی کو چھوڑ کر کچھ بول انھیں
جرم ہو جائیں نہ ثابت برلا
یہ حیا کی سرخی کچھ ظاہر کرے

اک زر و جواہر کے نایاب خزانے کی طرح
گم کر کے خود کو اسے ہی کھوجتا رہا میں
کب کا کہیں ٹھہرا ہے جانے کب پھر سے ابھرے گا
سوچ کے یہ عمر بھر اس کا انتظار کرتا رہا میں
لیکن قریب رہ کر بھی وہ نظروں سے دور تھا
پانے کیلئے جس کو در بدر یوں پھرتا رہا میں
(طارق محمود.....انک)

ریزہ ریزہ پہنوں والے ٹوٹے چہرے آدھے لوگ
جانے والے کب آتے ہیں کیوں کرتے وعدے لوگ
آس میں بیٹھی شہزادی کی مانگ میں چاندی جھانک چکی
اتنی دیر سے کیوں آتے ہیں، آخر یہ شہزادے لوگ
بیاد کی راہ پر انگلی تھامے اندھا دھند چل پڑتے ہیں احسان
ناگہی میں مرجاتے ہیں ہم سے سیدھے سادھے لوگ
(احسان سحر.....میانوالی)

کم سہی ہم سے لیکن ملا کیجئے
کچھ تو رسم محبت ادا کیجئے
کون کہتا ہے ہم سے بھلا کیجئے
کیجئے کچھ بھی چاہے برا کیجئے
بڑھ گیا ہے جنوں ایک حد سے مرا
میرے مرنے کی اب تو دعا کیجئے
مانگنے سے بھی اب موت آتی نہیں
ایسی صورت میں پھر کوئی کیا کیجئے!
دم تڑپتے تڑپتے نکل جائے گا
قہر الفت سے مجھ کو رہا کیجئے
اس نے پوچھا کہ تصویر کا کیا کروں
میں نے بھی کہہ دیا کہ جلا دیجئے!
(محمد سراقہ قریشی.....حضرہ)

ملنے ہو نہ بات کرتے ہو، تم کیسی محبت کرتے ہو
روتے ہو نہ ہنستے ہو، تم کیسی محبت کرتے ہو
یہ عارض و مغل پہ چہرہ کھلتا گلابی
تم کب بننے سنورتے ہو تم کیسی محبت کرتے ہو
کبھی لیوں پر غصہ ہوتا ہے کبھی لیوں پر پیار ہوتا ہے
پیاد جتاتے بھی ہو، تم کیسی محبت کرتے ہو
کبھی پاس ہو کر بھی تم ہی سے شکوہ کرتے ہیں
اب کہاں روز ملتے ہو، تم کیسی محبت کرتے ہو
جنہیں دیکھے بنا تو دن کتنا نہیں ہے نقش
پھر جانے کی بات کرتے ہو، تم کیسی محبت کرتے ہو
(شرف الدین جیلانی.....نندوالہ یار)

وہ مجھ سے روز ملتا رہا کیا رہا کیا نصیب تھا
وہ بھی تھے دن کہ آئینہ میرا رقیب تھا
میری طلب میں پھول تھے کانٹے ملے مجھے
جس کو رفیق سمجھا تھا، میرا رقیب تھا
اک شخص مر گیا ہے جسے دیکھنے کے بعد
کہنے کو لوگ کہتے رہیں وہ طیب تھا
میں داستان اپنی سانے چلا مگر
جو شخص بھی ملا مجھے اعلیٰ خطیب تھا
میں نے تلاش یار میں کتنے سفر کئے
ملا جو کوئی دوست کہاں یہ نصیب تھا
نظریں جھکائے آج وہ بیٹھا تھا سانے
اس کے خوش رہنے کا عالم عجیب تھا
جو دور دور مجھ سے رہا راز ہر گھڑی
وہ شخص میرے دل کے نہایت قریب تھا
(انتخاب: آویس نازی.....یڈ موڈ گرام)

میری تنہائی کا احوال سنا تو بولے
ہم نے بھی عمر گزاری ہے بنا ساتھی کے
ہم کو بھی رات کا ہر چاند رلا دیتا تھا
ہم بھی تنہائی کے لمحوں میں تڑپتے تھے بہت
ہم کو بھی تھی کسی ہرجائی سے ایسی الفت
اپنی ہر سانس پہ اک نام جوادیتے تھے
ہم بھی اس عشق کی آتش میں سلگتے تھے بہت
لوگ ہم کو بھی کہتے تھے کہ سودا کی ہے
موسم گل میں یہ کانٹوں کا تمنائی ہے
نقص کچھ اس طرح آنکھوں میں بسایا ان کا
میری تنہائی میں بھی لطف ہے رعنائی ہے.....!
(حکمتہ ادرام درانی.....پشاور)

اترا کہاں پہ چاند میرا دیکھتا رہا میں
کرنے اس کا دیدار ادھر ادھر گھومتا رہا میں
بہت بے چین کئے رکھا اس کے نہ ملنے نے
جس سے ملنے کو ہزار ہا طریقے سوچتا رہا میں

وہ جو پھرتا تھا اب نہیں معلوم
(ڈاکٹر شاکر کا شیریں..... لاہور)

میں لگی جو سر شام
سمندر کی لہروں سے اوپر در افق میں
سورج کے ڈوبتے لمحے
یہ سوچتی ہوں

چند ساعتوں بعد
محل اندھیرا چھا جائے گا
پھر نئی حرکت

کتنے پچھچی کھر کا رستہ بھولیں گے
کتنے مسافر اپنی منزل سے بھٹکیں گے
نئی جگہ تک تو نہ جانے کیا کچھ

ہو جائے گا
سب کچھ اک دم رک جائے گا
میں بھی بالکل بھول جائوں

جو یہ سوچتی رہتی ہوں
حالانکہ ہر شب چاند کی آمد
یہ اعلان کرتی ہے

سب کچھ ویسے چلتا رہے گا
میں بھی بالکل بالکل ہوں
کیا کیا سوچتی رہتی ہوں

(عطیہ زاہرہ..... لاہور)

کون آیا ہے دل کے آئینہ میں
پھول کھلنے لگے ہیں گلشن میں
میرے سینے پہ ہاتھ تو رکھو

ہے بہت شور دل کی دھڑکن میں
جس سے مل کر قرار آیا ہے
تو ہی پہلا ملا ہے جیون میں

بھگ کر آج تیز بارش میں
آگ تو نے لگادی ساون میں
تو نے مہکادیا ہے کچھ ایسا

جیسے خوشبو نسبی ہے چندن میں
(ریحان آفاق..... حیدر آباد)

☆☆

دنیا تیری عجبی تیرا
شہ رگ سے نزدیک ہے ڈیرہ
ہر کوئی منگتا تیرے در کا
جو مانگے ہے سب کو دیتا
تیرے لطف کے سب محتاج
خُشک اور تر ہر تیرا راج
رنج و راحت تیرے دم سے
ہم زندہ ہیں تیرے کرم سے
تو واحد تو رب جلیل
دو جگ تیرا عکس جلیل
(چوہدری قمر جہاں علی پوری..... ملتان)

خواب آنکھوں میں کیا مہکتا ہے
میرا سارا ہی گھر مہکتا ہے
جب بھی اس کا خیال آتا ہے
زندگی کا سفر مہکتا ہے

کوٹ پہ اس کا پھول ہے اب تک
دل کا سارا گھر مہکتا ہے
وہ تصور میں اب بھی ہے دیکھ
کتنا شام و سحر مہکتا ہے

اس نے رکھے تھے بھول کر پاؤں
ایک عرصے سے درد مہکتا ہے
انکی تصویر بن گئی رانا
انگلیوں میں ہنر مہکتا ہے

(قدیر رانا..... راولپنڈی)

میرے مرنے کے بعد میری کہانی لکھتا
کیسے برباد ہوئی میری جوانی لکھتا
اور لکھتا کہ میرے ہونٹ خوشی کو ترے
کیسے برسا میری آنکھوں سے پانی لکھتا

اور لکھتا کہ اسے انتظار تھا بہت دیر تک تیرا
مگر خری سانس میں وہ بچکیوں کی روانی لکھتا
لکھتا کہ رتہ دنت لگی دیتی رہی دعا میں تھک کر نہ
ہاتھ باہر تھے کفن سے یہ نشانی لکھتا

(مصباح کریم..... چوکی)

کٹ گئی کیسے شب نہیں معلوم
ہو گئی صبح کب نہیں معلوم
کون تھا جاں بلب نہیں معلوم
کس نے ڈھایا غضب نہیں معلوم

رات بھر محو تھا تصور میں
گل ہوئی شمع کب نہیں معلوم
ایک پل میں جو بھا گیا من کو
اس کا نام و نسب نہیں معلوم

حال دل اس سے کہہ تو دیتا ہوں
بات کہنے کا ڈھب نہیں معلوم
دشت سے کہہ رہا تھا دیوانہ
دشتوں کا سبب نہیں معلوم

اس بدن کے فقس میں سانسوں کی
ڈور ٹوٹے گی کب نہیں معلوم
جانے کس موڑ پر ملے شاکر

زندانی کی روح

شہزادہ چاند زیب عباسی - کراچی

اچانک کمرے میں ایک ہیولہ نمودار ہوا، جس نے آہستہ آہستہ ایک خوبرو حسینہ کی شکل اختیار کر لی، اس کے چہرے اور سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بہتا ہوا خون اس کے چہرے کو تحیر انگیز اور خوفناک بنا رہا تھا۔

ایک دولت کے بیماری کی عبرت انگیز اور حیرت انگیز خونی اور ناقابل فراموش حقیقی روداد

پیکار رہتا تھا۔ اکثر ایماندار پولیس افسران اس کی رپورٹ اور معاونت سے کارروائی کرنے کے جرائم پیشہ افراد کو کیفر کردار تک پہنچاتے تھے۔ علینہ ان کی اکلونی بنی تھی۔

”پوسٹ مین آپ کے نام رجسٹری ہے ریسیدو کر لیں۔“ باہر سے جواب دیا گیا۔

شام کے چار بجے کسی پوسٹ مین کے آنے کا کون سا وقت ہے؟ یہ سوچتے ہوئے اس نے اٹھتے ہوئے ذہن کے ساتھ دروازہ کھولا ہی تھا کہ نوار اسے دھکیلتے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا۔ علینہ نے چیخنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ نوار نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے تھمیتے ہوئے بیڈ روم میں لے گیا۔

وہ ایک دروازہ اور تو منہ شخص تھا۔ جو پوسٹ مین کی مخصوص وردی میں ملبوس تھا۔ شانے سے ایک تھملا سا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بچی داڑھی اور آنکھوں پر مونٹے فریم کی عینک موجود تھی۔ ناک کے تھننے غیر معمولی پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے کمرے کا دروازہ لٹ مار کر بند کیا اور علینہ کو بیڈ پر دھکیل دیا۔ اب اس کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر موجود تھا۔ جو اس نے چشم زدن میں اپنی پنڈلی سے نکالا تھا۔

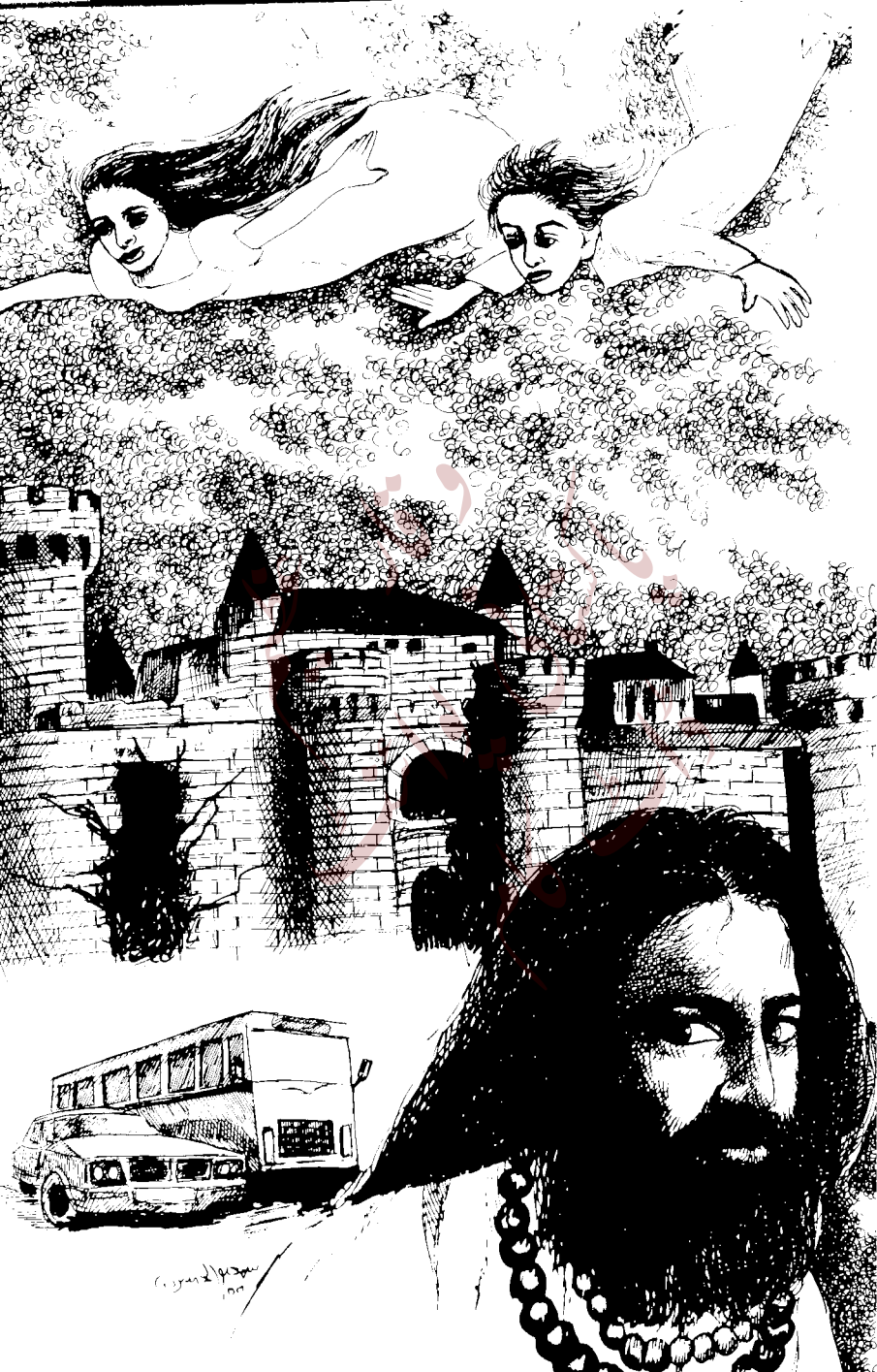
”تتم کون ہوا اور کیا چاہتے ہو؟“ علینہ نے اسے

علینہ اپنے روم میں موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی، وہ نرم و گداز میٹرس پراوندھے منہ لیٹے گانا سننے میں مچھی کہ ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ بیل کی آواز سننے ہی وہ کسماتے ہوئے بیڈ سے اتری اور بیرونی دروازے پر جانچنے۔ ”کون؟“ اس نے دروازے پر پہنچ کر پوچھا۔

ان دنوں شہر کے حالات کافی خراب تھے۔ اس لئے اس کے والدین نے جتنی سے تاکید کر رکھی تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں کسی اجنبی کے لئے ہرگز دروازہ نہ کھولے۔ اس کے مئی پاپا، اکرام شاہ کے گھر تعزیت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اکرام شاہ علینہ کے والد قدیر خان کا قریبی دوست تھا۔ گزشتہ روز اکرام شاہ کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ علینہ اس قسم کے سوگوار ماحول میں جانے سے کتراتے تھی۔ اس لئے گھر پر اکیلی ہی رہ گئی اور قدیر خان اور ان کی اہلیہ کلثوم اسے سمجھا بچھا کر چلے گئے۔

قدیر ایک رپورٹر تھا اس کے علاوہ اینکر پرسن اور سیاسی تجزیہ نگار بھی تھا۔ وہ ایک بڑے اخبار سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ، ایک نجی ٹی وی چینل سے بھی واسطہ تھا۔ اس کے اندر موضوع اور چسپتے ہوئے سوالات داغنے کی زبردست صلاحیت تھی۔

وہ اکثر شہر میں ہونے والے جرائم کے خلاف برسر



خوفزدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے نوار کے ہاتھ میں موجود خنجر کی جگہ سے چیخنے چلانے سے گریز کیا تھا۔ نوار نے اپنے شانے سے لٹکا ہوا تھلا اتار کر ایک طرف رکھا اور اس کی بات کا جواب دیتے بغیر اپنے تھیلے سے جدید ترین خودکار بھینٹل کسیرہ نکال کر سنگار میز پر اس انداز سے رکھا کہ کمرے کا وہ حصہ بخوبی ریکارڈ ہو سکے جہاں علیہ موجود تھی۔ وہ کسیرہ آن کر کے سبھی ہوئی علیہ پر ٹوٹ پڑا۔ علیہ اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ بھر چلاتے ہوئے چیخنے چلانے لگی۔ ”چیخو اور زور سے چیخو، مجھے تمہاری چھینیں سکون دیں گی۔“ وہ بذیانی ہنسی، وہ کوئی جنونی معلوم ہو رہا تھا۔ جسے علیہ کی چیخ و پکار لطف دے رہی تھی۔ علیہ کو دبوچے ہوئے اس نے اس کے لباس کی دھجیاں نکھیر دیں۔ ”خدا کے لئے مجھے جھوڑ دو۔“ وہ چیخنے چلاتے ہوئے اس کے آگے گڑبڑانے لگی۔

وہ جنونی اس کی چیخ و پکار سے بے نیاز اس پر حاوی ہوتے ہوئے اسے کسی وحشی جانور کی طرح نوج کھسٹ رہا تھا۔

علیہ نے مچلتے ہوئے اپنے ہاتھ کے لمبے ناخنوں سے اس جنونی کا چہرہ نوج ڈالا۔ جنونی کراہا اور اشتعال میں آ کر علیہ کے چہرے پر زوردار تھپھر رسید کر دیا۔ جنونی نے ہوس کی آگ بجھانے کے بعد اس نے خنجر کی نوک سے علیہ کے سینے پر چیر لگایا تو وہ ایک بار پھر چیخی اور تڑپ کر اسے اپنے اوپر سے دھکیل کر جان بچانے کے لئے کمرے میں ادھر ادھر بھاگنے لگی۔ وہ جنونی قاتل اس صورتحال سے بہت خوش تھا۔ اسے جو بے بسی کے اس کھیل میں لطف آ رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر ایک بار پھر علیہ کو دبوچا اور ہیڈ پرنٹ کر اسے بے بس کر کے خنجر کی نوک اس کے جسم پر نقش و نگار بنانے لگا۔ جیسے جیسے علیہ کی چھینیں بلند ہو رہی تھیں اور اس کے جسم سے بہنے والا خون اس کے قاتل کے جوش و خروش میں اضافہ کر رہا تھا۔

علیہ کا پورا جسم لہو بہان ہو چکا تھا۔ اخراج خون کے باعث اس پر اس قدر کمزوری غالب آ چکی تھی کہ اب اس میں چیخنے چلانے کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔ وہ بے بس پڑی

اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے اس درندے کو دیکھ رہی تھی جو خنجر کی نوک سے اس کے بے لباس جسم پر نقش و نگار بنا رہا تھا۔ علیہ کی مزاحمت ختم ہوتے ہی قاتل کا دل اس کھیل سے اکٹا گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے علیہ کے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور تیر دھار خنجر اس کے گلے پر پھیر دیا۔ پھر اس نے کسی ماہر قصاب کی طرح اطمینان سے علیہ کا سر دھڑ سے الگ کر دیا اور اس کا لٹکا ہوا سر تھیلے میں ڈال کر کسیرہ اٹھایا اور خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔

اس جنونی قاتل کے گھر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد پولیس موبائل کے ہوڑے سے فضا گونج اٹھی۔ علیہ کے چیخ و پکار کی آواز سن کر اس کے کسی پڑوسی نے پولیس ایمر جنسی کو فون کیا تھا۔ یہ بھی اس کی مہربانی تھی ورنہ ہمارا معاشرہ اس قدر بے حس ہو چکا ہے کہ ایک قاتل درجنوں افراد کے سامنے اطمینان سے کسی قاتل کر کے فرار ہو جاتا ہے اور ان درجنوں افراد کی ہمت نہیں ہوتی کہ اسے روکیں اور نہ ہی کوئی گواہی دینے کو تیار ہوتا ہے۔ اور پولیس جو کہ اصل مجرم کو گرفتار کرنے کے بجائے عام شہریوں کو ہراساں کرتی ہے۔

پولیس اس لرزہ خیز واردات کے آدھے گھنٹے بعد اپنی روایتی سستی سے پہنچ چکی تھی۔ سب انسپکٹر شاہد علی علیہ کے بغیر سر کی لاش دیکھتے ہی لرز اٹھا۔ ادھر قدر خان اور کلثوم اپنی گاڑی میں گھر کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ گیٹ پر پولیس اہلکاروں اور ایسیو پولیس کو کھڑا دیکھ کر ان کا دل اٹھانے خوف سے لرز اٹھا۔

”کیا ہوا؟ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟“ قدر نے دھڑکتے دل سے ایک پولیس کا ٹیشیل سے استفسار کیا۔ ”آپ کون؟“ پولیس کا ٹیشیل نے اسے گہری نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں قدر خان ہوں اور یہ میرا گھر ہے۔“ ”آپ کے کسی پڑوسی نے اطلاع دی تھی کہ اس گھر سے کسی لڑکی کے چیخنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ہم یہاں پہنچے تو اندر کسی نوجوان لڑکی کی عریاں سرکش لاش ملی ہے۔ اسے بہانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے،“ پولیس کا ٹیشیل کے جواب سے اسے ایسا لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر اس کے سر پر

آگرا ہو۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا بیڈ روم میں داخل ہوا۔ علیہ کی خونچکاں لاش دیکھتے ہی اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ جبکہ روٹی چلاتی کلثوم وہیں گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

دوسروں کی خبریں شائع کرنے والا خود ایک خبر بن گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے علیہ کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ پولیس اہلکاروں نے علیہ کا عریاں جسم ایک چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔ انسپٹر شاہد علی لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ علیہ کے ہاتھوں پر پڑی اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ علیہ کے لمبے لمبے ناخنوں میں گوشت کے ذرات اسے نظر آ چکے تھے۔ گویا مزاحمت کے دوران مقتول نے قاتل کو نوچا تھا۔

کچھ دیر بعد علیہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ کمرے سے فنگر پرنٹ کے نشانات اٹھائے گئے۔ قاتل کی شرٹ کا ایک پٹا ہوا ٹکڑا بھی کمرے سے ملتا تھا۔

انسپٹر ایک ذہین پولیس افسر تھا۔ اس نے بوگیر کتے کی مدد سے قاتل تک پہنچنا چاہا۔ قاتل کے لباس کا ٹکڑا سوچتے ہی کتا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بھونکنے لگا۔ وہ کتے کی زنجیر تھامے مقتول کے گھر سے باہر نکلا۔ کتے کی زنجیر شاہد علی کے ہاتھ میں تھی اور کتا بھونکتے ہوئے ایک سمت بھاگ رہا تھا۔

قدیر خان پولیس اہلکاروں کے ہمراہ پولیس موبائل میں موجود تھا۔ ان کے پیچھے میڈیا کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی تھے۔ ان کا یہ سفر کچھ دیر بعد ایک گھر کے سامنے اختتام پذیر ہوا۔ کتے کو اس گھر کے دروازے پر رک کر بھونکتے دیکھ کر انسپٹر بھونکا رہ گیا۔ ”تو یہ SHO صاحب کا گھر ہے۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

دیگر پولیس اہلکار قدیر خان اور پریس رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی اپنی گاڑیوں سے اتر چکے تھے۔ ڈورنیل نیچے ہی دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا ادھیڑ عمر گھریلو ملازم تھا۔ اس نے تعجب سے پولیس اہلکاروں اور پریس رپورٹرز کو دیکھا۔ غالباً اس کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ پولیس نے ایس

ایچ او کا گھر کیوں گھیرے میں لے رکھا ہے۔

”انور صاحب کہاں ہیں۔“ انسپٹر نے پوچھا۔ ”بیگم صاحبہ کی طبیعت اچانک خراب ہوئی تھی۔ صاحب کچھ دیر پہلے انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔“ ملازم نے جواب دیا۔

ادھر کتابے قاری سے گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کتے سمیت انسپٹر گھر میں داخل ہوا، دیگر افراد بھی اس کے پیچھے اندر آ چکے تھے۔ کتا مکان کی عقبی سمت جا پہنچا۔ وہاں ڈانکے کا پوٹیفارم بڑا تھا۔ جس کی شرٹ آستین سے پھٹی ہوئی تھی۔ پریس فوٹو گرافر تصویریں کھینچنے لگے۔ انسپٹر نے اعلیٰ افسران کو اطلاع دینے کے بعد ایس ایچ او انور علی کا نمبر ملایا۔

”ہاں شاہد علی کیا بات ہے؟“ دوسری طرف سے SHO کی آواز سنائی دی۔ ”سر ہمارے علاقے میں ایک لڑکی کا لرزہ خیز قتل ہوا ہے۔ مقتولہ مشہور صحافی قدیر خان کی اکلونی بیٹی ہے۔ وہاں ہمیں قاتل کے لباس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ملا۔ ہم نے بوگیر کتے کی مدد سے حاصل کی، کتا ہمیں آپ کے گھر تک لے آیا ہے۔ آپ کے گھر کی عقبی سمت سے قاتل کا لباس بھی ملا ہے۔“ انسپٹر سرد لہجے میں بولا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ ہم میں ابھی آتا ہوں۔“ SHO کی گھبراہٹی ہوئی آواز سنائی دی اور اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ کچھ دیر بعد SHO انور علی ان کے سامنے تھا جبکہ انسپٹر شاہد علی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایس ایچ او کے چہرے پر ناخنوں کے نشان موجود تھے۔

☆.....☆.....☆

شام کا وقت تھا اور موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ بادلوں کے ٹکڑوں نے مدھم چاندنی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ایسے خوشگوار موسم میں تیس سالہ آسیہ وسیع عریض شاندار حویلی کی چھت پر موجود منڈیر پر اپنے دونوں ہاتھ جمائے کھڑی تھی۔ وہ سردار سکندر میرانی کی سب سے بڑی بیٹی اور غیر شادی شدہ تھی۔ سردار سکندر اس دیہی علاقے کا مالک دولت مند اور بااثر شخص تھا۔ اس کے دو بیٹے نوید اور آفتاب جبکہ تین بیٹیاں آسیہ، فوزیہ اور سمن تھیں۔ سمن ان سب سے چھوٹی

تھی۔ ایک روز اسے بخار چڑھا اور مناسب دیکھ بھال اور علاج نہ ہونے کے باعث اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ اس پسماندہ علاقے کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

یہاں عورت کو بھڑکری سے بھی کستر سمجھا جاتا تھا۔ یہاں بہت سی فرسودہ اور جاہلانہ رسومات پر عمل کیا جاتا تھا۔ نوید میرانی نے شہر سے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ دل بھر جانے کے بعد شادی کے ایک سال بعد ہی اسے کاری قرار دے کر قتل کر ڈالا۔ اس سے اسے دہرا فائدہ ہوا۔ ایک تو بیوی سے نجات مل گئی۔ دوسرا اپنے ایک مخالف مراد کو کالا قرار دے کر مار ڈالا۔

ان باپ بیٹوں کے نزدیک غریب کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر تھے۔ شہر میں بھی ان کی شاندار کوٹھی تھی جس میں وہ باپ بیٹا آکر عیاشی کے لئے کچھ دن قیام کر کے اپنے علاقے میں لوٹ آتے تھے۔

آسیہ کی عمر 30 سال ہونے کے باوجود اس کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ اس کی شادی نہ ہونے کا یہ سبب نہ تھا کہ اس کے لئے کوئی رشتہ نہیں آیا۔ کئی معزز گھرانوں کے خوب صورت لڑکوں کے رشتے اس کے جوان ہوتے ہی آنے لگے تھے۔ لیکن اس کا باپ اور بھائی نہیں چاہتے تھے کہ وہ زمین و جانیدار کا ایک حصہ لے کر پرانے گھر چلی جائے۔ اس لئے اس کی شادی عجیب و غریب رواج کے سبب قرآن سے کر کے اسے گھر پر بٹھا رکھا تھا۔ قرآن آخری مقدس کتاب ہے، لیکن بعض لوگ قرآن پاک کو بھی اپنی بے جا ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اس حویلی کی چار دیواری میں روتے روتے آسیہ کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ کوئی اس کے دکھ کا مداوا کرنے والا نہ تھا۔ جذبات کے کوڑے کھا کھا کر وہ ہسٹریا کی مریض بن چکی تھی۔ احتجاج پر باپ اور بھائیوں نے کئی بار وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ عورت کو وہ پاؤں کی جوتی بچھتے تھے، وہ اپنی اس زندگی سے تنگ آ چکی تھی اور خودکشی کی نیت سے حویلی کی چھت پر موجود تھی۔ اسی وقت حویلی کے ایک کمرے سے اس کی بہن فوزیہ اور ماں باہر نکلیں اور ان کی نظر چھت پر موجود آسیہ پر پڑی۔ ”باجی نیچے آ جاؤ بابا

جان نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔“ فوزیہ نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

آسیہ کوئی جواب دیئے بغیر منڈیر پر چاچھی اور بلندو بالا حویلی کی چھت سے نیچے کود گئی۔ فضا اس کی آخری کرناک چیخ سے گونج اٹھی تھی۔

فوزیہ اور اس کی ماں جیتنی ہوئی اس کی خونچکاں لاش کے قریب جا پہنچیں۔

”کیوں چیخ رہی ہو؟“ سردار سکندر اور اس کے بیٹے چیخوں کی آواز سن کر اپنے اپنے کمروں سے باہر آچکے تھے۔ اور ناگوار نظروں سے ان ماں بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ جو آسیہ کی لاش سے لپٹی بین کر رہی تھیں۔ ”باجی نے چھت سے کود کر خودکشی کر لی ہے۔“ فوزیہ روتے ہوئے بولی۔

”نوید اس کی لاش خاموشی سے دفن دو۔“ سردار سکندر نے حکم صادر کیا اور رات کی تاریکی میں اس کے کارندوں نے بنا کفن دفن کے حویلی کے تہہ خانے میں فرش کھود کر اسے کسی جانور کی طرح گڑھے میں ڈال دیا گیا۔ یہ تہہ خانہ حویلی کا زندان تھا۔ جہاں ان کے مخالف اور نا فرمان افراد کو قید کر کے اذیتیں دے کر ہلاک کیا جاتا۔ یہاں ایسی ہی نہ جانے کتنی ظالمانہ اقدس پر فوزیہ اور اس کی ماں احتجاج بھی نہ کر سکیں، وہ جانتی تھیں کہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی پاداش میں انہیں بھی زندگی سے محروم کر دیا جائے گا۔

آسیہ کی موت کو چھ ماہ بیت چکے تھے، ارد گرد کے گاؤں دیہاتوں سے ان کے ہم پلہ گھرانوں سے فوزیہ کے لئے رشتے آنے لگے تھے۔ سکندر نے آنے والے رشتوں سے جان چھڑانے کے لئے اس کی شادی بھی قرآن پاک سے کر دی۔

فوزیہ کے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ گویا اسے بھی تہا جذبات کی آگ میں جلتے ہوئے زندگی گزارنی تھی یا پھر اپنی بہن کی طرح ہسٹریا کا شکار ہو کر خودکشی کر لیتی اور اسے بھی زندان میں دفن کر دیا جاتا۔

اپنے باپ سکندر کے ظالمانہ اور جاہلانہ رسم و رواج کے خلاف اس کے دل میں بغاوت جنم لینے لگی۔ اسی بغاوت کو عملہ جامہ پہنانے کے لئے اس کی نگاہ انتخاب

ماں

☆ ماں کی قدر وہ جانتا ہے جو اس سے محروم ہے۔

☆ ماں ایک خوشبو ہے جس سے یہ جہاں مہک اٹھتا ہے۔

☆ ماں ایک دعا ہے جو ہمیشہ سر پر تھی رہتی ہے۔

☆ ماں ایک آہ ہے جو سیدھی عرش پر جاتی ہے۔

☆ ماں دنیا میں جنت ہے اور آخرت میں بھی۔

☆ ماں اگر عورت کے روپ میں آ جائے تو بتائی ہو جاتی ہے۔

☆ ماں ایک ایسی ہستی ہے جو خود کیلئے پرسوتی ہے اور بچے کو سونے پر سلاتی ہے۔

(محمد عمران - کراچی)

”محمد میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟“ فوزیہ نے اس کی براؤن آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

”کک..... کیا..... مطلب؟“ وہ گھبراہٹ سے

جہمیں کیسی لگتی ہوں۔“

”بی بی سائیں آپ مالک ہیں اور مالک غلام کو اپنی جان سے بھی عزیز ہوتا ہے۔“ وہ بدستور نظریں جھکائے

ہوئے بولا۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اپنی آقا زادی سے نظریں ملاتا۔ اس کے علاوہ اسے سردار سکندر کا بھی ڈر

تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سردار کے بیٹوں یا خود سردار کے کانوں میں اس بات کی بھنگ بھی پڑ گئی کہ محمود نے فوزیہ سے بات

چیت کی تھی تو اسے زندہ زمین میں گاڑ دیا جائے گا۔

”محمود میرا باپ ظالم اور بے رحم انسان ہے۔ باقی آپ کے بعد مجھے بھی زندہ درگور کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس

خونی زندان سے نکال کر دروہیں لے جاؤ۔“ وہ دلیرانہ لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”خدا آپ دروہیں مت۔“ اس کا دل بچ گیا۔

”تو پھر میں آج رات کو تمہارے کمرے میں آؤں

حویلی کے ملازم محمود پر پڑی جو سردار سکندر کے جانثاروں میں سے ایک تھا۔ قبول صورت اور چہرے پر بدن کا مالک محمود کم گو شخص تھا۔ حویلی کے گھر پہلو کام کاج کے علاوہ وہ سردار کے محافظ دستے میں بھی شامل تھا۔

اس کی ماں رضیہ گاؤں کی خوب صورت ترین لڑکی تھی، یہ ان دنوں کی بات ہے جب سکندر نو جوان ہوا کرتا تھا اور تعلیم کے سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا۔ گاؤں آنے پر رضیہ پر نظر پڑی تو دل تھام کر رہ گیا۔ اس نے ایک روز سہرا روک کر اپنا مدعا بیان کیا۔ رضیہ ایک باکردار عورت تھی جس نے اسے جھڑک دیا۔ وہ شہر چلا گیا۔ جب واپس لوٹا تو رضیہ کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ایک بیٹے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے حسن و جمال میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

سکندر نے ایک بار پھر اس کا راستہ روک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ رضیہ نے سب کے سامنے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ان دنوں سکندر کا باپ زندہ تھا۔ جو اخلاق اور کردار کے حوالے سے بہترین انسان تھا۔ اس نے سکندر کو ڈانٹا کہ آئندہ کسی کی بہن بیٹی کی طرف بری نظر سے نہ دیکھے، پھر سکندر کی شادی ہو گئی۔

دو سال بعد ہی سکندر کا باپ دنیا سے کوچ کر گیا۔ سیاہ و سفید کا مالک ہوتے ہی اس نے محمود کے باپ کو قتل کر دیا اور رضیہ کو زبردستی اٹھا کر حویلی میں لے آیا۔

عورت کی عزت ہی اس کا سب کچھ ہوئی ہے۔ رضیہ یہ بے عزتی برداشت نہ کر پائی۔ اور خودکشی کر لی۔ ان دنوں محمود چار سال کا تھا۔ سکندر اسے حویلی میں لے آیا۔ اور اپنا غلام بنالیا۔ وہ سکندر کے زیر سایہ پل کر جوان ہوا۔ اسے اہلیت کا علم نہیں تھا۔ وہ سکندر کو اپنا محسن سمجھتا تھا۔ جس نے ایک یتیم بچے کی پرورش کی، لڑائی بھڑائی اور اسلحے کو استعمال کرنے کی ٹریننگ دینے کے بعد اسے سکندر کے محافظ دستے میں شامل کر لیا گیا۔ وہ حویلی کا خدمت گزار بھی تھا۔

محمود کو فوزیہ نے ایک روز راہداری میں گھیرا، یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ محمود شہنشاہ گیا۔

”جی بی بی سائیں۔“

گی میرا انتظار کرتا۔“ فوزیہ نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

محمود کی الجھن دو چند ہو گئی۔ اس کا کمرہ حویلی کی عقبی سمت میں تھا۔ وہ رات کو دیر سے اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ گیا، کمرے میں دیر سے آنے کا مقصد یہ تھا کہ فوزیہ کیس جیج مونیج پا کر اس سے ملنے نہ پہنچ جائے۔

اگر سردار سکندر کو اس بات کا علم ہو جاتا تو اسے بے دردی سے قتل کر دیا جاتا۔ یہ بات بھی سچ تھی کہ فوزیہ اسے اچھی لگتی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فوزیہ اس چاند کی طرح ہے جو آسمان کی بلندیوں پر ہے اور اس کی دسترس سے باہر ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جب چاند ہی اس کی گود میں خود مگر نہ چاہتا ہو۔

نصف شب کے بعد کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا۔ دروازے پر فوزیہ ایستادہ تھی۔ وہ دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہوئی اور دروازہ بھینٹ دیا۔ ”بی بی سائیں، رات کے اس پہر یہاں آ کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اگر بڑے صاحب کو اس بات کا علم ہو گیا تو ہم دونوں جان سے جائیں گے۔“ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

”مجھے بی بی سائیں مت کہو نام سے پکارو۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ اور مجھے موت کا بھی ڈر نہیں، روز روز مرنے سے بہتر ہے۔ انسان ایک بار ہی مر جائے۔“ وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ اس کے بدن سے انھنے والی دھیمی آغج محمود کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے لگی۔

”فوزیہ یہ سب باتیں فلموں اور کہانیوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ حقیقت میں پیار کی جیت مشکل ہے۔ آج تک جتنے بھی پریمی گزرے ہیں سب بے چارے عشق کے چکر میں مارے گئے۔“ محمود کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔ فلموں اور کہانیوں میں بھی وہی کچھ لکھا ہوتا ہے۔ جو اس معاشرے میں ہوتا ہے اور کہانیاں لکھنے والوں کے سینے میں بھی ننھا سا دل دھڑکتا ہے وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔

فوزیہ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور محمود کا دایاں ہاتھ تمام لیا۔ اس کی نرم گداز پھیلی کے لمس سے محمود کے بدن میں چوہنیاں سی رینگ گئیں۔ وہ اس قیامت آہنیں شب کی تمام تر جولانیوں میں کم ہو کر اس کے اور اپنے درمیان معاشرتی فرق کو یکسر فراموش کر بیٹھا۔ ویسے بھی اس کے کنارے جسم کی بھین بھینی محسوس کن خوشبو کے ہالے میں گم اس کا اپسرا لہجہ و جداس کے ہوش و حواس چھین چکا تھا۔

محمود نے بے اختیار فوزیہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ فوزیہ کے گداز جسم کی آغج محمود کو بے قابو کر چکی تھی۔ اس نے اپنے نقشہ لبوں کو فوزیہ کے گالوں سے لگا دیا۔ سرور کی ایک سر پھری لہر اس کے بدن میں سرایت کر گئی۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے اپنے لب اس کے گال سے ہٹائے اور فوزیہ کے چاند چہرے کو دیکھا۔ وہ شرماتی لپاتی ہوئی نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ محمود نے اپنی ہانہوں کا کھیرا حیدر تنگ کرتے ہوئے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔

ادھر فوزیہ اپنی ممر میں آہنیں اس کے گلے میں حائل کر چکی تھی۔ محمود نے اس کا ہنر کلپ کھول دیا۔ اس کی زلفیں کھیر کر محمود کے چہرے پر سایہ فگن ہو گئیں اور اس کی سانسوں کی پیش بڑھ گئی۔

محمود نے اپنے جلتے بجھتے ہونٹ اس کے لبوں پر رکھے ہی تھے کہ فوزیہ بڑنی اور اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑا کر چار پائی پر گر پڑا۔ ”ایک تو تم مردوں میں یہ عادت بڑی خراب ہے، گلائی تھاتے ہی گلے کا ہار بن جاتے ہو۔“

وہ ہنسی مکر محمود کچھ کہنے یا سننے کے قابل کہاں تھا۔ اس پر فوزیہ کے حسن کا جادو چل چکا تھا۔ وہ اپنی نشلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی سرسرا رہی تھی۔ چہرے پر آس اور امید کے کئی رنگ بھللا رہے تھے۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ اسے دیکھنے کے بعد کوئی دوسرا چہرہ دل کو نہیں بھاتا تھا۔ محمود کو اپنی قسمت پر رشک ہونے لگا۔ وہ اٹھا اور اسے اپنے پاس بیٹھا کر دیکھنے لگا۔ ”محمود مجھے اس زندان سے رہائی دلا دو۔“ اس نے ملتانہ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے کل رات ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

وہ اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے بولا۔ وہ کچھ دیر تک پیار بھری باتیں کرتے رہے۔ پھر فوزیہ اس سے رخصت ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے روز نصف شب کے قریب وہ اس کے کمرے میں پہنچی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اپنی کیس تھا۔ جس میں اس کے چند کپڑے تھے۔ حویلی کے مکین بخوشی سو رہے تھے۔ وہ فوزیہ کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر نکلا اور کوریڈور میں چلنے لگا۔ وہ دونوں ہی اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ اگر حویلی کے کسی مکین نے انہیں دیکھ لیا تو ان کا زندہ بچنا محال ہوگا۔ ابھی وہ فوزیہ کا ہاتھ تھامے احاطے میں پہنچا ہی تھا کہ جہاں تھا وہیں گھبرا گیا۔ اس کے سامنے حویلی کا پہرے دار جاوید موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں بارہ پور کی رائفل موجود تھی۔

”ذلیل انسان تم حویلی کی ناموس پر ہاتھ ڈال کر زندہ یہاں سے نہیں جاسکو گے۔“ وہ سانپ کی طرح پھٹکارا، محمود نے برقی سرعت سے اپنے دائیں پاؤں کی اپر پام اس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں ماری وہ اورغ کی آواز نکالتا ہوا رکوع کے بل جھکا۔ محمود کے گھٹنے کا بھرپور وار اس کے چہرے پر پڑا۔ جاوید کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ الٹ کر پشت کے بل گر گیا۔ محمود نے جھپٹ کر اس کے ہاتھوں سے گرنے والی رائفل اٹھائی اور رائفل کے دسٹے کا بھرپور وار جاوید کے سر پر کیا۔ جاوید کی آخری چیخ بلند اور لرزہ خیز تھی۔

محمود جانتا تھا کہ جاوید کی چیخوں کی آواز سن کر حویلی کے مکین جاگ چکے ہوں گے اور مسلح پہرے دار چوکنے ہو چکے ہوں گے۔ بڑے جان گسل لمحات تھے۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے حویلی کے احاطے میں بنے اسٹبل میں داخل ہوئے۔ محمود نے کالے رنگ کا ایک خون منڈ گھوڑا کھولا اور فوزیہ کو بٹھا کر خود بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اسے حویلی کے مین گیٹ کی طرف دوڑا دیا۔ سامنے سے دو رائفل بردار دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ محمود نے رائفل سیدھی کی اور ٹیکر دبا دیا۔ بارہ پور کے کارٹوس کے چہرے ایک

رائفل بردار کے سینے میں اور دوسرے کے چہرے پر لگے۔ وہ چیختے ہوئے بہنم رسید ہو گئے۔

گھوڑا حویلی کے گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ یہاں بھی ایک رائفل بردار موجود تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی محمود کے شانے کو چھوئی ہوئی گزری۔ اس نے جوابی فائر کیا، گولی رائفل بردار کی پیشانی میں لگی اور وہ کٹے ہوئے مہیتر کی طرح گر گیا۔ محمود نے گھوڑے سے چھلانگ لگا کر چھانک نما گیٹ کھولا اور دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر اسے سر پٹ دوڑا دیا۔

فائرنگ اور چیخوں کی آوازیوں نے حویلی میں ہلچل مچادی تھی۔ لائسنس آن ہو چکی تھیں اور لٹکارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے حویلی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک اسے عقب میں کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے آنے والی جیپ تھی جس پر سات آٹھ افراد سوار تھے ان میں سے کچھ جیپ پر کھڑے تھے۔ جیپ سے آگے چار پانچ کتے بھونکتے ہوئے آ رہے تھے۔ محمود نے ایک ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھامی اور دوسرے ہاتھ سے فائر کیا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ ان کے پیچھے آنے والے سردار سکندر کے کارندے جان جائیں کہ اس کے پاس بھی ہتھیار موجود ہیں۔ اس ہوائی فائر کے جواب میں ان پراسٹریٹ فائرنگ کی گئی۔ محمود نے گھوڑے کو لہرا کر خود کو چھاپا یا اب گھوڑا ازگم زیگ انداز میں دوڑ رہا تھا۔ اس کے بعد بھی ان پر لگاتار کئی فائر ہوئے۔

بڑی اعصاب شکن صورتحال تھی۔ فوزیہ کے لئے تو یہ صورتحال بالکل ان دیکھی اور وحشت ناک تھی۔ اس کا تو جیسے سانس رکا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے گھوڑے کی گردن سے چپکی ہوئی تھی۔ محمود نے ایک بار پھر مڑ کر جیپ کی طرف فائر کیا، خوش قسمتی سے اس کا نشانہ کامیاب رہا اور دھماکے سے جیپ کا اگلا نازر برست ہو گیا اور جیپ لہرائی ہوئی ایک درخت سے ٹکرائی، وہ گھوڑے کو اوپر نیچے راستوں پر بھگا تا چلا جا رہا تھا۔

بدقسمتی سے موسم کے تیور بھی بدل چکے تھے۔ بارش تو

اچانک دوڑتے دوڑتے فوزیہ چیختی ہوئی گر گئی۔ محمود نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ وہ درد کی شدت سے کراہ رہی تھی۔ ”محمود اب مجھ سے بھاگا نہیں جائے گا۔“ وہ ایک درخت کے تنے سے ٹپک لگا کر بیٹھ گئی۔ محمود نے اس کے پاؤں کا معائنہ کیا، خوش قسمتی سے کوئی گہری چوٹ نہ تھی۔ چند لمحے پاؤں کو مسلنے سے وہ چلنے کے قابل ہو گئی۔ وہ دوبارہ آگے بڑھ گئے۔

اچانک ایک فائر ہوا۔ اور ایک گرجدار آواز سنائی۔ ”رک جاؤ۔“

محمود بولنے والے کولب دلچسپ سے پہچان چکا تھا۔ یہ سردار سکندر کا خاص کارندہ سہراب تھا۔ اب رکنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے فوزیہ کو جھاز یوں کے جھنڈ میں بیٹھایا اور اسے خاموشی سے وہیں چھپے رہنے کی تاکید کر کے خود ایک اونچے گھنے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دشمن خود کار ہتھیاروں سے لیس تھے جبکہ وہ خالی ہاتھ تھا۔ پنڈلی سے فقط ایک خنجر بندھا تھا۔ کچھ دیر بعد تارچ کی روشنی دکھائی دی۔ یہ ایک تومند شخص تھا۔ جواہل ایم جی مگن اٹھائے اسی درخت کے نیچے سے گزرنے لگا۔ جس کی شاخ پر محمود براجمان تھا۔ اس نے جھلانگ لگائی اور اس کی پشت پر پہنچ کر اسے ہینڈ لاک میں جکڑ لیا۔ اس کا ایک ہاتھ دشمن کے منہ پر تھا۔ پھر اس نے زوردار جھک دیا۔ کڑاک کی آواز ابھری اور تومند شخص مردہ جھپکی کی طرح زمین پر گر پڑا۔

محمود اس کی ایل ایم جی مگن اٹھا کر قریبی درخت کی آڑ میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد چند افراد کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی تارچوں کی روشنی بھی دکھائی دی۔ یہ سہراب کے ساتھی تھے پھر انہوں نے اپنے ساتھی کی لاش دیکھ لی۔ ”یہ ہمارے سکھائے ہوئے داؤ پیچ ہم پر ہی الٹ رہا ہے۔“ ان میں سے ایک حیرت سے بولا، اب وہ چوکنے ہو چکے تھے۔

اگلے لمحات اس جنگل میں تہلکہ خیز تھے۔ دونوں اطراف سے ایک دوسرے پر فائر کئے گئے۔ کم از کم چار افراد محمود کی ایل ایم جی مگن کی گولیوں کا شکار ہو چکے تھے۔

نہیں ہوئی لیکن بادلوں کے گر جنے کی آواز اور کبھی کبھار بجلی کے جھپکنے سے قرب و جوار روشن ہو جاتے۔ اور پھر گہری تاریکی چھا جاتی، محمود کو ڈرتا کہ اندھیرے میں کہیں گھوڑا ٹھوکر لگ جانے کے باعث نہ گر جائے ایسی صورت حال میں وہ دونوں بھی زخمی ہو سکتے تھے۔ اس گہری تاریکی میں کبھی کبھار اسے اپنے پیچھے دور سے روشنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ جو جھنڈ کی طرح تھی، غالباً یہ سردار سکندر کے کارندے تھے۔ جو موت کے ہر کاروں کی طرح ان کے پیچھے تھے۔ کچھ دیر بعد گرج چمک کے ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی۔

محمود گھوڑا دوڑاتے ہوئے فوزیہ کے گداز وجود کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس کے جسم کی محور کن مہک اس کے رگ و جان میں اتر رہی تھی۔

”ہم کہاں جائیں گے؟“ فوزیہ سننائی۔ اس کی آواز واضح طور پر خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ان کے پیچھے لپکنے والی روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ فوزیہ بھی اس صورت حال کو بھانپ کر ہراساں ہو چکی تھی۔

ایک جگہ گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ دونوں گرتے چلے گئے۔ خوش قسمتی سے وہ دونوں خود رو جھاز یوں میں گرے تھے اس لئے انہیں کوئی گہری چوٹ نہیں لگی تھی۔ فوزیہ گرتے وقت بے اختیار چیخ بڑی تھی، مگر نے کی وجہ سے رائل محمود کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی، زخمی گھوڑا ایک طرف بڑا ہنہار ہا تھا۔ یہ بھی ان کی خوش قسمتی تھی کہ گرتے وقت وہ گھوڑے تلے آ کر نہیں دب گئے تھے۔ خود رو جھاز یوں میں گرنے کی وجہ سے معمولی چوٹیں آئی تھیں، گھوڑا سواری کے قابل نہیں رہا تھا۔ رائل نہ جانے کہاں گری تھی، اندھیرے میں ڈھونڈنے کے باوجود نہیں ملی۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بھاگنے لگے۔ اب وہ جنگل کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔

فوزیہ بھاگنے کے سبب ہانپ رہی تھی۔ اس کی سانسوں کی لے بھی تیز تھی۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے چند لمحوں کے لئے آرام کیا۔ اور پھر دوڑنے لگے۔ ان کے کپڑے بارش کے باعث بری طرح بھگ چکے تھے،

محمود واپس پلٹا اور کن اٹھا کر شانے سے لٹکا کر فوزیہ کے قریب جا پہنچا۔
 ”تم تم ٹھیک تو ہو۔“ اس کے خون آلود کپڑے دیکھ کر فوزیہ گھبرا گئی۔

”مجھے کچھ نہیں ہوا، ہمیں جلد از جلد یہاں سے لٹکانا ہوگا۔ سردار کے دیگر کارندے بھی ہمارے پیچھے ہوں گے، وہ بوگیر کتوں کی مدد سے ہمیں کھوج لیں گے۔“ محمود نے کہا اور اس کا ہاتھ تمام کرتیزی سے چلنے لگا وہ بنا رکے چلتے رہے۔

رات کے آخری پہرہ اس جنگل سے متصل پہاڑی علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ ٹھکانے سے ان کا برا حال تھا۔ لیکن وہ بغیر کے اس مختصر سی پلٹڈی پر چل رہے تھے کہ اچانک کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر مڑے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا وہ جتوئیں اسی طرف آ رہی تھیں۔ ان کے آگے بھاگتے ہوئے بوگیر کتے تھے جو شور مچاتے ہوئے انہی کی طرف آ رہے تھے۔ ان دونوں نے اپنی رفتار تیز کر لی لیکن پستی سے بلندی کا سفر دشوار تھا جبکہ موت کے کارندے پہاڑ تک پہنچ چکے تھے۔ یہ تعداد میں چھ سات افراد تھے۔ ان کے ساتھ سردار سکندر اور اس کے بیٹے بھی تھے۔ وہ خاصی اونچی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ چکے تھے۔

اسی وقت فائر ہوا گولی محمود کے شانے کو چھوئی ہوئی گزری، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی قریب آتی جا رہی تھیں۔ ان پر اکا دکا فائر بھی کئے جا رہے تھے، بڑے سنگین لمحات تھے۔ وہ کسی بھی وقت ان برسی گولیوں کا شکار ہو سکتے تھے۔

بلآخر ایک گولی محمود کی ٹانگ میں لگی تو وہ چیخا ہوا اگرا، فوزیہ بھی چلائی، بوگیر کتے بھی ان تک پہنچ چکے تھے جو غراتے ہوئے محمود پر حملہ آور ہو گئے۔

سردار سکندر اس کے بیٹے اور ان کے کارندے اس کا گھبرا کر چکے تھے، ان کے چاروں طرف موت تھی۔ جس راستے سے وہ آئے تھے وہاں سے واپس پلٹنا ناممکن تھا۔ جبکہ پہاڑی دوسری سمت تیز رفتار دریا بہہ رہا تھا۔ محمود زخمی تھا اور کتے کی طرح اسے ہنبھوڑ رہے تھے۔ سہراب

نے سکندر کے اشارے پر مخصوص انداز میں سیٹی بجائی اور کتے محمود سے الگ ہو کر کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ محمود لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور فوزیہ کا ہاتھ تمام لیا۔ بری طرح گھما ل سکندر ان کے گھبرے میں تھا۔ سردار سکندر کے ہاتھوں میں وہ خنجر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ جس سے محمود نے اس کے کارندوں کو جنم رسید کیا تھا۔

”گندی ٹالی کے کیڑے تیرے جرموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ تو نے ہمارا سکھایا ہوا سبق میرے ہی کارندوں پر آزمایا، میرے بہت سے آدمی مارے ہو، جلی کی عزت پر ہاتھ ڈالا، میں تیری لاش کو قبر تک نصیب نہیں ہونے دوں گا۔ برسوں پہلے تمہارے باپ کو بھی میں نے تڑپا تڑپا کر مارتا تھا۔ تمہاری ماں کی عزت بھی میں نے ہی خراب کی تھی۔“ سردار سکندر کے الفاظ نے اسے سکندہ زدہ کر دیا تھا۔ اسی لمحے سکندر نے آگے بڑھ کر اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا۔ محمود کرناک انداز میں چیخا۔

”بابا جانی اسے مت ماریں۔“ فوزیہ چلائی نوید نے تھپڑ رسید کرتے ہوئے فوزیہ کو اپنی طرف کھینچا۔ ادھر سردار سکندر نے لڑکھڑاتے ہوئے محمود کے سینے پر زوردار فرنٹ لک۔ رسید کی تو وہ چیخا ہوا بلند بالا پہاڑ سے نیچے گرتا چلا گیا۔ اور پھر فوزیہ کو جوبلی کے تہہ خانے میں واقع زندان میں قید کر دیا گیا تھا۔

محمود والے حادثے کو چار پانچ ماہ بیت چکے تھے۔ وہ ہر وقت گم سم سی رہتی تھی۔ وہ بدن لاغر ہوتی جا رہی تھی، اسے شب نہیں یقین تھا کہ اسے سلو پوائزن دیا جا رہا ہے۔ یہ سلو پوائزن اس مکانے میں شامل کیا جاتا تھا جو تینوں وقت پابندی سے اس زندان میں جوبلی کی ملازمہ لے کر آتی تھی۔ آسیر کی خودکشی کے بعد فوزیہ کا ایک دم مارا جانا۔ سردار سکندر کو سب کی نظروں میں لاسکتا تھا۔

آج آئیس دسمبر کی رات تھی۔ 31 دسمبر کو آسیر نے اپنے باپ اور بھائیوں کے مظالم سے تنگ آ کر خودکشی کی تھی۔ نصف شب کے قریب جوبلی لڑزہ خیز چیخوں سے اچانک گونج اٹھی۔ چیخوں کی یہ آواز سوانی تھی۔

کی طرف جانے کے لئے دیوار کے ساتھ چلتا ہوا، بھاری بھرکم الماری کے قریب سے گزرنے لگا۔ آسیہ نے فلک شکاف چچ ماری بھاری بھرکم الماری خود بخود آفتاب کے اوپر جاگری، اور پھر آسیہ کے ہاتھ نے لمبا ہو کر آفتاب کو جکڑ لیا پھر آفتاب اوپر ہوا میں ملحق ہو گیا کہ اچانک وہ نیچے فرش پر اوندھے منہ گرا اور اتنے میں اس کے ساتھ ہی آسیہ غائب ہو گئی اور چیخوں کی آواز ختم ہو گئی۔

ماحول پر سکوت چھا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد حویلی کی لائش آن ہوئیں۔ سردار سکندر، اس کی بیوی اور نوید اپنے کمروں سے باہر نکل کر کوریڈور میں آ گئے، حویلی کے پہرے دار بھی پہنچ چکے تھے۔ کوریڈور میں دو پہرے داروں کی لائشیں پڑی تھیں۔

جن کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

وہ آفتاب کے کمرے سے بھاری بھرکم الماری کے گرنے اور آسیہ کی چیخوں کی آواز سن چکے تھے۔ سکندر نے آفتاب کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ جب کافی دیر تک دستک دینے کے باوجود دروازہ نہ کھلا تو مسلح پہرے داروں نے اس کے حکم پر کمرے کا دروازہ توڑ دیا۔

اندک اندک منظر خوفناک اور دل خراش تھا۔ آفتاب کی سبکی ہوئی لاش بھاری بھرکم الماری تلے دبی ہوئی تھی۔ اس کی ماں یہ منظر دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی، سکندر پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی، اس کا جوان بیٹا، روح کے انتقام کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ آفتاب کو خاندانی قبرستان میں دفنایا گیا۔

ظلم اور دہشت کا نشان سکندر آسیہ کی روح سے خوفزدہ تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں آفتاب کے بعد آسیہ کی روح اسے بھی اپنے انتقام کا نشانہ نہ بنائے۔

وہ سہراب کے مشورے سے گاؤں کی مسجد کے پیش امام بشیر چانڈیو کے پاس جا پہنچا۔ وہ پرہیزگار اور دین دار شخص تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ راجوں کے حضرات کا علم بھی جانتے ہیں وہ گاؤں کے دھمی لوگوں کا بلا معاوضہ روحانی علاج کرتے تھے۔

سردار سکندر اور اس کے بیٹے بھی چیخوں کی آواز سن کر بیدار ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے کمروں کے دروازے کھولے اور شدھرہ گئے۔ خوف اور دہشت سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کوریڈور میں آسیہ خون میں لت پت کھڑی تھی۔ اس کا سراہی طرح چٹخا ہوا تھا۔ جس طرح سال پہلے چھت سے کودنے کے بعد اس کا سر چٹخا تھا۔ اس کی شکل وحدت کافی، بھیا نک دکھائی دے رہی تھی۔ آسیہ کو دیکھ کر اپنے کمروں میں جا گئے اور دروازے اندر سے لاک کر دیئے، آسیہ مسلسل چیخ رہی تھی، چیخوں کی آواز سن کر دو راقفل بردار محافظ بھی وہاں آ گئے، آسیہ کو دیکھ کر وہ ڈر اور خوف سے لرزنے لگے، انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گولیاں بھی چلائیں لیکن یہ گولیاں بے اثر رہیں۔

آسیہ چیختی ہوئی دونوں ہاتھ پھیلائے ان کی طرف بڑھی تو وہ دونوں خوف کے مارے اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ وہ جیسے ہی ان کے قریب پہنچی، دونوں راقفل بردار لہرا کر کوریڈور میں گرے اور بے حس و حرکت ہو گئے۔ اب آسیہ کی روح چیختی چلاتی ہوئی کمروں کے دروازے بج رہی تھی۔ اس گھمبیر اور خوفناک صورتحال میں حویلی کے مکین اپنی اپنی جگہ خوف سے دبکے ہوئے تھے۔ سردار سکندر تو اس قدر سہما ہوا تھا کہ اپنے بیٹے کے نیچے جا چھپا تھا۔ خوف و ڈر سے ہر قطر کا بربہا تھا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ آسیہ کی روح کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ڈر اور خوف سے اس کی حرکت قلب بند ہو جائے گی۔

آسیہ اب آفتاب کے کمرے کے دروازے پر جا پہنچی تھی۔ آفتاب بیڈ پر خوف سے گھڑی بنا کپکپا رہا تھا۔ پھر اس نے ناقابل یقین اور خوفناک منظر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ مقفل ہونے کے باوجود آسیہ اس کے کمرے میں داخل ہو چکی تھی اور اب دونوں ہاتھ پھیلائے غرائی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گویا وہ اس کا گلا گھونٹنا چاہتی تھی۔

وہ بیڈ سے اترا اور رزنا کانپتا ہوا دروازے کی طرف دوڑا، آسیہ کی روح، اس کی راہ میں حائل ہو گئی، وہ کھڑکی

سکندر نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے بیان کیا اور بولا۔
 ”ایک بدروح حویلی میں آٹھسی ہے اس نے میرے جوان
 بیٹے کو مار ڈالا ہے اور میری جان کے درپے ہے خدا کے
 لئے میری مدد کریں، میں آپ کو نہ مانگے پیسہ دوں گا۔“
 بارلش پیش امام صاحب نے اسے اپنی جلالی
 آنکھوں سے دیکھا کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کیں اور
 قدرے توقف سے آنکھیں کھول کر بولے۔ ”مجھے کسی
 کے روپے پیسے کی ضرورت نہیں، میرے لئے اللہ ہی کافی
 ہے۔ جسے تم بدروح کہہ رہے ہو وہ تمہاری بیٹی کی روح
 ہے، جس نے تمہارے ظلم سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی۔
 اور تم نے اسے بتا دیا کہ نماز جنازہ پڑھاؤ بغیر خاموشی
 سے گڑھا کھود کر دفن دیا تھا۔ یہ سب تمہاری کرنی کا پھل
 ہے جو تمہیں دنیا میں ہی مل رہا ہے۔ تم نے اپنے جاہلانہ خود
 ساختہ عقیدے سے گناہ عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ قرآن
 پاک اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ جسے انسانوں کی
 ہدایت اور بھلائی کے لئے اتارا گیا۔

لیکن تم نے اپنی دولت کا معمولی سا حصہ بچانے کے
 لئے اپنی بیٹیوں کا نکاح قرآن پاک سے کر دیا اس کے
 علاوہ تمہارے سر پر بہت سے بے گناہوں کا خون بھی
 ہے، تمہاری حویلی کے زندان میں کئی بے گناہوں کی
 لاشیں دفن ہیں۔ زندان کی روح تمہارے خاندان کی دشمن
 ہے، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ فوراً سے پیشتر یہ حویلی
 چھوڑ دو۔“ وہ مدللہ میں بولے۔

سکندر حویلی لوٹ آیا، وہ پیش امام صاحب کی باتوں
 سے جان چکا تھا کہ اس کے دل کا بھیج جانے والا کوئی
 معمولی انسان نہیں، اس کا کہا جیج ثابت ہو سکتا ہے۔

”سکندر نے اپنی جان بچانے کے لئے حویلی اور
 گاؤں کو خیر باد کہہ دیا۔ سہرا بسمیت کچھ کارندوں کو حویلی
 کی دیکھ بھال کے لئے وہیں چھوڑا اور گاؤں سے رخصت
 ہو گیا۔ وہ خود اپنی فیملی سمیت لینڈ کروزر میں تھا جبکہ کچھ
 مساح کارندے اس کے پیچھے جیب میں تھے۔ وہ گاؤں کی
 حدود سے نکل کر کئی گھنٹوں بعد شہری حدود میں داخل
 ہو گئے۔ ایک جگہ ٹریفک سنکسل کی جی سرخ ہوئی اور ڈرائیور

نے گاڑی روک لی۔

فوزیہ پچھلی نشست پر ماں کے ساتھ بیٹھی تھی۔
 اچانک اس نے اپنی سائیڈ والا دروازہ کھولا اور چشم زدن
 میں گاڑی سے باہر نکل گئی، یہ سب کچھ غیر متوقع تھا، اس
 سے پہلے کہ سکندر سنبھلتا یا کچھ سمجھتا وہ سڑک کی دوسری
 طرف لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

قدیر شہر کی معروف ترین سڑک پر کارڈرائیو کر رہا تھا۔
 علیہ کے بہیمانہ قتل کے بعد اس کی دنیا اندھ ہو چکی تھی۔
 بوکیہ رکتوں کا ایس ایچ او نواز علی کے گھر تک پہنچا، نواز علی
 کے گھر سے قاتل کا لباس ملنا اور اس کے چہرے پر موجود
 خراشیں اسے قاتل ثابت کر رہی تھیں۔

قدیر نے پھر کراس پر حملہ بھی کر دیا تھا لیکن پولیس
 اہلکاروں اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد نے اسے
 پکڑ لیا۔ حالات اور شواہد نواز علی کو قاتل ثابت کر رہے تھے
 اور معاملہ میڈیا سے تعلق رکھنے والے فرد کا تھا۔ نواز علی کو
 گرفتار کر لیا گیا تھا۔ چہرے پر موجود خراشوں کے بارے
 میں نواز علی نے بتایا کہ یہ خراشیں ایک مجرم سے گتھ گتھا
 ہوتے ہوئے آئی ہیں۔ اسے معطل کر دیا گیا اور تفتیش کی
 گئی۔

مقتولہ کے ہاتھوں کے ناخنوں میں موجود قاتل کے
 گوشت کے ریشوں کا ڈی این اے (DNA) ٹیسٹ
 کر لیا گیا جب یہ انکشاف ہوا کہ گوشت کے یہ ریشے نواز علی
 کے نہیں تھے۔

سب چکر اکر رہ گئے۔ تو پھر قاتل کون تھا؟ نواز علی کو
 چھوڑ دیا گیا اور قدیر خان کے احتجاج کے باوجود بحال بھی
 کر دیا گیا۔

نواز علی کے رہا ہونے کے بعد ملک کے مختلف شہروں
 سے بہت سی دیگر دو شیز انیس بھی اغوا ہوئیں اور پھر ان کی
 بھی گلائی بغیر سر کے لاشیں ملیں۔ جن کو تشدد کرنے کے
 بعد وحشتانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا تھا۔

پولیس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے قاتل کا
 سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے۔ میڈیا پر قانون نافذ

ہے، تم بس خاموشی سے لیٹی رہو۔“ قدیر نے کہا۔
تلاش کرنے والے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ان
میں سے دوسرے کی دوسری طرف چلے گئے جبکہ دور انتقال
بردار افراد باتیں کرتے ہوئے اس کی گاڑی کی طرف
آئے، ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ ”وہ مصیبت زیادہ دور
نہیں مچی ہوگی، یہیں کہیں چھپی بیٹھی ہوگی، وہ یہاں کے
راستے سے آگاہ نہیں۔“

دوسرا تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ لیکن اگر وہ نہ ملی تو
سردار سکندر ہمارا شہر نشر کر دے گا۔

ایک نے بنا کی تکلف کے اس کی کاری کھڑکی سے
چہرہ لگایا اور اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ قدیر نے اپنی طرف
کا شیشہ اتار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”کیا بات ہے
پہلوان کسے ڈھونڈ رہے ہو؟ اور یہ ہاتھوں میں مہلک
تہتیار لے کر عام کیوں گھوم رہے ہو؟“

”ہم سردار سکندر کے ذاتی محافظ ہیں۔ تم نے کوئی
لڑکی تو نہیں دیکھی، وہ سردار سکندر کی بیٹی ہے اور اس کا کافی
توازن درست نہیں۔ وہ ٹریفک سنٹرل پر گاڑی سے اتر کر
اچانک بھاگ نکلی ہے۔“ ان میں سے ایک نے دیکھی لب
دلچہ میں کہا۔

”سردار سکندر کا ذاتی محافظ ہونے کا مطلب یہ نہیں
کہ تم سرعام سڑکوں پر اسلحہ لے کر گھومو اور دوسروں کی
گاڑیوں کی تلاشی لیتے ہوئے انہیں ہراساں کرو۔ یہ تمہارا
گوٹھ نہیں شہر ہے۔ جاؤ۔ یہاں سے ورنہ پولیس کو فون
کردوں گا، میرا تعلق پریس سے ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ
ڈیش بورڈ پر رکھے موبائل فون کی طرف بڑھایا۔

دونوں گاڑ کاچہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، انہوں نے
غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ لڑکی
چھپیلی نشست پر غلاف کے نیچے ساکت پڑی تھی۔

اس دوران سنٹرل کی بتی گرین ہو گئی۔ قدیر نے گاڑی
آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس سڑک سے کافی
فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ قدیر نے گاڑی بھلی سڑک پر موڑی
اور فٹ ہاتھ کے قریب روک دی۔ ”اب بتاؤ تم کون ہو؟
اور یہ کیا چل رہے؟“ اس نے مڑ کر کہا۔

کرنے والے اداروں کی کارکردگی پر کڑی تنقید کی جا رہی
تھی۔ قدیر خان بیٹی کے صدمے سے شاید پاگل ہو جاتا۔
ایسے میں اسے پرویز نے حوصلہ دیا۔ پرویز بھی پریس
رپورٹر تھا اور اسی اخبار سے منسلک تھا جس میں قدیر ڈیوٹی
کر رہا تھا۔ وہ پچیس سالہ تو موندنوجوان تھا۔ پرویز کے
والدین انتقال کر چکے تھے اور وہ شہر کے ایک پوش علاقے
میں تنہا رہائش پذیر تھا۔

سنٹرل کی بتی گرین ہونے پر قدیر نے گاڑی سائیڈ
میں روکی۔ اچانک ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ایک طرف
سے ایک خوب صورت لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ کافی
خونفردہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے کار کا عقبی دروازہ کھولا اور
اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ نہ صرف بیٹھ چکی تھی بلکہ اس
نے خود کو قیمتی نشست پر دراز کر لیا تھا۔

قدیر نے مڑ کر عجیب سے اسے دیکھا۔ اس کی عمر
انیس بیس سے لگ بھگ تھی۔ انتہائی حسین و جمیل بدن
جیسے سامنے میں ڈھلا ہوا اس کا حسین چہرہ اس وقت خوف
سے زرد پڑ رہا تھا۔ ”خدا کے لئے میری مدد کرو۔ وہ مجھے
مار دیں گے۔“ وہ دروازے آواز میں بولی۔

”کون لوگ ہیں وہ؟“ قدیر نے پوچھا۔
”وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ وہاں گاؤں میں بھی مجھے
انہوں نے قید کر رکھا تھا۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

اسی وقت کچھ لوگ نظر آئے۔ ان میں سے دو نے
رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر
دیکھ رہے تھے۔ لڑکی کی بات کی تصدیق ہو چکی تھی۔ کہ وہ
چچ کہہ رہی ہے۔ واقعی کچھ لوگ اس کے پیچھے تھے۔ لڑکی
بھی انہیں دیکھ چکی تھی۔ وہ نشست پر کچھ اور سمٹ گئی۔
دونوں نشستوں کے درمیان گاڑی کا غلاف پڑا تھا۔ قدیر
نے پھرتی سے غلاف اٹھا کر لڑکی کے اوپر پھیلا دیا۔

تلاش کرنے والے افراد مختلف گاڑیوں کی کھڑکیوں
سے اندر جھانک رہے تھے۔

لڑکی غلاف کے نیچے سے بولی۔ ”گاڑی چلائیں۔
یہ نہ ہو وہ لوگ ادھر ہی آ جائیں۔“
”کیسے چلاؤں دیکھ نہیں رہی۔ سنٹرل کی بتی سرخ

کرنے کا طریقہ اسے کلثوم نے سمجھا تھا۔ کبھی کبھار کلثوم اسے اپنے ساتھ باہر بھی لے جاتی تھی۔ البتہ قدیر خان نے کئی مرتبہ کلثوم کو سمجھایا کہ ”فوزیہ کو گھر سے باہر زیادہ مت لے جایا کرو، سردار سکندر بھی اسی شہر میں ہے۔ اگر اس نے فوزیہ کو دیکھ لیا تو فوزیہ کے ساتھ ساتھ ان کا جینا بھی دشوار ہو جائے گا۔“

ادھر علینہ کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے بھی قدیر خان بے چین تھا۔

پچھلے دنوں ایک اور لڑکی اس درندے کی درندگی کا شکار ہوئی تھی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ ایس ایچ او نواز علی وہ جنونی قاتل ہے، وہ اسے رستے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا اس روز وہ اپنے ساتھی رپوڑ پرویز کے ساتھ کیفے ٹیریا میں بیٹھا کھد رہا تھا۔ ”یار کچھ میں نہیں آتا اس جنونی قاتل کو کیسے رستے ہاتھوں پکڑوں، مجھے تو پورا یقین ہے کہ نواز علی ہی وہ قاتل ہے۔“

قدیر! جس جنونی قاتل کو ملک بھر کے قانون نافذ کرنے والے ادارے تلاش نہیں کر سکے، اسے ہم کیسے ڈھونڈیں گے، رہی بات یہ کہ SHO نواز علی ہی وہ جنونی قاتل ہے تو مجھے اس پر یقین نہیں، DNA ٹیسٹ سے وہ بے گناہ ثابت ہو چکا ہے۔“ پرویز نے کافی کاگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

قدیر خان کچھ دیر سوچتا رہا اور کافی کے ٹھونٹ بھرتا رہا۔ پھر ایک دم اپنی کرسی سے اچھلا۔ ”میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔“

”وہ کیا؟“ پرویز نے پوچھا۔
”پولیس کی اب تک کی نقیشت سے پتہ چلا ہے کہ علینہ کے علاوہ اس سفاک قاتل نے جتنی بھی لڑکیوں کو بے رحمی سے قتل کیا ہے، وہ تقریباً بھی ماڈرن اور درنگ گرل تھیں۔ جو مختلف دفاتر، یونیورسٹی، کالج یا اس قسم کے دوسرے پیشوں سے منسلک تھیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق شوہر سے بھی تھا۔ پچھلے دنوں ماڈل ناٹوں کے علاقے میں قتل ہونے والے لڑکیوں کی ڈراموں کی ایکسٹریکٹس ہم کسی ماڈرن لڑکی کو معاوضے پر ہانڈ کریں گے، جو

لڑکی نے غلاف میں سے ڈرتے ڈرتے سر باہر نکالا۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ تم ان لوگوں سے چھپ کیوں رہی ہو؟“ ”میرا نام فوزیہ ہے۔“ اس نے ہنسی پکوں سے اپنی رو دوسنا ڈالی۔ جسے وہ حیرت سے سنتا رہا اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی باپ ایسا ہو سکتا ہے جو اپنی بیٹی کی جان لینا چاہتا ہو۔ لیکن وہ سردار سکندر کے دہی علاقے کے رسم دروازے کے بارے میں بھی جانتا تھا۔

”روؤ مت تم میری بیٹی علینہ کی طرح ہو۔ وہ بھی تمہاری طرح خوب صورت تھی، میں تمہیں اپنے گھر لے چلتا ہوں، وہاں میری بیوی ہے جو تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔“ قدیر خان نے کہا اور اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر کے دروازے پر تھا۔ اس نے ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ کلثوم اس کے ساتھ اس خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر چونک پڑی اور سوالیہ نگاہوں سے قدیر خان کی طرف دیکھا۔ ”بیگم ہم باپ بیٹی کو اندر آنے بھی دو گی یا دروازے پر کھڑا رکھو گی؟“ اس نے کہا اور کلثوم کو وہیں حیران و پریشان کھڑا چھوڑ کر فوزیہ سمیت ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ”کلثوم ہمیں ہماری بیٹی اللہ نے دوبارہ لوٹا دی ہے۔“ کلثوم کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر اس نے کہا اور فوزیہ کی رو دواسے سنا ڈالی، کلثوم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے فوزیہ کو سینے سے لگا لیا، کچھ دیر میں وہ دونوں بے تکلف ہو چکی تھیں، انہیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی پہلی ملاقات ہے۔ باتوں باتوں میں فوزیہ بھی ان کے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی۔ انہیں باتوں میں مشغول دیکھ کر قدیر خان مسکرایا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

علینہ کی موت کے بعد قدیر نے آج پہلی بار کلثوم کو ہنستے بولتے دیکھا تھا اس سے پہلے وہ ہمیشہ کرم رتی تھی۔ فوزیہ دینی ملانے کی رہنے والی تھی لیکن ذہین لڑکی تھی جلد ہی وہ یہاں کے طور طریقے جان گئی۔ وہ قدیر خان کو باہار کلاؤم لہائی جان کہنے لگی تھی۔ قدیر خان نے فوزیہ کو موہل فون مٹی لہرائے دیا تھا۔ جسے استعمال

کے پیچھے تھی۔ وہ سنگٹاتی ہوئی اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی، دروازہ لاگ کیا اور نہانے چلی گئی، یہ اس کا معمول تھا۔ ڈیوٹی سے آنے کے بعد اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی وہ غسل کرتی تھی، وہ اس اپارٹمنٹ میں تنہا رہتی تھی۔ باں باپ کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہو چکا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی، خوب صورت بھی تھی، اس لئے جلد ہی ایک ملٹی پلٹنل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔

وہ شاور کے نیچے کھڑی نہا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ سنگٹنا بھی رہی تھی کہ اچانک اسے ایسا لگا جیسے اسے کوئی دیکھ رہا ہو۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور دھک سے رہ گئی، ہاتھ روم کے کھلے ہوئے دروازے میں ایک تنومند شخص کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنسی داڑھی اور آنکھوں پر موٹے فریم کی عینک موجود تھی۔ تاک کے نتھنے غیر معمولی پھیلے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ چیختی وہ شخص اسے برقی سرعت سے دبوچ چکا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ یاسمین کے منہ پر جم رہا۔ ایک ناگوار سی بو کے احساس کے ساتھ وہ بے ہوش ہو کر اس کی ہانپوں میں جھول گئی۔ اسے ہوش آیا تو خود کو ایک آراستہ کمرے میں بیڈ پر پڑے پایا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے جسم پر لباس بھی موجود تھا۔ یہ وہی کپڑے تھے جو اس نے نہانے سے پہلے اتار کر بیٹنگر سے لٹکائے تھے، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی، بیڈ سے کچھ فاصلے پر سنگھار میز تھی وہاں ایک پرس بھی موجود تھا، وہ بخوبی اس پرس کو پہچانتی تھی، یہ اس کا اپنا پرس تھا، کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھی۔ جس وقت اس جنونی قاتل نے اسے اغوا کیا تھا۔ وہ بے لباس تھی۔

اغوا کنندہ نے اسے اس کے کپڑے پہنائے، اس کا پرس بھی لیا۔ پھر اسے کس طرح اپارٹمنٹ سے باہر لے گیا۔ اور اب کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ شخص غائب تھا۔ وہ بیڈ سے اتر کر سنگھار میز کے قریب آئی اپنا پرس اٹھایا۔ دایاں ہاتھ پر اس میں ڈالا اور حیرت سے اٹھل پڑی، اس کا موبائل فون بھی پرس میں موجود تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے قدیر خان کا نمبر مایا۔ نیل

مختلف پبلک مقامات پر گھومے گی۔ ہو سکتا ہے اس جنونی قاتل کی نظر اس لڑکی پر پڑیں اور وہ اسے شکار کرنے کی کوشش کرے، ایسی صورت میں ہم اسے ٹریس کر لیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے سب انسپکٹر شاہد علی اس جنونی قاتل کی گرفتاری کے لئے ہمارا ساتھ دے گا۔“ قدیر خان نے تفصیل سے اپنا منصوبہ بیان کیا۔

کچھ ہی روز میں قدیر نے یاسمین نامی لڑکی کو اپنا ساتھ دینے کے لئے قائل کر دیا۔ وہ ایک ملٹی پلٹنل کمپنی سے واسطہ تھی اور خوب صورت خدو خال کی مالک تھی۔ معاوضے سے زیادہ انڈو پتھر کے چکر میں اس نے ان کا ساتھ دینے کی ہامی بھری۔ وہ آفس ٹائم کے بعد مختلف پبلک مقامات پر گھومتی اور قدیر خان اور شاہد علی مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرتے۔ کسی بھی خطرناک صورت حال سے نمٹنے کے لئے وہ تیار تھے۔ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر دوسری گاڑی میں پرویز بھی یاسمین کی نگرانی کرتا رہتا۔ تقریباً ایک ہفتے تک ان کی محنت بے سود رہی، آٹھویں روز یاسمین ماڈرن ڈریس میں ایک پارک میں موجود تھی کہ اچانک اسے اپنی پشت پر کسی کی آنکھوں کی تپش کا احساس ہوا۔ اس کی حساسات! کی تیز تھیں۔ یاس کی چھٹی حس نے اسے چوکنہ کر دیا تھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے۔

پارک میں اس وقت بہت سے افراد موجود تھے۔ اس نے سب کا جائزہ لیا۔ مگر کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ وہ چند لمحوں پارک میں گھومنے کے بعد باہر نکل اور اپنی کار کی طرف بڑھی، کار کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مگر اب بھی اسے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ جس پر اسے شبہ ہوتا کہ وہ اس میں دھپسی لے رہا ہو۔ کچھ فاصلے پر انسپکٹر شاہد اور قدیر خان کھڑے اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ فاصلے پر کالکس میں پرویز بھی موجود تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھا کہ وہ اکیلی نہیں رہے گی۔ وہ تینوں سے تحفظ دینے کی غرض سے موجود تھے۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ تک آئی۔ کار پارکنگ میں پارک لی شاہد علی اور قدیر خان نے دور سے اسے الوداعی اشارہ کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ پرویز کی کالکس بھی ان

تھی کہ یہ جنونی قاتل اس سے چوہے بلی والا کھیل کھیل رہا ہے۔ جس طرح بلی چوہے کو دبوچ کر چھوڑتی ہے اور پھر دبوچتی ہے بلا خراسی طرح اسے مار ڈالتی ہے۔“

”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔“ تمہیں بے گناہ اور معصوم لڑکیوں کو اس قدر بے رحمی سے مار کر کیا ملتا ہے۔ تم خود سوچو اگر تمہاری ماں یا بہن کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرے تو تم پر کیا کرے گی۔“ یاسمین نے ہمت کر کے پوچھا۔ وہ اسے باتوں میں لگا کر سوچنے کا موقع حاصل کرنا چاہتی تھی۔

”بہت چالاک ہو تجھے باتوں میں لگا کر یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب سوچنا چاہتی ہو۔ لیکن یہاں آنے کے بعد لڑکی کا صرف دھڑی باہر جاتا ہے۔ سر ہینس رہ جاتا ہے۔ اس نے سفاک لہجے میں کہا اور پھر قدرے توقف سے بولا۔

”اب رہا سوال یہ کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں؟ اس کی داستان بہت لمبی چوڑی ہے، میں تمہیں مختصر بتا دیتا ہوں، میرا تعلق ایک پوش گھرانے سے تھا۔ میرے ڈیڈی بزنس میں تھے، انہوں نے اپنی پسند سے ایک ابھرتی ہوئی ماڈل گرل سے شادی کی، میری ماما کا ماڈلنگ کی دنیا میں نام تھا۔ میرے ڈیڈی نے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی ان سے ماڈلنگ کا پیشہ چھڑوا دیا۔ جس کا مکی کو بہت رنج تھا۔ شادی کے سال بعد میں پیدا ہوا، اس کے دوسرے سال ایک بہن پیدا ہوئی، دو بچوں کی پیدائش کے باوجود مکی کی حسن و جوانی قائم و دائم تھی۔ ڈیڈا اکثر کاروباری سلسلے میں کئی کئی دنوں کے لئے ملک سے باہر چلے جاتے ان کی غیر موجودگی میں ایک شخص ہمارے گھر آتا۔ رات بھر مکی کے کمرے میں رہنے کے بعد صبح سویرے وہ رخصت ہو جاتا۔

مثلاً مشہور ہے۔ سودن چور کے اور ایک دن کو تو لال کا۔

ان دنوں ڈیڈی کا دوبار کے سلسلے میں شہر سے گئے ہوئے تھے، ہم دونوں بہن بھائی اپنے کمرے میں تھے۔

ڈیڈی اچانک غیر متوقع طور پر عرقی سمت سے گھر میں داخل ہوئے اور اپنے بیڈروم میں جا بیٹھے، شاید انہیں شک ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے پہلے کڑیڈی کچھ کرتے پہلے بیڈ سے اٹھایا اور گولی چلا دی جو ڈیڈی کے دل میں پیوست ہوئی۔ وہ شخص انہیں قتل کر کے چلا گیا۔ میری ماں نے

جاری تھی۔ لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دو تین دفعہ رٹائی کیا۔ لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو نہ کی گئی۔ اس نے موبائل فون دوبارہ پرس میں رکھا اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

لیکن کمرے سے باہر نکلنا اسے نصیب نہیں ہوا، دروازے میں وہی جنونی قاتل کھڑا استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ جنونی قاتل اندر داخل ہوا۔

اور کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ ”کک کون ہو تم؟ اور مجھے یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟“ یاسمین نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تم مجھے کوئی بھی نام دے سکتی ہو۔ میں وہی ہو، میں وہی ہوں جسے ٹریس کرنے کے لئے ان دونوں صحافیوں اور انکسپکٹر شاہد علی نے تمہیں ہار کیا تھا۔“ وہ ہنسا۔

”تنت تمہیں کیسے پتہ چلا؟ یاسمین نے متوحش انداز میں پوچھا۔

”اتفاق سے وہ دونوں صحافی کیسے میرا میں جس وقت پلاننگ کر رہے تھے اس وقت میں ان سے پیچھے ایک دوسرے نیپیل پر موجود ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر تو میں سائے کی طرح ان کے پیچھے رہا، ایک ہفتہ تک میں جان بوجھ کر تمہیں نظر انداز کرتا رہا۔ تاکہ وہ تم سے لاپرواہ ہو جائیں۔ تم جس وقت پارک میں تھیں ان کے ساتھ ساتھ میری بھی تم پر نظر تھی، میں خاموشی سے پارک سے باہر نکلا، تمہاری کار کی ڈیگ کھولنا میرے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں تمہاری گاڑی کی ڈیگ میں چھپ کر باآسانی تمہارے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ پھر تمہیں کلوروفارم کے ذریعے بے ہوش کر کے یہاں لے آیا۔ تمہاری سہولت کے لئے تمہارا پرس بھی میں ساتھ لے آیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس میں موبائل فون موجود ہے۔ پھر تم ہی میں نے رسک لے کر تمہیں موقع بھی دیا کہ کسی کو اپنی مدد کے لئے بلا سکو۔

لیکن بد قسمتی سے تم ناکام رہیں۔ دراصل مجھے شکار کو دوڑا دوڑا کر مارنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔“ اس نے کہا اور اطمینان سے اک طرف رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جبکہ یاسمین اپنی جگہ پر کھڑی خوف سے لرز رہی تھی۔ وہ کچھ چکی

لیا۔ اور پل بھر میں اسے بے لباس کر ڈالا وہ چیخی چلائی خود کو اس کی حیوانی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی، مگر وہ جانور جا سے باہر ہو چکا تھا۔ اس نے یاسمین کو اٹھا کر بیڈ پر بٹخ دیا اور خود اس پر لد گیا۔ وہ اس کے ہوس کے پنجوں میں فراڈن مچھلی کی طرح تر پڑے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ شرمناک حالت میں بیڈ پر پڑی تھی۔

جنونی قاتل اس کے اوپر سے اٹھا اور شوکیس کی دروازے سے خنجر نکال کر اس کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر وہ خوف و دہشت سے چلانے لگی۔ عزت ٹوٹ چکی تھی اب زندگی بھی خطرے میں تھی۔ اس کی چیخ و پکار سن کر میں نے خوشی سے سرشار ہوتے ہوئے اسے دیوچ لیا۔

خدا کے لئے مجھے مت مارو۔“ وہ روتی ہوئی اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ جنونی قاتل نے اسے زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے خنجر سے اس کے سینے پر چرکا لگایا اس کے سینے سے خون بہنے لگا۔ وہ اذیت سے چیخی چلی جاری تھی۔ جنونی قاتل نے خنجر کا ایک اور بھر پور وار کیا۔ وہ تڑپی اور مزاحمت کے طور پر اپنے لمبے ناخنوں سے اس کے چہرے پر خراشیں ڈالیں۔ جنونی قاتل نے اس خنجر کا ایک اور وار کیا اس بار یاسمین نے چیختے ہوئے اس کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے۔ اور اس قدر زور سے کاٹا کہ قاتل چیخ پڑا اور اس کے ہاتھ سے خنجر نکل گیا۔ یاسمین نے برنگی کی پرواہ کئے بغیر دروازے کی طرف بھاگنا چاہا مگر اس درندے نے ایک بار پھر اسے دیوچ لیا۔ اور خنجر سے اس کے جسم پر جگہ جگہ کٹ لگاتا چلا گیا۔ یاسمین کے جسم سے بہنے والا خون اور اس کی کرہناک چیخیں قاتل کو لطف اندوز کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس کی کٹی پٹی لاش فرش پر پڑی تھی۔ قاتل نے اس کا سر دھڑ سے الگ کیا اور اپنی کلائی کو مسلنے لگا۔ اسے اپنے چہرے پر پڑنے والی خراشوں سے سخت جلن ہو رہی تھی اور کلائی میں سخت تکلیف ہو رہی تھی، اب اسے مقتول کا دھڑ بھی کسی ویران مقام پر پھینکنا تھا۔

اسی وقت مقتولہ کا موبائل فون بجائے قاتل نے اٹھا کر زور سے دیوار پر دے مارا، اور پھر اپنے ذمہ کی ڈرینک کرنے لگ گیا۔

ہوشیاری سے ایک کہانی تیار کی کہ ہمارے گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے جنہوں نے مزاحمت پر ڈیڈی کو گولی مار دی۔ ڈیڈی کی تمام دولت اور جائیداد کی مالک میری ماں بنی۔

میرے دل میں ماں کے خلاف نفرت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ کرن میری بہن کو ایک روز تیز بخار چڑھا اور وہ اسی بخار میں مر گئی۔ میں ماں کے کروتے دیکھتے دیکھتے جوان ہو گیا۔ سب سے پہلا قتل میں نے اپنی ماں کا کیا۔ یہ میری نوجوانی کا پہلا قتل تھا، میں نے اس کی لاش کے کئی کٹوے کئے، دوسرا قتل میں نے اس کے آشنا کا کیا۔ اور پھر کچھ عرصے بعد وہاں سے پر اپنی بیچنے کے بعد میں نے اس شہر کا رخ کیا۔

یہیں مجھے ایک لڑکی ملی، مجھے اس سے محبت ہوئی، لیکن وہ بھی بے وفا نکلی، وہ فلٹ تھی، مالدار آسامیوں کو پھانسی تھی، میں اسے اسی گھر میں لے آیا اور نشاط انگیز لمحات کے دوران اسے خنجر کے پورے وار کر کے قتل کر دیا۔ یہ میرا تیسرا قتل تھا، لیکن اس لڑکی کو قتل کرتے وقت مجھے بہت سر دھڑلا، پھر تو ایک نشہ سا چھا گیا۔ میں ہفتے پندرہ دن بعد کسی نہ کسی لڑکی کو قتل کر کے اس کا سر محفوظ کر لیتا ہوں۔“ اس نے اپنی روداد مکمل کی، اسی دوران یاسمین کا موبائل فون بجا۔ اس نے جلدی سے شوڈر بگ میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکالا یہ تھا کہ اس قاتل نے یاسمین سے موبائل فون چھین لیا۔ اور اسکرین پر نمبر دیکھا۔ ”اوہ قدر خان کی کال ہے۔“ اس نے کہا اور موبائل فون ایک طرف پھینک دیا۔ ”اب اسے بھی چیختے دو اور خود بھی جیو مجھے حسین دو شیرازوں کی چیخیں سرور دیتی ہیں۔ اس کمرے میں کیرہ بھی آن ہے تمہاری فلم بھی ریکارڈ ہو رہی ہے۔ اور بے فکر رہو یہ فلم میں دکھاؤں گا کسی کو نہیں۔ ایسی ان گنت فلمیں میرے پاس محفوظ ہیں۔“ وہ کرسی سے اٹھا اور شیطانی ارادے سے اس کی طرف بڑھا۔

”خدا کے لئے مجھے یہاں سے جانے دو۔“ وہ سمجھکھاتے ہوئے بولی۔

لیکن اس کی التجاؤں کا اس جنونی قاتل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے جھپٹ کر اسے کسی بازی کی طرح دیوچ

سراٹھا کر نواز علی کی طرف دیکھا، اس کی کلائی پر پٹی بندی ہوئی تھی۔ ”آپ کی کلائی پر کیا ہوا ہے؟“ قدیر خان نے سر دلچھے میں پوچھا۔

”کل میری موٹر سائیکل سلب ہو گئی تھی، سڑک پر گرنے سے وہاں پڑا ہوا کالج کلائی میں چبھ گیا۔“ نواز علی نے جواب دیا۔

”ایس ایچ اوصاحب جب بھی کوئی لڑکی قتل ہوتی ہے آپ رڈی کیوں ہو جاتے ہیں، علیحدہ جب قتل ہوئی آپ کے چہرے پر خراشوں کے نشان تھے اور جب یاسمین کا قتل ہوا تو آپ کی کلائی رڈی ہے۔“ قدیر خان تلخچے میں بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ نواز علی نے اسے غصے سے گھورا۔

”میرا مطلب ہے SHO صاحب کہ وہ جنونی قاتل تم ہو۔“ قدیر خان کا انداز جارحانہ ہو گیا، نواز علی بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اس سے پہلے کہ نوبت ہاتھ پائی تک جا پہنچتی، شاہد علی اسے پولیس اسٹیشن سے باہر لے گیا۔ ”آپ اچھی خاصی عمر کے مجھدار انسان ہیں اور صحافی بھی ہیں، پھر بغیر ثبوت کے کسی پولیس آفیسر پر الزام لگانے کا مطلب بھی آپ جانتے ہیں، پہلے بھی تفتیش میں ایس ایچ اوصاحب بے گناہ ثابت ہوئے تھے۔“ شاہد علی نے قدیر کو سمجھانا چاہا۔

”مجھے سب معلوم ہے اس قسم کی تفتیش کے بارے میں۔“ قدیر خان کا اشتعال اب تک کم نہیں ہوا تھا۔

شام سات بجے اخبار کے دفتر روانہ ہوا۔ مقتول کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آنچکی تھی، اس پر واضح طور پر درج تھا کہ ”مقتول کے انگلیوں کے ناخنوں میں کسی کے گوشت کے ذرات پائے گئے ہیں۔“ قدیر کو نواز علی پر شک ہی نہیں پورا یقین تھا کہ وہ قاتل ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ اس نے پرویز کا نمبر ملا لیکن اس کا نمبر آف تھا، وہ اس کے ابارٹمنٹ میں گیا، وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے پڑوسی نے بتایا۔ ”وہ گاؤں چلا گیا ہے۔“

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ جنونی قاتل نے اب

اچانک قدیر کے موبائل فون کی بیل جی تو اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا یہ انسپکٹر شاہد علی کا تھا۔ قدیر نے کال ریسیو کی۔ ”قدیر صاحب غضب ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک ویران مقام سے ایک نوجوان لڑکی کی بغیر سر کے لاش ملی ہے، جسے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے، لاش کے پاس سے ایک شوڈر ریگ بھی ملا تھا۔ جس میں مقتولہ کا آئی ڈی کارڈ بھی ملا ہے۔ آپ کو یہ جان کر میری طرح بہت افسوس ہوگا کہ مقتولہ کوئی اور نہیں بلکہ یاسمین ہے، دوسری طرف سے انسپکٹر نے بذیانی لچھے میں کہا۔

اور قدیر کو یوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر اس کے سر پر آگرا ہوا، وہ لاشعوری طور پر خود کو یاسمین کے قتل کا مجرم سمجھنے لگا اور سوچنے لگا کہ اگر وہ یاسمین کو ہار نہ کرتا تو وہ جنونی قاتل کے ہتھے نہ چڑھتی۔

”ہیلو کہاں گم ہو گئے۔“ قدیر کی طرف سے خاموشی پا کر انسپکٹر نے کہا۔

”شاہد علی وہ لڑکی میری وجہ سے ماری گئی ہے نہ میں اسے اس راہ پر لگاتا اور نہ جنونی قاتل اسے قتل کرتا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”حوصلہ رکھو اس کی موت شاہد علی طرح لکھی تھی۔“ اگر چاہو تو پولیس اسٹیشن آ جانا میں تمہیں وہیں ملوں گا۔“ انسپکٹر نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت قدیر کا موبائل فون دوبارہ بجاس بار پولیس رپورٹر پر پڑا تھا۔ اس نے بھی اسے وہی اطلاع دی جو کچھ دیے پہلے انسپکٹر نے دے چکا تھا۔

اس اثنا میں فون پر زبیر ناشتہ تیار کر کے لایا تھا۔ اس کا دل رکھنے کے لئے اس نے مختصر سا ناشتہ کیا اور پولیس اسٹیشن جا پہنچا، SHO نواز علی اپنے کمرے میں ہی موجود تھا۔ انسپکٹر شاہد بھی وہیں تھا۔ ”مسٹر قدیر خان آپ پولیس کے بندے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ لڑکی آپ ہی کی وجہ سے اس وحشی قاتل کی بربریت کا شکار ہوئی ہے۔“

قدیر خان نے شرمندگی سے نگاہیں جھکا لیں اسے واقعی اپنی ناقص منصوبہ بندی پر شرمندگی تھی، پھر اس نے

اور پھر بولا۔ ”گاڑی لیفٹ سائڈ میں لے لو۔“ کلثوم نے

قدرے ہچکچاتے ہوئے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

اب وہ اس شخص کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد کار ایک سنسان سڑک پر پہنچ گئی۔ ”اب گاڑی روک دو۔“ اس نے حکم دیا اور کلثوم نے گاڑی سائڈ پر روک دی۔ سڑک کے کنارے ایک دوسرے کار کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ جنونی قاتل نے برقی سرعت سے پہلے کا دستہ کلثوم کے سر پر رسید کیا۔ کلثوم کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

فوزیہ نے چیخنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس شخص نے دوسرے ہاتھ میں دبا رومال اس کے منہ سے لگا دیا۔ کلوروفارم کی ناکواریو سے وہ لمحہ بھر میں ہوش و حواس سے محروم ہو گئی۔

فوزیہ کو ہوش آیا تو خود کو ایک آراستہ کمرے میں بیڈ پر پڑے پایا، اس سے کچھ فاصلے پر وہ شخص اطمینان سے کرسی پر بیٹھا تھا۔ ”کون ہو تم؟“ اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ فوزیہ اٹھ بیٹھی۔

”میں وہی جنونی قاتل ہوں جس کی تلاش میں ملک بھر کی پولیس سرگرداں ہے۔“ وہ ہنسنا اور فوزیہ کا چہرہ خوف و دہشت سے زرد پڑ گیا، قدیر خان اور کلثوم کی زبانی وہ اس جنونی قاتل کے بارے میں سن چکی تھی۔

قدیر خان کی بیٹی علیہ بھی اس جنونی قاتل کی بربریت کا شکار ہوئی تھی۔

”مجھے جانے دو میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“ وہ رونے لگی۔

”خاموش چپ ہو جاؤ، تمہارے یہ آنسو مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، مجھے دنیا کی ہر عورت سے نفرت ہے۔“ قاتل جیسے چلایا۔

”عورتوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“ فوزیہ نے خوف سے لرزتے ہوئے پوچھا۔ اور اس جنونی قاتل نے ہڈیانی لہجے میں اپنی کہانی دہرا دی اور پھر وہ کرسی سے اٹھا اور شیطانی ارادے سے فوزیہ کی طرف بڑھا۔

فوزیہ ہراساں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے

نیک کوئی دوسرا شکار نہیں کیا تھا۔

ادھر فوزیہ کے شب و روز قدیر خان کے گھر میں گزر رہے تھے۔ کبھی بھی اسے محمود کی یاد آیا تو وہ اس ہو جاتی، لیکن اسے معلوم تھا دنیا سے جانے والے کبھی لوٹ کر واپس نہیں آتے۔ وہ کلثوم کو بھی اپنی داستان حیات سنا چکی تھی۔ جب کبھی فوزیہ اس ہوتی تو کلثوم سمجھ جاتی کہ اسے محمود کی یاد آ رہی ہے، وہ اسے سیر و تفریح کی غرض سے لے کر گھر سے نکل جاتی تاکہ اس کا دل بہل جائے۔

آج بھی فوزیہ اس شخص سے شدت سے محمود یاد آ رہا تھا۔ کلثوم نے اسے اس حال میں دیکھا تو معمول کے مطابق اسے لے کر گھر سے باہر نکل گئی۔ قدیر خان گھر پر ہی تھا اس لئے کلثوم نے ٹیکسی میں جانا مناسب نہ سمجھا ویسے بھی وہ اچھی ڈرائیور تھی۔ کچھ دیر ایک پارک میں وقت گزارنے کے بعد وہ شارع فیصل پر واقع ایک سپر اسٹور کے سامنے رکی، کافی سارا سامان خریدنے کے بعد سامان سے لدی بھدی ہوئی فوزیہ کے ہمراہ اپنی کار کے قریب پہنچی، سامان ڈکی میں رکھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

کار سڑک پر سبک رفتاری پر رواں دواں تھی کہ ان کی گردن کی پشت سے لوہے کی ایک سر دال آ گئی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا اور شدت درہ گئیں، پچھلی نشست پر ایک تنومند شخص بیٹھا تھا۔ اس کی چہرے پر جنگی داڑھی اور آنکھوں پر مونے فریم کی عینک موجود تھی۔ ناک کے نیچے غیر معمولی پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں موجود پہلے کی نال کلثوم کی گردن کی پشت سے لگی ہوئی تھی۔

”کل کون ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو؟“ کلثوم نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

”بڑی بی خاموشی سے گاڑی چلاتی رہو، ورنہ تم دونوں کو گولی بارودوں کا تجربہ مجھے شکاری کے نام سے خطاب کر سکتی ہو۔ میں شکاری کی غرض سے اس شانگ مال کے گرد منڈلا رہا تھا جہاں تم گئی ہوئی تھیں۔ تم دونوں کے آنے سے پہلے میں خاموشی سے تمہاری گاڑی میں گھس کر پچھلی نشست کے پائیدان میں سمٹ کر لیٹ گیا۔ اس نے کہا

فوزیہ نے اسے اپنے اوپر سے دھکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ فوزیہ کی مزاحمت جاری تھی۔ لیکن صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی مزاحمت اس چڑیا کی مانند ہے۔ جسے باز اپنے بے رحم بیٹوں میں دبوچ چکا ہوتا ہے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ جبکہ فوزیہ بے بسی سے چیخ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درود تکلیف اور مدھوشی کے درمیان اسے دور سے چمکتی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر روشنی کی طرف دیکھا۔ یہ بارہ بانی بارہ کا کمرہ تھا اور وہ ایک بیڈ پر موجود تھا۔ قریب ہی ایک کرسی پر کسی حور سے مشابہ ایک حسین و جمیل لڑکی موجود تھی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”خدا کا شکر ہے تم ہوش میں آ گئے۔“ لڑکی اسے ہوش میں آتا دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کی اور بے اختیار کراہ کر رہ گیا۔ اس کا پورا جسم بیٹوں میں جکھ جکھ سے جکڑا ہوا تھا۔ ”لیئے رہو بٹے جلنے کی کوشش مت کرنا۔ تم بری طرح زخمی ہو، تمہیں آج پانچ دن بعد ہوش آیا۔“ وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ پھر قدرے توقف سے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم ہوش میں آ گئے ہو، کیا نام ہے تمہارا اور تم دریا میں کیسے گرے تھے؟ وہ تو تمہاری قسمت اچھی ہے کہ باپا فجر کی نماز پڑھنے کے بعد ٹھیلنے کے لئے دریا کی طرف نکل گئے اور تمہیں دریا کے پانی میں بہتے ہوئے دیکھا، وہ ریٹائرڈ فوجی ہونے کے ساتھ ماہر تیراک بھی ہیں۔ انہوں نے بڑی مشکل سے تمہیں دریا سے نکالا۔ تم بری طرح زخمی تھے۔ تمہاری ٹانگ میں گولی لگی اور پیٹ میں خنجر کا زخم تھا اور بلندی سے گرنے کی وجہ سے پورا جسم جگہ جگہ سے زخمی تھا۔

نبض بالکل آہستہ چل رہی تھی۔ وہ تمہیں گھر لے آئے، میں ڈاکٹر ہوں۔ تمہارے بچنے کی امید بہت کم تھی۔ اور یہاں سے شہر بہت دور تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ تمہیں شہر کی اسپتال میں پہنچایا جاتا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر تمہارا علاج شروع کیا۔ اور اللہ کا شکر ہے کامیاب

جان جانے کا اتنا خوف نہیں تھا۔ جتنا عزت کے لٹ جانے کا ڈر، اسے معلوم تھا پہلے اسے یہ جنونی قاتل بے آبرو کرے گا پھر اسے اذیت ناک موت سے دوچار کرے گا۔ جنونی قاتل نے جست لگائی اور اسے دبوچنا چاہا تو فوزیہ نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور ایک طرف ہوئی۔

”بہت خوب تم دوسری لڑکیوں کی نسبت بہت پھرتیلی ہو۔ ویسے بھی مجھے آسان شکار اچھے نہیں لگتے۔“ وہ خیمہ انداز میں ہنسا، اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر چھلانگ لگائی، اس بار وہ فوزیہ کو دبوچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ”چھوڑو مجھے۔“ وہ چلائی۔ اور پھر اس نے خود کو چھڑانے کے لئے ہاتھ پیر چلائے۔ مگر اس جنونی قاتل کی گرفت مضبوط تھی۔ اسی وقت فوزیہ نے اپنے بائیں ٹھٹھے کا زوردار وار اس کی ٹانگوں کے بیچ کیا تو وہ ”اوغ“ کی آواز نکالتا ہوا کراہ کے بل جھک گیا۔

فوزیہ دروازے کی طرف بھاگی اور دروازہ کھولنا چاہا مگر جنونی قاتل حیرت انگیز طور پر سنبھل چکا تھا۔ بلاشبہ وہ زبردست اسمٹنا کا مالک تھا، اس نے ایک بار پھر چھلانگ لگائی اور اسے دبوچنا چاہا مگر فوزیہ اپنی جگہ سے ہٹ چکی تھی وہ دروازے سے جا کھڑا۔ جنونی قاتل کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فوزیہ کی زبردست مزاحمت جہاں اسے لطف دے رہی تھی وہیں اس کے اشتعال میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسے دبوچنا چاہا۔ اس بار وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔

دونوں اوپر نیچے جھمکتے ہوئے کرفش پر گرے، فوزیہ نے اس کی گرفت سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی، یہ قاتل کے ہاتھوں میں اس کی بائیں ٹانگ تھی۔ اس نے دوسرے پاؤں کی ٹھوک قاتل کے منہ پر ماری۔ قاتل کے منہ سے تسکین نکلی۔ اس کے ہونٹ زخمی ہو چکے تھے۔ فوزیہ چپٹی چھلی کی طرح اس کی گرفت سے نکل چکی تھی۔

”بہت خوب! چوہے ملی کے اس کھیل میں مزہ آ رہا ہے۔“ اس نے فوزیہ کو مخاطب کرتے ہوئے جست لگائی اور اسے اپنی مضبوط ہاتھوں میں دبوچ کر بیڈ کے قریب لے جا کر بیڈ پر بیٹھے ہوئے خود بھی اس پر چھلانگ لگادی۔

لگے۔ کچھ ہی روز میں اس کے زخم بھرنے لگے اور وہ خاصا بہتر نظر آنے لگا۔ لیکن اسے مکمل صحت یاب ہونے میں خاصا وقت لگ گیا۔

وہ دونوں باپ بیٹی بہت مہربان تھے۔ انہوں نے اس کی کسی اپنے کی طرح دیکھ بھال کی۔ محمود نے صحت یاب ہوتے ہی جانے کی اجازت طلب کی اور کہا۔ ”اب میں اپنے گاؤں جاؤں گا نہ جانے فوریہ کس حال میں ہوگی، کہیں اس کے ظالم باپ نے اسے مار نہ دیا ہو۔“

”جاؤ بیٹا خدا تمہارا حامی و ناصر ہو لیکن اپنا خیال رکھنا کیونکہ جس طرح کے حالات تم نے بتائے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔“ ہارون رشید نے کہا اور محمود ان دونوں باپ بیٹی سے مل کر وہاں سے نکل گیا۔

وہ پیدل سفر کر رہا تھا اس لئے اپنے گاؤں تک پہنچنے سے شام ہو گئی۔ وہ گاؤں کی حدود میں داخل ہوا وہی تھا کہ نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دی، یہ چیخیں ایک جیب سے سنائی دے رہی تھیں جو خاصے فاصلے پر گرد آرائی ہوئی اس کے راستے پر آ رہی تھی، اس نے جہی سڑک کے کنارے بڑے چند پتھر اٹھائے اور ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا، سڑک ٹوٹی پھوٹی اور ناگفتہ حالت میں تھی اس لئے جیب کی رفتار خاصی کم تھی۔ جیب کی پچھلی نشست پر دو رائفل بردار موجود تھے۔ ان کے بیچ ایک سبھی ہوئی خوب صورت لڑکی تھی۔

فرنٹ سیٹ پر سردار سکندر کا دست راست سہراب موجود تھا۔ جبکہ ایک محکمہ خیمہ خیمہ ڈرائیور جیب ڈرائیور کر رہا تھا۔ غالباً وہ اس لڑکی کو زبردستی اغوا کر کے لے جا رہا تھے اور لڑکی اپنے بچاؤ کے لئے چیخ چلا رہی تھی۔ اس کی چیخ و پکار گاؤں کے اگر کسی فرد نے سنی تھی ہوگی تو اس کی ہمت نہیں ہوگی کہ سردار سکندر کے کارندوں کا راستہ روکتا۔ جیب جیسے ہی اس کے قریب پہنچی۔

محمود نے درخت کی آڑ سے نکل کر ایک پتھر پوری قوت سے جیب کی طرف پھینکا اور دوبارہ درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ پتھر خاصا دھڑلے سے ٹکرایا تھا۔ اور پوری قوت

رہی۔ شاید تمہاری زندگی باقی تھی۔“ وہ بولتی چلی گئی۔

غالباً وہ اکثر لڑکیوں کی طرح باتوئی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے لئے کسی فرشتے سے کم نہیں تھی۔ اسی وقت ایک ادھیڑ عمر دراز قد و درزی جسم کا مالک شخص کمرے میں داخل ہوا اور ان کی طرف بڑھا۔ ”پاپا یہ ہوش میں آگئے ہیں۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”اور تم نے اس کے ہوش میں آتے ہی اس کے کان کھانا شروع کر دیئے۔“ اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو آپ کے خیال میں، میں بہت بولتی ہوں۔“

اس نے منہ پھیلاتے ہوئے کہا۔

”ارے بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ وہ لڑکی کے سر پر چپت مارتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھا۔

”ایک من سب سے پہلے ہم اپنا تعارف کرواتے ہیں پھر تمہارے بارے میں تفصیل سے جانیں گے۔ میرا نام ہارون رشید ہے اور میں ریٹائرڈ فوجی ہوں، یہ میری بیٹی ہے، میمونہ اسے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ اس لئے میں اسے شہر لے گیا تھا یہ بہت ذہین بچی ہے۔ اپنی ذہانت سے اس نے اپنے مقصد کو پایا۔ پچھلے سال اس کی ماں اور میری بیوی کا انتقال ہو گیا۔ یہ بہت افسردہ اور ملول تھی۔ میں اسے کچھ دن کے لئے آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے اپنے اس گاؤں فیروز آباد لے آیا۔ یہ میرا آبائی گاؤں ہے۔ یہیں میرے آباؤ اجداد اپنی آخری آرام گاہوں میں موجود ہیں۔ اس روز اتفاق سے میں دریا پر جا پہنچا اور تمہیں دریا میں بہتے دیکھا۔“ وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

”میرا نام محمود ہے۔“ زخمی شخص نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے خیمہ آواز میں اپنی روداد سنا ڈالی۔ جسے وہ دونوں باپ بیٹی حیرت اور دلچسپی سے سنتے رہے۔

”واؤ فٹنکاسٹک یہ تو کوئی بالکل فلمی سچویشن ہے۔ ہیرو ہیروئن اور ظالم سامراج۔“ میمونہ نے شرارتی انداز میں کہا اور محمود مسکرا اٹھا۔

فیروز آباد نامی یہ گاؤں اس کے گاؤں سے کچھ کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کے شب و روز وہیں گزرنے

بردار سکتے زندہ سے لڑائی دیکھنے میں مجھتے۔

محمود نے ایک طرف جست لگائی، وہاں سہراب کے ہاتھوں سے گرا ہوا پسل پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ رانقل بردار سنبھلتے بے درپے دو فائر ہوئے۔ ایک گولی ایک رانقل بردار کی پیشانی میں جبکہ دوسری گولی دوسرے کے سینے میں دل کے مقام میں پیوست ہو گئی۔ محمود دوبارہ سہراب پر پل پڑا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سہراب کسی حقیر کپکپے کی طرح زمین چاٹ رہا تھا۔ ”بتاؤ فوزیہ کہاں ہے ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ وہ اس کی کپٹی پر پسل کی نال رکھتے ہوئے بولا۔

”میں سب کچھ بتا دوں گا مجھے مارنا مت۔“ موت کو سامنے دیکھ کر سہراب گھکھکیا اور تمام رو دودیا بن کر ڈالی۔ اکتیس دسمبر کی رات کس طرح آسیہ کی روح نے آفتاب کو مار ڈالا اور سردار سکندر اہل خانہ کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا پھر پتہ چلا کہ فوزیہ بھی راستے میں سکندر کی گاڑی سے بھاگ نکلی تھی، تاہاں اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ ”تم اگر زندہ رہے تو نہ جانے کتنے گھر اجاڑو گے۔“ محمود نے سفاک لہجے میں کہا اور ٹریگر دبا دیا۔ پسل سے نکلنے والی گولی سہراب کی کپٹی میں جا گھسی۔

لڑکی انہیں آپس میں برسر پیکار ہوتا دیکھ کر آڑا ہونے ہی بھاگ نکلی تھی۔

اب مجھ کو فوزیہ کی تلاش میں شہر جانا تھا۔ اس کے پاس نہ ہی رقم تھی اور نہ کوئی گاڑی پیدل سینکڑوں کلومیٹر جانا ناممکن تھا۔ اس کا حل بھی اس کے دماغ نے سوچ لیا۔ اور وہ مغرب کی سمت چل دیا۔ وہاں سے ایک ریلوے لائن گزرتی تھی۔ اس نے سوچا اگر قسمت نے ساتھ دیا تو کسی چلتی ہوئی ٹرین میں سوار ہو جائے گا۔ دورے ریلوے ٹریک نظر آرہی تھی۔ پھر ٹرین کے وصل کی آواز سنائی دی اس نے دوڑنا شروع کر دیا اور عین اس وقت ریلوے لائن پر پہنچے میں کامیاب ہو گیا۔ جب گاڑی دھیمی رفتار سے وہاں سے گزر رہی تھی۔ یہ مال گاڑی تھی۔ اس کی رفتار کم تھی۔ اس نے مال گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کی اور مشکل اس میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس کے افسانے سے بے

سے پھینکا گیا تھا۔ اور ڈرائیور کی بد قسمتی کہ پھر اس کے سر پر لگا۔ وہ کرینا کے انداز میں چیخا اور اسٹیرنگ پر لڑھک گیا۔ جیب اس کے کنٹرول سے باہر ہو کر لہرائی ہوئی سڑک کے کنارے ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔ جیب چونکہ آہستہ تھی اس لئے ڈرائیور کے علاوہ کسی کو بھی جسمانی چوٹ نہیں لگی۔

لہجائی جھکے سے سنبھلتے ہی سہراب جیب سے اتر اور ہولشٹر سے پسل نکال کر پھر پھینکنے والے کو چند ناقابل اشاعت گالیاں دے کر لٹکارا۔ ”بزدل اب چھپ کیوں گیا ہے ہمت ہے تو باہر نکل۔“

محمود درخت کی آڑ سے نکلا اور اس کی طرف بڑھا۔ سہراب حرمت سے اچھل پڑا۔ ”تم تم زندہ ہو؟“ وہ استعجاب انگیز حرمت سے بولا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سردار سکندر نے محمود کے پیٹ میں خنجر پیوست کیا تھا۔ پھر اس کے سامنے ہی محمود اس بلند بالا پہاڑ سے دریا میں جا گرا تھا۔ ”ہاں میں تم سب کی موت! اب تمہارے ظلم کے دن گنے جا چکے ہیں۔“ محمود نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”موت کو سامنے دیکھ کر تم پاگل ہو چکے ہو؟“ سہراب ہنسا اور ٹریگر دبا دیا۔

محمود بجلی کی سی تیزی سے ایک پاؤں کی ایڑی پر گھوما، دوسرے پاؤں کی ٹھوکرنے سہراب کے ہاتھوں سے پسل اڑا دیا۔ سہراب اس پر جھپٹا مگر محمود کے طاقتور گھونٹنے نے اسے زمین چٹا دی۔ وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا، دونوں رانقل بردار لڑکی کو چھوڑ کر جیب سے اترے اور ٹریگر دبانے چاہا۔ ”نہیں رک جاؤ میں اسے خود سبق سکھاؤں گا۔ اس نے سہراب پر ہاتھ اٹھایا ہے۔“ وہ غصے سے دہاڑا اور کسی جنگلی تیل کی طرح محمود پر پل پڑا۔ اس کی آہنی ضربات کو محمود نے با آسانی اپنے جسم پر سہا اور اچھل کر جب سائیڈ تک اس کے سینے پر رسید کی وہ تقریباً اڑتا ہوا سا جیب کے بوٹ سے ٹکرا کر اداہیں پلٹا، محمود نے دائیں ایڑی پر ٹھوم کر ہوشیار ورن کو بیخ اس کی کپٹی پر رسید کیا۔

سہراب کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، وہ نشے میں دھت شربانی کی طرح ڈول رہا تھا۔ دونوں رانقل

نیا ز مال گاڑی لمحہ بہ لمحہ رفتار پکڑتی جا رہی تھی۔ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد جب مال گاڑی شہر کے اسٹیشن پر رکی تو صبح ہو چکی تھی وہ خاموشی سے ریلوے ٹریک پر اتر اور کافی لمبا چکر لٹ کر ریلوے اسٹیشن کی حدود سے باہر نکل گیا۔ یہ روڈ نیوں کا شہر اس کے لئے ابھی تھا۔ جہاں لوگوں کا ایک اثر دہام عام تھا۔

سڑکوں پر گاڑیوں کا ایک جھوم تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فوڈی کو کہاں ڈھونڈے وہ تو اللہ پر توکل کر کے شہر پہنچ گیا تھا۔ کئی گھنٹوں سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ اسے پیاس کے ساتھ ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ جیب میں پھوڑی کوڑی تک نہیں تھی۔ وہ ایک سادہ لوح دیہاتی تھا کسی سے مانگتے ہوئے یا چوری کرنے کی اس کا ضمیر اجازت نہیں دے رہا تھا۔ سڑک کنارے نصب ایک پانی کے نلکے سے پانی پیا۔ اور کچھ دیر پارک میں گزاری، اس اثنا میں اذان کی آواز سنائی دی، وہ پارک سے نکل کر مسجد میں چلا گیا۔ باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد صدق دل سے دعائیں کر مسجد سے نکل کر ایک طرف چل دیا۔ اس کی کوئی منزل کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ شہر کی انجان سڑکوں پر پیدل چل رہا تھا کہ اچانک ایک گاڑی کے بریک چڑچڑائے تو وہ چونک کر مڑا اور جہاں کتاہاں کھڑا رہ گیا اس سے کچھ فاصلے پر ڈبل کمبن وین کھڑی تھی جس میں ڈرائیور سمیت چار افراد موجود تھے۔ دو کے ہاتھ میں رائفیں جبکہ فرنٹ سیٹ پر موجود شخص خالی ہاتھ تھا۔ وہ کوئی اور نہیں اس کے انزلی دشمن کا بیٹا نوید تھا۔ جو خشکیوں نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

دراصل نوید اسے کارندوں کے ساتھ وہاں سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر سڑک کے کنارے چلتے محمود پر پڑی۔ اس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دے دیا۔ رائفل بردار افراد نوید کے اشارے پر گاڑی سے اترے اور محمود نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ وہ دونوں رائفل بردار بھی اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ سڑک پر موجود لوگ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کے ہاتھوں میں موجود رائفلوں کی وجہ سے کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ انہیں روکتا۔

بھاگتے بھاگتے ان میں سے ایک نے فائر بھی کیا اور خوش قسمتی سے اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔

ادھر نوید کے اشارے پر ڈرائیور نے گاڑی بھی محمود کے پیچھے دوڑا دی تھی۔ وہ محمود کے زندہ نظر آنے پر حیران تھا اور اسے ہر قیمت پر قتل کر دینا چاہتا تھا۔ گزشتہ روز حویلی سے کی جانے والی فون کال میں سردار سکندر کو اطلاع دی گئی تھی کہ گاؤں میں موجود سہراب سمیت اس کے دیگر کارندوں کو کسی نے قتل کر دیا تھا اس وقت تو وہ نہیں سمجھے کہ کس نے سکندر کے کارندوں کو ہلاک کرنے کی ہمت کی ہے۔ اب محمود کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ انہیں ضرور محمود نے ہی مارا ہوگا۔

محمود بھاگتے ہوئے ایک گلی میں کھس چکا تھا۔ یہ تنگی سی گلی تھی جس میں کسی گاڑی کا داخل ہونا ناممکن تھا۔ رائفل بردار اس سے خاصے فاصلے پر تھے پھر یہ گلی داہنی سمت مڑ گئی۔ دوسری گلی خاصی کشادہ تھی۔ یہ پوش علاقہ تھا۔ دونوں اطراف خوب صورت بنگلے بنے ہوئے تھے۔ محمود نے پلٹ کر دیکھا۔ رائفل بردار اب تک اس کے پیچھے اس گلی میں نہیں پہنچے تھے۔ اس نے سوچا اگر اسی طرح بھاگتا رہا۔ تو ان مسلح افراد کے ہاتھ چڑھ جائے گا اور نوید اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ جان بچانے کے لئے کسی کے گھر کو دو جائے، یہ سوچتے ہی اس نے ایک بنگلے کی احاطے کی دیوار پھلانگی اور اندر داخل ہو گیا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ مختلف پھولوں کے پودے تھے۔ وہ کیاری میں ان پودوں کے نیچے چھپا ہوا تھا، گلی میں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی اور قدموں کی چاپ اس بنگلے کے گیٹ کے سامنے رکی اور کسی شخص کی درشت آواز سنائی دی۔

”وہ خبیث کہاں چلا گیا۔ میرے خیال میں وہ ان بنگلوں میں سے کسی میں پناہ لے چکا ہے۔“

ایک دوسری آواز سنائی دی۔ ”پھر کیا کریں۔“

وہ چھوٹے سردار آ رہے ہیں ان سے مشورہ کرتے ہیں، وہ جیسا کہیں گے ویسے ہی کریں گے۔“ ان میں سے ایک نے کہا اور پھر ان کے جانے کی آواز سنائی دی۔

تمہارے دشمنوں کو نال کر آتا ہوں۔“ وہ شخص اسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ محمود جلدی جلدی کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ اس نے بیڈ کے نیچے چھانکا۔ لکڑی کی بھاری بھر کماری کو کھول کر دیکھا۔ مگر واقعی کمرہ خالی تھا۔ اس شخص کی واپسی تین چار منٹ بعد ہوئی۔

”وہ واقعی خطرناک لوگ تھے میری بات پر یقین نہیں کر رہے تھے کہ تم یہاں نہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں ٹالا ہے۔ تم کچھ دیر یہیں ٹھہرو پھر ان کے جانے کے بعد چلے جانا۔“ اس شخص نے کہا۔

”میرا نام محمود ہے؟ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟“

”تمہارا میرے بارے میں جاننا ضروری نہیں۔ ویسے بھی کون سا ہمیں دوبارہ ملنا ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ میں تمہیں باحفاظت باہر نکالتا ہوں۔“ وہ شخص رکھائی سے بولا۔ اور اسے لئے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہاں ایک کار موجود تھی۔ ”تم عقبی نشست پر لیٹ جاؤ، تاکہ تمہارے دشمن باہر ہوں تو تمہیں دیکھ نہ سکیں۔“ وہ شخص کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

محمود سب کچھ لیٹ کر نشست پر لیٹ گیا۔ اس شخص نے ہینکے کا پیر ونی دروازہ کھولا اور گاڑی باہر نکال کر دروازہ مقفل کر کے گاڑی میں آ بیٹھا، راستے میں نوید اور اس کے کارندے کہیں بھی دکھائی نہ دیئے۔ اس کی نظر پچھلی نشست پر لیٹے ہوئے گاڑی کے پائیدان پر پڑی وہاں ایک خوب صورت ساموئل فون پڑا تھا۔ نہ جانے محمود کے دل میں کیا آئی کہ موبائل فون اٹھایا اور اسنے کرتے کی سائیڈ کی جیب میں ڈال دیا۔

یہ موبائل فون فوزیہ کا تھا۔ جو قدیر خان نے اسے لے کر دیا تھا۔ جنونی قاتل نے اسے بے ہوش کر کے مہران کار سے اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالا اور اپنی کمین گاہ میں پہنچ کر جب اسے اٹھانے لگا تو فوزیہ کے لباس سے موبائل فون نکل کر پچھلی نشست کے پائیدان میں جا گرا۔ جنونی قاتل کو اس بات کی خبر نہ ہو سکی۔

”تمہارے دشمن موجود نہیں اب تم اٹھ کر بیٹھ سکتے

محمود اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ ٹھک کر رک گیا۔ اندر ایک کمرے سے کسی لڑکی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یہ آواز اور دلچسپ فوزیہ کا لگ رہا تھا۔ وہ نوید کا ڈر بھول کر بے دھڑک کمرے سے ہوتا ہوا کوریڈور میں داخل ہوا اور اس کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ جس سے چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ اندر خاموشی چھا گئی۔ مگر کمرے کا دروازہ نہیں کھلا اس نے دوبارہ دستک دی۔ ”کون ہے؟“ اندر سے بھاری لب و لہجے میں پوچھا گیا۔

”دروازہ کھولو۔“ وہ غراہٹ آمیز آواز میں بولا۔

دروازہ کھولنے پر تاخیر پر اس کا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ اور پھر دروازہ کھلا اور ایک تنومند شخص باہر نکلا چلی داڑھی اور موٹے فریم کی عینک پہنٹی ہوئی تاک کے ساتھ وہ عجیب بیبت کا شخص دکھائی دیتا تھا۔ ”کون ہو تم؟ اور میرے گھر میں اس طرح کیوں گھسے ہو؟“ وہ شخص آگ بگولا ہو گیا۔ لیکن محمود اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے اس کمرے سے کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز سنائی دی تھی۔ بتاؤ وہ لڑکی کہاں ہے؟“ محمود کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا۔

مگر اس وقت اس کمرے میں اس شخص کے علاوہ کوئی بھی موجود نہ تھا، بی وی ٹرائی پر رکھے بی وی پر ایک ہار فلم چل رہی تھی۔ ”اودہ تو یہ بات ہے۔ اس ہار فلم میں لڑکی کی چیخیں سن کر تم نے میرے دروازے پر دستک دی۔“ وہ شخص مسکرایا۔ اور محمود کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات نظر آنے لگے پھر وہ ایک دم چونکا بیڈ کی ٹمکن آلود چادر پر کانچ کی کچھ چوڑیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔

”اب بتاؤ تم کون ہو؟ اور میرے گھر میں اس طرح گھسنے کا مطلب کیا ہے؟“ اس شخص نے اسے غضب ناک تیوروں سے گھورا۔

”میری زندگی خطرے میں ہے اور میرے کچھ دشمن میرے پیچھے پڑے ہیں۔ ان سے جان بچانے کے لئے میں تمہارے گھر میں داخل ہوا تھا۔“ محمود نے جواب دیا۔ اور اس شخص کے چہرے کے تاثرات نابل ہو گئے۔ اسی وقت ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ ”تم یہیں ٹھہرو میں

کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

جنونی قاتل لمحہ بہ لمحہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ چیخ رہی تھی اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، جنونی قاتل ہڑبڑا کر اس سے الگ ہوا اب اس کی آنکھوں میں تشویش کے آثار تھے۔ فوزیہ نے دوبارہ چننا چاہا۔ مگر قاتل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اسے دیوبچ کر کمرے کے ایک کونے میں لے گیا۔ وہ جھلی مگر جنونی قاتل کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

ادھر دروازے پر کوئی مسلسل دستک دے رہا تھا۔ جنونی قاتل نے دیوار کے ایک کونے میں نصب جھوٹا سا لیور دیا یا سر کی آواز کے ساتھ فرش چار بانی چار کے قریب سرک گیا اس نے فوزیہ کو نمودار ہونے والا خلا میں دھکیلا اور لیور دوبارہ دبا دیا۔ فرش خود کار طریقے سے سرک کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ چکا تھا۔

جنونی قاتل نے ٹی وی اشارت کی۔ اس چینل پر اس وقت ہار فلم چل رہی تھی۔ اس نے اپنا لباس درست کر کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے محمود موجود تھا جو اتفاق سے وہاں پہنچ چکا تھا پھر وہ نوید کے کارندوں کو ٹالنے کے بعد اسے اسے گھر لے گیا تاکہ وہاں آ کر اپنا ادھورا کام پورا کر سکے۔

ادھر فوزیہ چیختی ہوئی اس تہہ خانے میں جا گری۔ اسے معمولی چونٹیں آئی تھیں۔ تہہ خانے میں گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں، تہہ خانے میں شدید بو اور بساندہی اس کا جی متلانے لگا وہ چند قدم آگے بڑھے یہ تھی کہ کسی گول چیز سے ٹھوکر کھا کر گری اس نے ٹٹول کر دیکھا تو یہ تریوز نما شے تھی۔ ہاتھ پھیرنے اور فور سے دیکھنے پر وہ بے ساختہ چیختی چلی گئی اس کا سارا جسم سننا اٹھا تھا۔ یہ انسانی سر تھا جس سے بے شمار گیس لنگ رہی تھیں، اس تہہ خانے میں ایسے بے شمار ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ یہ سب ان مظلوم عورتوں کے سر تھے۔ جو اس جنونی قاتل کا شکار بن چکی تھیں۔ ان میں سے بہت سے انسانی سر خالصے پرانے

ہو۔ اس شخص نے کہا اور محمود اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جنونی قاتل نے اسے اپنے علاقے سے کافی دور اتارا اور دوبارہ اپنی کمین گاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

نقدیر کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں، محمود اپنی عزیز جان محبوبہ تک پہنچ کر وہاں لوٹ آیا تھا اور اب جنونی قاتل واپس جا کر اس کا مشر خراب کرنے والا تھا۔ اس کی گاڑی کے جاتے ہی محمود نے اسے کرتے کی جیب سے موبائل فون نکالا۔ کسی قدر خان نامی شخص کی دس مس کال تھیں۔ وہ بیچارہ اب تک اس بات سے لاعلم تھا کہ یہ موبائل فون اسی فوزیہ کا ہے جسے ڈھونڈنے کے لئے وہ گاڑی سے شہر آیا ہے۔ اس نے موبائل فون جیب میں رکھنا چاہا اسی وقت موبائل فون بجا۔

”فوزیہ بیٹی کہاں ہو تم؟“ دوسری طرف سے جیانی لہجے میں کہا گیا اور محمود حیرت سے اچھل پڑا۔

”جی میں محمود بول رہا ہوں۔“

”یہ موبائل فون میری بیٹی کا ہے، تمہیں کہاں سے ملا؟“ دوسری طرف سے قدیر خان نے پوچھا۔ اور محمود نے اسے بتایا کہ کس طرح وہ دشمنوں سے اپنی جان بچانے کے لئے ایک گھر میں گھسا اور وہاں کیا ہوا اور موبائل فون اس کے ہاتھ کیسے لگا۔

”تم کہاں ہو جلدی بتاؤ؟“ قدیر خان نے پوچھا۔

”سر میں اس علاقے کا واقف نہیں۔“

”تمہارے آس پاس کوئی خاص جگہ یا مقام ہو تو بتاؤ؟“

”سر میں جہاں کھڑا ہوں وہاں سڑک کی دوسری طرف اشارہ ٹیٹورنٹ ہے۔“

”اوکے تم وہیں ٹھہرو میں آتا ہوں۔“ قدیر خان نے غلبت میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

محمود اب تک نہیں سمجھا تھا کہ یہ اس کی محبوبہ فوزیہ کی بات کر رہا ہے وہ اس سوچ میں تھا کہ ہو سکتا ہے قدیر خان کی بیٹی کا نام بھی فوزیہ ہو اور پھر قدیر خان نے یہ بھی تو کہا تھا کہ میری بیٹی کا موبائل تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ وہ وہیں رک کر اچھے ہوئے ذہن سے قدیر خان کا انتظار

تھے۔ ان ہی کئے ہوئے سروں کی بدولاد اور بساں اس تہہ خانے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ خوف و ہست سے لرز رہی تھی۔ یہ وسیع و عریض ہال ماتہ خانہ تھا۔ جس میں جا بجا انسانی سر پڑے تھے۔ وہ ان سروں کو دیکھتے ہوئے ڈراور خوف سے چیخ رہی تھی۔ اور یہ سوچ کر خوف سے کانپ رہی تھی کہ اس جنونی قاتل کے دوبارہ یہاں پہنچنے ہی اس کا سر بھی ان کئے ہوئے سروں کے درمیان پڑا ہوگا۔

وہ کافی دیر تک ان سروں سے نگرانی کرتی پڑتی اس تہہ خانے میں گھومتی رہی، اچانک اس کی نظر داہمی سمت کی دیوار پر نصب روشن دان پر پڑی اور روشن دان زیادہ بلند نہیں تھا۔ اور اس میں لگے سریے رنگ آلود تھے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ان سروں پر زور آزمائی کرنے لگی۔ اپنی اس کوشش میں اس کے ہاتھ زخمی بھی ہوئے۔

جب زندگی داؤ پر لگی ہو تو انسان جان بچانے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ اس نے بھی ہمت نہیں ہاری اور بلا خراس کی کوشش بار آور ثابت ہوئیں۔ وہ لوہے کی ایک سلاخ کو اکھاڑنے میں کامیاب ہوئی۔ اب اس نے دوسری سلاخ پر زور آزمائی شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد وہ اس سلاخ کو بھی اپنی جگہ سے اکھاڑ چکی تھی۔

فوزیہ اپنی پتی مگر کی بدولت اس روشن دان سے باہر نکل آئی اور خود کو اس گھر کے عقب میں گھنی جھاڑیوں میں پایا۔ اسی وقت اسے محسوس ہوا کہ تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہے۔ گویا جنونی قاتل لوٹ آیا تھا اور تہہ خانے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے بہت دور آگئی۔ بھاگتے ہوئے وہ مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی کہیں جنونی قاتل اس کے پیچھے تو نہیں ایک بار جو اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

اچانک کسی گاڑی کے بریک چڑھائے۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ کر بروقت بریک لگائے تھے لیکن اس کے باوجود بھی اس کا جسم سامنے سے آنے والی کار سے ٹکرایا اور وہ ہوش دھواں سے عاری ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ اس ریسٹورنٹ کے باہر کھڑا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے مہران کا راپنی طرف آئی دکھائی دی۔ یہ قدری خان اور

محمود نے انسپکٹر شاہد علی کے استفسار سے اس گھر کا محل وقوع تفصیل سے بتایا۔ جہاں جنونی قاتل رہتا تھا اور وہ تینوں اسی مہران کار میں جنونی قاتل کے گھر پہنچ کر گئے۔ انسپکٹر نے اپنے افسران اہلی کو اطلاع دے دی تھی اور قدیر خان نے اپنے ساتھی رپورٹر پرویز کو فون پر اطلاع دے کر کہا وہ فونو گرافر کے ہمراہ جنونی قاتل کی رہائش گاہ تک پہنچ جائے۔ وہ کچھ ہی دیر میں اس جنونی قاتل کے گھر پہنچ چکے تھے، لیکن انہیں نہ ہی فونو ریلی اور نہ ہی وہ جنونی قاتل۔ کچھ ہی دیر میں پولیس اور میڈیا سے متعلق افراد بھی آچکے تھے۔ بلا خرد وین پولیس انسپکٹر شاہد علی نے تہہ خانے دریافت کر لیا، اندر جاتے ہی ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جا بجا کئی عورتوں کے کئے ہوئے سر پڑے تھے جن سے رئیس لٹک رہی تھیں۔ پولیس فونو گرافر دھڑا دھڑ تصویریں کھینچ رہے تھے۔ قدری خان کا کچھ ٹی وی چینل لائیو ٹیلی کاسٹ کر رہا تھا۔ پرویز اس چینل کے ساتھ ساتھ تھا۔ گھر کی مکمل تلاشی لی گئی۔ لیکن قاتل کی کوئی شناخت نہ مل سکی، کئے ہوئے انسانی سر مردہ خانے بکھوادے گئے اور کوشی سیل کر دی گئی۔ محمود، عابد خان اور شاہد علی کے ہمراہ جنونی قاتل کی رہائش گاہ سے باہر آچکا تھا۔ ”جوان تم نے کہاں جانا ہے ہمارے ساتھ چلو، ہم تمہیں چھوڑتے ہوئے نکل جائیں گے۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”سر میں اس شہر میں انجینی ہوں، میرا یہاں کوئی نہیں، میں کسی کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور اتفاق سے اس جنونی قاتل تک جا پہنچا اور اتفاق کی بات یہ بھی ہے کہ مجھے جس لڑکی کی تلاش ہے اس کا نام بھی فوزیہ ہے۔“ محمود نے کہا اور قدری خان چونک پڑا۔ ”تو پھر ایسا کرو میرے ساتھ میرے گھر چلو وہیں تمہاری کہانی بھی سنوں گا۔ ویسے بھی تم اس جنونی قاتل کو دیکھ چکے ہو۔ گویا تم اس کیس کے کوہ بھی ہو۔“ قدری خان نے کہا اور اس کے منع کرنے

ڈریسنگ کی اس نے ہوش میں آتے ہی اپنا نام فوزیہ بتایا ہے اور آپ کا نمبر دے کر کال کرنے کو کہا وہ نہ جانے کیوں بہت خوفزدہ نظر آ رہی ہے۔ پلیز آپ جلدی آجائیں۔ میری اہلیہ بھی بچوں کے ساتھ اپنے میکے گئی ہیں۔“ اشتیاق احمد نے کہا۔

”آپ اپنا ایڈریس بتائیں۔“ قدیر خان نے کہا اور اشتیاق احمد نے اپنا ایڈریس بتا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

”شکر ہے فوزیہ خیریت سے ہے۔“ قدیر خان نے کہا اور ثریا اور محمود کو دکھایا کہ ان کی اشتیاق احمد سے کیا گفتگو ہوئی۔ پھر انہوں نے شاہد علی کو فون کر کے تمام تفصیلات بتائیں۔

”آپ گھر پر ہی رہیں میں فوراً آ رہا ہوں۔“ اسپیکر شاہد علی نے کہا۔ ”اے ایچ او اور اعلیٰ کومت بتانا یہ نہ ہو وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔“ قدیر خان نے کہا۔ ”اوہ تو آپ اب تک ایس ایچ او صاحب کو قاتل سمجھ رہے ہیں۔“ شاہد علی ہنسنا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

قدیر خان نے دوسری کال پر پردیو کی اور اسے تمام صورت حال بتا کر کہا کہ وہ بھی وہاں پہنچ جائے تاکہ فوزیہ سے بیان کے بعد جنونی قاتل پر ہاتھ ڈالا جاسکے۔ شاہد علی تقریباً بیس منٹ بعد پہنچا تو وہ دونوں تیار ہی بیٹھے تھے۔ آگے کا سفر انہوں نے تیز رفتاری سے طے کیا۔ اشتیاق احمد کی جہاں رہائش تھی وہ جنونی قاتل کی کمین گاہ سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ شاہد علی نے گاڑی اشتیاق احمد کے گھر سے کچھ فاصلے پر روکی۔ اس کے گھر کے قریب ایک ہنڈا اکارڈ کھڑی تھی ابھی وہ تینوں گاڑی سے اترے ہی تھے کہ اشتیاق احمد کے گھر سے فائر کی ہولناک آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فوزیہ کی چیخ بھی سنائی دی۔

وہ تینوں گھر کی طرف بھاگے دروازہ اندر سے لاک تھا۔ وہ تینوں احاطے کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گئے۔ کسی بھی ناخوشگوار صورتحال سے نمٹنے کے لئے شاہد علی نے اپنا ہسٹل نکال لیا تھا جبکہ محمود اور قدیر خان خالی ہاتھ تھے، اسی وقت فوزیہ کی چیخ پھر سنائی دی۔ وہ تینوں انجام سے بے پرواہ کوریڈور میں بھاگتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہو گئے جہاں سے فوزیہ کی چیخ سنائی دی تھی۔ اسی لمحے فائر

کے باوجود اسے اپنے گھر لے گیا۔ اور ثریا بیگم کو چائے بنانے کو کہا۔ انہیں کسی راہ گیر نے گاڑی میں بے ہوش دیکھ کر اسپتال پہنچایا تھا۔

ثریا کے موبائل فون میں قدیر خان کا نمبر دیکھ کر اس راہ گیر نے قدیر خان کو کال کی تھی ثریا نے ہوش میں آتے ہی قدیر خان کو بتایا کہ فوزیہ کو جنونی قاتل نے اغوا کر لیا ہے۔ قدیر خان نے فوزیہ کا نمبر بار بار ڈائل کیا مگر کال ریسیو نہ ہوئی، یہ وہی وقت تھا جب جنونی قاتل اسے اپنی کونجی میں لے جا چکا تھا۔ پھر کافی دیر بعد اس نے فوزیہ کا نمبر ڈائل کیا تو اس کا رابطہ محمود سے ہو گیا۔

ثریا بیگم کے چائے لانے تک محمود نے اپنی روداد تفصیل سے سنا ڈالی تھی۔ فوزیہ بھی اپنی کہانی دونوں میاں بیوی کو بتا چکی تھی اس نے ان سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ قدیر خان سمجھ گئے یہ وہی محمود ہے جس کا ذکر اکثر فوزیہ کرتی رہی تھی۔ ”تم بیٹھو میں ابھی آیا۔“ وہ محمود کو وہیں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں گئے جب واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی، انہوں نے تصویر محمود کے ہاتھ میں تھما دی۔

”یہ تو میری فوزیہ ہے۔“ وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اور قدیر خان نے اسے بتایا کہ کس طرح فوزیہ انہیں ملی اور انہوں نے اسے اپنی بیٹی بنالیا۔

محمود کے دل و دماغ میں آنندھوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فوزیہ اور اس جنونی قاتل کو کہاں ڈھونڈے، کہیں اس جنونی قاتل نے فوزیہ کو قتل تو نہیں کر دیا، یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اسی وقت قدیر خان کا موبائل فون بجا۔ اسکرین پر دیکھا کوئی اجنبی نمبر تھا۔ قدیر خان نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو کیا آپ قدیر خان صاحب بول رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”جی لیکن آپ کون؟“ قدیر خان نے پوچھا۔ ”میں ایڈووکیٹ اشتیاق احمد ہوں۔ آج جب میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا ایک لڑکی میری گاڑی سے ٹکرائی، چوٹیں معمولی تھیں میں اسے گھر ہی لے آیا، میرے پردوں میں ڈاکٹر شیر علی ہیں انہوں نے لڑکی کی

جھٹکا دیا۔ محمود اس کے اوپر سے اڑتا ہوا سا ایک طرف جاگرا، جنونی قاتل قلابازی کھا کر کھڑا ہو چکا تھا اور مارشل آرٹ کے کھلاڑیوں کے سے اسٹائل سے اسٹائل بنائے کنگ فو کی ہارس پوزیشن میں کھڑا تھا، محمود نے پینترا بدلتے ہوئے چھلانگ لگائی اور زوردار جھپ سائیڈ کلک اس کے سینے پر رسید کی، جنونی قاتل نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور کامیابی سے ہلاک کرتے ہوئے زوردار گھونڈہ محمود کے چہرے پر رسید کر دیا اور ساتھ ہی اپنا اپنا گھٹنا محمود کی دو ٹوں ٹانگوں کے بیچ مارا۔

محمود کے قتل سے دہلی دہلی سی چیخ نکلی اور درو کی کٹیلی کی لہر اس کے پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ محمود نے دانت پیستے ہوئے ٹھٹھکی کا وار اس کی ناک پر کیا۔ وہ چہرہ کا رخ بدل کر اس کا وار خطا کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ساتھ ہی ایک زوردار ریخ رسید کیا محمود کے جڑے پر پڑا۔ اس کا دماغ جھنجھٹا اٹھا اس جنونی قاتل کا ہاتھ خاصا بھاری تھا۔ محمود نے اس کا وار اسی پر اٹلتے ہوئے اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کی زیر ناک جڑیا۔ وہ بلبلایا کرایک قدم پیچھے ہٹا، پھر روکے کے بل جھٹک گیا۔ محمود بچوں کے بل اچھلا اور اس کی کہنی کا وار جنونی قاتل کی پشت پر پڑا۔ جنونی قاتل نیچے گرے اور مغلظات بکتا ہوا انھنے کی کوشش کی مگر محمود اس کے سر کے بال جکڑ کر اس کا سر اٹھا کر زمین پر پھینچ چکا تھا۔ جنونی قاتل کی ناک فرش سے ٹکرائی اور پورے بدن کو جھٹکا سا لگا۔ محمود نے تب تک اپنا ہاتھ نہیں روکا جب تک جنونی قاتل کا ترپا ہوا بدن ساکت نہیں ہو گیا۔

جنونی قاتل اوندھے منہ فرش پر ساکت پڑا تھا۔ محمود فازیہ کی طرف مڑا تو درخت پر بھی جنونی قاتل کو بے حس و حرکت دیکھ کر اس کے قریب آچکا تھا۔

اچانک کمرے میں بجلی سی کوندی۔ جنونی قاتل کسی جھلاوے کی طرح اچھلا تھا۔ اور محمود پران گرا، اس کا سر زور دار آواز سے محمود کے سر سے ٹکرایا اور محمود کی آنکھوں کے سامنے سورج طلوع ہو گیا۔ اس کے لئے نیم مردہ جنونی قاتل کا لینے لینے یوں اسپرنگ کی طرح اچھلنا استغجاب انگیز تھا۔ مگر یہ وقت سوچنے کے لئے مناسب نہیں تھا۔ اس

ہوا اور پہلے شاہد علی کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ یہ فائر جنونی قاتل نے کیا تھا۔ گولی شاہد علی کے پہلے والے ہاتھ میں لگی تھی۔ شاہد علی نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے اٹھنا چاہا، دوسرا فائر ہوا، اس بار گولی شاہد علی کی دائیں ٹانگ میں لگی مگر وہ جیتتا ہوا گر پڑا۔ کمرے میں اشتیاق احمد کی لاش بھی پڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر جنونی قاتل کھڑا تھا۔ اس نے فوزیہ کی گردن سے ہینڈ لاک لگا رکھا تھا اور خود اس کی آڑ میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے پہلے کی نال کا رخ ان کی جانب تھا۔ فوزیہ کے کپڑے جگہ جگہ سے جنونی قاتل کی دست دراز سے پھنے ہوئے تھے۔

”محمود مجھے اس درندے سے بچاؤ۔“ وہ ہدایانی انداز میں چیخی۔

”خبردار آگے مت بڑھنا ورنہ اس لڑکی سمیت تم سب کی لاشیں بچھا دوں گا۔“ جنونی قاتل غرایا۔

شاہد علی ٹانگ میں لٹکنے والی گولی کے باعث بے ہوش ہو چکا تھا۔ محمود اور قدیر خان کی نظریں اس جنونی قاتل پر جمی ہوئی تھیں۔ اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر سوچ رہے تھے اس صورتحال سے کیسے نمٹیں، وہ خطرناک مجرم درجنوں لڑکیوں کا قاتل تھا اور کسی چپیتے کی طرح چوکنا تھا۔ پھر اس جنونی قاتل نے پہلے کا رخ محمود کی طرف کر کے ٹریگرو با دیا۔ مگر وہ برقی سرعت سے ایک طرف ہو گیا۔

جنونی قاتل کا نشانہ خطا ہو چکا تھا۔ بھر کے لئے اس کے بازو کی گرفت فوزیہ کے گلے پر کم ہوئی اور فوزیہ نے اپنی دائیں کہنی کا وار اس کی پسلیوں پر کیا تو وہ کراہتا ہوا پیچھے ہٹا۔ فوزیہ نے چشم زدن میں قریب ہی رکھی میز پر سے بھاری الٹن ٹرے اٹھا کر سر پر ماری، جنونی قاتل کے منہ سے چیخ نکلی اور پہلے ہاتھوں سے نکل گیا، اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

محمود اس کے ہاتھ سے پہلے نکلتا دیکھ کر اس پر جھٹک لگا چکا تھا۔ وہ دونوں سقم گتھا ہو کر گرے، جنونی قاتل نیچے تھا جبکہ محمود اس کے سینے پر بیٹھا گھونڈے برسا رہا تھا۔ اسی جنونی قاتل نے اپنے دونوں ہاتھوں سے محمود کی کلاسیں تھامیں اور بائیں پاؤں کو اس کے سینے پر رکھ کر

بھی تاخیر نہ کی اور پوری قوت سے اس کی آنکھوں میں اگھیاں پھونک کر اس کی آنکھ کی پتلی نوج ڈالی۔
جنونی قاتل چیخ چیخ کر ادھر ادھر پھرتا رہا تھا۔
محمود پر خون سوار ہو چکا تھا۔ یہ انسان نما جانور درجنوں معصوم لڑکیوں کی عصمتوں اور زندگیوں کا قاتل تھا۔ اس نے اپنی تسکین کے لئے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو انتہائی بے رحمی سے مارا تھا۔

محمود نے اپنے بدن کی تمام تر طاقت کو اپنی اگھلیوں میں مرکوز کرتے ہوئے اس کی آنکھ کی پتلی نوج ڈالا، محمود کا ہاتھ لیس دار رطوبت سے لچلچا ہو چکا تھا۔ قاتل کی آنکھیں محمود کی اگھلیوں میں دبی ہوئی تھیں اور کمرہ جنونی قاتل کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ اس کا جسم بری طرح جھٹکے کھارہا تھا۔ محمود نے اس کی آنکھ ایک طرف پھینک کر اس پر گھونسلوں کی بارش کر دی۔ کچھ ہی دیر میں جنونی قاتل کے کس بل ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ وہ نڈھال سے ایک طرف پڑا اگھڑے اگھڑے سانس لے رہا تھا۔

محمود اسے چھوڑ کر فوڑیہ کی طرف بڑھا تو وہ دوڑ کر اس کے سینے سے لپٹ گئی اور کھٹکی لگی۔

اسپیکٹر شاہد علی اور قدیر خان ہوش میں آچکے تھے، بساط کارن پلینٹو کچھ کدو خوشی سے محل اٹھنے بجنی شاہد علی لنگڑا تے ہوئے اٹھا اور نیم مردہ جنونی قاتل کی طرف بڑھا۔

محمود کے ساتھ زور دار جھڑپ میں اس کی نقلی چٹکی داڑھی اکھڑ چکی تھی جسے شاہد علی نے سچ کر اس کے چہرے سے اتارا۔ غیر معمولی بھیلے ہوئے ناک سے اسپرنگ نظر آرہا تھا۔ شاہد علی نے اگھلیوں کی مدد سے ننھا سا اسپرنگ اس کی ناک کے نھتوں سے نکالا اب وہ جنونی قاتل کی گردن ٹول رہا تھا، پھر اس نے ایک معمولی سے ہمار کو محسوس کر کے اس کے چہرے پر موجود جھلی اتار دی، اگھا ہی لمحہ کمرے میں موجود افراد کے لئے حیرت انگیز تھا۔
جنونی قاتل کوئی اور نہیں، قدیر خان کا ساتھی رپورٹر پرویز تھا۔

وہ بری طرح زخمی تھا اور جانتا تھا کہ اب مزاحمت کے قابل نہیں، شاہد علی نے اپنی جیب سے ننھا سا شیپ ریکارڈر

کا وجود جنونی قاتل کے دیوبیکل وجود تلے دب کر رہ گیا۔
اس نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مار مار کر اپنے طاقتور گھونسلوں سے محمود کا بھرکس نکال دیا وہ اس کے چہروں پر گھونسلوں کے ساتھ ساتھ اپنے گھٹنوں سے اس کی لاتوں اور گھٹنوں پر بھی وار کر رہا تھا۔ اس کے چاروں ہاتھ پیر مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ محمود نے سر جھٹکا اور اپنے اوسان ٹھکانے رکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے رقص کرنے لگے تھے اور ذہن پر دھند سی چھانے لگی تھی۔ اس کا پورا چہرہ خون آلود ہو چکا تھا۔
پھر وہ نیم جان ہو گیا اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے، جنونی قاتل نے دو چار گھونسلے اس کے چہرے پر مزید جڑ دیئے اور فاتحانہ انداز میں اس کے ساکت وجود پر سے اٹھا۔ محمود کو اس کے ہاتھوں زیر ہونا دیکھ کر قدیر خان جنونی قاتل پر جھپٹا اس نے گھوم کر زوردار پینچ قدیر خان کی کٹپٹی پر سید کیا۔ قدیر خان لہرانا ہوا کر اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

جنونی قاتل اب خوف سے سہمی ہوئی فوزیہ کی طرف بڑھا اور اس کی کلائی پکڑ لی اور استہزاء سے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”مجھے دنیا کی ہر عورت سے نفرت ہے میں جب تک زندہ ہوں اپنے ہاتھوں سے ہر لڑکی کو اس بے رحمی سے ماروں گا۔“ اس نے جھپٹی چلائی فوزیہ کو فرش پر پینچا اور اسے دیوبچ لیا، کمرہ فوزیہ کی چیخوں اور فریادوں سے گونج اٹھا۔ وہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک محمود کے جسم میں فوزیہ کی چیخوں سے تحریک پیدا ہوئی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور فوزیہ پر سوار جنونی قاتل کو اس کے جسم سے ٹھیکٹ کر اتارتے ہوئے زوردار گھونسلے اس کے چہرے پر سید کیا۔ جنونی قاتل نے سنبھلنے کی کوشش کی، محمود نے اچھل کر بچ فرشت لک اس کے جبرے پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گر اور دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی، محمود فضا میں اچھلا اور محمود کرپے درپے کئی کلکس اس کے جسم پر سید کیس جنونی قاتل دوبارہ گر پڑا، محمود چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جنونی قاتل کے چہرے پر جمائے، اس کی اگھیاں ہونٹوں قاتل کی آنکھوں پر جاملیں، اس نے ساعت بھر کی

کارندہ جنہیں دیکھ کر تمہارا اچھا کرنے لگا، تمہارے اس گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے ہمیں فون کیا اور ہم یہاں پہنچ گئے، یہ گھر اس وقت میرے کارندوں کے گھر سے مل رہا ہے۔” سردار سکندر غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔

”سردار سکندر فوریہ نے مجبوراً گھر سے باہر قدم نکالا۔ یہ سب تمہارے جہلانہ اور فرسودہ رسم و رواج کا نتیجہ ہے۔ تم ایک گمراہ اور ظالم انسان ہوتے کتنے گھروں کو اجاڑا، تمہارے مظالم سے تنگ آ کر خود تمہاری بیٹی نے خودکشی کر لی۔ جاہل انسان تم خود کو مسلمان کہتے ہو لیکن تمہارے پاس میرے اس سوال کا کیا جواب ہے، قرآن ہماری رہنمائی اور ہدایت کے لئے اتارا گیا ہے اور تم نے اپنی جائیداد کا معمولی حصہ بچانے کے لئے قرآن پاک کے ساتھ اپنی بیٹیوں کا نکاح چڑھوایا۔ کاروباری میں اپنی بہو کا قتل کرنے والے بھی تم ہی ہو۔ تم نے جوان بیٹے کی موت سے سبق نہیں سیکھا۔“ محمود بولتا جا رہا تھا۔

”بابا سائیں جلدی سے اپنا کام منٹائیں یہ ہمارا گھر نہیں شہر ہے۔ یہاں گولیاں بھی چلتی ہیں کسی بھی وقت پولیس پہنچنے والی ہوگی۔“ نوید بے چینی سے بولا۔

اسی وقت پولیس موبائل کے ہوٹرز کی آواز گونجی یہ ایک سے زائد پولیس موبائل تھیں۔ پولیس موبائلز کے ہوٹرز کی آواز سن کر سکندر بولھلا گیا اور ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ محمود برقی سرعت سے اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا جبکہ قدیر خان اسے گولی چلاتا دیکھ کر فوریہ کے سامنے آ چکا تھا۔ گولی قدیر خان کے سینے میں لگی۔ وہ دونوں باپ بیٹا بدحواس ہو کر باہر کی طرف بھاگے۔ پولیس نے گھر کو گھیر لیا تھا۔ ان دونوں اور اس کے کارندوں کو روکنے کی کوشش کی گئی، انہوں نے پولیس پر فائر کئے۔ ان کی فائرنگ سے ایک پولیس اہلکار مارا گیا، جوانی فائرنگ میں سردار سکندر کے کارندہ گولیوں کا شکار ہو گئے۔ نوید اور سکندر جان بچانے کے لئے دو مختلف سمتوں میں بھاگے۔ ایک پولیس اہلکار کی گولی بھاگتے ہوئے نوید کے سر میں لگی اور وہ ہٹا چیتے زمین پر گر کر زخمی ہو گیا۔ جب کہ سکندر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

نکال لیا تھا اور اب اس کا اعتراف جرم ریکارڈ کر رہا تھا۔ اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں میں جو بتایا اس کا لبالب یہ تھا کہ ماں کی اصلیت سامنے آتے ہی ماں اور اس کے آشنا کے قتل کے بعد اس نے ہر عورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ چند لڑکیوں کو قتل کرنے کے بعد اسے اس کام میں لذت آنے لگی۔ وہ میک اپ کے ذریعے بوقت ضرورت چہرہ بدل دیتا رہی سہی کس رنگ کا اسپرنگ چٹکی داڑھی اور عینک پوری کر دیتی، وہ آسانی پر پورے کے بھیس میں رہ رہا تھا۔ اس نے جعلی کاغذات سے پوش علاقے میں نئے نام سے گھر بھی لے رکھا تھا جس کے تہ خانے میں وہ لڑکیوں کے کٹے ہوئے سر جمع کر رکھا تھا۔

علینہ سمیت اس نے کئی لڑکیاں اپنی تسکین کے لئے قتل کیں۔ عینہ کو قتل کر کے اس نے اپنا لباس جان بوجھ کر SHO نواز علی کے گھر کے عقبی سمت پھینکا، اپنے لباس کا ٹکڑا بھی اس نے خود ہی جانے دوڑا۔ پتہ پھینکا تھا۔ اس کا مقصد پولیس کو راہ سے بھٹکانا تھا، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہا۔

قدیر خان سمیت سارے نواز علی پر شک کرتے رہے اور وہ اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کرتا رہا۔

اس کا بیان ریکارڈ کرنے کے بعد اسپیشل شاہد علی نے ایمر جنسی پر کال کر کے پولیس طلب کی، اسی لمحے اچانک قدیر خان نے فرش پر پڑ پھل اٹھا لیا اس سے پہلے کہ شاہد علی اسے روکتا اس نے پے درپے کئی فائر کر کے دھرتی کو جنونی قاتل کے مکروہ وجود سے نجات دلا دی۔

”یہ آپ نے کیا کیا؟“ شاہد علی نے کہا۔ ”یہ زندہ رہنے کے قابل نہیں تھا۔“ قدیر خان نے جواب دیا۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور دو راتوں بعد دروازہ اندر داخل ہوئے، یہ نوید اور سردار سکندر تھے۔ ”ذلیل انسان نہ تو تم زندہ بچو گے اور نہ ہی یہ لڑکی اس نے تمہارے ساتھ گھر سے بھاگ کر میری عزت کا جنازہ نکال دیا۔ تم کیا سمجھتے تھے اس شہر میں جنہیں نہیں ڈھونڈ سکتا۔ میرے کارندہ جنہیں شہر بھر میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ آج جب تم اس رپورٹر کے ساتھ یہاں آ رہے تھے تو میرا ایک

کہ حویلی خوفناک چیخوں سے گونج اٹھی وہ خوف سے لرز اٹھا۔
☆.....☆.....☆

اسی وقت مرزا علی کی آواز گونجی۔ ”سردار سکندر تمہاری حویلی کو پولیس نے گھیر لیا ہے تمہارے بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔

جناب میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ یہ فائر سکندر کے کارندوں نے کئے تھے۔ اب دو طرفہ فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ سردار سکندر سہا ہوا کمرے کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔

اجانک کمرے میں ایک ہیولہ نمودار ہوا، جس نے رتہ رتہ آبیہ کی شکل اختیار کر لی، اس کے چہرے اور سر سے خون بہہ رہا تھا اور بہتا ہوا خون اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہا تھا۔

سکندر چیخا ہوا بھاگا ہی تھا کہ چھت پر موجود بھاری بھرکم فانوس اس پر آن گرا تو وہ آخری بار کریناک انداز میں چیخا۔

حویلی کے دروازے پر بری طرح لرز رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے خوفناک زلزلہ آچکا ہو، اور پھر اس ہال نما کمرے کی چھت گر گئی، جہاں سکندر کی لاش موجود تھی۔ سکندر کے کچھ کارندے گرفتار ہو چکے تھے اور کچھ مارے گئے تھے۔

پیش امام اصوب کے مشورے پر حویلی کے زندان میں مدفن لاشوں کو نکال کر نماز جنازہ پڑھانے کے بعد گاؤں کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ پھر کبھی زندان کی روح حویلی میں دکھائی نہ دی۔

فوزیہ سردار سکندر کی وارث تھی۔ محمود سے شادی کے بعد حویلی میں مقیم ہو گئی، قدیر خان زندہ بچ گیا تھا۔ قدیر خان اور ثریا بیگم گاؤں میں ان دونوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ قدیر خان نے اخبار کی جاب کو خیر آباد کہہ کر اس پسماندہ گوشہ میں اسکول کھول لیا ہے وہ جانتا تھا کہ تعلیم ہی جہالت تو ہمانی اور فرمودہ رسومات کا خاتمہ کر سکتی ہے۔



پولیس اہلکار اندر داخل ہو چکے تھے۔ قدیر خان کو فوراً ہی ایک گاڑی میں ہو سٹل روانہ کر دیا گیا۔ ایس ایچ او نواز علی بھی پولیس کے ساتھ ہی تھا۔

محمود اور فوزیہ کے بیان لئے گئے، فوزیہ نے تمام کہانی بتانے کے ساتھ بتایا کہ قدیر خان نے جب پرویز کو اطلاع دی کہ فوزیہ اشتیاق احمد کے گھر پر ہے وہ درندہ فوراً ہی وہاں پہنچ گیا اور مزاحمت پر ایڈووکیٹ کو لے کر گیا۔ شاید علی نے جنونی قاتل کی ریکارڈ کی ہوئی گفتگو بھی پولیس کے حوالے کر دی۔

سردار سکندر کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے گئے۔ لیکن وہ اپنے آبائی گاؤں فرار ہو چکا تھا۔ محمود نے تفتیش کے دوران ہی پولیس سردار سکندر کے آبائی گاؤں کے بارے میں جان چلی تھی۔ فوراً ہی وہاں جانے کے لئے پولیس پارٹی تشکیل دی گئی۔ اس میں شاہ علی خان اور نواز علی بھی تھے۔ انہوں نے رہنمائی کے لئے محمود کو بھی ساتھ لیا کیونکہ وہ مقامی بندہ تھا اور محل وقوع سے خوب واقف تھا وہ جس وقت گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے رات کے دس بج رہے تھے۔

مقامی پولیس کو بھی ساتھ لیا گیا اور سردار سکندر کی حویلی کو گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ اس کے محافظ احاطے میں چوکنے کھڑے تھے اور سردار سکندر اپنے کمرے میں بے چینی سے نہل رہا تھا وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ پولیس حویلی کو گھیرے میں لے چکی ہے۔

ٹپٹے ٹپٹے سکندر کی نظر کیلنڈر پر پڑی اور وہ ششدر رہ گیا۔ آج 31 دسمبر کی رات تھی اسی رات آبیہ نے خودکشی کی تھی اور اکتیس دسمبر کی ہی ایک رات اس کی روح نے آفتاب کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

سکندر کے جسم میں خوف و ہشت کی ایک لہر سرایت کر گئی اور ذہن میں پیش امام بشیر چاندیو کے الفاظ گونجنے لگے۔ وہ پولیس کے خوف سے جان بچانے کے لئے اس حویلی میں قس آیا تھا۔ جہاں رہنے سے پیش امام صاحب نے منع کیا تھا۔

سکندر کمرے کے دروازے سے باہر نکلنے ہی والا تھا